UST - SEPT.
1982

**GULBUN**
AHMEDABAD.

**Price 2-50**

گجرات سے نکلنے والا واحد علمی ادبی اور ثقافتی ماہنامہ

# ماہنامہ گلابن احمد آباد


اگست، ستمبر ۱۹۸۲ء

جلد ۵ ✻ شمارہ [illegible]



نگراں
سید محمد حکیم الدین شیرازی

منتظم اعلیٰ
سید احمد مختار غوثی

مشیر
سید علی احسن بخاری

ایڈیٹر
ثریا ہاشمی

مینیجنگ ایڈیٹر
ظفر ہاشمی

ترتیب کار
مناظر عاشق ہرگانوی


## بدلِ اشتراک

لائف ممبری ———— ۲۵۰ روپئے

دو سال کے لئے ———— ۲۵ روپے

ایک سال کے لئے ———— ۱۵ روپے

غیر ممالک میں: بحری ڈاک سے ———— ۲ پونڈ

ہوائی ڈاک سے ———— ۵ پونڈ

عام شمارہ ———— ایک روپیہ پچیس پیسے

قیمت دو روپے پچاس پیسے


پتہ:- ۲۰/۱۶۹ گجرات ہاؤسنگ بورڈ کالونی، شاہ عالم احمد آباد ۳۸۰۰۲۸ (گجرات)

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: ثریا ہاشمی

مطبع نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد یوپی (انڈیا)

# فہرست

اداریہ

# اردو میڈیم کے اساتذہ سے دو باتیں

گجرات میں اردو میڈیم کے طلباء کے مسائل پر ہم اس صفحہ میں اکثر بحث کر چکے ہیں۔ چونکہ ہم مستقبل میں اردو زبان کی صحت اور بقا کا دار و مدار انھیں اسکولوں اور ان میں زیر تعلیم بچوں پر ہی سمجھتے ہیں اس لئے ان کے مسائل پر خصوصی توجہ دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اردو میڈیم اسکولوں کے اساتذہ کو ہم صحیح معنوں میں معمارِ قوم تصور کرتے ہیں۔ ہمیں ان کی مشکلات ماحول کی گھٹن، الجھے مسائل محدود وسائل اور کشمکش حیات کا علم ہے لیکن ہمیں ان ہی کی ذات سے اردو سے متعلق توقعات بھی وابستہ ہیں۔ گجرات میں اگر اردو کی ترویج و اشاعت ہوئی اور اُسے فروغ حاصل ہوا تو اُس کا سہرا بلاشبہ انھیں اساتذہ کے سر ہوگا۔ ایسی صورت میں اِن معزز خواتین و حضرات کی توجہ ہم ایک اہم مسئلہ کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

ہم نے محسوس کیا ہے کہ گجرات کے تقریباً تمام اردو اسکولوں میں تعلیم محض نصاب کے دائرہ میں قید ہو کر رہ گئی ہے۔ بچوں کو محض امتحانی نقطۂ نظر سے ہی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہمیں اس طریقۂ تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ بچوں میں غیر نصابی لٹریچر پڑھنے کا ذوق و شوق پیدا کیا جائے۔ در اصل اردو زبان سے اِن بچوں کا اٹوٹ رشتہ اسی وقت قائم رہ سکتا ہے اور وہ تا عمر اردو کو اُسی وقت گلے لگائے رہ سکتے ہیں جب اُن کے دلوں پر نو عمری ہی میں اس زبان کی رعنائی اور اس سے وابستہ تہذیب کی دلکشی نقش کر دی جائے اور یہ چیز ان کے اندر مطالعہ کا شوق ابھارنے سے ہی پیدا ہوگی۔ لہٰذا بچوں کو نصابی کتابوں کے علاوہ سبق آموز کہانیوں، قومی رہنماؤں اور مذہبی پیشواؤں کے حالات زندگی، اسلاف کے قصوں، حکایتوں اور اصلاحی نظموں وغیرہ کی کتابوں کے مطالعہ کی طرف راغب کیا جانا چاہیئے تاکہ اُن کے ذہن اردو پڑھنے کے عادی ہوتے رہیں اور جب وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد نصاب کے دائرے سے باہر نکلیں لگے عملی زندگی میں قدم رکھیں تو اردو کے عام لٹریچر سے اپنا دائمی رشتہ قائم کرلیں اور اسی طرح اس زبان کو زندہ اور تابندہ رکھیں۔

ہمیں امید ہے کہ اساتذہ کرام اس پر توجہ دیں گے

ثریا ہاشمی

نظیر لدھیانوی (پاکستان)

میں ہوں غلامِ احمدِ مختارؐ یا غفور
ہو جاؤں مغفرت کا سزاوار یا غفور

ہیں پیشِ دیں گناہ کے انبار یا غفور
رحمت کی اک نگاہ ہے درکار یا غفور

محشر میں مغفرت کے سوا اور کون ہے
اس جنسِ معصیت کا خریدار یا غفور

لَاتَقْنَطُوْا سے تجھ کو بھی انکار ہے کہاں
گر ہے مجھے خطاؤں کا اقرار یا غفور

لَاتَقْنَطُوْا کا مہرِ جہاں تاب کر طلوع
ہے ظلمتِ گناہ سے شب تار یا غفور

دے عدل سے پناہ مجھے اپنے فضل کی
آمرزگار تو میں گنہگار یا غفور

دل معصیت پسند مگر تو کرم شعار
گھبرائے کیوں کرم کا طلبگار یا غفور

رحمت کے اقتضا کو کیا تو نے اختیار
قابل سزا کے تھا مرا کردار یا غفور

تیرے وفورِ عفو و کرم سے ہے کیا بعید
میرے لئے ہو نار بھی گلزار یا غفور

تو کافروں کے واسطے قہار و منتقم
تو مومنوں کے واسطے غفار یا غفور

دنیا میں جیسے عیب چھپائے نظیرؔ کے
تو حشر میں بھی ہے یونہی ستار یا غفور

نظیر لدھیانوی (پاکستان)

خاکِ طیبہ کا ہر اک ذرہ ہے کشورِ جمال
ہر مکاں نور کے آئینے میں تصویرِ جمال

خشک و تر جس سے منور وہ ترا ذکرِ جمیل
چاندنی جس سے خجل وہ تری تنویرِ جمال

سر کٹے ہاتھ سے صد معرکۂ بدر و حنین
آستیں میں یدِ بیضا ہے کہ شمشیرِ جمال

ہے نسیمِ سحری ناشر بوئے گیسو
صبحِ خنداں کا تجمل تری تشہیرِ جمال

گردِ دامن بھی تری سرمۂ چشمِ انجم
شبِ اسرا ہمہ اعجاز بھی تصویرِ جمال

تیرے دیوانے کو ہے صحنِ چمن بھی زنداں
کثرتِ گل سے ہر اک شاخ ہے زنجیرِ جمال

عجز کی ایک ادا بابِ اجابت کی کلید
عشق کی نیم نگہ آیۂ تسخیرِ جمال

جانفزا ہے کششِ عشق کا اعجاز نظیرؔ
تیرے اشعار کا ہر لفظ ہے تصویرِ جمال

ناظر عاشق ہرگانوی

# "پوسٹ مارٹم"

ادب میں چوری کی وبا عام ہوتی جا رہی ہے۔ اس
مرتکب اچھے بھلے لوگ بھی ہو رہے ہیں۔ وجہ غالباً نام
و دادرسستی شہرت ہے۔ قوت تخیل اور قوت تخلیق
ہر تاجن کے پاس نہیں وہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اساتذہ کا کلام
نا کی تخلیق سرقہ کر رہے ہیں۔ یا نووارد حضرات کے کلام
تھ صاف کر رہے ہیں۔ ایسی ہی ایک تازہ مثال "ر
ہما آواز" لکھنؤ میں دیکھنے کو ملی۔ "گلوریاں" کے تحت
ر تبریزی کی ایک نظم "نغمۂ مچھر" شائع ہوئی ہے۔
یہ نظم اردو کے معروف طنز و مزاح نگار شاعر رضا
ی واہی کی ۔۔ واہی کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے
ی کا پہلا مجموعہ "ن۔ زاہیات" ۱۹۵۰ء میں شائع
تھا۔ اس میں ایک نظم ہے۔ "مچھروں کا سوراج" یہی
"مچھروں کا گیت" کے عنوان سے واہی کے دوسرے
وعۂ کلام "طنز و تبسم" اور چوتھے مجموعۂ کلام "کلام نرم و
ک" میں بھی شامل ہے۔ یہ نظم واہی نے ۱۹۵۰ء سے
لکھی تھی اور ملک کے کئی رسائل میں شائع ہوئی تھی۔
اب یہی نظم نظر برنی نے اپنے نام سے شائع کرائی
۔ میں دونوں نظمیں یہاں پیش کر رہا ہوں تاکہ قارئین
کریں : یہ سرقہ ہے یا اسے توارد کہا جا سکتا ہے۔
اہی کی نظم ملاحظہ فرمائیے ـــ

خلوص دل سے گاتے ہیں، عظیم آباد کے مچھر
بڑے داتا ہیں اپنے بلدیہ کے اسپشل افسر

*

ان ہی کا فیض ہے جو گندگی پھیلی ہے سڑکوں پر
انہیں کے فیض سے مسکن ہے اپنا شہر کا ہر گھر

*

انہیں کی مہربانی ہے جو آزادی مسلی ہم کو
ہماری قوم کے حق میں ہیں وہ انگریز سے بڑھ کر

*

جلوس اپنا جہاں چاہیں جدھر چاہیں نکالیں ہم
نہیں ہے ہم کو پبلک سیفٹی آرڈر کا مطلق ڈر

*

ہماری پرورش کے واسطے پٹنہ کی گلیوں میں
کہیں کوڑے کی ڈھیری ہے کہیں بھینسوں کا ہے گوبر

*

ہماری قوم کا آبائی مسکن تھا کبھی جنگل
مگر اب تو وطن ہے خاص بانکی پور کے اندر

*

سٹی سے لے کے اسٹیشن تک اپنا بول بالا ہے
یہ سبزی باغ کے نالے ہیں اپنے کلچرل سنٹر

*

ہمارے مورچوں پر کوئی دشمن چڑھ نہیں سکتا
فلٹ کا توپ خانہ ہو کہ ڈی ڈی ٹی کا ہو بمبر

*

محلوں کا ہر اک نالا ہے اسٹالن گراڈ اپنا
شکست فاش کھاتا ہے صفائی کا جہاں لشکر

*

(بقیہ صفحہ ۱۹ پر)

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
مبارک ہے آئینہ اور گندگی اس کے لئے جوہر

*

غلاظت میں بھی پوشیدہ ہے اک صورت بھلائی کی
ضروری کھاد ہے کشت تمدن کے لئے گوبر

*

بڑھی رونق دواخانوں، مطب اور اسپتالوں کی
غلاظت کا اثر پڑنے لگا جب عام صحت پر

*

تجارت شہر میں ایسے طبیبوں کی بھی چل نکلی
جو پہلے مارتے تھے دن کو مکھی، رات کو مچھر

*

ہر اک موسم میں مچھردانیاں بکنے لگیں اتنی
کہ پھیری کرنے والے بن گئے کپڑے کے سوداگر

*

گلی کوچوں میں اور سنڈاس میں تفریق مشکل ہو
تعفن نے کیا پٹنہ میں قائم سوشلسٹ آرڈر

*

خدا کی یاد سے غافل نہیں ہوتے کبھی زاہد
ہمارے نیشتر کا قرض ہے شب زندہ داروں پر

*

ہمیں ہیں شام ہجراں میں انیس درد تنہائی
ہمیں عاشق کے ارمانوں کو بہلاتے ہیں گا گا کر

*

ہماری موسیقی کی جب صدا کانوں میں آتی ہے
تو کس شفقت سے کہتے ہیں ہمارے اسپیشل افسر

*

مبارک ہو حصول رزق کی آزادی کامل
کرو مشق ستم خون دو عالم میری گردن پر

*

اور اب نظر برنی کی نظم مطبوعہ "قومی آواز" دیکھیے

سریلی راگنی میں گاتے ہیں ہمارے شہر کے مچھر
یہ سب نغمہ سناتے ہیں بپا ہوتا ہے اک محشر

*

انھیں کے واسطے تو گندگی پھیلی ہے سڑکوں پر
گلستان و بیاباں میں غلاظت کی بچھی چادر

*

ہمارے شہر میں ان کو ملی ہے ایسی آزادی
نہیں ہے انکو پبلک سیفٹی آرڈر کا مطلق ڈر

*

غلاظت میں بھی پوشیدہ ہے صورت اک صفائی کی
ضروری کھاد ہے کشت تمدن کے لئے گوبر

*

بڑھی رونق دواخانوں، مطب اور اسپتالوں کی
غلاظت کا اثر پڑنے لگا جب عام صحت پر

*

تجارت شہر میں ایسے طبیبوں کی بھی چل نکلی
جو پہلے مارتے تھے دن میں مکھی، رات میں مچھر

*

ہر اک موسم میں مچھردانیاں بکنے لگیں یارو
کہ پھیری کرنے والے بن گئے کپڑوں کے سوداگر

*

خدا کی یاد سے غافل نہیں ہوتے کبھی زاہد
انھیں کے نیشتر کا قرض ہے شب زندہ داروں پر

*

ہمی ہیں شام ہجراں میں انیس درد تنہائی
ہمی عاشق کے ارمانوں کو بہلاتے ہیں گا گا کر

*

باقی صفحہ ۱۹ پر

ب نواز مائل (پاکستان)

# حزن پہ ایک نظم

ن سنتا ہے یہاں درد کی بات
خادر لفظ یہی صبح کہے

ا در لفظ یہی شب نے کہا
تہاں یوں بھی تحیر کا جہاں

ں نہ سو طور ہی کہلائے بہار
ھ نظاروں سے کیا پائے یہاں

ہ اندیشہ میں رہنا ہے عجب
ن کو حزن بھی کہنا ہے عجب

سحر صدیقی

# یوٹوپیا

اک نگر تو ایسا بھی خطۂ زمیں پہ ہو
جس کی سرحدیں نہ ہوں
جس کے سب مکانوں پہ
روشنی کے پہرے ہوں
سبز رنگ میں لپٹی جس کی سرخ مٹی ہو
جھاڑیوں درختوں پہ سبزگی کی چادر ہو
تتلیوں کو اڑنے کی
رنگ کو پنپنے کی
جگنوؤں کو جینے کی
جس جگہ ہو آزادی
سُر جہاں کے سچے ہوں
دل جہاں کے سچے ہوں
لوگ خوبصورت ہوں
اک نگر جو ایسا بھی خطۂ زمیں پہ ہو
میں، تجھے وہاں ڈھونڈوں
تو مجھے وہاں پائے

منظر اعجاز (مظفر پور)

# عرفانِ ذات

کہیں گپھاؤں میں
تاریکیوں کے میلے میں
زمیں کی حد میں کہیں اور کہیں زمیں سے پرے
کوئی چراغ ہے روشن کسی بھی طور جلے
یہ کوئی امر حقیقت یا خواب ہو بھلے
مگر شعاعیں بکھرتی ہیں اس کے جلووں کی
اگر ہے آنکھ تو خوابوں کی اہمیت کیا ہے
اگر نظر ہے تو خوابوں میں بھی حقیقت ہے
کہ ہے اسی کی بنا پر کوئی حسیں تعبیر
یہی مسلک عرفانِ ذات کی تفسیر
اسی زمین پہ ہوتا ہے وہ مکاں تعمیر
کہ جو زمانے کی گردش سے دور ہوتا ہے
اسی کے در سے، دریچے سے جھانکتی ہے کرن
اسی سے آگہی صبح کا ہوتا ہے ظہور۔

ڈاکٹر بیچین (بھاگلپور)

# سوچ

کانچ کی چوڑیاں کیوں خریدتی ہو
جلدی ٹوٹ جاتی ہیں
سونے کی چوڑیوں کا دام بہت ہوتا ہے
لوہے کی چوڑیاں بدصورت معلوم ہوتی ہیں
جیوتشی جی کہتے تھے
'اُشبھ' بھی ہوتی ہیں
لیکن میں مضبوطی چاہتا ہوں
ہر صبح کو ایک دو ٹوٹ جاتی ہیں
پیسے دیتے دیتے میں پریشان رہتا ہوں
کانچ کی چوڑیاں کیوں خریدتی ہو
جلدی ٹوٹ جاتی ہیں
کانچ لوہے اور سونے میں انتخاب کرنا ہوگا
یا نقلی گولڈ کا گہنا پہننا ہوگا
لیکن .... لیکن ..... تمہارا پیار
نقلی یا اصلی
اس کا فیصلہ کون کریگا
سونا! کانچ!! لوہا!!!

شاہدہ تبسم

# خواب معصوم رہنے دو

لفظ کہنے دو اب
سوچ بہنے دو اب
بس ہواؤں کے رخ پر
خواہشوں کے سبھی بادباں کھول دو
زندگی کے ہر اک اجنبی رنگ سے
آشنائی کو ان کی لپٹنے بھی دو
جاگتے ہی میں نادیدہ سپنوں کے پر
ان کو بے رنگ پلکوں سے چننے بھی دو
ورنہ خوابوں میں بے تجربہ جسم پھر
لمس کی آخری حد کو چھو جائیں گے۔

**

غنی وتلانی (بڑودہ)

# رباعیات

خاموش پرندوں کو چہک بخشے گا
سوکھے ہوئے سبزے کو لہک بخشے گا
اے اہلِ چمن صبر ہمارا اک دن
پھولوں کو بہشتوں کی مہک بخشے گا

احساسِ عمل اپنا جگا کر دیکھو
غفلت سے ذرا ہوش میں آکر دیکھو
تقدیر سے جو کام نہیں بنتا ہو
تدبیر سے وہ کام بنا کر دیکھو

اس گھر میں کہاں چین ہے اس گھر سے نکل
نادان اس آماجگہِ شر سے نکل
دشمن ہیں ترے آتش و گل آب و ہوا
اے روحِ ستم خانۂ عنصر سے نکل

ہے فیض امیری سے فقیری اچھی
مشروط رہائی سے اسیری اچھی
اے دورِ شباب اب مجھے معلوم ہوا
گم کردہ جوانی سے تو پیری اچھی

دنیا کی ہوس یا غمِ عقبیٰ کر لوں
حیراں ہوں کہ دو روز میں کیا کیا کر لوں
کچھ دیر ٹھہر اے نفسِ عمرِ رواں
آیا ہوں تو اس کا بھی خلاصہ کر لوں

جمال قریشی (احمد آباد)

# قطعات

اے دوست جدائی کی المناک فضا میں
پالیتا ہوں تسکین کچھ اشعار ہی کہہ کر
پھر ایسے ہی ویران نظر آتا ہے مجھ کو
جیسے کہ فسادات میں بازار کا منظر

میں نے دنیا ترے بارے میں بہت سوچا ہے
ایک شب رنگ سویرے کے سوا کچھ بھی نہیں
ان کی یادوں کے اجالوں سے نکل کر دیکھا
زندگی صرف اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

ان گنت لوگ ہیں دنیا میں غموں کے مارے
صرف ہم پر ہی کرم ہو یہ ضروری تو نہیں
فطرتاً رہتی ہے انساں کو مسرت کی تلاش
زندگی وقفِ الم ہو یہ ضروری تو نہیں

کل سرِ شام جو اس سمت ہوا میرا گذر
آنکھ میں گرد بنی حسنِ نظر کا کاجل
رخِ روشن پہ تھیں اس طرح پریشاں زلفیں
جیسے مہتاب کو گھیرے ہوئے کالے بادل

محمد منشا یاد

# کنٹوپ

گاڑی نہایت آہستہ چل رہی تھی۔ بار بار رک جاتی تھی بعض اوقات اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا تھا کہ چل رہی ہے یا رکی کھڑی ہے۔ کبھی کبھی لگتا انجن زور لگا رہا ہے۔ مگر گاڑی۔ اس سے کھینچی نہیں جا رہی۔

اس نے پریشان ہو کر پھولوں کی طرف دیکھا۔ ان پر پژمردگی بھنبھنانے لگی تھی۔ ایک آدھ پھول نے مرجھا کر پنکھڑیوں کا تاج اتار پھینکا تھا اور گردن ایک طرف ڈال دی تھی گر گاڑی اسی رفتار سے چلتی رہی اور بار بار رکتی رہی تو اس کے سارے پھول مرجھا کر رہ جائیں گے۔ اس نے دکھ سے سوچا وہ ــ یہ پھول اس کے لئے کر جا رہا تھا جسکی آنکھیں نرگسی تھیں مگر اس نے نرگس کے پھول نہیں دیکھے تھے صرف ہزاروں سال نرگس والا شعر پڑھا تھا۔ اگر یہ پھول۔ مرجھا گئے تو وہ بالکل خالی ہاتھ رہ جائے گا۔ اس کے پاس اسکے لئے اور کچھ بھی تو نہیں تھا۔ اسے دکاندار کی بات یاد آگئی "بابو جی ــ اگر آپ ان کو دھوپ، دھوئیں، و حبس سے بچا کر رکھیں گے اور گلدان کا پانی بدلتے رہیں گے تو یہ منزل تک پہنچنے تک بالکل تازہ رہینگے" اس نے پوری احتیاط کی تھی ہر طرح سے ان کا خیال رکھا تھا مگر پتہ نہیں موسم کا اثر تھا! انجن کے دھوئیں کی وجہ سے وہ بہت جلد مرجھانے لگے تھے حالانکہ ابھی اس نے آدھا سفر بھی طے نہیں کیا تھا۔

اس اسٹیشن پر جہاں سے اسے گاڑی تبدیل کرنا تھی۔ پہنچ کر اس نے سوچا کیوں نہ وہ پھولوں کا نیا گلدستہ خرید لے۔ کیا پتہ دوسری گاڑی اسے بروقت منزل پر پہنچا دے اور وہ کھلے ہوئے۔ مہکتے ہوئے تازہ پھولوں سمیت اسکے پاس پہنچ جائے۔ اس نے ایک مسافر سے جو اسی شہر کا رہنے والا تھا اور اپنا سامان اتار رہا تھا پوچھا "یہاں نرگس کے پھول ملتے ہیں"

"کس کے پھول؟"

"نرگس کے"

"کیا یہ کسی خاتون کا نام ہے؟"

"خاتون کا نام بھی ہو سکتا ہے۔ مگر میں پھولوں کی بات کر رہا ہوں"

"میں ان پھولوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا"

"کیا آپ نے وہ شعر نہیں سنا ــ ہزاروں سال نرگس۔ اپنی بے نوری پہ روتی ہے"

"اچھا اچھا ــ وہ والی نرگس" مسافر نے جواب دیا، پھر کچھ دیر کے توقف کے بعد بولا "میں نے خود تو یہ پھول کبھی نہیں خریدے مگر میرا خیال ہے ضرور مل جائینگے"

پھر مسافر نے اسے دکان کا پتہ بتایا۔ دوسری گاڑی آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ وہ شکریہ ادا کر کے اور اپنا سامان حفاظت سے رکھوا کر باہر آیا اور ایک رکشہ میں سوار ہو کر چل دیا۔

راستے میں ایک جگہ ــ ایک بہت بڑے میدان میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ تل دھرنے کی جگہ

نہیں تھی۔ اس نے رکشہ والے سے پوچھا۔ "کیا یہاں کوئی میلہ لگا ہے؟"

"میلہ؟" رکشہ والا عجیب سی ہنسی ہنس کر بولا۔ "ہاں بابوجی! میلہ ہی سمجھو"

"میلہ ہی سمجھوں۔ میں کچھ سمجھا نہیں؟"

"ویسے یہاں کبھی میلہ بھی لگتا تھا۔ یہ اتنی بڑی بڑی دکانیں اور اسٹال لگتے تھے۔ طرح طرح کے کھیل تماشے ہوتے۔ جھولے ہنڈولے، موت کا کنواں، جادو کے کھیل، سرکس اور تھیٹر ہیرا رانجھا، سوہنی مہیوال اور سسی پنوں کے کھیل دکھائے جاتے تھے۔ مرزا صاحبان کا سوانگ رچایا جاتا۔ رنگ برنگی روشنیاں جھلمل جھلمل کرتیں۔ لاؤڈ اسپیکروں پر تیز موسیقی میں ماہیے ٹپے گائے جاتے۔ گانے والے اور والیاں لوگوں سے داد اور نوٹ حاصل کرتے۔" اس نے کچھ اور پوچھنا چاہا۔ مگر اسے اخبار میں پڑھی ہوئی ایک خبر یاد آ گئی اور وہ سہم کر چپ ہو رہا۔

ہجوم پیچھے رہ گیا تھا مگر اسے لگتا تھا جیسے اس کے پیچھے پیچھے ماتم کرتا آرہا ہو یا پھر وہ اسی ہجوم میں کھو گیا تھا۔ پیچھے رہ گیا تھا۔ سیکڑوں میل پیچھے۔ جس بازار میں پھولوں کی دکان تھی وہاں یک طرفہ ٹریفک تھا۔ وہ بازار کے سرے پر اتر کر پیدل چلنے لگا۔

ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اس نے ایک جگہ بہت سے لوگوں کو شور مچاتے، نعرے لگاتے اور باجے بجاتے دیکھا۔ خوشی ابھی اس شہر میں کہیں نہ کہیں موجود تھی۔ یہ سوچ کر وہ بہت خوش ہوا۔ شاید کشتیاں ہو رہی تھیں۔ اسے کشتی بہت پسند تھی۔ پہلوانوں کو اکھاڑے میں اترتے اور ایک دوسرے کے پنجے میں پنجہ ڈال کر زور آزمائی کرتے دیکھ کر اس کا اپنے اوپر اعتماد بڑھ جاتا تھا۔ فخر سے سینہ تن جاتا تھا وہ آگے بڑھا، مگر وہ یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ کہ وہاں بٹیر لڑائے جا رہے تھے۔ لڑانے سے پہلے شاید انہیں کافی عرصہ تک بھوکا رکھا گیا تھا۔ مایوس ہو کر وہ پلٹ آیا اور پھولوں کی دکان تلاش کرنے لگا۔

واپسی پر وہ بڑے میدان کے قریب سے گزرا۔ اس نے دیکھا سب لوگ میدان کے وسطی حصے کی طرف آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔ لوگوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کی اوٹ سے خوفزدہ نظروں سے ایک ہی سمت میں دیکھ رہے تھے۔ پھر اس نے عورتوں اور بچوں کو سسکتے اور چیخیں مارتے سنا۔ اسے چھوٹے ماموں یاد آ گئے۔

ایک بار چھوٹے ماموں کا چتا مرغ پڑوس والے نانبائیوں کے مرغ سے ہار گیا تھا تو چھوٹے ماموں نے دو دن تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ پھر تیسرے دن جب وہ اسکول سے لوٹا تو اسے پتہ چلا کہ چھوٹے ماموں کافی دیر سے چھت پر چڑھے ہوئے تھے۔ وہ اپنی پتنگ لے کر چھت پر آیا۔ مگر وہاں اس نے عجیب منظر دیکھا۔ وہ چھوٹے ماموں کی بہت عزت کرتا تھا مگر اس روز کے بعد اسے ان سے سخت نفرت ہو گئی۔ چھوٹے ماموں نے نانبائیوں کے کالے مرغے کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اور ان کا چتا مرغ اس کی گردن اور کلغی پر بے رحمی سے چونچیں مار رہا تھا۔

وہ جلدی جلدی اسٹیشن کی طرف چلنے لگا۔ لیکن اسے لگ رہا تھا۔ جیسے چھوٹے ماموں کا چتا مرغ اس کی ننگی پیٹھ پر اپنی نوکیلی چونچوں سے سوراخ کر رہا ہو۔ اس کی روح نکلنے کہاں رہ گئی تھی۔ شاید ہزاروں لاکھوں لوگوں کے درمیان گھری رہ گئی تھی۔ اکیلی، بے بس۔ ذلت و تحقیر کی کیچڑ میں لت پت۔

جب وہ اسٹیشن پر پہنچا گاڑی روانہ ہونے والی تھی۔ اس نے جلدی جلدی سامان رکھوایا اور سوار ہو گیا مگر اس کا ذہن اب تک الجھا ہوا تھا۔ اس نے باہر

مناظر میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ مگر اسے سب
پھیکا پھیکا اور اداس اداس لگ رہا تھا۔ یہ گاڑی بھی
گاڑی کی طرح بار بار رک جاتی تھی۔ اور یہ اندازہ
نا مشکل تھا کہ چل رہی ہے یا رک گئی ہے۔ اسے ایسا
رہا تھا کہ آٹھ دس بوگیوں والی اس ریل گاڑی کے
انجن کی جگہ وہ خود جتا ہوا ہے اور ریل گاڑی اس
سے کھنچی نہیں جا رہی ہے۔

سفر کے پہلے مرحلے میں وہ کتنا خوش، مطمئن اور
مید تھا۔ اس کا قد دو گز ہی تھا مگر اسے نو گز لگتا تھا۔ مگر
وہ سکڑ کر اپنے اصلی قد سے بھی آدھا رہ گیا تھا۔ ہمسفروں
چہروں سے اپنائیت اور اعتماد غائب ہو چکا تھا۔ اور
لانکہ اب اس کے پاس تازہ پھولوں کا گلدستہ موجود
مگر اس کا دل مرجھا سا گیا تھا۔ اسی لمحے آدمی جتنا
ایک چوہا اندر آگیا۔ اس کا سر چھوٹا پچکا ہوا تھا۔

"پیسہ دے۔"

اسے یاد آیا۔ اس نے کسی ملک کے بارے میں پڑھا
جہاں چھوٹے پاؤں خوبصورتی کی علامت سمجھے جاتے
تھے اور انھیں چھوٹا رکھنے کیلئے بچوں کو لوہے کے جوتے پہنا
کے جاتے تھے۔

کیا پتہ اس نے سوچا ہمارے ہاں چھوٹے اور پچکے
ہوئے سروں اور نابالغ ذہنوں کو اپنی کامیابی کی ضمانت
سمجھا جاتا ہو۔ اس لئے بچوں کو پیدا ہوتے ہی لوہے کے
ٹوپ پہنا دئے جاتے ہیں۔

چوہے کی گردن پر اس کے گائیڈ کی گرفت تھی۔ اس
ہاتھ میں کشکول تھا۔ کشکول میں پیسے تھے۔

"پیسہ دے۔"

"تمہارا کنٹوپ کہاں ہے؟"

"پیسہ دے۔"

"اور تمہارا کنٹوپ؟" اس کے اندر کسی
نے سرگوشی کی۔

"میں نے اتار کر رکھ دیا ہے۔"

"نہیں، تم جھوٹ کہتے ہو — تم نے اب تک پہن رکھا
ہے۔ سب نے پہن رکھے ہیں۔ طرح طرح کے کنٹوپ، تعصب
اور تنگ نظری کے — جہالت کے۔ خود غرضی کے۔ ان کے
اتارنے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ اجازت دینے والوں
نے خود پہن رکھے ہیں۔ اس لئے — میرا، تمہارا — ہم
سب کے سر چھوٹے رہ گئے ہیں۔ اسی لئے ہم کوتاہ
ہمت ہیں۔"

بوگیاں ایک دوسری کی کمر میں ہاتھ ڈالے انجن کے
پیچھے گھسٹتی ہیں

چوہے کے کشکول میں سکے کھنکتے ہیں۔
دبوچی ہوئی گردن، اسٹیرنگ کی طرح اِدھر اُدھر گھومتی
ہے اس کے تالو میں فٹ چھوٹی سی مشین سے آواز —
سنائی دیتی ہے — "پیسہ دے۔"

اسے خالو یاد آگیا

سارے لڑکے ایک دوسرے کی کمر پر ہاتھ رکھے
کھلے میدان میں اسکے پیچھے بھاگتے۔ چھک چھک چھک۔
لالہ موسیٰ چھ چھ پیسے۔ لالہ موسیٰ چھ چھ پیسے۔
پھر خالو کے باپ کے غصے اور نفرت کے زہر میں بجھی
آواز تیر کی طرح سنسناتی ہوئی آتی اور اس کے سینے میں
پیوست ہو جاتی۔ "اوئے حرام زادے ادھر آ۔"
اور ساری ریل گاڑی پٹڑی سے اتر جاتی۔ انجن
کی کوک اس کے حلق میں پھنس جاتی اور وہ گاڑی سے علیحدہ
ہو کر اس طرف کو، جدھر سے آواز آتی بھاگ جاتا —
بوگیاں کچھ دیر انجن کا انتظار کرتیں پھر اس کے پٹنے اور
چیخنے چلانے کی آوازیں سن کر سہم جاتیں اور اپنے اپنے
گھروں کو بھاگ جاتیں۔

خالو کا باپ بہت غصیلا اور بدمزاج تھا۔

[illegible] سمجھ میں خیال ہوتا کہ [illegible] اپنا بیٹا نہیں تھا۔ خالو کبڈی کا بڑا اچھا کھلاڑی تھا۔ اس کا قد اور سانس لمبا اور چھاتی [illegible] چوڑی تھی۔ اپنے ہم عمروں میں وہ دور سے پہچانا جاتا مگر جب اسکے باپ کی آواز سنائی دیتی وہ سکڑ کر چوہا سا [illegible]

"پیسہ دے" چوہے نے اسے پھر چونکا دیا۔

"پیسہ دے، پیسہ دے" بوگیوں کے پہیے پٹری کے جوڑوں پر سے گزرتے ہوئے اس کی نقلیں اتارنے لگے اس کے دل پر چھوٹے ماموں کے چوزے نے پھر ٹھونگا مارا۔ پتہ نہیں وہ کون تھا۔ اب کس حال میں تھا۔ شاید وہ ہسپتال کے بستر پر اوندھے منہ پڑا کراہ رہا ہو۔

"ایک روپے کا سوال ہے بابا"

"تمہارے ہاتھ کو کیا ہوا؟"

"ایک روپے کا سوال"

"کیا مشین میں آکر کٹ گیا تھا؟"

"نہیں ایک روپے کا"

"ویلنے میں آگیا تھا؟"

"نہیں"

"چکی میں؟"

"نہیں، ایک روپے کا سوال"

"کیا اس پر کوڑھ اگ آیا تھا کیونکہ پھوڑا نکل آیا تھا؟"

"ایک روپے کا سوال"

ایک دن اس نے خالو سے پوچھا "تمہیں اپنے باپ کے مرنے کا افسوس تو ہوا ہوگا؟"

"ہاں [illegible] دیا تھا۔ کیونکہ وہ بچ میرا باپ تھا اور"

"اور کیا؟"

"اور میں نے خود اسے ہلاک کر دیا"

"تم نے۔۔ اپنے باپ کو؟"

"ہاں۔ گھر میں سب روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کرتے تھے۔ مگر میں، اس کا کھانا جو گھر میں علیحدہ پکتا تھا، اور بہت لذیذ ہوتا تھا، موقع پا کر چکھ لیتا تھا۔ مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس طرح وہ میرے زہر سے آہستہ آہستہ مرتا چلا جائے گا"

چھوٹے ماموں کا چوزہ اس کے ذہن میں پر پھڑپھڑا کر اور غرور سے تنی ہوئی گردن کو خم دیکر پورے غرور سے بانگ دیتا ہے۔ وہ چونک جاتا ہے۔ کیا دیکھتا ہے کہ آدھی رات کا وقت ہے۔ ہر طرف خاموشی اور اندھیرا ہے۔ اور ریل گاڑی عین جنگل کے درمیان رکی کھڑی ہے۔ اس نے گھبرا کر پھولوں کو ٹٹولا، وہ مرجھا چکے تھے اور ان سے مری ہوئی مچھلیوں کی سڑاند آرہی تھی۔

"انجن خراب ہو گیا ہے" ساتھ والے نے اسے اطلاع دی۔

"اب کیا ہوگا؟"

"اب دوسرا انجن آئے گا۔ اس وقت تک ہمیں انتظار کرنا ہوگا"

وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔

ایم کے اثر کی تصنیف

نعیم آروی

# مائی فیئر لیڈی

کبھی وہ صدر میں سب وے کے قریب ملتی، کبھی
ہ اجبین کے مقابل ہانگ کانگ ریستوران کے سامنے
جہاں فٹ پاتھ کے ساتھ مختلف ماڈل کی گاڑیاں رُک
رتی، معطر معطر بیگمات کو لے کر وہاں زناٹے سے آ رکتیں
وہ ان کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتی "بخشش"۔
بیگمات تو ناک بھوں چڑھاتی اس سے دور ہٹ
کر چلی جاتیں مگر بعض اوقات موٹے فربہ، توندیل، گلے میں سونے
کی زنجیر، سونے کے دانت اور انگلیوں میں سونے کی بھاری بھاری
انگوٹھیوں کی نمائش کرتے ہوئے سیٹھ افسر اور تاجر اس پر
ایک نگاہ ڈالتے تو ان کے اندر یکایک انسانی ہمدردی کا
جذبہ جوش مارنے لگتا ——— "ونڈر فل"
"دیکھ ڈیں پھول"
ان کے ہاتھ بے اختیاری میں بڑی بڑی جیبوں میں اتر
جاتے اور جب برآمد ہوتے تو ان میں چند بڑے بڑے نوٹ
ہوتے ——— گندے ہاتھوں کے لمس سے گوشت کے پہاڑ سے
میں لذت کے نا آشنا کرنٹ دوڑ جاتے۔ پٹھان دربان
سے ادب سے دروازہ کھولتا اور وہ چیتھڑے میں لپٹی عورت
ہونٹوں سے نکلتے ہوئے خود ہانگ کانگ کے پیٹ میں اتر
جاتے۔

رات کے دس گیارہ بجے کے درمیان جبیں اور ہانگ کانگ
کے چند سندھی فن کار سندھی لوک موسیقی کا مظاہرہ
کرتے۔ یہ ان کا معمول ہے۔ ہوٹلوں سے نکلنے والے موسیقی کے
دلدادہ" ذرا کی ذرا رک کر لوک دھنوں سے لطف اندوز
ہوتے ہیں اور چند سکوں کی صورت میں اس کی قیمت ادا کرکے
کار میں بیٹھ کر نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو جاتے
ہیں۔

ہمارے یہاں بڑے لوگوں نے ہمیشہ سے موسیقی اور
اصنافِ سخن کی سرپرستی کی ہے۔

ادھر سے گذرتے ہوئے میں نے یہ بات نوٹ کی ہے
کہ اکثر وہ ان فن کاروں کے قریب بے تکلفی سے بیٹھ کر بڑے
غور سے لوک دھنیں سنتی۔ اس دوران بڑے سے بڑا
سخی گزر جائے وہ نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتی۔ "میرے
محبوب میں تجھے اپنی آنکھوں کی پتلیوں میں چھپا لوں
اور پھر تمہاری آنکھوں سے ساری دنیا دیکھوں۔ مگر
اس بے رحم دنیا میں محبت کا خوبصورت تحفہ نہ اتارا
جاتا تو زندگی جہنم کی آگ سے بدتر ہو جاتی۔" ایسے گیتوں
کی دھن سن کر اس پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔

گیارہ بجے کے بعد شکار کی تلاش میں گھومنے والی
گاڑیاں اس کے قریب کھڑی ہوتیں مگر وہ اپنے اطراف
سے بے نیاز ——— جانی پہچانی منزل کی جانب چل دیتی۔
کسی میں اتنی ہمت نہ ہوتی کہ آگے بڑھ کر راستہ روک لے۔

ہمارا اس کا اکثر آمنا سامنا ہوتا۔ شروع شروع میں
اس نے ہمارے سامنے بھی مخصوص انداز سے ہاتھ پھیلائے
تھے "بخشش صاحب"

لیکن بعد میں جب اس نے محسوس کیا کہ ہمارا شمار
"صاحبوں" میں نہیں ہے اور ادھر سے گزرنا ہمارا معمول

جنہ تو اس نے ہاتھ پھیلانا ترک کر دیا۔ البتہ ہماری نگاہیں غیر ارادی طور پر طاری ضرور ہوتیں۔ کبھی کبھی وہ مسکرا بھی دیتی اور میری بے خواب راتیں آسانی سے کٹ جاتیں۔ گو وہ گندی بہت تھی اور قریب سے گزرتے ہوئے کبھی اس کے جسم سے بدبو کے بھبھکے اٹھتے تھے۔

میں اکثر سوچتا، ایک دن وہ اسی طرح فٹ پاتھ پر بیٹھی ہو گی۔ اُدھر سے کوئی دل پھینک رئیس گزرے گا۔ وہ اسے اٹھا کر اپنی محل نما کوٹھی میں لے جائے گا۔ اس کو مرمریں ٹب میں غسل کرائے گا۔ اس کے گندے چکٹ بال دھلنے کے بعد ریشم جیسے ملائم اور سنہرے ہو جائیں گے اس کے جسم پر ابٹن اور مہندی مل جائے گی۔ گلاب کا پانی چھڑکا جائے گا۔ پھر اس کے بالوں کو سنوارا جائے گا۔ جوڑے میں تازہ پھول مہکیں گے۔ ریشمی لباس میں اس کا ریشمیں جسم جگ مگ کرتا طلوع ہو گا —— ہر طرف خوشبو اور چاندنی بکھر جائے گی۔ مائی فیئر لیڈی۔

ایک روز ادھر سے گزرا تو وہ موجود نہ تھی۔ میں نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں مگر نظر نہ آئی۔ میں نے سوچا شاید آج کسی دوسری جانب نکل گئی —— دوسرے دن میں قصداً دیر سے گزرا کہ شاید نظر آ جائے۔ مگر وہ دکھائی نہ دی۔ البتہ سندھی فنکار حسب معمول فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے لوک دھن بجا رہے تھے۔ ان کے ارد گرد چند موالی چرس کا سوٹا لگا کر سر دھن رہے تھے۔

"میرے محبوب تو کہاں چلا گیا۔

تیرے انتظار میں میری روح آنکھوں میں اٹک کر رہ گئی ہے۔

میں کانٹوں کے بستر پر تنہائی کی اذیتیں جھیل رہا ہوں آجا تاکہ مجھے اس عذاب سے چھٹکارا مل جائے"

اتنے ماہ گذر گئے کہ میں تقریباً اس کو بھول چکا تھا میں روزانہ ادھر سے گزرتا۔ اس کی جگہ دوسرا بھکاری چپکا جسم سے چپکی تھیں۔ یہ زندگی کی بڑی تکلیف دہ حقیقت تھی کہ کسی کے رہنے یا نہ رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کاروبار حیات اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہتا ہے۔ وقت ہر زخم مندمل اور ہر یاد کو دھندلا کر دیتا ہے۔

ایک دن مجھے وہ اچانک فٹ پاتھ پر نظر آ گئی۔ مجھے حیرت ہوئی ـــ اسے میں دیکھتے اور محسوس کرتے وہاں کئی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ وہ پہلے کی طرح زیادہ گندی نہ تھی۔ لباس بھی کچھ کچھ صاف تھا۔ جسم سے بدبو کے بھبکے بھی نہیں اٹھ رہے تھے۔ لیکن اس کے چہرے کا سونا لٹا لٹا سا نظر آیا۔ سرسوں کا مرجھایا ہوا پیلا پھول۔ بڑی بڑی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ سب سے اہم تبدیلی اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس وقت نظر آئی جب وہ بڑی "بے حیائی" سے اپنا پیٹ کھجانے لگی

"صاب۔ بخشش۔"

احمد سہیل (مظفر پور)

# سوال

میں بھاگ رہا ہوں۔ بھاگتا ہی جا رہا ہوں۔ سماعت کی دیوار سے بس ایک ہی صدا بار بار ٹکرا رہی ہے۔ بھاگو! بھاگو بھاگو............!

اور میں بھاگنے لگتا ہوں یہ سوچے سمجھے بغیر کہ میں کہاں بھاگ رہا ہوں؟ کس سے بھاگ رہا ہوں؟ کیوں بھاگ رہا ہوں ——؟ بھاگتے بھاگتے پورا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا ہے جسم سے نکلنے والا پسینہ دماغ کو پراگندہ کرنے کیلئے کافی ہے۔ پاؤں کے تلوؤں میں آبلے پڑ گئے ہیں، جن سے خون اور پانی جیسی رطوبت جاری ہے جسم پر جگہ جگہ خراشیں ہیں سر پہ دھوپ کی تمازت —— بھاگتے بھاگتے جب میرے پاؤں جواب دینے لگتے ہیں۔ تو میں عالم بے بسی میں چاروں طرف دیکھنے لگتا ہوں، کچھ دیر کسی سایہ دار درخت کے نیچے دم لے لوں اور پھر اپنے آپ کو بھاگنے کے لئے تر و تازہ اور تیار کر لوں —— لیکن میری نگاہ ہر طرف سے مایوس لوٹ آئی اور میں پھر بھاگنے لگتا ہوں۔ اس بے گناہ کی طرح جس نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے مگر زمانہ اسے ایک نا۔ کردہ گناہ کی سزا دینے کے لئے اس کے تعاقب میں ہو اور وہ خوف و دہشت سے چھپتا چھپاتا کوئی گوشۂ عافیت کی تلاش میں ہو۔

میں پھر بھاگنے لگتا ہوں۔ کچھ اور دوری طے کر لینے کے بعد مجھے ایک چوراہا پر لوگوں کی بھیڑ نظر آتی ہے۔ انسانی جسموں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک بیکراں سمندر —

ایک ہی جیسے لوگ، سنِ شعور اور سنِ بلوغت کو پہنچے ہوئے جواں سال چہرے —— آہستہ آہستہ بھیڑ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ چاروں جانب سے لوگ بھاگتے چلے آ رہے ہیں۔ اور پھر سب لوگ ایک ہی بھیڑ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ہر نئی آواز پا کے ساتھ لوگ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں ... اپنے جیسا ہی پا کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ سبھوں ... ایک انجانا سا خوف، ایک سراسیمگی — جسم کے عریاں حصے پر جگہ جگہ خراشیں جن سے سرخ سرخ قطرے نکل کر جلد کی شاخ پر شبنم کی طرح بوند بوند یکجا ہو گئے ہیں اور جسم کے باقی ماندہ کپڑے کو داغدار بنا رہے ہیں — پاؤں میں چلنے کی سکت نہیں —— جسم نڈھال —— آنکھوں سے تھکاوٹ اور بیزاری مترشح، جن میں دہشت کا عنصر بھی شامل —— پلکیں نیند سے بوجھل ——

چند لمحے رک کر میں ان کی طرف غور سے دیکھتا ہوں اور انہیں اپنے جیسا ہی پا کر ان میں شامل ہو جاتا ہوں۔ مجھے دیکھتے ہی لوگ ایک بار پھر چونک اٹھتے ہیں۔ اور سہم جاتے ہیں —— چند ایک نگاہیں تو تیر کی طرح میرے اندر اتر جاتی ہیں شاید وہ میرے اندر کے شخص کو پہچاننا چاہتی ہیں، آیا کہیں میں وہی شخص تو نہیں جس کے سبب ان لوگوں کی یہ حالت ہوئی ہے۔ اور جب انہیں اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ میں وہ شخص نہیں ہوں، میں بھی ان میں سے ہی ایک ہوں تو ان کی نگاہیں مایوس لوٹ جاتی ہیں —— میں ایک شخص کو دور

خلاؤں گھورتے ہوئے پاکر اسے اپنی طرف متوجہ کرتا ہوں اور پوچھتا ہوں —— تم لوگ کون ہو اور کیوں بھاگ رہے ہو؟

وہ خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا ہے اور پھر اپنے آپ میں مشغول ہو جاتا ہے۔ جیسے یہ سوال اس کیلئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہو —— جیسے یہ سوال اس کے لئے نیا نہیں ہو —— جیسے اب تک کے ہر آنے والے ایک دوسرے سے یہی سوال پوچھا ہو۔ جیسے اس کا جواب بھی ایک ہو۔ خالی خالی نظروں سے سوال کرنے والے کی طرف دیکھنا —— اور پھر اپنے آپ میں مشغول ہو جانا میں پھر اس سے پوچھتا ہوں۔ تم لوگ کہاں بھاگ رہے ہو اور کس سے بھاگ رہے ہو۔

وہ پھر بھی کوئی جواب نہیں دیتا بس —— دور خلاء میں خالی خالی نظروں سے ایک ہی مرکز کو ڈھونڈتا رہتا ہے میں اس سے عاجز ہو کر دوسرے شخص کو مخاطب کرتا ہوں اور اس سے بھی یہی سوال کرتا ہوں۔ لیکن اس کی طرف سے بھی وہی خاموشی میں مایوس ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگتا ہوں —— کسی ایسے چہرا کو ڈھونڈنے لگتا ہوں جو میرے اندر اٹھتے سوالوں کا مناسب جواب دے سکے۔ میرے اندر کے اندیشوں کو دور کر سکے —— میری نظر ایک ایسے شخص پر مرکوز ہو جاتی ہے جو میرے خیال میں میری پریشانیوں کا حل ڈھونڈ سکتا تھا۔ میں اسکی جانب بڑھ جاتا ہوں۔ میرے ہی جیسے اور بھی بہت سے لوگ اسے گھیرے ہوئے تھے اور اس سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے۔ میں بھی اس بھیڑ میں شامل ہو جاتا ہوں —— جو سوالات میں کرنا چاہتا تھا —— جو میرے ذہن کو پریشان کر رہے تھے —— وہی سوالات دیگر لوگوں کو پوچھتے ہوئے پاکر میں خاموش رہ جاتا ہوں اور اس شخص کے جواب کا انتظار کرنے لگتا ہوں۔

وہ شخص کچھ دیر تک خاموش خلاء میں گھورتا رہتا ہے اور پھر ایک نظر بہت ہی گہری نظر سے مجمع کی سمت دیکھتا ہو —— سوکھے ہوئے زرد زرد چہرے —— پسینے سے ترجسم —
جگہ جگہ خراشیں —— آنکھوں میں دہشت —— بے نام سا خوف —— اپنے سائے سے سہمے ہوئے لوگ —— چہرے پر سارے جہاں کی مایوسیاں —— کچھ دیر یونہی دیکھتے رہنے کے بعد وہ ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتا ہے اور پھر کہتا ہے ——

یہ سوالات جو تم مجھ سے پوچھ رہے ہو، اس سے اچھا تھا کہ یہ سوال تم اپنے آپ سے کرو —— تمہیں تمہارے سوال کا جواب تمہاری ذات سے مل جائے گا —— ذرا سوچو!
غور سے سوچو!! تم لوگ کیوں بھاگ رہے ہو —— ؟
کس سے بھاگ رہے ہو —— کہاں بھاگ رہے ہو —— ؟
کیا اس طرح بھاگتے رہنے سے تمہیں تمہاری مطلوبہ منزل مل جائے گی؟ جس سے بھاگ رہے ہو، کیا اس سے دور جا سکو گے —— ؟

اور میں سوچنے لگتا ہوں —— میں کس سے بھاگ رہا ہوں —— ؟
اپنے دوستوں سے —— ؟
اپنے رشتہ داروں سے —— ؟
زمانے سے —— ؟
یا خود اپنے آپ سے —— ؟
آخر کہاں —— ؟ کس سے —— ؟ کیوں —— ؟
کب تک —— ؟ کون جواب دے گا —— ؟

افتخار عظیم 'چاند' (پٹنہ)

# کربلا

وہ ایک سیدھا سادا، شریف النفس اور نیک صفت دیہات کا رہنے والا نوجوان تھا۔ بچپن کے زمانے ہی سے اس کی بڑی خواہش رہا کرتی تھی کہ وہ شہر گھومنے جائے۔ بچپن سے جوانی کی دہلیز میں داخل ہونے اور اپنا عمر کی تیئس بہاریں دیکھنے کے باوجود بھی اُسے شہر جانے کا موقع ہاتھ نہیں آیا تھا لیکن آج اس کی دیرینہ خواہش پوری ہو رہی تھی۔ اور وہ اپنی زندگی میں پہلی بار اپنے کھیت کے واسطے "پمپنگ سیٹ" خریدنے کے لئے شہر آیا تھا۔ کیونکہ شدت کی گرمی پڑنے کی وجہ سے اس کے اطراف کے سارے کنویں سوکھ گئے تھے۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ وہ گھومتے گھومتے کافی تھک گیا تھا۔ ہوا کے مطلق خاموش رہنے اور چلچلاتی دھوپ میں چلنے پھرنے سے اُسے زور کی پیاس لگی تھی اور وہ پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر سرگرداں تھا۔ وہ سرکاری نل پر اپنی پیاس بجھانے کے لئے گیا لیکن دور دور پر واقع کئی نل پانی کی سپلائی بند ہونے کے سبب سوکھے پڑے ہوئے تھے۔ کافی پریشان ہونے کے باوجود بھی وہ اپنی پیاس بجھانے میں ناکام رہا لہٰذا اُس کے حلق میں کانٹے چبھنے لگے اور نڈھال ہو کر ایک ہوٹل میں جا گھسا۔

پانی..... پانی......"

پانی نہیں ہے، صاحب......! ہوٹل کے ملازم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

نوجوان کی قوت برداشت جواب دے گئی اور وہ پیاس کی تاب نہ لا کر غش کھا کر زمین پر گر گیا۔ آس پاس کے سارے لوگ اس نوجوان کے گرد جمع ہو گئے۔ کوئی چلانے لگا کہ پانی لاؤ پانی؟ اور کوئی کہنے لگا کہ پنکھا چلاؤ؟

پانی کہاں سے لاؤں؟ یہاں تو چوبیس گھنٹوں سے بجلی فیل ہے اور نل سے پانی غائب ہے۔ اب تو ہمارے پاس چائے بنانے کے لئے بھی پانی نہیں بچا ہے......! ہوٹل کے مالک نے بڑی عاجزی سے کہا۔

پھر وہاں موجود سب لوگ دم توڑتے ہوئے نوجوان کو قریبی اسپتال پہونچانے کی کوشش کرنے لگے۔

اسپتال لے جا کر کیا کیجئے گا، آپ لوگ...... وہاں بھی بجلی بند ہے!" مجمع میں سے ایک شخص نوجوان کی حالت زار پر افسوس کرتے ہوئے بول پڑا۔!

---

## بقیہ پوسٹ مارٹم

مبارک ہو حصول رزق بھی، آزادئ کامل
نظر عشق ستم خون جہاں ہے ان کی گردن پر
دائی کی نظم میں ۱۹ اشعار ہیں، اور نظر برنی کی نظم ۱۰ اشعار کی ہے۔ ۱۰ میں ۹ نشان زدہ اشعار دیکھئے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ یہ سرقہ ہے یا توارد!

ظفر ہاشمی (احمد آباد)

# لاشوں کی شناخت

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر فساد نہ پیدا کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے لوگ ہیں۔ آگاہ رہو کہ یہی لوگ فساد برپا کرنے والے ہیں لیکن یہ محسوس نہیں کر رہے ہیں"

(سورہ بقرہ)

مولوی نقشبندی نے اس رات دھواں دھار تقریر کی تھی۔ میدان تھا کہ کھچا کھچ بھرا تھا۔ مجمع میں معتقدین اور مریدین کے علاوہ منکرین اور منافقین بھی شامل تھے مولوی صاحب نے اپنے الفاظ کے زیر و بم لہجے کے اتار و چڑھاؤ، آواز کی نرمی و سختی، آنکھوں کی نمی و خشکی ہاتھوں کی جنبش اور چہرے کے تناؤ سے وہ سماں باندھا تھا کہ معتقدین اور مریدین کا روتے روتے اور منکرین و منافقین کا ہنستے ہنستے برا حال تھا۔ لیکن مزا دونوں کو آیا تھا۔ مولوی صاحب نے اپنی تقریر کا نقش دونوں پر چھوڑا تھا، یہ بات اور تھی کہ نوعیت جدا جدا تھی اول الذکر کو ایسا لگا تھا جیسے وہ کسی انجانی اور ان دیکھی جگہ بیٹھے ہوں اور اُن کی نگاہوں کے سامنے سے جنت و دوزخ باری باری گذر رہا ہوں اور موخر الذکر کو ایسا لگا تھا جیسے انھوں نے کسی نٹ کا تماشا یا کسی مداری کا کرتب دیکھا ہو —— ان دنوں قوم کے دو جید فرقوں میں جو ایک دوسرے پر مدتوں سے کفر کا فتویٰ صادر کرتے آئے تھے، ایک، ایسی بحث چھڑ گئی تھی جس سے دونوں ہی اپنی زندگی تو خیر ٹھیک ہے اپنے مذہب کو بھی داؤ پر لگا بیٹھے تھے اور ہر قیمت پر اپنی بات منوانے کے درپے تھے۔

مسئلہ یہ چھڑ گیا تھا کہ پائجامہ کتنا لمبا پہننا چاہیئے ایک فرقے کا کہنا تھا کہ پائجامہ ٹخنوں سے بس ذرا سا اوپر اٹھا رہے اتنا کہ ٹخنہ کھلا رہے مگر دوسرے فرقے کا کہنا تھا کہ یہ خیال صریحاً غلط ہے اور اس پر عمل کرنے والا کافر ہے۔ ان کے خیال میں پائجامہ اتنا نیچا ہونا چاہیئے کہ ٹخنہ ڈھکنے نہ پائے بس ذرا سا باقی رہ جائے ——
یہ بات دوسری تھی کہ منکرین و منافقین کا کہنا تھا کہ دونوں میں کچھ بھی تو فرق نہیں بلکہ وہ تو یہ بھی کہتے تھے کہ پائجامہ پہنا ہی کیوں جائے اور یہ کہ اگر انسان کپڑے سے بے نیاز ہو جائے یعنی شرافت کے ظاہری لبادے کو نوچ پھینکے تو یہ حرکت فطرت کے عین مطابق ہوگی اور روئے زمین سے فساد کا قلع قمع ہو جائے گا۔ مگر یہ لوگ بصیرت سے محروم تھے اس لئے ان کی بات کوئی نہیں سنتا تھا یہ لوگ تعداد میں تھوڑے تھے اور باقی لوگ ایمان کی دولت سے مالا مال تھے اس لیے انھیں فکر تھی کہ پائجامہ کی لمبائی کا تعین تو ہونا ہی چاہیئے ورنہ وہ مالک حقیقی کو منہ کیسے دکھائیں گے۔

تو صاحب اس رات مولوی نقشبندی نے وہ دھواں دھار تقریر کی تھی کہ لوگوں کے دماغ روشن ہو گئے تھے۔ اُن کے دلوں پر شیطان جو آ بیٹھا تھا۔

ار بھاگا تھا مگر منکرین و منافقین کا کہنا تھا کہ شیطان اور ڈٹ کر بیٹھ گیا تھا بلکہ لیٹ گیا تھا ـــــ تو وہ سب سب کچھ نہ کچھ بولتے ہوئے تتر بتر ہو گئے تھے اور اپنے نے گھر جا کر بچوں کو مارا تھا کہ وہ ابھی تک سوئے کیوں نہیں تھے یا پھر اتنی جلدی سو کیوں گئے تھے، بیوی کو ڈانٹا تھا کہ وہ وعظ سننے کیوں نہیں گئی اور یا پھر گھر چھوڑ کر کیوں گئی۔ اور مولوی نقش بندی نے خاصہ تناول فرمایا تھا کہ کھانا اگر تقریر سے پہلے کھا لیتے تو گرانی کے باعث تقریر میں روانی نہ آتا۔ تقریر تو یوں ہو جاتی مگر ہلا دینے والی نہ ہوتی۔ ایسی نہ ہوتی کہ لوگوں کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑپھڑانے لگتیں اور دانت کٹکٹانے لگتے۔ ویسے بھی کھانا اگر پیٹ میں چلا جائے تو آدمی بولتا کم ہے۔ بولتا تو وہی ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ چیختا چلاتا وہی ہے جو خالی پیٹ ہوتا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ پیٹ مجبوراً خالی ہے یا مصلحتاً۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ آدمی وہ چاہے جس قماش یا قیمت کا ہو چیختا چلاتا اسی وقت ہے جب اس کا پیٹ خالی ہوتا ہے ـــــ اسی باعث مولوی نقش بندی نے خاصہ تقریر کے بعد تناول فرمایا تھا کھانا کھانے کے بعد انھوں نے کچھ گولیاں نگلیں تھیں، کچھ معجون چاٹے تھے اور سونے کے کمرے میں جاتے جاتے اپنے حواریوں سے کہتے گئے تھے کہ اگر مخالف گروہ کے مولوی نے کل تقریر کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ پائجامہ...

مگر دیر یوں ہی ہو گئی تھی۔ اب اگر مولوی صاحب مزید احکامات جاری کرتے یا فتویٰ صادر فرماتے تو صبح ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لئے ایک معتقد نے جو ابھی کم عمر تھا اور باوجود تزکیہ نفس کے رات میں گدگدانے والے خواب دیکھا ہی کیا کرتا تھا کہ شیطان مردود کا کام ہی ہے کہ نیک بندوں کو صراط مستقیم سے ہٹا دے، جلدی کی مولوی صاحب کی بات کاٹ

”حضرت آپ فکر نہ کریں۔ ہم نے اپنے سروں پر کفن باندھ لکھا ہے“

”ماشاء اللہ“۔ مولوی صاحب نے حلق سے نکالا تھا اور مسکراتے ہوئے حجرہ استراحت میں داخل ہو گئے تھے۔

صبح ہوئی تو ـــــ لیکن ٹھہریئے ـــــ صبح ہونے کے بہت پہلے بلکہ یوں سمجھئے کہ مولوی نقش بندی نے جس وقت تقریر ختم کی تھی اور ان کے معزز سامعین کچھ نہ کچھ بولتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے تھے اسی وقت دوسرے فرقے کے مجاہدین اکا دکا آنا شروع ہو گئے تھے اور جب ایک طرف پورا میدان خالی ہو گیا تو دوسری طرف ایک چہل پہل بھی ہو گئی۔ آنے والوں میں کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں پانی سے بھری ہوئی بالٹیاں تھیں، کچھ کے ہاتھوں میں جھاڑو تھے۔ کچھ لوبان اور اگر بتی لئے ہوئے تھے۔ ماچس تو سبھی کے پاس تھی اس لئے کہ بیڑی سبھی پیتے تھے اس کے علاوہ کون جانے مولوی صاحب کب جہاد کا حکم دے دیں ایسے موقع پر آگ لگانے کے لیے وہ ماچس کہاں ڈھونڈتے پھرتے ـــــ انھوں نے میدان کو جو مولوی نقش بندی اور ان کے سامعین کے وجود سے ناپاک ہو گیا تھا، ابھی جھاڑنا دھلنا شروع کیا۔ جب وہ ”پاک“ ہو گیا تو انھوں نے اس تخت کو، جس پر کھڑے ہو کر مولوی نقش بندی نے ہلا دینے والی تقریر کی تھی، اپنے جوتوں سے خوب پیٹا پھر اسے ایک کنارے کھڑا کر دیا۔ اس کی جگہ ایک دوسرا تخت لا کے، اسے بچھایا اور اس کے چاروں کھونٹ اگر بتی کھونس کر جلا دی۔

اور پھر وقت مقررہ پر وہ میدان ایک بار پھر انسانوں کے مجمع سے کھچا کھچ بھر گیا۔ وہاں موجود ہر آدمی بول رہا تھا اور ان کی آواز کی بازگشت دور دور تک پھیل رہی تھی مولوی تربلوی ابھی تشریف نہیں لائے تھے۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ مولوی صاحب کھانا کھا رہے ہیں۔ کچھ دوسروں کا خیال تھا کہ مولوی صاحب کھانا۔۔! کہاں کھاتے ہیں

وہ تو صرف پھل کھاتے اور لسی پیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ مولوی صاحب عبادت میں مشغول ہیں اور بارگاہ الٰہی میں دعا فرما رہے ہیں کہ اللہ مخالف گروہ کا منہ کالا کرا دے اور انھیں یہ توفیق عطا فرما کہ وہ پائجامہ کے صحیح مقام کا تعین کر سکیں یعنی یہ کہ اُس کی حد بندی کر سکیں۔ اس مجمع میں بھی مرتدین اور منافقین موجود تھے اور مزا تو یہ کہ یہ لوگ وہی تھے جو کل والے مجمع میں شامل تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ دونوں مولوی اِس وقت سازش کر رہے ہیں۔ مگر ان کی بات سن کر دوسروں نے اپنے اپنے کانوں میں انگلیاں کر لی تھیں کہ حشر کے دِن اُن کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ نہ ڈالا جائے۔ وہ جانتے تھے کہ بد سامع کا حشر ایسا ہی ہونے والا ہے۔ ان کے خیال میں یہی وہ بہرے گونگے اور اندھے لوگ ہیں جو لوٹنے والے نہیں ہیں اور جن کا ذکر آسمانی صحیفوں میں بار بار آیا ہے۔

آخرکار مولوی صاحب آئے اور مجمع ایک بار بن گیا، جیسے زلزلہ سے زمین دہلتی ہو۔ پھر چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ لوگ گردنیں لمبی لمبی کرکے تخت کی طرف دیکھنے لگے مولوی صاحب اپنے قریب ترین کی معیت میں خراماں خراماں تخت تک آئے۔ وہ جوتا اتارنے کے لیے بس جھکے ہی تھے کہ ان کے ارد گرد بھنور بن گئے اور جوتا کیسے اور کہاں غائب ہو گیا ان کو پتہ ہی نہ چلا۔ وہ جانتے تھے کہ جب وہ جانے لگیں گے تو جوتا خود بخود ان کے پیروں میں گھس جائے گا ــــ وہ عبا سنبھالتے ہوئے مائک تک آئے مجمع پر طائرانہ نظر ڈالی۔ خاموشی کا پردہ اور دبیز ہو گیا گردنیں زیادہ تن گئیں۔ آنکھوں نے پلک جھپکنے میں تاخیر کی حد کر دی۔ لوگ مجسم گوش بن گئے، چند لمحوں بعد مولوی صاحب کی آواز آئی۔

"میرے بزرگو اور دوستو، ہمارے سامنے مسئلہ قوم کی زندگی اور موت کا ہے۔ مسئلہ عدم و وجود ہے، مسئلہ صفر و کل کا ہے، مسئلہ فنا و بقا ہے ــ ہمارے حریف ہم سے نبرد آزما ہیں لیکن اللہ جسے چاہے ذلت دے اور جس کو چاہے عزت دے۔ اگر ہم حق پر ہیں تو اللہ ہماری مدد کرے گا اور اگر باطل پر ہیں تو اللہ انھیں غرق کرے گا ــــ مسئلہ یہ نہیں کہ پائجامہ کتنا بڑا ہو یا چھوٹا، سوال یہ ہے قوم کے ناموس کی ستر پوشی اس سے ہوتی ہے ہے... وقت آنے پر قوم کے نام پہ وہی اپنا سر پیش کرتا ہے جس کے نام کے آگے لوح محفوظ پر شہید لکھا ہے اور جس کا وارث انسان نہیں خدا ہوتا ہے۔ تو میرے بزرگو اور دوستو یہ بندہ حقیر یہ عرض کرتا ہے کہ پائجامہ اتنا لمبا ہو کہ ٹخنے سے ذرا اوپر رک جائے نہ کہ اتنا چھوٹا ہو کہ ٹخنہ ذرا سا کھلا رہ جائے جیسے ہمارے حریف، جن کی حرکتوں سے امت مسلمہ کا سر شرم سے جھک جھک جاتا ہے، خیال کرتے ہیں ــــ وقت میرے پاس کم ہے ورنہ میں یہاں اس پُرنور مقام پر اس مجمع ارباب حل و عقد کے سامنے جن کے دل نور ایمان سے بھرے ہوئے ہیں، جن کے سینوں میں شمع ہدایت فروزاں ہے، کتابوں سے، آسمانی صحیفوں سے، اقوال بزرگان سے، نگارشات اولیاء سے، مکتوبات صوفیاء سے، مخطوطات علماء سے یہ ثابت کر دیتا کہ پائجامہ اتنا ہی لمبا ہونا چاہیئے جتنا میں نے ابھی ابھی عرض کیا۔ اس سے کم یا زیادہ خلاف شرع ہے اور اس سے انحراف کرنے والا مرتد ہے اور آپ سب جانتے ہیں کہ مرتد کا مقام جہنم ہے۔ اس لیے وہ بھٹکے ہوئے لوگ جو مجھ سے متفق نہیں ہیں اور قطعاً غضب الٰہی کے مستحق ہیں اور جب وہ عذاب الٰہی کے مستحق ہیں تو وہ ہم میں سے نہیں ہیں اور جو ہم میں سے نہیں

ن سے جہاد فرض ہے۔"
یکایک ان میں سے جسے باقی لوگ یہ سمجھتے تھے
وہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں اور آسمانی صحیفوں
بار بار انھیں کا ذکر آیا ہے' ایک شخص کھڑا ہو کر
رے چیخا۔
"یہ غلط ہے' فریب ہے' بکواس ہے"
وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ کسی نے اس کے پیٹ
چاقو اتار دیا اور وہ چپ ہو گیا۔
پھر جب سارا ہنگامہ ختم ہو گیا۔ گھروں سے
دان نکلنا بند ہو گیا عورتوں اور بچوں کی چیخیں بند
گئیں شعلوں کی لپلپاتی زبان پر پانی کی مقراض
۔گئی تو سرکاری عملے کے سامنے لاشوں کی شناخت
مسلہ کھڑا ہو گیا۔
انھوں نے ہر لاش کو بغور دیکھا۔ الٹ پلٹ کر
لیکن ان کے چہروں پر جلد ہی مایوسی کی چھیٹ پڑ گئی
رت سے ایک دوسرے کا منہ تاکنے لگے کیونکہ
پاجامہ تو کسی لاش کی ٹانگوں پر نہ تھا اور جو تھا
بھی وہ اتنا پھٹ گیا تھا یا جل گیا تھا کہ لاش کا ختنہ
نیں پوری ٹانگ برہنہ ہو گئی تھی۔
پھر شناخت کیسے ہو؟
انھوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک کر
تلاش کرنا چاہا مگر ساری آنکھوں میں سوال ہی سوال
ا۔
مجبور ہو کر انھوں نے تمام لاشوں کو اکٹھا کیا اور
ن گاڑیوں میں لاد کر چلے گئے
البتہ ایک لاش جو سب سے ٹھنڈی تھی۔ چھوڑ
: کیونکہ اس لاش کی شناخت ہو گئی تھی۔
وہ لاش سر سے پیر تک ڈھکی تھی اور کوئی اس
کا وارث نہ تھا۔

مدالحسن بدر (سیتامڑھی)

## غزل آزاد

پھر وہی بے خودی کا عالم ہے اپنی ہستی سے بے خبر ہوں میں
آج پھر اسکا منتظر ہوں میں
ظلمتوں کے مقلدینو! تم مجھ کو مصلوب کر نہیں سکتے
میری ہستی کو غور سے دیکھو روشنی کا پیامبر ہوں میں
کون آئے گا اب مری جانب کون بیٹھے گا میری چھاؤں میں
زرد موسم کا اک شجر ہوں میں
شام ہوتے ہی جس میں یادوں کی ان گنت روحیں رقص کرتی ہیں
اپنے ماضی کا وہ کھنڈر ہوں میں
تجربوں کی نئی عمارت پر دیکھ کر اپنے نام کی تختی
ایسا محسوس ہوتا ہے مجھ کو ساتویں آسمان پر ہوں میں
وقت کی گردشوں سے بے پروا جو حقیقت کے سنگریزوں پہ پیچھے دیکھے بغیر چلتے ہیں
ایسے لوگوں کا ہمسفر ہوں میں
مان لو بس ذرا سا مشورہ میرا مجھ سے کترا کے تم نکل جاؤ
ایک خوں خوار رہگزر ہوں میں!

حق اعظمی (گیا)

## غزل

کس کو معلوم تھا دن یہ کبھی ایسا ہوگا
منتظر راہوں میں ہر سمت اندھیرا ہوگا
خشک پتوں کی بھی آواز نہیں آئے گی
دور تک راہوں میں سناٹوں کا پہرا ہوگا
ایک اک کر کے ستارے یہ بجھے جاتے ہیں
مجھ کو لگتا ہے اندھیروں کا نہ ڈر وا ہوگا
کیا رگ سنگ سے ہی رت یہ نچوڑی گئی ہے
گرم سانسوں کا جو اٹھتا ہوا میلا ہوگا
حق مری طرح اسے بھی تو ندامت ہوگی
ہاتھ اک لمحہ جہیں عمر کا آ گیا ہوگا!

ایم۔ کے۔ اثر (کلکتہ)

## غزل

اپنے شعور سے کوئی معنی پہنا لے تو
نقطے ہیں چند سرخ سے لفظوں کے درمیاں
شاید پلٹنے والوں کے یہ نقش راہ ہیں
رستے مڑے ہوئے بھی ہیں رستوں کے درمیاں
ان منجمد اندھیروں کو پگھلا کے دیکھ لو
کوئی تو ہوگا آہنی پردوں کے درمیاں
خود اپنی نازکی کی جسارت پہ خندہ زن
ہوتے ہیں کچھ حباب بھی موجوں کے درمیاں
اپنی شناخت کے لئے بے چین کیوں نہ ہو
سورج بھٹک کے آ گیا ذرّوں کے درمیاں
میں اپنے ہی حصار میں ہوں اس طرح اثر
سورج تھکا ہوا کوئی کرنوں کے درمیاں

شہپر رسول (علی گڑھ)

جوش ملیح آبادی کی نذر

# غزل

ہم زندگی شناس تھے سب سے جدا رہے
کمرہ میں میرے دھوپ کا آنا ہو وقت صبح
بابا! یہ مجھ حقیر کو اتنی بڑی دعا
پھر آج میرے درد نے مجھ کو منا لیا
کب تک کسی پڑاؤ پہ وحشت کرے قیام

بستی میں ہول آیا تو جنگل میں جا رہے
آنکھوں میں کاش ایک ہی منظر بسا رہے
تو بات کا دھنی ہے ترا قد سوا رہے
کوئی کسی عزیز سے کب تک خفا رہے
کب تک کسی کے ہجر کا سایہ گھنا رہے

شہپرؔ صدائے وقت سے کر لو مصالحت
محرومیوں کے در پہ کوئی کیوں کھڑا رہے

---

عبدالرحیم نشترؔ (ناگپور)

# غزل

تو اپنے ہاتھوں کی مہندی بگاڑ کر رکھ دے
نہیں تو میری محبت اجاڑ کر رکھ دے
اب اور جی نہ جلا اپنی عذر خواہی سے
مرے لکھے ہوئے مکتوب پھاڑ کر رکھ دے
بڑا شدید ہے محرومیوں کا یہ احساس
گئے دنوں کی رفاقت کو جھاڑ کر رکھ دے
وہ جس کی شوخی و نکہت کا ہم نے خواب بنا
وہ پھول اب اسی مٹی میں گاڑ کر رکھ دے
میں خود سے ہار گیا اور تو بھی یوں کچھ کر
کہ بیا ہتا کو کنواری پچھاڑ کر رکھ دے
کھلی ہتھیلی پہ آنکھیں گڑائے گا کب تک
کھنچی ہوئی ہیں لکیریں بگاڑ کر رکھ دے
بہت اٹھا لئے دو روزہ زندگی کے نخرے
حرام زادی کو نشترؔ لتاڑ کر رکھ دے

ظفر ہاشمی (جمشید پور)

# آزاد غزل

وہ جو خواب زار لئے رہا
وہ اپنی نیند میں انتشار لئے رہا
بڑھی اتنی پیاس کہ دشت میں ہی وہ مل گیا
وہ جبل بھی جو کبھی آبشار لئے رہا
وہ مقام بھی تو نجوم و ماہ کو پی گیا
جسے شہریار لئے رہا
وہ جو جس کے واسطے آندھیوں میں جلا کیا
وہ چراغ ہی شب انتظار لئے رہا۔
کوئی بانٹتے ہی تو بانٹتے بھی قرار خود
دل بے قرار لئے رہا
کسی لفظ کا [illegible] سے کوئی معنی نہ مل سکا
جو کتاب زیست بھی شاندار لئے رہا
جہاں خاک کے سوا کچھ نہیں
وہی موڑ پیڑ بھی سایہ دار لئے رہا۔

شان بھارتی (دھنباد)

# غزل

پھر مرے خوابوں کو وہ زخم پرانے دے گا
اک خلل ہے جو کبھی نیند نہ آنے دے گا

کم سوادوں نے جلائے ہوں جہاں گھی کے چراغ
فکر کی شمع وہاں کون جلانے دے گا

اس قدر بھیڑ مسائل کی ہے رستے رستے
کون ماضی کی طرف لوٹ کے جانے دے گا

یہ چمکتے ہوئے خوابوں کے حسیں تاج محل
اب مرا شہر مجھے گاؤں نہ جانے دے گا

اس کی یک طرفہ عنایت کا ہے انداز عجیب
شانؔ اپنے پہ وہ الزام نہ آنے دے گا

---

نذیر فتح پوری (پونہ)

# آزاد غزل

رگوں میں سلگتے لہو کی سلگتی ہوئی کامنائیں بہت ہیں
ہمارے بدن میں چتائیں بہت ہیں
تمہارے تمکنت کی ادائیں بہت ہیں
ہمیں بھی ہماری انائیں بہت ہیں۔
زمانے کی منصف مزاجی کے صدقے
ہمارے لئے زندگی میں سزائیں بہت ہیں
میں کم مائیگی سے پریشاں نہیں ہوں کہ کاسے میں میرے
تمہاری انڈیلی دعائیں بہت ہیں
ابھی کشتِ جاں کے مہکنے کے دن ہیں
ابھی دل کی دھرتی پہ چھائی لہو کی گھٹائیں بہت ہیں
نذیرؔ اپنے دل کے غموں کی سیاہی چھپانے کی خاطر
تبسم کی اُجلی روائیں بہت ہیں۔

سردار ایاغ (بنگلور)

# آزاد غزل

(عالیجناب جناب مناظر عاشق ہرگانوی کے نام)

نیند کے شہر میں خواب کی لاش پر کوئی میرے سوا رونے والا نہیں
کیا کہوں ناپنے کو بھی گز بھر اُجالا نہیں
کس قدر کام کی چیز تھی خامشی، لب کھلیں گے تو معلوم ہو جائے گا
یہ کوئی زنگ آلود بیکار تالا نہیں
بند آنکھوں کے سبزہ رنگ محراب میں ان کی تصویر موجود پاتا ہوں میں
جنکو بیداریوں میں کبھی دیکھا بھالا نہیں۔
جانے کیسے فلک سرخرو ہو گیا، ایک مقتول کے پیرہن کی طرح
بُوند بھر خوں کسی نے زمیں سے اُچھالا نہیں۔
رنگ اور نسل کی تیز تر دھوپ نے کتنے جسموں سے پرچھائیاں چھین لیں
یہ حساب اونچے طبقہ کے لوگوں نے ڈالا نہیں
کچھ سوالات ایسے بھی پیدا ہوتے ذہن راضی نہ تھا جن پہ کچھ سوچنے
دل بھی سنجیدگی سے کوئی حل نکالا نہیں
میں نے سرداؔر ایاغ آن کی آن میں طے کئے سینکڑوں رہگزارِ شہر
باوجود اس کے قدموں میں اک آدھ چھالا نہیں۔

رشید اعجاز (پونا)

## غزل

شدت خواب سے گذر بابا!
نیند کی گود سے اتر بابا!

کب نہیں تھے اناؤں میں جھگڑے
کب لڑے یونہی سنگ و سر بابا!

وسوسے اوڑھنے سے بہتر ہے
راستے اوڑھ کر گذر بابا!

صبح جن حوصلوں سے دیکھی تھی
شام انھیں ہمتوں سے کر بابا!

ڈر بے جائیں گے آہنی تلوے
پانیوں کا سفر نہ کر بابا!

ہم فقیروں کی کائنات ہی کیا
چار دروازے چار گھر بابا!

بند کس پر رہا درِ اعجاز!
کیا بھٹکنا اِدھر اُدھر بابا!

---

نور للت پودی
(بھوپال)

## غزل

آئینہ میری انا نے جو دکھایا مجھ کو
خود مرا ظرف ہی پہچان نہ پایا مجھ کو

آس سی پٹتی رہی میرے بدن سے شب بھر
تھپکیاں دے کے ترے غم نے سلایا مجھ کو

میں تو ہونٹوں پہ لرزتا رہا لفظوں کی طرح
لاکھ چاہا وہ مگر بھول نہ پایا مجھ کو

جانے کیوں دامن ہستی نے مجھے تھام لیا
تو نے بھیگی ہوئی پلکوں سے گرایا مجھ کو

راہ میں گرد کی مانند بکھر جاؤں گا
وسعتِ غم نے اگر ہاتھ لگایا مجھ کو

منتشر ہو گئے کچھ اور بھی یادوں کے نقوش
جب کبھی کرب مرا ڈھونڈ نہ پایا مجھ کو

نور شبنم کی طرح تھی مری معصوم حیات
کس نے احساس کی بھٹی میں جلایا مجھ کو

---

منظر اعجاز (مظفرپور)

## غزل

میری آنکھوں میں اگے خواب کے پیکر کتنے
دیکھتے دیکھتے دھندلا گئے منظر کتنے

بچ نکل آئے تھے جو موج بلا کی زد سے
آ کے ساحل پہ ہوئے غرق سمندر کتنے

پہلے اس سمت لگائی گئی شیشے کی دکاں
پھر اسی سمت اچھالے گئے پتھر کتنے

ایک بھی مل نہ سکا میرے گناہوں کا ثبوت
یوں تو رکھے گئے الزام مرے سر کتنے

موسمِ رفتہ کا احسان ہے مجھ پر منظر
زخم کے پھول کھلے ہیں مرے اندر کتنے

---

محمود رائے بریلوی (الہ آباد)

## غزل

تمام عمر میں اک بات ہوش کی کر لی
جفا شعار نگاہوں سے دوستی کر لی

رہ طلب میں خودی کا تھا کس کو پاس و لحاظ
ملا جو راہ نما اس کی پیروی کر لی

علاوہ اس کے محبت میں اور کیا کرتے
وفورِ غم سے دل اٹھا تو شاعری کر لی

یہ کیا کہ بر سرِ محفل اتار لی عزت
ملے اکیلے گلی میں تو عاجزی کر لی

وہ انقلابِ عمل پر نہ روئیں کیوں محمود
جنھوں نے عمرِ دوام اپنی عارضی کر لی

صابر فخر الدین (یادگیر)

## غزل

ساتھ وہ جب تک نہیں تھے
میرے ہم مسلک نہیں تھے

دوسرے کچھ اور ہوں گے
آپ تو بے شک نہیں تھے

تھے تو پہلے سے کارفرما
لیکن اس حد تک نہیں تھے

کل کی دنیا کے مسائل
اسقدر گنجلک نہیں تھے

---

شہناز اختر ہاشمی (قنوج)

## غزل

افسوس زندگی کے سہارے نہیں رہے
کل تک جو تھے وہ آج ہمارے نہیں رہے

میرے دکھوں میں ساتھ نبھاتے تو بات تھی
جتنے لیے ہیں غم وہ تمہارے نہیں رہے

اب رات انتظار کی گذرے تو کسطرح
جب آسماں پہ چاند ستارے نہیں رہے

یارب مرے نصیب کی ہے کون سی خطا
اب تک جو تھے ہمارے، ہمارے نہیں رہے

یوں بڑھ رہے ہیں نازؔ الم زندگی کے ساتھ
دریائے غم کے جیسے کنارے نہیں رہے

---

طلحہ تابش (پرتاب گڑھ)

## غزل

یوں تو کہنے کو بہت خوش ہیں یہاں انساں مگر
زندگی شامل ہو جس میں وہ ادا ملتی نہیں

شہر میں نافذ ہے لاقانونیت کا وہ نظام
آج مجرم کو یہاں کوئی سزا ملتی نہیں

ہم کسی سے مل کے اس کی خیریت کیوں پوچھتے
کوئی صورت اپنی صورت سے جدا ملتی نہیں

گھٹ رہا ہے کب سے تابشؔ بے بسی کے خول میں
موت کی مانگی دعائیں بے وفا ملتی نہیں

---

سعید اٹاوی (اٹاوہ)

## غزل

منہ میں زبان برف کی دل میں حسد کی آگ
ایسے نفاق گیر مقابل سے دور بھاگ

مانا کہ تیرے پاس ہے تریاق زہر کا
بالغرض جب نگل ہی گیا تجھ کو کوئی ناگ

حزن و ملال جزوِ شگفتِ حیات ہیں
وہ گل ہے ناشگفتہ جب اس میں نہیں ہے آگ

حیرت ہے مجھ کو دیکھ کے سب بے انتہا سعیدؔ
زردی الگ سفیدی الگ ہے درونِ خاگ

سفرنامۂ پاکستان
چوتھی قسط

رام لعل (لکھنؤ)

# زرد پتوں کی بہار

## ملتان :

رات دس بجے کے بعد ابصار عبدالعلی مجھے اور ڈاکٹر آغا سہیل اور ان کی بیگم کو اسٹیشن پر لے گئے۔ اس وقت آخری گاڑی خانیوال تک ہی جاتی تھی۔ اور ایک بس سیدھی ملتان کے لئے روانہ ہونے والی تھی۔ بس کا پرانا اڈہ بھی اسٹیشن کے سامنے واقع تھا۔ کار میں بیٹھے ایک فٹ پاتھ کے ٹی اسٹال سے چائے پی گئی۔ میں رات کی جگمگاتی ہوئی ٹیوب و نیون لائٹس میں سڑکوں پر رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوئے ٹریفک کو دیکھتا رہا۔ بس اسٹینڈ کے تیل سے داغ داغ وسیع فرش پر چلتے ہوئے۔ ہم لوگ بس میں جا بیٹھے۔ بس کے اندر ملتان، ساہیوال، چیچہ وطنی، اوکاڑہ، میاں چنوں اور خانیوال جانے والے مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ سخت سردی سے بچنے کے لئے بھاری کوٹ اور کمبل اوڑھے ہوئے۔ اور سگریٹس پھونکتے اور کھانستے ہوئے۔ ہر آدمی بڑے اعتماد سے سلام علیکم کہہ کر اندر آتا اور کسی نہ کسی سیٹ پر جم جاتا ہے۔ میں سوچنے لگا۔ ہمارے یہاں بھی سکھوں میں بھی یہی رواج ہے کہ ایک اجنبی دوسرے اجنبی کو ست سری اکال کرکے فوراً متاثر کر لیتا ہے۔ مسلمان بھی سلام علیکم کا جواب فوراً دیتا ہے۔ اور دل اور بس دونوں کے اندر جگہ ضرور دے دیتا ہے عیسائی اگر مارننگ یا ہیلو کہنے والے کو جواب بھی ضرور دیتا ہے لیکن گھور کر بھی دیکھتا رہتا ہے بس کنڈکٹر ہر جگہ ایک سا ہوتا ہے۔ سواریوں کو بھیڑ بکریاں سمجھ کر زیادہ تعداد میں بس کے اندر ٹھونس لیتے ہیں۔ ماہر اور خاصا چرب زبان کبھی تند و ترش اور کبھی انتہائی شیریں زبان اور سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے اچانک کسی سواری پر برس پڑنے والا اور ڈرائیور کو بس روکنے یا چلا دینے کے جملہ اختیارات سے پوری طرح باخبر۔ ہماری بس کے اندر آکر بھی اس نے موٹی اور پتلی سواریوں کو خاصی پیشہ ورانہ تاجرانہ نظروں سے تاکا۔ ٹکٹ دینے سے پہلے اپنی مرضی کے مطابق ہر ایک کو یہاں وہاں اڈجسٹ کیا جیسے بس کے کسی ایک اوورلوڈ ہو جانے کا سخت خطرہ ہو۔ وہ راستے میں سواریوں کو اتارنے اور چڑھانے میں بھی بازو کا سہارا دے کر یا بازو سے کھینچ کر ایک برادرانہ شفقت کا مظاہرہ کرتا گیا۔ لیکن بس کے اسٹاپوں کے درمیان چونکہ کافی لمبا فاصلہ تھا۔ اسی لئے وہ ہر اسٹاپ پر سواریوں کو نیچے اتر کر چائے پی لینے اور پیشاب بھی کر لینے کی یاد ضرور دلا دیتا تھا۔

راستے میں کچھ لوگ پولٹکس پر بھی بحث کرتے چلے گئے۔ مہنگائی اور سڑکوں کی خرابی کا رشتہ پولٹکس سے فوراً ملا لینے میں وہاں کے بھی لوگ خاصے ذہین معلوم ہوئے جو ہر جملہ پر اللہ رحم کرے کہہ کر ظالم اور مظلوم دونوں کے لئے مغفرت کی دعا بھی کرتے تھے۔ ایسے ہی دو آدمی جو ہماری آگے کی سیٹوں پر کتنی دیر سے باتیں کر رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کی سگریٹس سلگانے میں بھی مدد کر رہے تھے۔ اچانک ایک دوسرے کے ساتھ لڑ پڑے۔

ایک نے دوسرے پر اس کی جیب سے روپئے نکال لینے
کا الزام لگا دیا۔ مبینہ جرم آناً فاناً بس کے سارے مسافروں
کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اگرچہ وہ بار بار کمال ہے یار، حد ہوگئی
یار! اور لوگو سنو کہہ کر اپنی ایمانداری کو بچانے کی سر توڑ
کوشش کرتا رہا۔ پھر خاصی توں توں میں میں کے بعد اس آدمی
کے روپئے اپنی ہی کسی دوسری جیب میں مل گئے۔ تو اس
نے معافی مانگنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور خاموش
ہو کر پھر سگریٹ کے کش لگانے لگا جس مسافر پر الزام
لگایا گیا تھا۔ وہ خاصی کمزور پرسنالٹی کا مالک معلوم ہوتا
تھا۔ کیوں کہ اس کے اندر اب بھی ذرا سی برہمی نہ پیدا ہو سکی
اس کا لہجہ ابھی تک معذرت خواہانہ تھا۔ اور بار بار پہلے
کی طرح کمال ہے یار۔ حد ہوگئی یار، اور لوگو سنو کہتا جا
رہا تھا۔

صبح چار بجے ہم لوگ ملتان پہونچ گئے۔ قریب ہی
کسی مسجد سے اذان سنائی دے رہی تھی۔ رات کے
وقت شاید دنیا کا ہر بس اسٹینڈ ایک ہی طرح کی پر
اسرار فضا میں لپٹا ہوا نظر آتا ہے۔ ہم لوگ صبح کی روشنی
کے نمودار ہونے کے انتظار میں۔ کبھی مختلف بنچوں پر جا جا کر بیٹھے
کبھی دوسرے مسافروں کو نظروں ہی نظروں میں ٹٹولا اور
جب کچھ اور نہ بن پڑا تو چائے کی تلاش میں دور تک پیدل ہی
نکل گئے۔ برصغیر میں بس اڈوں کے آس پاس ساری
دکانیں رات بھر کھلی رہتی ہیں۔ لیکن اللہ کی شان زیادہ تر
دکانیں حجاموں کی ہی تھیں۔ جن کے شیشے ٹیوب کی
روشنیوں میں خوب آنکھیں مار رہے تھے۔ اور ہر دکان
پر صبح کے اولین لمحوں میں لوگ بڑے مزے سے سر کی
مالش کر رہے تھے۔ یا اصلاح گیسو کی تمنا پوری کر رہے
تھے۔ خدا خدا کر کے ایک چائے کی دکان ملی۔ تو وہاں جا کر
خاصی پریشانی سی محسوس ہوئی۔ کیونکہ وہاں جہاں بیٹھنے
کی سیٹیں خالی تھیں دو کتے اور ایک بکرا بندھا ہوا تھا جنھیں
چائے خانہ کے مالک کا ہٹا دینے کا حکم سن کر بھی اس کے
نوکر نے ایسا نہ کیا۔ دوسرے شاید اس ہوٹل میں بیگم آغا
سہیل چائے کے لئے آنے والی پہلی خاتون تھیں ——
—— کیونکہ ہر شخص اس واقعہ کو غیر معمولی سمجھ کر
حیرت میں ڈوبا نظر آنے لگا تھا۔ بیگم آغا سہیل اگرچہ ——
پریشان ہرگز نظر نہ آئیں کیونکہ وہ لکھنؤ اور لاہور کی۔
فضاؤں سے پوری طرح مانوس تھیں۔ پھر بھی وہ اس قصباتی
فضا کو سمجھ کر بار بار اپنی بیٹی اور داماد کے پاس چل دینے
پر اصرار کرتی رہیں۔ جن سے ان کی شادی کے بعد باہر آکر
ملنے کے لئے انہوں نے میرے ساتھ یہ سفر کیا تھا لیکن
انہوں نے یہ ذمہ داری بھی قبول کر رکھی تھی کہ مجھے دوست
سید مجاہد علی کے مکان نمبر 5/6/9 واقع نواں شہر محلہ
ملتان خاص میں پہنچا کر ہی کہیں اور جائیں گے۔ اور میں
اس بات کی انہیں بار بار یاد دلا دیتا تھا۔ میرے اندر
غریب شہر ہونے کا احساس ابھی کی وجہ سے پیدا نہیں
ہو رہا تھا۔ میرے ذہن میں بار بار بابا فرید کا یہ دوہڑا
بھی تو بجتا رہا۔

فریدا چار گواہیاں ہنڈ کے چار گوائیاں سم
سیکھا رب منگیا، توں آیوں کیہڑے سم

اس نے اسی شہر کی ملتانی زبان میں تصوف کی شاعری
کی تھی۔

صبح چھ بجے کئی حجاموں سے پوچھتے ہوئے جنکی دکانیں
سڑک اور ہر گلی میں کھلتی ہوئی سیلین پیدل چلتے چلتے
منزل مقصود پر پہونچ گئے۔ مجاہد علی اور انکے بھائیوں
نے کو سوتے میں جا کر جگایا۔ وہ لوگ ایک روز پہلے۔

یمن آباد سے مجاہد صاحب کی دلہن لے کر لوٹے تھے۔ اور
روزان کے منجھلے بھائی کی بھی شادی ہوئی تھی۔ پانچ
ز کے بعد سب سے چھوٹے شاہد علی کی [illegible] لیکر
اچی جانے والے تھے۔ مجھے اور میرے ساتھ آغا [illegible] اور
بیگم کو دیکھ کر وہ سب خوش ہو گئے۔ لیکن میرا گلا بدستور
خراب تھا۔ اب تو بولنے میں بھی خاصی تکلیف ہو رہی تھی۔
بس خاموش رہ کر ہی مسکراتا رہا۔ اور بار بار یہی یاد آتا
رہا۔

گنگی گئی پیکے گئی نہ گئی کے لیکھے

گونگی کا مائکے میں جانا بے سود ہی ثابت ہوا)

دس بجے مجاہد کے دوست منور صاحب کے ساتھ
کچہری میں گیا۔ وہاں انکے ماموں میاں رشید احمد ایڈوکیٹ
سے ملاقات ہوئی۔ خاصے معروف وکیل ہیں۔ ان کے
ارد گرد موکلوں کا مجمع سا لگا ہوا تھا۔ اور وہ ہماری وجہ
سے ان کے کام جلدی جلدی نپٹاتے رہے اور اپنے جونیر
کو ضروری ہدایات دیتے رہے۔ موکل وکیل اور کچہریاں
ہر کہیں ایک سی ہوتی ہے۔ کم سے کم برصغیر میں تو ایک
سی ہی کیفیت نظر آتی ہے۔ زن زر اور زمین کے جھگڑے
میں موجودہ ملازمت میں ہندوستان کے کئی شہروں
کی کچہریوں میں گھوم چکا ہوں۔ میاں رشید احمد ہمیں ڈی ایس
پی کے یہاں لے گئے۔ وہاں ویزا پر آمد کی مہر لگوائی گئی۔ پھر ان کی
گاڑی میں صدر کے تھانے میں جا کر رپورٹ درج کرائی۔ وہاں
کے ڈی۔ ایس پی نے چائے پلا کر سواگت کیا۔ واپسی پر
میاں رشید مجھے ایک ڈاکٹر ملک محمود اسلم کے پاس لے گئے
جنھوں نے میرے گلے میں معائنہ کر کے بہت سی دوائیں لکھ
دیں۔ ساری دوائیں میاں رشید صاحب نے ہی ایک کیمسٹ
سے خریدیں۔ اور ہم کار میں ہند و پاک عالیہ کرکٹ میچوں کے
بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کچہری لوٹ آئے۔ میاں رشید
احمد پچاس پچپن سال کے خاصے تجربہ کار سوشل اور دل-

چسپ انسان لگے۔ دوپہر کا ایک بجنے والا تھا۔ ہم جلدی جلدی
مجاہد علی کے گھر واپس گئے۔ وہاں مہمان جمع ہو چکے تھے۔
آغا سہیل اور انکی بیگم اپنی بیٹی مسرت اور داماد کلب عابد کو
بھی لے آئے تھے۔ دونوں ملتان یونی ورسٹی میں پڑھاتے
تھے۔ مجاہد اور شاہد نے کئی دوستوں سے تعارف کرایا۔
رشید احمد اور فیض احمد جو دونوں وہاں لیکچرر تھے۔ اسرار حسین
جوان کے پڑوسی تھے۔ اور جبل پور کے غلام وارث شیخ صاحب
کھانا کھانے کے دوران اردو اور ہندوستان پر باتیں کرتے رہے
مجھے بار بار اس بات سے خوشی کا احساس ہوتا رہا کہ میرے
یہاں بھی قارئین موجود ہیں۔

شام کو اسرار حسین کے مکان پر عرش صدیقی جو اردو
کے مشہور شاعر اور افسانہ نگار ہیں اور ملتان یونی ورسٹی
میں رجسٹرار ہیں اپنی نئی کتاب "باہر کفن سے پاؤں" لیکر
آگئے۔ اس کتاب پر انھیں آدم جی پرائز مل چکا تھا۔ کتاب
کے ڈسٹ کور پر اردو اور پنجابی کے مشہور نقاد و شاعر
عارف عبدالمتین نے لکھا۔

عرش صدیقی کی افسانہ نگاری کے سحر کا تجزیہ ہم پر اس
امتیازی حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ انھوں نے اپنے فن
کو معاشرہ اور ماحول کے سائنسی شعور اور کرداروں
کی نفسیات کے معروضی مطالعہ پر استوار کیا ہے۔ اور ایسا
کرتے ہوئے انہوں نے جدیدیت کے اس صحت مند اور
متوازن تصور کو ہمہ وقت ملحوظ رکھا ہے۔ جو ایک طرف
افسانے کو روایتی اور منجمد قسم کی سماجی حقیقت نگاری
سے محفوظ کرتا ہے۔

تو دوسری طرف دور دراز کار اور آزاد ذہنی تلازمے
موں پر مبنی بے گرفت تجریدیت سے بچاتا ہے۔ مشہور نقاد
اور افسانہ نگار سلیم اختر نے بھی انکی حقیقت نگاری
کا اعتراف کیا ہے۔ وہیں اردو کے بزرگ شاعر فرخ دلی
اور مہر گل کے علاوہ کئی اور حضرات بھی تشریف لے آئے

انھوں نے بھی مجھے اپنی شاعری کا نیا مجموعہ "نیلے پانیوں کی سیند" ان سطور کے ساتھ عنایت کیا۔

اردو کے ___ افسانہ نگار ___ کی خدمت میں
جو تجریدیت ___ علامیت - لغویت اور بے معنویت کے
اس گمراہ کن دور میں بھی اچھی، در زندگی سے دھڑکتی ہوئی
کہانی لکھنے کا فن نہیں بھولے۔

میں دیکھتا ہوں کہ اردو ادب میں تجریدیت، بے معنویت اور علامیت کا چرچا ہر جگہ ہے۔ موافقت اور مخالفت دونوں میں ___ ترقی پسندی کے آغاز میں بھی قریب قریب اسی قسم کی فضا بن گئی تھی۔ میں نے فرخ صاحب کے مجموعہ کلام کو الٹ پلٹ کر دیکھا - اور ان اشعار پر نظریں ٹھہر گئیں۔

کچھ گھٹ گیا ہے حسن کا معیار بھی بہت
کچھ بڑھ گئے ہیں شہر میں بازار بھی بہت
آنکھیں ملیں تو عین عبادت ہے دیکھنا
آنکھیں نہ ہوں تو حسرت دیدار بھی بہت
رات کو جانے کیسے چین سے سوتا ہے
جس کا اک اک انگ تھرکتا رہتا ہے

---

ایک عالم سے ہو گیا ناراض
دل تری بزم سے اٹھا کیا ہے

---

قائم رہا ہزار طرح ٹوٹنے کے بعد
وعدہ ترا معاہدہ تاشقند تھا۔

---

پچھلے سال کی دھول ہوئی، تلوار نکال
پھر گرمی کا موسم لوٹ کے آیا ہے
میرے قد سے یہ کھڑکی کچھ اونچی ہے
جھانک کے دیکھو کتنی دور سویرا ہے

ہماری باتیں قرۃ العین حیدر کا اردو افسانے میں خواتین افسانہ نگاروں کا جنسی اظہار، زبان کے بدلتے ہوئے رجحا[نات] جدیدیت کی صحیح پہچان وغیرہ موضوعات پر لمبی بحث چھڑ گئی۔ امجد اسلام امجد کے ٹی وی ڈراما "وارث" کی بھی ایک قسط دیکھنے کو مل گئی۔ اور اس کے سب سے بڑے آرٹسٹ محبوب عالم کی اداکاری دیکھنے کا موقع ملا۔ میں خوش ہو کر وہ واقعی اعلیٰ درجہ کا اداکار ہے۔ کھانے کی میز پر بھی باتوں کا سلسلہ جاری رہا اور ہم پنجابی الفاظ کی جڑیں سنسکرت فارسی اور عربی میں تلاش کرتے رہے۔ ہم میں سے کوئی بھی ماہر لسانیات نہیں تھا۔ لیکن اس موضوع سے دلچسپی ہر ایک کو تھی۔ ان لوگوں نے چاہا کہ میں کل یا پرسوں ملتان یونیورسٹی میں اردو افسانے پر ایک تقریر کروں۔ لیکن مجھے اگلے روز صبح سویرے پہلی گاڑی سے لاہور لوٹ جانا تھا۔ وہاں شام کو انتظار حسین صاحب کے نئے ناول "بستی" کی رسم اجرا کی ایک تقریب تھی۔ میں چاہتا تھا وہاں ایک ہی جگہ بہت سے ادیبوں سے ملوں۔ اس لئے ملتان کے ساتھیوں سے پھر ایک دن آنے کا وعدہ کر لیا

(باقی اگلے شمارہ میں)

نسیم نیشو فوز

# علامت اور فکشن

" مقدس اشیار کی ساری تلمرو علامات کا خزانہ ہیں۔ ایسی مقدس اشیار بذات خود مقدس نہیں ہوتیں بلکہ وہ اپنی ہستی سے کہیں بڑھ کر سارے (آفاقی) تقدس کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ وہ زیادہ جو " تعلق منتہا " ہوتا ہے۔" (امریکی فلسفی: پال ٹیلچ)

"PERHAPS THE SIMPLEST DEFINATION OF SYMBOLS IS THAT THEY STAND FOR OTHER THINGS." (WILLIAM TROY)

ہماری زندگی کا ہر لمحہ علامات سے مزین ہے۔ کبھی ہم حرف بن جاتے ہیں کبھی لفظ اور کبھی ہندسہ! لیکن یہ عظیم ترین شعور کہ ہم انسانیت کے آفاقی معبد کی سب سے بڑی علامت ہیں ہمیں اشرف المخلوقات بناتا ہے۔ جہاں تک انسان کی فہم و فراست کا تعلق ہے اسکے تخیل کے تمام تر مدارج علامتی طریقہ کار ہیں۔ بقول پروفیسر اے ڈی ایچ "خیال کا اہم عمل علامت نگاری ہے۔"

علامت یونانی لفظ " سم بولن " سے مشتق ہے جس کا مطلب نشان، اشارہ یا سگنل ہے۔ علامت کی علمی و ادبی تعریف یہ ہے کہ علامت کسی شخص، شے، خیال یا عمل کا نعم البدل ہے جو اس شے یا خیال یا عمل کی نمائندگی کرے مگر براہ راست اس کا اپنا کوئی تعلق نہ ہو۔

انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں لفظ سمبل کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے کہ سمبل ایک طرح کا سائن (SIGN) ہے جو کسی بھی دیکھنے والی شے کو دیا جاتا ہے تاکہ وہ انسانی ذہن میں کسی ایسی چیز کی نمائندگی کر سکے جسے دیکھا نہیں جا سکتا لیکن اس کے تعلق کا احساس ذہن میں ضرور پیدا ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال کھجور کے درخت کی شاخ ہے جو کہ فتح و نصرت کی علامت ہے۔ غلبے اور ظفر مندی کی علامت ہے۔ اسی طرح لنگر امید کی علامت ہے۔

قدیم مسیحی سمبالزم کے مخارج کو یونانی اصنام پرستی میں ڈھونڈا جا سکتا ہے۔" نیک گڈریا اپنی بھیڑ کے ساتھ " کو ہرمیز (HERMES) سے متعلق سمجھا گیا جو بکری کو قربان کرنے عبادت گاہ کی طرف روانہ ہو رہا ہے۔

آرفیوس (ORPHEUS) کو جب زومن زمین دوز غاروں میں نقش کیا ہوا پایا گیا تو اسے بھی یسوع مسیح کی نمائندگی کرنے والا کردار تصور کیا گیا۔ یسوع مسیح کا ایک اور قدیم ترین سمبل " مچھلی " ہے جو یونانی لفظ DOUS سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ لفظ یسوع مسیح کے نام کی دلالت کرتا ہے ایک اور پرانا سمبل جہاز بھی جو چرچ کی نمائندہ علامت ہے۔ جہاز جیسی علامت کا مفہوم یہ ہے کہ اہل یقین ـــ بحر زیست پر بہ آسانی سفر کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی علامات کی باری آتی ہے جو جانوروں سے متعلق ہیں خواہ وہ جانور حقیقی ہیں یا فوق الفطری ـــ لہذا " بھیڑ " یسوع مسیح کی علامت ہے (علامت از یوحنا) اور ایک جگہ قدیم عہد نامے میں یسوع مسیح کو جوڈا قبیلے کا شیر کہا گیا (علامت از کتاب مکاشفات) مور ابدیت اور ابدی زندگی کی علامت ہے جبکہ ہما یوم حشر کا نشان ہے۔

اژدہا سانپ شیطان کی اور بارہ سنگھا روح کی علامت ہے جو ہلیتسہ کے لئے مضطرب ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بالخصوص یونانی دیومالا۔ ہندی اور مشرق بعید کی دیومالا، مصریات اور عیسائیت کی علامات وغیرہ نے مل جل کر مغربی ادب کے لئے علامات کا اتنا ضخیم ترین ذخیرہ اکٹھا کر دیا جس سے مغربی ادب کی ہر صنف بہرہ ور ہوئی۔ یونانیوں نے اپنے ادب اور فنون لطیفہ کا دارومدار اپنی گریک دیومالا کے مواد پر رکھا اور اہل روما جن کی اپنی متھالوجی بہت تھوڑی تھی انہوں نے اپنے علم و فن کا مدار تھوڑی بہت تبدیلی کر کے یونانی متھالوجی پر رکھا۔

جدید فکشن نویس اس قدیم متھالوجی کو علامات کے طور پر استعمال کرتے ہیں حالانکہ وہ اپنی اوریجنل کہانی اس قدر بدل کر رکھ دیتے ہیں کہ مذکورہ متھالوجی کی شناخت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا یورپ اور امریکہ کے قاری کو سمجھایا جاتا ہے کہ وہ اپنی قوتِ مطالعہ میں بصیرت پیدا کرنے کے لئے ایسی دیومالا اور دیگر دیومالاؤں کو ہمیشہ نگاہ میں رکھیں کیونکہ ان دیومالاؤں کا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ہر مظاہر فطرت اور فطرت انسانی کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے

مثال کے طور پر جب تک ہم بطور قاری یونانی دیوتا سیسی فس SISY PHOS کے متعلق جملہ معلومات نہ رکھتے ہوں، ہم البرٹ کاموکی کتاب "متھ آف سیسی فس" کا مطالعہ نہیں کر سکتے یا جون اپ ڈائک ( JOHN UP DIKE ) کے ناول سنتور (CENTAUR) کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔

اگر یورپی ادب کی تاریخ کے زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ سمبالزم فرانسیسی شعراء کی جدید تر تحریک کا نام ہے جن میں ملارمے، بودلیئر، ورلین اور رامبو کے نام آتے ہیں ان شعراء کا مقصد بذریعہ ایمائیت و اشاریت ان خیالات اور جذبات کی ترجمانی کرنا تھا جن کا ابلاغ براہِ راست اظہار سے بھی ممکن ہو سکتا تھا۔ یہ نئی تحریک درحقیقت ایمائیل زولا ZOLA کی نیچرل ازم اور رئیل ازم کے خلاف بغاوت تھی۔ بعد ازاں جدید فکشن میں سمبلزم کی اس جدید روایت کو مارسل پروست، جیمز جوائس، جرٹرڈ سٹائن، ورجینیا وولف، کافکا اور ولیم فاکنر نے بڑی کامیابی سے نبھایا جبکہ شاعری میں امیج اسٹ (IMAGIST) تحریک نے نبھایا جس کے نمائندہ شعراء ہیوم، ایذرا پاؤنڈ، ایمی لاؤل، ہیرٹ، منرو اور ایلیٹ تھے۔ ان میں سے بعض فکشن نویسوں نے سمبل اور امیج (IMAGE) کو یکجا کر کے اپنے اپنے فن میں بڑی ندرت پیدا کر دی بعض ناقدین نے سمبل کو امیج کے مساوی گردانا، بعض نے ان علامات کو مردہ یا پُر از جمود قرار دے کر مسترد کر دیا۔ بعضوں نے ان علامات کو تخیل کا سب سے متحرک طریقۂ کار سمجھا۔ ادھر دوسروں نے یہ کہا کہ ایسے سمبل ضروری معانی سمجھانے سے قاصر ہیں یا ان کا ذہن محدود ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کامیاب افسانے کی خاصیت اختصار پسندی ہے لیکن اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ اکثر بہترین افسانے مختصر ہوتے ہیں۔ اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ ہر لفظ اور جزئیات کا ایسا متوازن انتخاب کیا جائے کہ اس افسانے میں مکمل تاثیر پیدا ہو سکے۔ ایسی جزئیات جو کردار اور پلاٹ دونوں کو بیک وقت بڑھائیں کامیاب افسانے کی دلیل ہے۔ افسانے میں قابل قبول اور کامیاب اختصار پسندی کو اپنانے کے لئے "سمبل" ایک خاص صنعت ہے۔ سمبل کی ایمائیت و اشاریت شاعری اور فکشن میں اکثر ابہام اور مہمل پسندی کی طرف رخصت ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا اس میں قاری کی باخبری، وسیع قوتِ مطالعہ اور بالغ نظری کو بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ امکانات اور اضافیت کی نئی جہتوں میں سمبل کے بیک وقت کئی معنی ہو سکتے ہیں جن میں بعض معنی بنیادی ہوتے ہیں اور بعض اضافی و فروعی۔

افسانے میں علامت کا کامیاب ترین منصب یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے ابلاغ کا واضح اظہار ہو۔ اس کے اضافی و فروعی معنے تک قاری کے ذہن کے لئے اپنی قدر و قیمت پا سکیں۔ اگر ایسا بھی نہ ہو سکے تو ان کی ابلاغی صنعت رائیگاں نہ سمجھی جائے۔ افسانہ نگار کے لئے اگر ممکن ہو تو وہ اپنے سمبل کو کہانی کی خاص سچوئیشن میں ضرور دہرانے کی کوشش کرے کیونکہ ایسی تکرار سے سمبل کی وجودی

سمعیت برقرار رہ سکتی ہے۔ اسی طرح سمبل اپنی AURAL SIGNIFICANCE AND FORC کا ابلاغ بن سکتے ہیں۔

سمبل بوقلموں حقیقت ہوتے ہیں۔ ان کی نیرنگئ نگر گردشِ فانوس کی مانند ہوتی ہے کہ "مرکز" پر روشنی اور پرچھائیں کا کھیل جاری ہے۔ اس تیز تر سی گردش میں ان کے مفاہیم و معنی مختلف رنگ و روپ اختیار کرتے چلے جاتے ہیں مثلاً :۔۔۔

ایک درخت چار موسموں کے مختلف مزاجوں کے عین مقابل کھڑا اپنی نباتاتی بالیدگی، مزاحمت، مقاومت، استقامت، مظلومیت، نشاط، حزن اور علم کی علامت بنتا ہے۔ نباتاتی زندگی کی اس بڑی علامت میں ایک نئی علامت خود بخود جنم لے لیتی ہے جب وہاں مختلف نوع کے پرندے اپنے گھونسلے بناتے ہیں۔ گہری پروازوں کے یہ سفر پھر اپنے کومل بچوں کو جنم دے کر ایک اور نئی علامت کا باعث بنتے ہیں اور بالآخر مذکورہ درخت سے ہجرت کر کے "کشتی نوح" کے کسی طاقچے میں ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتے ہیں اور وہ درخت بھی کسی بنا پر کٹ کر افریقی قبیلے کا ٹوٹم TOTEM بن جاتا ہے مگر پھر بھی وہ "حتمی علامت" نہیں بنتا۔

یہاں میں امریکی وجودیت پرست فلسفی پال ٹیلچ (PAUL TILLICH) کو دوبارہ QUOTE کرنا پسند کروں گا جو کہتا ہے کہ "انسان" کے "مدعائے منتہا" کو علامتی طور پر بیان کرنا چاہئے کیونکہ علامتی زبان ہی اس "منتہا" لا نہائیت تعلق کا اظہار کر سکتی ہے۔ ایسا اظہار جو مابعد الطبیعات کے ذکر سے عبارت ہے۔

پال ٹیلچ اسی باب میں یہی کہتا ہے کہ علامات کو ایجاد نہیں کیا جا سکتا انہیں تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ انسان کی ثقافتی تخلیق میں یہ علامات نجانے کتنی جگہ احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

ایک بات تقدس افسوس سے کہی جا سکتی ہے کہ علامتی زبان جس قدر موثر اور دیرپا استعمال و استفادہ علم نفسیات اور علم النفس نے کیا اتنا موثر استعمال و استفادہ عالمی ادب نہیں کر سکا۔ اگر تحلیل نفسی کے ادائلی مکتب بن جاتا۔۔۔ فرائڈ کی کتاب INTERRE-TATION OF DREAMS فحش کتاب قرار دی جاتی اور تحلیل نفسی کے دیگر مشاہیر کو OPEN LANGUAGE کی پاداش میں جیلوں میں ٹھونس دیا جاتا، ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جاتے۔ یہ سمبالزم کا طفیل ہی تھا کہ مذکورہ علم کی جملہ تحقیقات ہم تک پہنچ سکیں اور ہماری مریضانہ ذہنیت کا کتھارسس ہوتا چلا گیا جو اس سے قبل ممکن نہ تھا۔ تاہم انسپریشن (INSPIRA-TION) کی ابدی روح یہ بار بار کہتی ہے کہ فکشن میں علامتی زبان کا استعمال مستقبل قریب میں ایک نیک فال ثابت ہوگا اور اس علامتی زبان کا پھیلاؤ دیگر علوم کے مقابل زیادہ اظہار و ابلاغ کر سکے گا۔

اے ڈی اظہر

# عروض کی بھول بھلیاں

لاطینی گرامر کے وضع کرنے والوں کی طرح اردو گرامر کے اولین مؤلفین نے بھی عربی گرامر کے کم از کم کچھ لیبل اردو زبان کی مختلف النوع ساخت پر بے سوچے سمجھے چپکا دئے ہیں توضیح کے لئے ایک مثال کی طرف اشارہ کرتا ہوں —

عربی گرامر میں کسی اسم کو اسم آلہ یا اسم ظرف کہنے کی وجہ صرف یہی نہیں کہ معنی ہتھیار یا جگہ کے ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی اس لئے کہ وہ ایک وزن اور صورت لئے ہوتا ہے یعنی مفعل یا مفعال اسم آلہ کے لئے مفعل یا مفعل اسم ظرف کیلئے — ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ صرف ہتھیار یا جگہ کے مفہوم کو اس عمل تسمیہ کے لئے چن لیا جانا اور خوراک، پوشاک وغیرہ کو غیر مسمیٰ چھوڑ دیا جانا۔ اردو میں کنجی، چاقو جیسے الفاظ کو جن میں عربی کے اسم آلہ کی صوری یا وزنی ہم آہنگی کا شائبہ تک نہیں ہے اسم آلہ سے تعبیر کرنا۔ جوڑ بات ہے۔

ہمارے علم عروض کا مسئلہ کچھ اس سے بھی پیچیدہ تر ہے یہاں سوال محض تقلید بے تدبیری کا نہیں، اصل کی غیر ضروری اور خواہ مخواہ برتی ان کی پیچیدگی کا بھی ہے — یہاں یہ امر ملحوظ رکھنا اشد ضروری ہے کہ بحث شعر کے نفس وزن و بحر کی صوتی اور وزنی تمیز کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ دوسرے لفظوں میں بحث اس سے ہے کہ بحروں کے پہچان کی بنیاد ہم افاعیل تفاعیل کی صورت انہی خاص شکلوں پر کیوں رکھیں جو خلیل بن احمد بصری یا مکی کو اور بعد میں ابو الحسن اخفش کو اتفاقاً سوجھ گئیں۔ علم عروض کا یہ نام یا تو اس وجہ سے ہے کہ عروض کا معنی پیش کرنا ہے اور یہ علم شعر کو پیش کرنے کی گویا کسوٹی ہوگا۔ پندرہ بحریں خلیل بن احمد کی اور اخفش کی ایجاد ہے اور بنیادی انیس بحروں میں سے باقی تین متاخرین کی اختراع کا نتیجہ ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ یہ بحریں اول خلیل بن احمد نے ایجاد کیں مگر یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ان بحروں کے خاص نام اور طریق تقطیع اس کی ایجاد ہے۔ ورنہ بحریں تو خود اس وقت سے موجود تھیں جب سے عربی شعر موجود تھا۔

ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اگر آپ کسی مصرع کو اسکے وزن اور بحر کے اعتبار سے چاہے کتنی اچھی طرح سے سمجھتے ہوں اسکی تقطیع۔ اصطلاحی طور سے نہ سہی مگر صحیح کر سکتے ہوں حتی کہ اس بحر میں مصرع موزوں کر سکتے ہیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود اگر آپ اس کی تقطیع خاص انہیں ارکان سے نہ کریں جو خلیل بن احمد کو القا ہوئے تھے تو آپ کی جہالت [illegible]ب باقی یہ سوال رہ جاتا ہے کہ صورت کے اعتبار سے نہ سہی تال یا Ruthm کے اعتبار ہی سے سہی —

— وزن اور بحر کی کچھ تو امتیازی تقسیم ہونی چاہئیں سو اس کے لئے متذکرہ بالا تقطیع میں کوئی رکاوٹ نہیں جس ترتیب سے چھوٹا اور لمبا رکن شعر میں جڑے گا۔ اسکے اعتبار سے بحر کی تقسیم کر لی جائے گی۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ عروض برائے شعر ہوتا لیکن ہوا یہ کہ

گویا شعر برائے عروض ہو گیا اور اس عروض میں اتنی اصطلاحات ٹھونس دی گئی کہ کم سے کم طالبان علم اس پر حاوی ہو سکیں ـــــ آخر میں ایک بات اور کہنی ہے۔ سید انشاء کی بی جا سری خانم، والی بات چلی کیوں نہیں؟

جہاں تک مجھے یاد ہے انشاء کی چلبلی طبیعت نے اس نظریے کو بھی محض تفریحاً ایجاد کیا اور تفریحاً ہی پیش کیا اور انکے نظریہ / تختی کی طرح علمائے قاف شین و مفتیان شرع عروض یتین نے اسے کبھی ایک طفلانہ وقتی کھیل سے زیادہ وقعت نہ دی۔ اگر یہ نظریہ صداقت علمی سے ایک غیر ضروری طور پر مشکل علم کی ضروری تسہیل کیلئے پیش کیا جاتا اور اس پر غور و فکر کی دعوت دی جاتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم اب تک اسے اپنا کہ اس میں خاطر خواہ ترقی نہ کر چکے ہوتے اور اس عقل کو چکرا دینے والے گورکھ دھندے سے نجات نہ پا چکے ہوتے جس کے متعلق اکبر نے کہا ہے کہ ؎

ڈاکٹر سمیع اللہ (بنارس)

# خان بہادر میر ناصر علی

## (دلی کالج کا ایک غیر معروف طالب علم)

دلی کالج ہندوستان کا ایک عظیم و تیج تعلیمی ادارہ تھا جو انگریزوں کی فکر رسا کے نتیجے کے طور پر معرض وجود میں آیا اس ادارے سے ہندوستانی زبانوں بالخصوص اردو کو وہ فروغ ملا جو فورٹ ولیم کالج سے بھی نہ ملا تھا۔ دلی کالج کے قیام سے انگریزوں کا مقصد خواہ مغربی علوم و فنون کی تعلیم رہا ہو خواہ مشرقی زبان و ادب کی ترویج و ترقی۔ خواہ اس کا مقصد ہندوستان کے ارباب علم و فضل کی حوصلہ افزائی کر کے ان کی تالیف قلب ہو۔ بہر صورت ایمان کی بات تو یہ ہے کہ مغربی و مشرقی علوم و السنہ کی تعلیم کا یہ خوش گوار امتزاج ہندوستانیوں کے لئے بڑا مفید ثابت ہوا۔

۱۸۲۵ء میں جب غازی الدین خاں کے مدرسے کو دلی کالج میں منتقل کیا گیا تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے لڑکوں نے اس میں داخلہ لیا اور وہ مشرقی ادب و السنہ اور مغربی علوم و افکار سے سیراب ہوئے۔ دلی کالج کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں نہ صرف اردو زبان میں تعلیم دی جاتی تھی بلکہ اردو میں مضمون نویسی کا مقابلہ بھی ہوتا تھا اور اچھے مضمون لکھنے والے طلبہ کی انعام و تحفہ کے ذریعے ہمت افزائی کی جاتی تھی۔ دلی کالج کے دوران قیام تقریباً ۱۴۴ کتابیں تصنیف، تالیف یا ترجمہ کی گئیں۔ ان کتابوں کی ترتیب میں کالج کے طلبہ سے بھی مدد لی جاتی تھی۔ بالفاظ دیگر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انھیں کتابوں کی تصنیف و تالیف کی مشق کرائی جاتی تھی۔ اس لئے یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ نے بعد میں اردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ان ہی طلبہ کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے کہا ہے کہ

"دلی کالج کا پھل اس کے وہ سپوت ہیں جو اس کی آغوش میں پلے اور پھلے پھولے اور جنھوں نے علم کے اس نور سے جو ان کے سینوں میں مشتعل تھا اپنے ملک اور اپنی زبان کو جگمگا دیا۔ علم کے وہ پجاری آج ہماری زبان کے دیوتا ہیں۔ ان کے نام اردو زبان کی تاریخ میں روشن ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں جن کی جگمگاہٹ کبھی کم نہ ہوگی۔"[1]

کالج کے ان مشہور طلبہ میں محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، ماسٹر رام چندر، پیارے لال آشوب، مولوی ذکاء اللہ اور مولوی کریم الدین کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے بعض طلبہ نے بھی اردو زبان و ادب پر اپنے گراں قدر نقوش چھوڑے ہیں۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ مقبول انام نہ ہو سکے مثلاً شیخ ضیاء الدین، موتی لال دہلوی، پنڈت دھرم نرائن منشی حکم چند ہتمبر، شیو نرائن، سروپ نرائن۔ پیرزادہ محمد حسین اور مدن گوپال وغیرہ۔ خان بہادر میر ناصر علی بھی اسی موخر الذکر زمرے میں شامل ہیں، جن کی اردو خدمات مسلم الثبوت ہے۔

میر ناصر علی، ۱۸۴۷ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید ناصر الدین محمد ابو المنصور بلند پایہ عالم و مبلغ تھے

[1] مرحوم دلی کالج ص ۱۵۶ (طبع ۱۹۴۵ء دہلی)

بڑے بھائی میر نصرت علی "نصرت الاخبار" کے ایڈیٹر اور مالک
تھے۔ ان کے دادا اور نانا ریاست بھوپال میں اعلیٰ عہدوں
پر فائز تھے۔

ناصر علی نے دستور زمانہ کے مطابق متداول علوم
معقول و منقول کی تحصیل کے بعد بزرگوں کی مخالفت کے
باوجود انگریزی پڑھنا شروع کی اور ۱۸۷۰ء میں دہلی کالج
سے انٹرنس کا امتحان دیا جس میں اول آئے۔ امتحان
میں کامیابی کے متصل بعد وہ نان پارہ ضلع بہرائچ کے سرکاری اسکول
میں مدرس مقرر ہوگئے۔ بعد میں ان کی خدمات نمک کے محکمہ میں
منتقل ہوگئیں۔ اس ملازمت کے دوران مسلسل سولہ برس تک
وہ فرخ نگر ضلع گڑگاؤں کے میونسپل کمیٹی کے نائب صدر بھی رہے
درانسداد قحط سالی اور دوسری مختلف النوع خدمات کے
صلے میں ۱۸۹۶ء میں خان بہادر کے خطاب سے سرفراز کئے گئے
۱۹۰۸ء میں محکمۂ نمک سے پنشن لی۔ اس کے بعد تین سال تک
دلی میں آنریری مجسٹریٹ کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۱۳ء
میں ریاست پاٹودی کے دیوان مقرر ہوئے اور ۱۹۲۲ء تک
اس معزز عہدے پر فائز رہے۔ یہاں سے سبکدوشی کے بعد عمر
کے باقی ایام دلی میں گزارے، جہاں ۸۷ برس کی عمر میں ۱۲
جنوری ۱۹۳۳ء کو ان کی وفات ہوئی۔

میر ناصر علی کا علمی میدان صرف صحافت رہا ہے۔ انکی
زندگی کا آغاز مضمون نگاری سے ہوا۔ شروع میں ان کے
مین مختلف رسائل میں چھپتے رہے۔ اس کے بعد ۱۸۷۷ء میں
ں نے آگرہ سے "تیرھویں صدی" کے نام سے اپنا ایک جریدہ
ا۔ اس زمانے میں سرسید احمد خاں "تہذیب الاخلاق" کے
ذریعے افہام و تفہیم اور تاویلات و توجیہات کی ایک نئی روایت
قائم کرنے میں مصروف تھے۔ میر صاحب نے اپنے رسالے میں
ان کے مضامین پر انتقاد کا سلسلہ شروع کیا جو بہت مقبول
ہوا۔ ان کے پوتے انصار ناصری کے بقول، سرسید احمد خاں
شن سے میر صاحب کو کوئی تعرض نہ تھا وہ محض ان کے
علمی و ادبی کارناموں پر سخن گسترانہ تنقید کرتے تھے اور اس طرح
دادِ سخن دیتے تھے کہ سرسید علیہ الرحمہ ہمیشہ انھیں ناصح مشفق سمجھتے
رہے۔[1]

"تیرھویں صدی" چار پانچ سال جاری رہنے کے بعد بند
ہوگیا۔ اس کے بعد میر صاحب نے آگرہ ہی سے "زمانہ" کے نام سے
ایک رسالہ جاری کیا۔ لیکن یہ بھی چار پانچ سال سے زیادہ
نہ چل سکا۔ "افسانۂ ایام" میر صاحب کے اہتمام اور ادارت میں
شائع ہونے والا تیسرا رسالہ تھا جو انھوں نے اپنے بھائی
میر نصرت علی کے "نصرت المطابع" دہلی سے شائع کرنا شروع کیا تھا
اس کے بند ہونے کے کچھ عرصے کے بعد اسی مطبع سے رسالہ
"ناصری" کا اجرا عمل میں آیا۔ اس رسالے کی نمایاں خصوصیت
یہ تھی کہ اس میں طنز و مزاح کا عنصر غالب رہتا تھا۔ ۱۹۰۸ء
میں سرکاری ملازمت سے دست کشی کے بعد "صلائے عام"
کے ساتھ میر صاحب کی صحافت نگاری کا آخری اور تابناک ترین
دور شروع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ وہ اپنے ذاتی پریس "مطبع ناصری"
سے نکالتے تھے۔ "صلائے عام" کو ادبی حلقوں میں غیر معمولی شہرت
و مقبولیت حاصل ہوئی حتی کہ میر ناصر علی اور صلائے عام اس
طرح لازم و ملزوم ہوگئے کہ آج بھی ایک کا ذکر آتے ہی دوسرے
کا نام ذہن میں رقص کرنے لگتا ہے۔ یہ رسالہ ان کی موت کے بعد
بھی ۱۹۳۷ء تک برابر شائع ہوتا رہا۔

میر ناصر علی کی کوئی مستقل تصنیف نہیں تاہم اردو کے
خادموں میں انہیں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ ان کی تحریریں
عموماً نہایت شگفتہ، رنگین اور مدلل ہوتی تھیں۔ نثر میں شاعری
کی حسین روایت کو مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنایا اور مولانا ابوالکلام
آزاد نے ایک منفرد اسلوب کی حیثیت عطا کی، اس کی ایجاد کا
سہرا دراصل میر ناصر علی ہی کے سر ہے۔ مہدی افادی کو آپ کی نثر
میں یونانیوں کی سی لطافت خیال کا احساس ہوتا تھا۔ ان کے
بقول[2] آپ نے اس وقت انشاپردازی کو چمکایا جب بہتوں
نے قلم بھی ہاتھ میں نہیں لیے تھے۔ آپ کا ادبی مذاق اور خامی

---

۱؎ نقوش (شخصیات نمبر) جنوری ۱۹۵۵ء ص ۹۰

طرح مادۂ اختراعی دراصل آپ کے ادبیات میں داخل ہونے کے لائق تھے۔ ۵۲ ان کی عبارتیں اگر آزاد کی طرح رنگین، مسرت افزا اور سحر آفریں ہیں تو دہیں شبلی کی طرح صاف شگفتہ اور مدلل بھی، لیکن ان کے باوصف بات کو آسان سے آسان زبان میں پیش کرتے اور لطف پہ لطف برقرار رہتا اور حسن و دل کشی میں کمی نہ آتی۔

انھوں نے اپنے اور دوسرے رسائل میں بے شمار مضامین و مقالات لکھے، جو اس زمانے میں بہت پسند کئے گئے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ انشائیہ نگاری کی بہترین مثال تھے۔ ۱۹۵۵ء میں ان کے منتخب مضامین و مقالات کا ایک مجموعہ "مقالات ناصری" کے نام سے زیر ترتیب تھا۔ یہ مجموعہ ان کے پوتے انصار ناصری اشاعت کے لیے مرتب کر رہے تھے فی الحال ہم اس کام کی تکمیل یا عدم تکمیل کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر ہیں۔ بہر حال میر صاحب کے حالات زندگی اور کارناموں سے متعلق ایک تحقیقی مقالے کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اگر کسی کو اس کی توفیق میسر ہوئی تو یقیناً وہ اردو زبان و ادب کے سرمائے میں ایک گراں قدر اضافہ ہوگا۔

(باقی بھیک یا رب)

ایک دن گذر گیا۔ دوسرا دن آیا وہ اسی طرح گڑگڑاتا رہا روتا رہا مگر نماز جنازہ پڑھنے والے امام کی آواز کا وقفہ دوسرے دن بڑھنے لگا۔ اسی طرح تیسرا دن بھی آگیا۔ حلوائی خانۂ کعبہ کے دروازے سے چمٹا ہی رہا۔ اسے نہ بھوک کی فکر تھی نہ پیاس کی وہ مسلسل رو رہا تھا اور خدا کے حضور گڑگڑا رہا تھا تیسرے دن نماز جنازہ کی تکبیر کم ہوتے ہوتے ختم ہوگئی پھر حلوائی کو ایک آواز سنائی پڑی۔

"میرے پیارے بندے۔ خوش ہو جا تیری دعا قبول ہوئی"

طاعون ختم ہوگیا۔ حالات معمول پر آگئے تو مستشار خصوصی نے شریف مکہ سے باادب پوچھا، حضور یہ کون سی ترکیب تھی،

شریف نے جواب دیا "حالات بڑے نازک تھے۔ سوائے اللہ کے کوئی ترکیب اس مصیبت سے نجات نہ دے سکتا تھا۔ اور اللہ ایسی ہی دعا قبول کرتا ہے جو دل سے مانگی جاتی۔ چنانچہ میں نے ایسے گنہگار کو چنا جو دل سے دعا مانگے۔ مجھے معلوم تھا۔ کہ حلوائی کو جان کے لالے جب پڑ جائیں گے تو وہ بڑے خلوص اور سچے دل سے دعا مانگے گا اور اس کی دعا قبول ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔



۵۲ نادرات مہدی ص ۱۵۵

ڈاکٹر محمد جابر صدیقی (الہ آباد)

# جنیک یاربیؔ

کب کس کی وہ کس سے کوئی نہیں جانتا مگر اس میں کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ہر ایک کی سنتا ہے اور خوب اچھی طرح سنتا ہے۔ اور جب مانگنے والا دل سے مانگتا ہے تو پھر وہ بندے کی تمام غلطیاں، گناہیں اور حکم عدولی معاف کر دیتا ہے اور دعا قبول کرتا ہے۔ ایک نہیں متعدد مثالیں موجود ہیں۔ ایک واقعہ میں نے سنا جبکہ میں مکتہ المکرمہ میں حکومت کے شفاخانہ کا انچارج تھا۔

کہا جاتا تھا کہ شریف مکہ کے دور حکومت میں ایک مرتبہ اتنا شدید طاعون پھیلا کہ سلطنت کے گوشہ گوشہ میں بے تحاشہ اموات ہونے لگیں۔ حالات پر قابو پانا ممکن نہیں ہو رہا تھا کوئی ترکیب کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ شریف مکہ بیحد پریشان تھا اس نے اپنے مستشار خصوصی سے دریافت کیا کہ مکتہ المکرمہ میں سب سے بڑا گنہگار کون ہے۔ جواب ملا کہ حرم کے دروازے پر مٹھائی کی ایک دوکان ہے۔ دوکان دار، دوکان پر کب آتا ہے اور کب جاتا ہے، کوئی نہیں جانتا لیکن جو بات ہر کس و ناکس جانتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ اس کو کسی نے کبھی حرم شریف کے اندر داخل ہوتے، نماز پڑھتے یا طواف خانہ کعبہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ حکم ہوا کہ حلوائی مذکور کو حاضر کیا جائے۔ چنانچہ حلوائی شریف مکہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ شریف مکہ نے حلوائی سے پوچھا کہ کیا اسے علم ہے کہ طاعون پھیلا ہوا ہے۔ حلوائی با ادب بولا ”اچھی طرح جانتا ہوں۔ بُری طرح لوگ مر رہے ہیں خود میرے خاندان میں ایک دن کے اندر گیارہ موتیں ہو چکی ہیں۔ ڈر رہا ہوں کہ

کہیں میری باری نہ آ جائے“۔ شریف نے حکم دیا۔ ”اچھا اب طاعون ختم ہو جانا چاہیئے اور کوئی مرنے نہ پائے ورنہ تمھاری خیر نہیں“ حلوائی نے گھبرا کر لڑکھڑاتی زبان سے پوچھا۔ ”میں کیا کر سکتا ہوں ملک الموت کی حرکتوں کی سزا مجھے کیوں۔ میرا کیا قصور“۔ شریف نے کہا۔ ”میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ وبا ختم ہونی چاہیئے بس چلے جاؤ“، حلوائی فرشتہ موت سے ملنا چاہتا تھا کہ اس سے منت کرے کہ وہ کچھ دنوں کے لیے شہر چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے۔ مگر موت کے فرشتے سے ملاقات کرنے کے لیے اللہ میاں سے اجازت لینا ضروری تھا۔ مگر اُسے خیال آیا کہ اس سے بڑھ کر کوئی گنہگار، بدکردار اور منکر صفت انسان تو شاید اس شہر میں کیا پورے کرہ ارض پر کوئی نہ ہوگا۔ اُسے بڑی مایوسی ہوئی۔ مگر اسی وقت ایک آواز آئی ”آجا۔ آجا تجھے کون روکتا ہے“، غیب کی آواز سن کر اس کی یاس، آس میں بدل گئی۔ دل و دماغ روشن ہو گئے۔ وہ بھاگتا ہوا گھر پہنچا۔ غسل کیا، جامہ زیب تن کیا۔ عطر لگایا۔ اور حرم شریف کی طرف چل پڑا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ وہ حرم کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اور فرش پر گر کر زور زور سے چلانے لگا۔

جنیک یاربیؔ (میرے رب میں تیرے حضور میں آگیا) اس کے پیچھے نماز جنازہ یکے بعد دیگرے ہو رہی تھی۔ امام کی تکبیر کے ساتھ حلوائی کی آواز تیز سے تیز تر ہوتی رہی وہ روتا رہا۔ گڑگڑاتا رہا اور دعائیں مانگتا رہا۔ اس طرح

باقی صفحہ ۴

# دس سال میں تین گنا

آپ کی بچت کے ساتھ ساتھ حفاظت

چھوٹی بچتوں کے میدان میں نیا منصوبہ سماجی تحفظ کے لئے بچت سرٹیفکٹ۔

منصوبہ کا عمل:۔ یکم جون ۱۹۸۲ء سے شروع

کہاں سے حاصل کئے جاسکتے ہیں؟ تمام پوسٹ آفسوں سے یا ایجنٹوں سے

کون مستفیض ہوسکتا ہے؟۔ ہر شخص

(۱) عمر: ۱۸ سال سے ۴۵ سال کے درمیان

(۲) اعلان: سرمایہ لگانے والے کو اس بات کا اعلان کرنا ہوگا کہ اسے کوئی جسمانی یا ذہنی بیماری نہیں اور وہ تندرست و صحت مند ہے۔

سماجی تحفظ کے بچت سرٹیفکٹ پانچ سو روپے اور ایک ہزار روپے کی قیمت کے دستیاب ہونگے نیز دس سال کی مدت پوری ہونے پر میعاد پر پانچ سو روپے کے سرٹیفکٹ کے پندرہ سو اور ایک ہزار روپے کے سرٹیفکٹ کے تین ہزار روپے مل سکیں گے۔

سرمایہ لگانے کی حد:۔ زیادہ سے زیادہ فی کس پانچ ہزار روپے

سماجی تحفظ کس طرح؟ ان بچت سرٹیفکٹ کی جاری میعاد میں سرمایہ لگانے والے کی اگر ——

(۱)۔ بچت سرٹیفکٹ کی خریداری سے دو سال پورے ہونے کے بعد موت واقع

یا

(۲)۔ دو سال کے درمیان حادثاتی غیر قدرتی موت واقع ہو تو پانچ سو روپے کے بچت سرٹیفکٹ کے پندرہ سو روپے اور ایک ہزار روپے کے بچت سرٹیفکٹ کے تین ہزار روپے ادا کئے جائیں گے۔

غیر قدرتی موت سے مراد ہے: ریلوے اور سڑکوں کے حادثات، بجلی کا کرنٹ لگنا، سانپ کا ڈسنا، پانی میں ڈوب جانا، آگ جنگلی جانوروں کا حملہ یا دوسرے حادثات۔

خصوصی سہولت:۔ وارث کا انتخاب کرنے اور رہن رکھنے کی سہولت۔

اس نئے منصوبے کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے قریب کے پوسٹ آفس، ضلع کلکٹر کے دفاتر، ڈپٹی ڈائرکٹر چھوٹی بچت احمد آباد، بڑودہ، راجکوٹ نیز قومی بچت ادارہ لال دروازہ احمد آباد اور نامزد ایجنٹوں سے رابطہ قائم کریں۔

کمشنر چھوٹی بچت اور ریاستی لاٹری
گاندھی نگر (گجرات)

چھوٹی بچت سے سرمایہ بڑھے — مزید منصوبہ آگے بڑھے

رحمت امروہوی (احمد آباد)

# راز صدیقی شاہجہانپوری

نام عبد اللطیف وطن (یو پی) ضلع قصبہ محمدی راز صدیقی شاہ۔
جہانپوری کے نام سے مشہور ہوئے پچاس سال کی عمر میں ۱۹۵۶ء میں
سر کے مرض سے احمد آباد ہی میں انتقال ہوا۔ انتقال سے قبل ایک
سال تک صاحب فراش رہے۔

راز صاحب غالباً ۱۹۴۷ء سے قبل ہی احمد آباد آ گئے تھے
مانچور پل کے نیچے ایک چھوٹی سی دکان تھی گھڑیوں کی مرمت
کام کیا کرتے تھے۔ لانبا قد چھریرا بدن سر پر معمولی گھونگریالے
ل بڑی موری کا پاجامہ اور شیروانی اکثر زیب تن کیا کرتے تھے
حضرت دل شاہ جہانپوری سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ شعر
فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ فن عروض پر
دسترس حاصل تھی بہت ہی مخلص اور ملنسار شخصیت، تصنع و
بناوٹ سے بے نیاز۔ اس زمانے کے کتنے ہی شعرا مرحوم سے
فیض حاصل کرتے تھے جس میں راقم الحروف بھی شامل ہے
لیکن زندگی بھر کبھی کسی پر یہ نہیں ظاہر کیا کہ فلاں شاعر میرا شاگرد
ہے یا مجھ سے مشورہ کرتا ہے۔ اگر کبھی کسی نے اس سلسلے میں
باز پرس کی بھی تو مرحوم یہ کہکر بات ختم کر دیا کرتے تھے۔ کہ ہم
لوگ آپس میں دوست ہیں اور ایک دوسرے سے مشورہ
کرتے ہیں مشاعروں میں اکثر شرکت کرتے تھے۔ اور اس وقت
کے اساتذہ راز صدیقی کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے اور انکے
علم و فن کی قدر بھی کرتے تھے۔ پڑھنے کا انداز انتہائی دلکش
متغزل ترنم سے پڑھتے تھے میری پہلی ملاقات ایک دوست
کے ذریعہ راز صاحب سے ہوئی اس وقت میری شاعری کی
ابتدا تھی۔ اور مجھے کسی ایسے مخلص ماہر فن کی تلاش تھی جو
صحیح مشورے دے سکے۔ چنانچہ راز صاحب سے چند ہی ملاقاتوں
کے بعد میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور راز صاحب نے
اسے قبول کر لیا لیکن استادی و شاگردی والی بات وہ پسند
نہیں کرتے تھے ہمیشہ ایک مخلص دوست اور اچھے ساتھی کی
طرح ملتے رہے جبکہ عمر میں وہ مجھ سے کافی بڑے تھے۔ اور یہ
سلسلہ انکی تا حیات چلتا رہا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ
تھے اور ترقی پسند خیالات کے حامی تھے انہیں کے ایما پر
ہم لوگ بھی انجمن کے ممبر بن گئے تھے۔ راز صاحب اور ہم
لوگ پابندی کے ساتھ انجمن کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے
فارسی کی تھوڑی بہت تعلیم اور فن عروض میں نے راز صدیقی
ہی سے حاصل کیا وہ بڑے خلوص و محبت کے ساتھ عروضی و
فنی رموز و نکات اکثر فرصت کے اوقات میں سمجھاتے رہتے
تھے متقدمین شعرا کے مطالعہ کی طرف اکثر احباب کی توجہ
مبذول کراتے رہتے تھے انکا کہنا تھا کہ جب تک آپ لوگ مطالعہ
نہیں کریں گے اچھے شعر نہیں کہہ سکیں گے۔ افسوس کہ عمر نے وفا
نہ کی آج ایسے مخلص لوگوں کی کمی کا احساس شدت سے ہوتا
ہے۔ راز صاحب کے قریبی اقارب میں صرف انکی ایک سگی
بہن اور بہنوئی تھے جو غالباً قصبہ محمدی میں آج بھی سکونت پذیر
ہونگے۔ راز صدیقی نے شادی نہیں کی تھی وہ سال دو سال میں
ایک مرتبہ اپنی بہن کے پاس ضرور جایا کرتے تھے اور ایک یا
ڈیڑھ ماہ رہ کر واپس احمد آباد چلے آتے تھے جب بھی آتے

تو کہتے کہ بہن شادی کے لئے بہت کوشاں ہیں لیکن راز صاحب نے اصرار سنجیدگی سے کبھی توجہ نہ دی انھوں نے کھانا ہمیشہ ہوٹل کا کھایا جس کی وجہ سے صحت پر برا اثر پڑا۔ آخری دنوں میں بہت کمزور ہو گئے تھے اور جس دن سے کینسر کا علم ہوا مسلسل علاج کے باوجود دن بدن صحت گرتی ہی چلی گئی آخر کار ۱۹۸۵ء میں غالباً مارچ یا اپریل میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ راز ایسے سراپا شرافت اور خلوص کے لوگ اب کہاں ملیں گے۔ میں نے ایک بار کوشش بھی کی کہ ان کا جتنا کلام ہے اسے شائع کر دیا جائے مگر افسوس میں اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا چند اشعار ناظرین کے پیش خدمت ہیں جن سے راز صاحب کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

---

راز تو بہ پے پھر گیا پانی
کوئی چھینٹا جو آسماں سے گرا
میری نظروں نے چن لیا اسکو
پھول جو دستِ باغباں سے گرا

راز وہ میکدہ بدوش آنکھیں
کیف برسا گئیں حیا کر کے
اس نے جسکا نہیں مقام کہیں
آپ کا سن لیا ہے نام کہیں
بیٹھ اے دل نظر ملائے بغیر
بندگی میں نہیں سلام کہیں

---

آتے ہی انکے روبرو سپنوں کی بات ہو گئی
لمحوں میں دن گذر گیا پلکوں میں رات ہو گئی
تم نے جو تو سے تم کہاں کھِل گئے زندگی کے پھول
تو نے نقاب الٹ دیا شرح حیات ہو گئی۔
راز دل شکستہ کا آ ہی گیا انھیں خیال
کانٹوں کو چومتے ہی آج پھولوں سے بات ہو گئی

زمانہ چال قیامت کی چل گیا ہے ہے
میں دیکھتا ہی رہا ہاتھ کی لکیروں کو
ڈرا ہوں یوں بھی سواد دیکھ کر تحریروں کو
سفیر بن کے نہ دیکھا تھا ہم سفیروں کو

---

ابھی سے گرم ہیں کیوں ناقدانِ بزم سخن
ابھی تو اور سخنور بننے والے رہیں۔

عاشق ہرگانوی

# "عکس ریز"

(تبصرہ کے لئے کتاب کی دو جلد بھیجئے)

**سات سمندر** — بدیع الزماں خاور
صفحات ۱۲۸ ۔ سائز ڈیمائی ۔ قیمت بیس روپئے
ملنے کا پتہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج،
نئی دہلی ۲

بدیع الزماں خاور کی شاعری کی اہم خوبی یہ ہے کہ [illegible]لی کی اعلیٰ قدروں کی پامالی کو ان کے یہاں نمایاں طور دیکھا جاسکتا ہے۔ وجدان و احساس سے گزرتے ہوئے عصر کی تنہائی، کس مپرسی، حزن و ملال، تشکیک اور دل کو بھی بقا و تحفظ کے ساتھ اپنے دائرہ سخن میں انتہائی [کام]یابی سے برتتے ہیں۔ "سات سمندر" خاور کی غزلوں کا [مجموعہ] ہے۔ یہ غزلیں ایک نئی کروٹ، نئی وسعت، نیا بانکپن سربلندی عطا کرتی ہیں۔ ساتوں سمندر میں غوطے لگانے [کے] بعد شفاف، نیلے اور گہرے پانی میں سورج طلوع ہوتا [دکھا]تا ہے۔ اور یہیں سے خاور کی ذاتی اور اپنے عہد کی [زندگی]ن کا منظر دیکھا جاسکتا ہے۔

پل تو دریا پہ نہیں ہے کوئی
جس کو چلنا ہو چلے پانی میں

*

لے کے مٹی کا بدن پار اترنا ہوگا۔
دشت کے بعد سمندر سے گزرنا ہوگا۔

*

بتائی جاتی ہے یہ بات روز خبروں میں
ہے آدمی کے لئے سہل خودکشی کتنی

*

جانے کس سوچ میں بیٹھا ہے وہ۔
دوستوں میں بھی اکیلا ہے وہ

*

نکلے تو ہیں مکاں سے باہر مگر یہ ڈر ہے
چہروں کی بھیڑ میں ہم گم ہو کے رہ نہ جائیں

*

ان پھول جیسے جسموں سے دیکھو تو پوچھ کر
کتنا شدید ہوتا ہے انگڑائیوں کا درد۔

*

ساتوں سمندر پی جانے کے سفر میں ضبط و احتیاط ہے، ارتکاز خیال ہے اور معنوی حسن ہے۔ ساتھ ہی ساتھ زندگی اور زمانے کی دلنوازی ہے۔

"سات سمندر" کے پہلے فلیپ پر خاور کی تصویر اور مظہر امام کی رائے۔ دوسرے فلیپ پر عنوان چشتی اور [illegible] کی پشت پر قمر رئیس کی آرا ہیں۔ ابتدائیہ، مقدمہ، دیباچہ اور پیش لفظ بالترتیب حرمت الاکرام، خلیق انجم، گیان چند جین اور سلیمان اطہر جاوید نے لکھا ہے۔ اس مجموعہ میں ۱۵ غزلیں اور دو آزاد غزلیں شامل ہیں ساتھ ہی ساتھ متفرق اشعار بھی ہیں۔ اپنے مجموعے میں آزاد غزلیں شامل کرکے خاور نے سمندر کے بہاؤ کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔ آزاد غزل کو اعتبار بخشنے والوں میں خاور کا بھی شمار ہوتا ہے کاغذ، کتابت، طباعت ہر لحاظ سے یہ مجموعہ معیاری ہے۔ سرورق کی نیلاہٹ اور دھنک رنگ کی لہریں

**دربہ در**: پردین کمار اشک

صفحات ۱۰۴، سائز ڈیمائی، قیمت بارہ روپے

ناشر: سمیکشا پرکاشن، مکان ۱۱-۵، ۱۹۱، کرشنا اسٹریٹ پٹھان کوٹ (پنجاب)

پردین کمار اشک فکر آبیاشی میں سول انجینئر ہیں۔ لیکن ذہن کے تیز بہاؤ کو اور اٹھتی بیٹھتی لہروں کو غزل کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ دربہ در ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں ۴۴ غزلیں اور متفرق اشعار ہیں۔ اشک کی غزلوں کی تازہ کاری، شادابی اور مٹھاس ایک الگ ذائقہ رکھتی ہیں۔ گھلاوٹ جذباتی کسک، تغزل اور فنی رچاؤ ان کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ندرت خیال اور تازگی بیان کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں اجتہاد کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ لیکن اشک نے فکر کے کسی خاص پہلو، کسی خاص جذبے یا کسی تجربے اور لمحے کو ابدیت بخشی ہے

دربہ در رہوں میں کئی جنموں سے کس کی خاطر
بار میں بیٹھ کے کچھ دیر یہ سوچا جائے

---

لاش اس شخص کی اک جھیل میں دیکھی گئی آج
جو ترے شہر میں ناکام پھرا کرتا تھا

---

کتنی مغرور تھی مٹی کے چراغوں کی ضیا
شام جس وقت سمندر میں گرا تھا سورج

---

گڑیا گڑیا ہی کی رچائی تھی جو شادی کل تک
میں نے اس لڑکی کو آج اپنے برابر دیکھا

---

مزے ہی مزے تھے وہ کیا وقت تھا
نگر گھومنا چھوریاں دیکھنا

---

اسے نفرت تھی گھر سے کرسی سے
بس اک بلی کے منہ کو چومتا تھا

---

ترک تعلقات کے بعد اس طرح ملے
میں کبھی تھا بے زبان سادہ بھی تھا نگوں

---

دربہ در میں اس طرح کے بے شمار اشعار ہیں جن میں اشک نے انفرادی تجربے کی چبھن کو اجتماعی احساس کی کسک میں تبدیل کر دیا ہے اور جن میں خارجی زندگی کے تجربات شخصی واردات بن کے اجاگر ہو سکے ہیں۔

اشک کی غزلوں کا یہ مجموعہ ادب کا دیرپا نقش ثابت ہوگا۔

اس مجموعے کے فلیپ پر محمود ہاشمی، راج نرائن راز مخمور سعیدی، کمار پاشی اور شمیم حنفی کی آرا ہیں۔ کتاب ہر لحاظ سے خوبصورت چھپی ہے۔ ر۔ ا

# آپ کے خطوط

**متین احمد عتیق (مالیگاؤں)**

تازہ گلبن بابت مئی کی نعت "غزالِ کنجِ حرا" اپنے فنی پیکر کے لحاظ سے بڑی پُرشکوہ لیکن اپنے فکری حجم کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے، بادی النظر میں تو ایسا لگتا ہے کہ فضا صاحب نے اپنی قادرالکلامی کے طفیل اس ذاتِ گرامی سے جس کی تعریف و توصیف سے قرآن حکیم بھرا ہے اپنی بھرپور عقیدت وارادت کا اظہار کیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ شعورِ الوہیت کا شاہد جو خیر البشرؐ کے روپ میں ظاہر ہو کر پردۂ ذات وصفات کو روشن کر گیا اس سے "کنتُ کنزاً مخفیاً" کا بھی سراغ ملتا ہے، نعت کے کئی شعر اسی ملتہ دتصور کو ابھارتے ہیں۔ خدا فضا ابن فیضی صاحب کو شفائے کاملہ سے نوازے، موصوف اپنی غزلوں اور نظموں کے ذریعے جدید رجحانات کے جیسا ڈکا کام جس ضبط او رتوازن سے انجام کر رہے ہیں اس سے ادب میں بہت کچھ دال دلیا ہو رہا ہے۔ آدمی بھی بڑی محبت کے ہیں۔ نہایت مرنجاں مرنج، میری ملاقات اترپردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ کے ہفت روزہ اردو کے میلہ میں ہوئی تھی۔ تو مشاعرہ کا اسٹیج چھوڑ کر تا دیر ساتھ رہے تھے، ڈاکٹر قمر رئیس اور رنند۔ نشور و کرم بھی ساتھ تھے، جن کے اندازِ خطابت و بیباکی سے فضا صاحب کی محترم شخصیت کا اور بھی قائل ہونا پڑا تھا۔ آپکی نعت کے علاوہ خانہ بدوش کا پوسٹ مارٹم، رام لال کا سفرنامۂ پاکستان، نذیر فتحپوری کا ایک نئے اور ابھرنے لیکن اچھے شاعر پر تعارفی مضمون اور تبصرے بطورِ خاص پسند آئے۔ دیگر مشمولات بھی دو ایک کے سوا خوب ہیں نیز چند غزلیں تو بڑے مزے کی ہیں۔"

**نواب احسن اساڑھوی (الٰہ آباد)**

جناب رحمت صاحب امروہوی نے اپنی تنقید میں جو گلبن ماہ مئی کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے یہ فرمایا کہ جناب وقار واثقی صاحب کے غزل کا مندرجہ ذیل مطلع عروضی اعتبار سے برابر نہیں ہے۔

پڑنے کو ہے کوئی افتاد تو پڑ جانے دو
پہلے اچھی طرح اس لاش کو سڑ جانے دو

(صوت وصدا پہلی غزل صفحہ نمبر ۱۰)

موصوف کے خیال میں پہلے مصرعے کا لفظ "کوئی" زائد ہے۔ اور دونوں مصرعے اس طرح برابر ہوتے ہیں،

پڑنے کو ہے افتاد تو پڑ جانے دو
پہلے اچھی طرح اس لاش کو سڑ جانے دو

حالانکہ اس طرح دونوں مصرعے بنانے میں دوسرا مصرع بڑا معلوم ہوتا ہے۔ اور حیرت ہے کہ جناب رحمت صاحب کو یہ فرق کیوں نہیں محسوس ہوا۔

میں نے جناب وقار واثقی صاحب کے مطلع کی جب تقطیع کی تو وقار واثقی صاحب کے دونوں مصرعے برابر نظر آئے۔

تقطیع کرنے سے پہلے میں عروض کے اس اصول کی طرف قارئین کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ اردو کے اہلِ عروض نے ی۔ و۔ ا۔ کو گرانا جائز تسلیم کیا بشرطیکہ الفاظ عربی و فارسی کے نہ ہوں۔

مطلع ہذا میں تقطیع کرتے ہوئے "پڑنے" کی ی۔ "کوئی" کا واو۔ "افتاد" کا الفِ وصل۔ "تو" کا واو۔ "پہلے" کی ی۔ "اس" کا الفِ وصل۔ "کو" کا واو۔ گر جائیگا

اور اسی طرح پڑھنے "کی۔ ن" "کوئی" کا ہمزہ (الف) "تو" کا (ت) متحرک ہو جائیں گے۔ اور اسی طرح "پہلے" "کا دل" "کو" کا (کاف) متحرک ہو جائیں گے۔

اس ترکیب سے دونوں مصرعوں کا وزن مندرجہ ذیل ہوگا۔

فاعِلاتُن ۔ فِعْلاتُن ۔ فعِلاتن ۔ فِعْلُن

امید ہے کہ جناب رحمت صاحب امروہوی اس اصول کو سمجھتے ہوئے تقطیع فرمالیں گے اور اپنی تنقید کی غلطی محسوس کرلیں گے۔

تبصرہ نگاری کسی ادبی کردار کشی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اچھے اور سچے فنکار کی فکری اور جمالیاتی تفہیم کا غیر معمولی سنجیدہ اور حساس مطالعہ ہوتا ہے جس سے عام قاری کو اسکے ادبی مرتبہ اور مقام کو متعین کرنے میں سہولت ہوتی ہو جناب وقار واثقی صاحب کے مجموعہ کلام "صوت و صدا" پر جناب رحمت امروہوی صاحب کا تبصرہ ان کی ذہنی انتہاپسندی پر دلالت کرتا ہے

● **آزاد گلاٹی (دنا بھا)**

گلبن کے دو شمارے ملے ۔ میں پہلے شمارہ کے بعد ہی آپ کو خط لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن علالت کی وجہ سے فوری طور پر خط نہ لکھ سکا۔ اور اب تازہ شمارہ ملا تو مجھے اپنی ندامت کا احساس ہوا کہ میں نہ تو رسالے کی رسید ہی کر سکا اور نہ ہی کلام بھیجوا سکا ——— گلبن خوب ہے۔ مجھے افسوس صرف یہی ہے کہ آپ کے اس خوبصورت رسالے سے رابطہ بہت دیر کے بعد قائم ہو رہا ہے۔

● **کریم خاں ساز (بڑودہ)**

اس پر آشوب دور اور نامساعد حالات میں بھی آپ نے گلبن کو جاری رکھا یہ آپ کی اولعزمی کا ثبوت ہے جس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ میرا دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے اور پرچہ اسی طرح ترقی کی راہ پر گامزن رہے۔ آمین۔

---



---

گجرات سے نکلنے والا واحد علمی ادبی اور ثقافتی

ماہنامہ

# گلبن

احمد آباد

نومبر ۱۹۸۲ء

جلد ۵
شمارہ ۵،۶ و ۷

نگراں
سید محمد حکیم الدین شیرازی

منتظم اعلیٰ
سید احمد مختار غوثی

مشیر
سید علی احسن بخاری

ایڈیٹر
ثریا ہاشمی

مینجنگ ایڈیٹر
ظفر ہاشمی

ترتیب کار
مناظر عاشق ہرگانوی

## بدلِ اشتراک

لائف ممبری ——— ۲۵۰ روپے

زرتعاون (سالانہ) ——— ۲۵ روپے

زرِ سالانہ ——— ۱۵ روپے

غیر ممالک میں — بحری ڈاک سے ——— ۲ پونڈ

ہوائی ڈاک سے ——— ۵ پونڈ

عام شمارہ ——— ایک روپیہ پچیس پیسے

پتہ ۴۹/۲۰ گجرات ہاؤسنگ بورڈ کالونی شاہ عالم احمد آباد ۳۸۰۰۲۸ گجرات

قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے

پرنٹر پبلشر، پروپرائٹر — ثریا ہاشمی

مطبع نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد یوپی (انڈیا)

# فہرست

محمد ابن الحسن (پاکستان)

## حمد

یہ سیلِ آب یہ آئینہ کاریٔ مہتاب
بھنور پہ رقص ہوا کا ہوا کے ساتھ سحاب
زمانہ دیکھ رہا ہے نگر نگر کے خواب

قدم قدم پہ اندھیروں میں روشنی کے خواب
امید و بیم کے حلقوں میں زندگی کے خواب
سراب زار پہ بے داغ چاندنی کے خواب

بکھر گئے ہیں یہی خواب موتیوں کی طرح
گلوں پہ اوس کے مانند آنسوؤں کی طرح
سیاہ رات میں تاروں کے جھرمٹوں کی طرح

یہ ایک عالمِ امکاں سکوتِ صحرا میں
گہر ہے بند صدف میں صدف ہے دریا میں
کہیں کہیں پہ جھلکتا ہے چشمِ بینا میں

نقوشِ جوشِ نمو کے ابھرتے جاتے ہیں
رکاوٹوں پہ سنبھلتے بپھرتے جاتے ہیں
ہوائے شوق چلی ہے سنورتے جاتے ہیں

مقامِ شکر ہے آرائشِ جمال کا غم
زوال دیکھنے والوں کو لازوال کا غم
وہ بے کمال کہ جن کو ملا کمال کا غم

محمد سرور الزماں سرورؔ (ہزاری باغ)

## نعت شریف

آپ سے آشنا ہوتے ہی اے نبیؐ
میری دنیا سنورنے لگی اے نبیؐ

زندگی ہو گئی زندگی اے نبیؐ
یاد جب آ گئی آپؐ کی اے نبیؐ

شوق ہے میں مدینہ کو دیکھوں کبھی
کاش حاصل ہو یہ بھی خوشی اے نبیؐ

جامِ کوثر مجھے میکشی کو ملے
میری بجھ جائے ہر تشنگی اے نبیؐ

آپ پیغامِ حق لائے تو دہر میں
چھا گئی جا بجا روشنی اے نبیؐ

آپؐ کے در پہ آکر نئی زندگی
مل گئی اب مجھے اے نبیؐ اے نبیؐ

آپ کی جس میں تحسین شامل رہے
ایسی سرورؔ کریں شاعری اے نبی

مناظر عاشق ہرگانوی

# پوسٹ مارٹم

کبھی کبھی پڑھے لکھے لوگ بھی فاش غلطیاں کر جاتے ہیں لیکن
غلطی تو انسان کی سرشت میں شامل ہے
پھر بھی ـــــ ایسی غلطی، جن کے اثرات بھیانک ہوں، اسے کیا نام دیا جا سکتا ہے؟

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے آج کے اردو ادیب بےحد سہل پسند ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر ایسی بھی کیا سہل پسندی کہ لکھتے وقت گمراہ کن حد تک ذہن اور قلم بہک جائے۔ وہ بھی ایسے شخص سے جو اردو کا بڑا ادیب شمار کیا جاتا ہو اور ایک بڑی یونیورسٹی کا پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو ہو۔

میری مراد ڈاکٹر شکیل الرحمن سے ہے۔ شکیل الرحمن ایک اچھے افسانہ نگار، ایک بڑے ناقد، سابق وائس چانسلر اور موجودہ صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی ہیں۔ کافی پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ یہ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ پھر بھی ان سے، ان کے حالیہ ایک مضمون میں بھیانک قسم کی غلطی ہوئی ہے۔ اتفاق سے پچھلے دنوں آل انڈیا ریڈیو کے آرگن "آواز" دہلی کا یکم سے ۱۵ مارچ ۸۲ء کا شمارہ میرے مطالعہ میں آیا۔ اس میں شکیل الرحمن صاحب کا مضمون "ایک ادبی اصطلاح ـــ کتھارسس" شائع ہوا ہے۔ شکیل الرحمن اپنے مضمون کی ابتدائی سطور میں لکھتے ہیں:

"لفظ کتھارسس ( CATHARSIS ) کی جڑیں ارسطو کے ماضی میں پیوست ہیں۔ بلاشبہ ارسطو نے اسے ایک ادبی اصطلاح کے طور پر پہلی بار استعمال کیا لیکن اس لفظ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ارسطو کا زمانہ ۳۸۴ سال قبل مسیح سے ۳۲۲ سال قبل مسیح کا ہے اور اس نے پہلی بار "کتھارسس" کی اصطلاح اپنی تصنیف "سیاسیات" میں استعمال کی۔"

حالانکہ ارسطو نے "کتھارسس" کی وضاحت "بوطیقا" میں کی ہے۔
ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"ڈرامہ اور شاعری دراصل ذہن انسانی کی کتھارسس کرتے ہیں۔ کتھارسس کی 'بوطیقا' میں وضاحت کی گئی ہے اور آج یہی بات ہر قابل وقعت ادب کے سلسلے میں ایک مسلمہ اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔"

(ارسطو سے ایلیٹ تک ص۵۸)

شکیل الرحمن اور دوسرے اہل قلم سے ایسی غلطیاں کیوں ہوتی ہیں؟ میرے خیال میں کام کے دباؤ کے تحت غور و فکر میں کمی آجاتی ہے، سہل پسندی راہ پا جاتی ہے اور خصوصی طور پر ریڈیو کے لئے لکھتے وقت، ٹالنے، کا جذبہ کارفرما ہو جاتا ہے، نتیجۃً میں گمراہ کن غلطیاں راہ پا جاتی ہیں!

●●

# نظمیں

فیض احمد فیض (پاکستان)

## ایک خط

کیسے ممکن ہے یار مرے
مجنوں تو ہو لیکن تم سے
اک سنگ نہ رسم و راہ کرے
ہو کوہکنی کا دعویٰ بھی
سر پھوڑنے کی ہمت بھی نہ ہو
ہر اک کو بلاؤ مقتل میں
اور آپ وہاں سے بھاگ رہو
تم بھونرا بن کر جب چاہو
ہر ایک کلی کا رس چوسو
اور ساتھ ہی یہ اصرار کرو
ہر ایک تمہیں سے لپٹی رہے
اور تم پر جان چھڑکتی رہے
بہتر تو یہی ہے جان مری
جس جا سر دھڑ کی بازی ہو
وہ عشق کی ہو یا جنگ کی ہو
گر ہمت ہے تو بسم اللہ
ورنہ اپنے آپے میں رہو
لازم تو نہیں ہے ہر کوئی
منصور بنے فرہاد بنے
البتہ اتنا لازم ہے
سچ جان کے جو بھی راہ چنے
بس ایک اسی کا ہو کے رہے۔

## ادھر نہ دیکھو

ادھر نہ دیکھو کہ جو بہادر
قلم کے یا تیغ کے دھنی تھے
جو عزم و ہمت کے مدعی تھے
اب ان کے ہاتھوں میں
صدق و ایماں کی آزمودہ پرانی تلوار
مڑ گئی ہے،

ادھر نہ دیکھو جو کج کلہ
صاحبِ حشم تھے
جو اہلِ دستار محترم تھے
ہوس کے پر پیچ راستوں میں
کلہ کسی نے گرو رکھ دی
کسی نے دستار بیچ دی ہے

ادھر بھی دیکھو
جو اپنے رخشاں لہو کے دینار
مفت بازار میں لٹا کر
لحد میں اس وقت تک غنی ہیں،
اُدھر بھی دیکھو
جو حرفِ حق کی صلیب پر اپنا تن سجا کر
جہاں سے اوجھل ہوئے
اور اہلِ جہاں میں، اس وقت تک نبی ہیں

صلاح الدین محمود (پاکستان)

# ان دیکھا خواب

ہاں اور نلکے درازوں میں
رات گئے جب ہوا چلی تھی
جسموں کی لانبی جنبش سے
شبنم سی اک بات کہی تھی
خشک ہوئی تھیں رات کی سمتیں
تاروں کی اک بند کلی تھی
ہم اور تم اک شجر تلے تھے
شجر کے اندر آگ پلی تھی
کبھی کبھی دستک سی کرنیں
کبھی سیاہی خود چمکی تھی
کبھی ہوا کے دو دامن تھے
کبھی ہوا جسموں سے لی تھی
پھر گیلے گیلے تاروں نے
ہونٹوں سے اک بات کہی تھی
ہاں اور نا کے دروازوں پر
ہم اور تم نے دستک دی تھی

راجکمار چندن (جموں)

# ایک نظم

بہت صدیوں سے
اس پر غور ہوتا جا رہا تھا
کہ پنچالی کی عزت
کرشن نے آکر بچائی تو
مگر سر سے بھی آنچل کیوں ڈھلا تھا
جواب آیا
کہ وہ اپنے تئیں تھی۔ جسد پر جب تک
بچانے کو ابھی یوگیشور
آئے نہیں تھے
اسی دوران سر بھی اور سینہ بھی برہنہ ہو گیا تھا
مگر اب کوئی دریودھن
مباحث اور رسوائی کا
ساماں مول کیوں لے
حقوق ایسے یہاں
پنچالیاں اب مانگتی ہیں
کہ ہم کو ٹاپ لیس اشنان
کرنے کی اجازت ہو
وہاں سپریم عدالت سے
انھیں حق مل گیا ہے
کہ وہ اب ٹاپ لیس اشنان
کر سکتی ہیں۔ ساحل پہ
عدالت کو یقیں ہوگا
کہ بازاروں میں شاید
امن قائم رہ سکے گا

رفعت النساء رفعت (مظفرپور)

# کوئی بتاؤ کہ.....

ہجوم ہے، اک جم غفیر ہے
حد نظر تک، ایسی نظروں کا میرے سامنے
جو، ہمہ دم یہ دعویٰ کرتی ہیں
کہ
مہذب انسان ہیں وہ، اور
ان ہی میں ہے انسانیت
مگر
یہی نظریں پسند کرتی ہیں کیوں دیکھنا
اپنے دعوؤں کے پس پشت
پردہ سیمیں و رنگیں منچ پر
عریاں رقص عورتوں کا
اور پسند کرتی ہیں کیوں پھر
ننگے چمکتے بدن میں پیوست ہو جانا
کوئی بتاؤ کہ حصار انسانیت کو پار کرتے ہوئے
کیوں بھول جاتی ہیں نظریں کہ وہ مہذب ہیں؟!

جمیل زبیری (پاکستان)

# ایک رباب کے تار

اس روز صبح ہی سے لوگوں نے میدان کے اطراف جمع ہونا شروع کر دیا تھا۔ مولاداد کے کوڑے لگائے جانے والے تھے۔ اسے تیس کوڑوں اور دو سال کی قید بامشقت کی سزا ملی تھی۔ اس نے جرم بھی ایسا کیا تھا۔ اسمگل شدہ مال اپنی دوکان میں رکھا ہوا تھا اور چوری چھپے بیچ رہا تھا۔

موسم میں خنکی تھی اس لئے ریاض نے اپنے سر اور منہ پر مفلر لپیٹ لیا تھا۔ چونکہ وہ میدان میں وقت سے پہلے پہنچ گیا تھا اس لئے اسے کافی آگے جگہ مل گئی تھی۔ جہاں وہ زمین پر اپنا رومال بچھا کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا تھا۔ تماش بین برابر آرہے تھے اور اب اس کے پیچھے کئی صفوں میں کھڑے ہو گئے تھے۔ سب لوگ آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔ ہر شخص پر کچھ ایسا ڈر طاری تھا جیسے اگر اس نے اونچی آواز نکالی تو سامنے کھڑے ہوئے افسر اسے بھی پکڑلے جائیں گے اور پھر نہ جانے کیا ہو۔ حالانکہ ہر شخص کو یہ بات معلوم تھی کہ اونچی آواز میں بولنے پر کوئی پابندی نہیں۔ اس کے خلاف ابھی تک نہ کوئی قانون ہے اور نہ کوئی مارشل لا کا ضابطہ

— پھر بھی احتیاط تو لازم تھی —

پھر میدان کے بیچوں بیچ ٹکٹکی لاکر رکھی گئی۔ ریاض کی نگاہیں گھبرا کر مجرم کو تلاش کرنے لگیں۔ "ٹکٹکی" عجیب نام رکھا ہے اس کا ...... وہ سوچنے لگا اس نے یہ نام چند روز پہلے ہی اخبار میں ایک تصویر کے نیچے لکھی ہوئی عبارت میں پڑھا ...... پہلے تو اس نے صرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا ہی سنا تھا۔ مگر اب تو ایک مجرم کو ٹکٹکی سے باندھا جانے والا تھا۔ اس نے ٹھنڈا سانس لیا۔ ...... اب تو سب ہی کچھ بدل گیا ہے الفاظ، الفاظ کے معنی، استعارے، محاورے ..... انسان ہی بدل گئے ہیں تو اور چیزوں کا ذکر ہی کیا —

اس نے دیکھا ٹکٹکی کے پچھلے حصے کی طرف جدھر مجرم کا منہ ہوتا ہے —— مائک لگایا جا رہا ہے تاکہ تماش بین ہر کوڑے پر نکلنے والی چیخ کی آواز اچھی طرح سن سکیں۔

مائک فٹ ہوگیا —— پھر اس نے دیکھا دو سپاہی مولاداد کو پکڑ کر لا رہے ہیں۔ جیسے ہی مولاداد نظر آیا۔ لوگوں نے ایک نعرہ بلند کیا اور زور زور سے تالیاں بجانے لگے۔ ان کے لئے خوشی کا موقع تو تھا ہی۔ لیکن ریاض نے نہ تالیاں بجائیں نہ نعرہ لگایا وہ صرف یہ سوچتا رہا کہ اسمگل کیا ہوا مال آخر مولاداد کے پاس آیا کیسے ہوگا۔ سمندر کے راستے۔ ہوائی جہازوں کے ذریعے مگر......

مگر کوسٹ گارڈ —— اور کسٹم حکام —— اور اکسائز والے

———

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ سپاہیوں نے مولاداد کے ہاتھ پاؤں ٹکٹکی سے باندھ دیے اور اسی وقت ایک قوی، دیو ہیکل کالا بھجنگ آدمی جس نے صرف ایک بنیان اور نیکر پہن رکھی تھی ہاتھ میں کوڑا لئے نمودار ہوا۔ اس کے سامنے آتے ہی پھر ایک نعرہ بلند ہوا — لوگوں نے پھر تالیاں بجائیں ——

کوڑے لگانے والے کو دیکھ کر ریاض کے جسم میں ایک کپکپی سی پیدا ہوئی اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ——

وہ کچھ دیر تک ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ کوڑے والے کی بڑی بڑی کالی مونچھیں تھیں اور وہ اس کی باہر کو ابلی ہوئی بڑی بڑی سرخ آنکھیں دور سے دیکھ سکتا تھا۔ مولاداد کی کمر پر ایک گدا

باندھا گیا تاکہ کوڑا اس کے گردوں پر نہ لگے۔ کیونکہ کوڑے
لگاتے وقت انسان کے گردوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے ——
پھر ڈاکٹر نے بڑھ کر مولاداد کا معائنہ کیا۔ اور اسے کوڑے
لگائے جانے کے لئے فٹ قرار دے دیا۔ وہاں موجود افسر نے اشارہ
کیا۔ ریاض نے کوڑے کو ہوا میں لہراتا ہوا دیکھا۔ پھر لاؤڈ اسپیکر
سے اسے ایک چیخ سنائی دی —— "میں بے گناہ ہوں —— مجھے
نہ مارو۔ میں بالکل بے گناہ ہوں —— میں بے قصور ہوں ——"
اس کے بعد کچھ گڑبڑ ہو گئی —— دوسرا کوڑا ابھی اٹھایا
ہی گیا تھا کہ ہاتھ کے اشارے سے روک دیا گیا۔ پھر ملی جلی
آوازیں آئیں جس سے ریاض کو پتہ چلا کہ پہلا ہی کوڑا غلط ہو گیا
تھا اسے کینسل کر دیا گیا۔ اب گنتی پھر سے شروع ہو گی ——
چنانچہ پھر سے گنتی شروع کی گئی ایک —— دو —— تین
—— ریاض کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے —— وہ ان آنکھوں
میں سے دو بڑی بڑی سرخ سرخ آنکھیں اور بڑی بڑی سیاہ مونچھیں
دھندلی سی دیکھ رہا تھا —— وہی آنکھیں اور وہی
مونچھیں جن سے وہ زندگی بھر خوف زدہ رہا تھا۔ اس دن جب
اس کے باپ کا جنازہ گھر میں رکھا ہوا تھا اور وہ پلنگ کی پٹی
پکڑے ہوئے زمین پر بیٹھا رو رہا تھا اور پکار رہا تھا۔ ابو ——
ابو —— تب اس کے چچا نے اسے گود میں اٹھانے کی کوشش
کی مگر اس نے پلنگ کی پٹی کو زور سے پکڑ لیا۔ وہ زیادہ چیخ چیخ
کر رونے لگا۔ اس وقت اس کے چچا نے اس کے ہاتھ کو ایک
زوردار جھٹکا دے کر اسے زبردستی گود میں اٹھا لیا اور اس کی بڑی
بڑی سیاہ مونچھیں ریاض کی آنکھوں اور گالوں میں چبھ
گئیں۔ اس نے خوف زدہ ہو کر چچا کے چہرے کی طرف دیکھا
اور اسے دو ابلی ہوئی سرخ سرخ آنکھیں دکھائی دیں اور
وہ اور بھی زیادہ خوف زدہ ہو کر اس کی گردن سے لپٹ گیا۔ چچا
الیاس نے اسے کمرے میں لے جا کر ایک پلنگ پر ڈال دیا
اور گرج دار آواز میں کہا۔ "یہاں خاموش لیٹے رہو۔"
اس کے بعد لوگ اس کے ابو کو اٹھا لے گئے اور ایسی جگہ
چھوڑ آئے جہاں سے وہ پھر کبھی لوٹ کر نہیں آیا ——
ایک روز وہ چچا الیاس کے ساتھ ان کے پیچھے سہما سہما آ رہا تھا
سامنے ایک خربوزہ والا نظر آیا اور اس کی مونچھیں بھی ذرا بڑی
بڑی تھیں۔ چچا نے اسے پکارا اور کہا "میرے گھر آ جانا خربوزے
لینا ہیں ——"
"اچھا سرکار" اس نے جواب دیا۔
وہ لوگ پھر اپنے گھر کی طرف چل پڑے وہ گھر میں داخل
ہونے ہی والے تھے کہ خربوزے والا اپنی ٹوکری سر پہ اٹھائے تقریباً
دوڑتا ہوا پہنچ گیا۔ چچا وہیں رک گئے۔ اس نے خربوزوں کا ٹوکرا
سر سے اتار کر نیچے رکھا۔ چچا نے پوچھا۔
"اس میں اتنے کم خربوزے کیوں ہیں؟"
"جی وہ راستے میں مجھے منشی سردار نے روک کر کچھ خربوزے
لئے ——" تڑ سے ایک تھپڑ اس کے گال پر پڑا اور ایک چیخ سنائی
دی ——
"ابے ہم سے پہلے اچھے اچھے دانے منشی سردار کو دے دیے
——" وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا —— "نہیں حضور۔ انھوں نے خود
ہی ——" چچا الیاس نے لپک کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور
ایک ہی جھٹکے میں اس غریب کی آدھی مونچھ اکھیڑ لی۔ اس کے
سے خون بہنے لگا۔ پھر چچا نے اس کے ٹوکرے میں اس زور سے
لات ماری کہ سارے خربوزے سڑک پر دور دور تک پھیل گئے
—— ریاض سہم کر رونے لگا ——
"تم کیوں روتے ہو، چپ رہو جی ——" چچا کی گرج دار
آواز سنائی دی۔ اس کے بعد انہوں نے جیب سے پانچ روپے
نکال کر اسے دیے چلو اٹھاؤ اپنے خربوزے۔ اور آئندہ سے سب سے
پہلے میرے پاس لایا کرو ——
خون روکنے کے لئے جو کپڑا اس نے اپنے سر سے اتار کر
اپنے منہ پر رکھ لیا تھا، وہ اب خون میں بھیگ چکا تھا۔ اسے
اسی حالت میں چھوڑ کر چچا الیاس گھر کے اندر چلے گئے اور ان کے
پیچھے پیچھے ریاض سہما سہما اندر جا کر اپنی ماں سے لپٹ گیا

چچا الیاس کچھ روز کے لئے باہر جا رہے تھے ۔ انھوں نے
سے کہا۔ اسٹیشن جانے کے لئے تانگہ لے آئے ۔ وہ کافی دیر
ر کرتے رہے اور تانگہ نہیں آیا۔ یہاں تک کہ ٹرین جانے کا
ے بالکل قریب آگیا۔ وہ بے تابی سے اپنی مونچھوں کو مروڑتے
ئے بار بار بیرونی دروازے تک جاتے اور واپس آجاتے تھے
دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ دوڑکر باہر نکلے۔ ریاض جو انھیں
، دیر سے اس غصے کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ چپکے چپکے ان کے
باہر آگیا۔ چچا نے کچھ نہیں کہا اور لپک کر تانگے کے اگلے حصے پر
ہ گئے اور اس تانگے والے کو اتنا مارا کہ وہ بے حال ہو کر نیچے گر
اور اس کے منہ سے خون جاری ہو گیا۔ اس کے بعد چچا الیاس
گے سے نیچے اترے اور گھر میں واپس آکر اعلان کر دیا کہ انہوں نے
سفر ملتوی کر دیا ہے۔ ان کا ملازم تانگے والے کو پٹتا دیکھ کر بھاگ
اور پھر کبھی ان لوگوں نے اس کی صورت نہیں دیکھی ـــــــ

ریاض کی چچی کو انڈا بُرا لگتا تھا۔ انڈے سے انھیں کچھ
ی الرجی تھی کہ اس کی خوشبو تک سے انھیں متلی ہوتی تھی۔ مگر
الیاس صرف انڈوں کا ناشتہ کرتے تھے اور اس پر ضد یہ تھی کہ
ب تک چچی اپنے ہاتھ سے انڈا نہ تلیں گی وہ نہیں کھائیں گے۔
ض اکثر دیکھتا تھا کہ چچی صبح کے وقت اپنی ناک پر ڈھاٹا باندھ
باورچی خانے میں جاتیں اور چچا کے لئے انڈے تل کر میز پر رکھ
تھیں۔ ریاض اکثر چچی کو انڈے میز پر رکھنے کے بعد غسل خانے
جاتے دیکھتا تھا، جہاں سے اُن کے قے کرنے کی آوازیں
سنائی دیتی تھیں ـــــــ

"میں بے گناہ ہوں ـــــ" میں بے قصور ہوں۔ مجھے مت
ریاض کے کانوں میں آوازیں آرہی تھیں۔ گیارہ۔ بارہ۔ تیرا
ری تھی۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے۔ نعرۂ تکبیر اللہ اکبر
، ریاض کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں پر لڑھک آئے
س کی خوفناک آوازیں اسے صاف دکھائی دے رہی
۔ غصے سے اُن کی مونچھیں تھرتھرا رہی تھیں۔ وہ ماموں

جان سے کسی بات پر جھگڑ رہے تھے ۔ ماموں جان کے ہاتھ میں کوئی
کاغذ تھا جو وہ ان سے چھیننا چاہتے تھے۔ کچھ زمینوں کا جھگڑا معلوم
ہوتا تھا۔ ریاض ایک کونے میں دبکا کھڑا تھا۔ اس کی امی کمرے
میں جا کر چھپ گئیں پھر چچا الیاس نے ماموں جان کو زمین پر گرا
دیا اور ان کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور کاغذ چھیننے کی کوشش
کرنے لگے اور انھیں مارنا شروع کر دیا۔ ماموں جان نے گھبرا کر وہ
کاغذ منہ میں رکھ لیا، چچا الیاس زبردستی ان کا منہ کھولنے کی کوشش
کرتے رہے۔ مگر ان کو ناکامی ہوئی۔ ماموں جان نے وہ کاغذ نگل
لیا...... چچا ان کے حلق میں انگلیاں ڈال کر اسے نکالنے کی کوشش
کرتے رہے جس سے ماموں جان کو الٹی ہو گئی ـــــــ چچا نے
منہ پر ایسا گھونسہ مارا کہ ان کے منہ سے خون بہنے لگا ـــــــ

"مجھے نہ مارو ـــــ مجھے نہ مارو ـــــ میں بے قصور ہوں۔
ریاض کے کانوں میں برابر آواز آرہی تھی ـــــ مگر گنتی جاری رہی۔
کوڑے لگانے والا چند قدم ہٹتا۔ کوڑا ہوا میں لہراتا، فضا میں
ایک ارتعاش پیدا ہوتا۔ لاؤڈ اسپیکر سے چیخ سنائی دیتی
پھر سسکیوں کی آواز آنے لگتی۔ ریاض پر ایک عجیب کیفیت
طاری ہوتی جا رہی تھی۔ اسے یاد آرہا تھا کہ اس کی چچی نے بھی چچا
الیاس کے ظلموں کی تاب نہ لا کر دم توڑ دیا تھا۔ ریاض بھی چچی
کے جنازے کے ساتھ ساتھ قبرستان گیا تھا اور اس نے اپنی مظلوم
چچی کو قبر میں اترتے دیکھا تھا۔ اور چچا کو یہ کہتے بھی سنا تھا ـــــ
"ہائے بیچاری بڑی ہی نیک عورت تھی۔" اور بس ـــــ پھر
گھر میں وہ اس کی ماں اور چچا الیاس رہ گئے۔

اور جس روز اس کے چچا نے اس کی ماں سے شادی کی اس
روز شاید پہلی مرتبہ اس نے چچا الیاس کو ہنستے دیکھا، اور اس روز اسے
ایسا لگا جیسے انہونی ہو گئی۔ مگر ان کی یہ ہنسی بھی بس تھوڑی ہی
دیر کی تھی۔ چند دنوں میں چچا نے ریاض کی ماں کے ساتھ بھی وہی
سلوک کرنا شروع کر دیا جو وہ چچی کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ وہ بیچاری
دن رات گھر کا کام کاج کرتی، کھانا پکاتی، برتن دھوتی لیکن

جب کھانا چچا کے سامنے رکھا جاتا تو عموماً وہ غصے میں برتن اٹھا کر پھینک دیتے۔ انھیں ریاض کی ماں کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیز پسند ہی نہ آتی تھی — ریاض راتوں کو اکیلے کمرے میں بیتال کے رونے کی آوازیں سنا کرتا۔ اسے تنہائی سے ڈر بھی لگتا تھا۔ جاڑوں کی راتوں میں وہ جب بھی لحاف سے منہ نکالتا تو اسے چچا کی سرخ سرخ آنکھیں اندھیرے میں چمکتی دکھائی دیتیں اور وہ خوف زدہ ہو کر منہ ڈھک لیتا۔

ستراہ — اٹھارہ۔ انیس۔ بیس۔ لوٹنے برابر لگ رہے تھے۔ اب مولا دار کی آواز بھی آنی بند ہو گئی تھی۔ صرف کراہ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ چچا الیاس ریاض کو بلیٹ سے مار رہا ہے ..... "تو آوارہ ہو گیا ہے۔ اسکول سے بھاگ جاتا ہے۔ اور آج گوشت بھی لینے نہیں گیا۔ " ریاض اسے بتانا چاہ رہا تھا کہ وہ گیا تھا مگر دوکان بند تھی مگر چچا اسے مارے جا رہا تھا اور وہ برابر کہہ رہا تھا "دکان بند تھی۔ مجھے مت مارو۔ مجھے مت مارو۔" پھر بیہوش ہو کر گر پڑا اور اس کے بعد کیا ہوا اسے کچھ یاد نہیں —

اور پھر ایک روز چچا الیاس نے ریاض کی موجودگی میں غصے کے عالم میں اس کی ماں کو چھت سے دھکا دے دیا، وہ نیچے گری اور فوراً ہی مر گئی۔ اس وقت الیاس کی آنکھیں ریاض کو اتنی سرخ نظر آئی تھیں کہ وہ سمجھا شاید ان میں خون اتر آیا ہے۔ اس کی ماں کے مرتے ہی پڑوسی جمع ہو گئے۔ گھر میں ایک کہرام سا مچ گیا اور ذرا ہی دیر میں پولس ان کے دروازے پر پہنچ گئی۔ الیاس کے پڑوسی نے جو برابر والی چھت پر اس وقت موجود تھا، الیاس کو دھکا دیتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور جا کر پولس کو اطلاع دیدی تھی۔ اور آج چچا الیاس کی جو دھراہٹ ختم ہو گئی تھی اور اس کی لمبی لمبی کالی مونچھوں کی چڑھی ہوئی نوکیں نیچے لٹک گئی تھیں —

جس وقت پولس والے الیاس کو ہتھکڑی پہنا کر لے جا رہے تھے، ریاض کو نہ معلوم کیا ہوا وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گیا اور چیخنے لگا " انھیں مت پکڑو۔ انھیں مت پکڑو۔ اماں تو چھت سے گر گئی ہے۔ انھیں مت لے جاؤ۔ ان کو کیوں پکڑ رہے ہو۔ انھیں نہ لے جاؤ میں اکیلا رہ جاؤں گا —"
مگر یہ لڑکپن کی باتیں تھیں۔ اب تو اس نے زندگی کا بہت سا سفر طے کر لیا تھا۔ لیکن وہ آج بھی اکیلا ہے — اس وقت بھی اکیلا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اتنا بڑا مجمع ہے — مگر میں — میں پھر بھی اکیلا ہوں —"

گنتی جاری ہے۔ اکیس.. بائیس.. تیئیس... اور جب کراہ کی آواز بھی آنا بند ہو گئی تو نہ معلوم ریاض کو کیا ہوا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دوڑ کر اس نے کوڑے لگانے والے کو پکڑ لیا اور چیخنے لگا — "اسے مت مارو — اسے مت مارو —" میدان میں بہت سے لوگ دوڑ پڑے اور اس کی آواز چیخوں میں دب گئی —

---

یہ خیال خام ہے ہو گا وہ میرا آشنا
غیر کو دیکھا ہے اکثر ہوتے اپنا آشنا

زلف دراز بن کے الجھتی رہی مدام
اک تارِ عنکبوت ہے، دنیا کہیں جسے

وہ بھی کہتے ہیں تو تسلیم ہے مجھ کو ماہر

مجھ سا دنیا میں نہیں کوئی برا میرے بعد

اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر مسیح الحق حزیں ہیں اور انہوں نے عرض مرتب، تاج پیامی نے عرض حال اور پروفیسر ذکی الحق نے "آہنگ غالب" کے تحت اس کتاب اور عارف صاحب کی شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ قطعۂ تاریخ تقیل دانا پوری نے لکھا ہے۔
کتابت، طباعت گوارا ہے۔

ڈاکٹر احمد سہیل (مظفر پور)
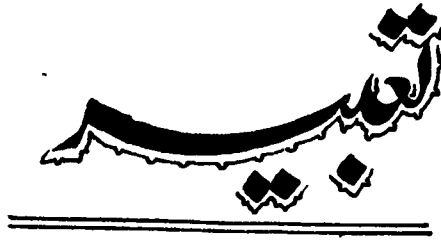
(سہیل شفق نے اپنا نام احمد سہیل تبدیل کر لیا ہے ۔ادارہ)

اس درخت کے مرجھانے میں بھی اسی باغباں کا ہاتھ ا۔جس نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے اسے سینچا تھا۔۔۔اس کے پتے پتے میں جان ڈالی تھی۔ بیج بونے کے وقت سے آج تک ں کی نشوونما کا خیال رکھا تھا اور ہر اندھی طوفان سے محفوظ رکھنے ں اپنی تمام تر قوتیں صرف کر دی تھیں۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ ،وا اسی کی وجہ سے اسی کے ہاتھوں آج اس درخت کا یہ حال ہوا تا کہ پتے پتے نے ٹہنیوں کو چھوڑ کر زمیں کی آغوش محبت میں ناہ ڈھونڈ لی تھی اور وہ درخت پورے طور سے لنڈ منڈ ہو گیا تا۔ اسے اس بات کا احساس تھا اور دکھ بھی۔۔۔ اور شاید ہی وجہ تھی، یہی احساس ندامت اور احساس گناہ تھا جس نے بور کیا تو اس نے اس درخت ہی سے نہیں بلکہ پورے باغ سے نارہ کشی اختیار کر لی اور ان سے منہ موڑ کر پتہ نہیں کن وادیوں میں گم ہو گیا کہ اب تک واپس لوٹ کر نہیں آیا اور نہ شاید کبھی ئے ۔۔۔ حالانکہ اس کے لئے نہ تو وہ درخت قصور وار یا ذمہ دار تھا اور نہ اس باغ کا کوئی دوسرا درخت۔ اس لنڈ منڈ درخت نے کبھی صرف شکایت زبان پر نہ آنے دی۔ لیکن مالی کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اس درخت پہ کیا بیت رہی تھی اور کون سے طوفان نے اس کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھی ۔۔۔ پھر اسے یاد آیا کہ کس طرح ایک ننھے سے پودے کو اپنا خون پلا پلا کر اس نے ایک جواں سال درخت میں تبدیل کرنے کی کوشش میں اپنے آپ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ اسی لئے اب اس کے جسم میں وہ پہلے جیسی توانائی باقی نہیں رہی تھی اور دن بہ دن نقاہت تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اب اس کے ہاتھ پاؤں میں اتنی طاقت نہیں کہ کسی دوسرے درخت کو سینچ کر ان کی جڑیں مضبوط کرے یا پہلے سے سینچے ہوئے ان درختوں کو کچھ اور دنوں تک سینچ سکے۔ ویسے بھی باغباں کو اس درخت سے کچھ خاص رغبت اور انسیت تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ شروع ہی سے یہ درخت جب کہ ایک ننھا پودا تھا، بہت ہی لاغر اور کمزور دکھائی دیتا تھا۔ اور اسی وجہ سے دوسرے درختوں کی بہ نسبت باغباں نے اس کی پرورش اور پرداخت میں خاص خیال رکھا اور اپنا زیادہ وقت اسی کی دیکھ بھال میں گذارا جس کی وجہ سے اس کی محبت کچھ زیادہ ہی گہری ہو گئی تھی ۔۔۔۔۔ یا پھر یہ وجہ رہی ہو کہ وہ اپنا عکس اس درخت میں دیکھتا تھا۔ جب بھی اس کی نظر درخت کے ہرے بھرے، سرخ اور گلابی پتوں پر پڑتی، اس کی نظروں کے سامنے اپنے اس وقت کا سراپا گھوم جاتا جب وہ بھی ٹھیک اسی طرح کا تھا۔

بات اس دن سے شروع ہوتی ہے۔ جب باغباں نے اپنے طور پر محسوس کیا تھا کہ اس درخت کا قد اب کافی اونچا ہو چکا ہے ـــ جڑیں زمیں کے اندر دور دور تک مضبوطی سے پیوست ہو چکی ہیں اور بانہیں لمبی ہو کر چاروں دشاؤں میں پھیل گئی ہیں ـــ اس نے درخت کو سینچ سینچ کر اس لائق بنا دیا تھا کہ اب وہ دنیا کے حوادث کے ہر سرد و گرم تھپیڑے کا مقابلہ آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے اور زمیں کی گہرائیوں سے اپنے لئے نمی حاصل کر سکتا ہے ـــ درخت کے نئے ہرے بھرے کونپلوں کو دیکھ کر اسے بے انتہا خوشی محسوس ہوتی تھی ـــ ایک طرح کی طمانیت کا احساس ہوتا تھا اور اس کے دوران خون کی رفتا کئی گنا زیادہ ہو جاتی تھی۔ اسے خوشی تھی کہ اس کے خون پسینہ سے سینچے ہوئے اس درخت میں اب پھل پھول لگنے کا وقت آگیا ہے ـــ لیکن اسے اس بات کا شک ہے اور افسوس بھی کہ شاید وہ اس درخت میں پھل پھول نہ دیکھ سکے کیونکہ وہ خود کئی ماہ سے اپنے اندر ایک عجیب طرح کا کھوکھلا پن ایک خلا پیدا محسوس کر رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے اس کی منزل قریب آ گئی ہو اور اس کے تمام ان دیکھے انجانے اور انجا ہے اس کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں ـــ اب وہ اپنے پاس آنے ہوئے ہر اس شخص سے اس درخت کے بارے میں کہتا اور ان سے مشورہ طلب کرتا جو اس کے اور اس کے باغ کے مخلص تھے۔ اس نے لوگوں سے مشورہ کیا تاکہ ان کی مدد سے ایسے انتظامات کر سکے اکوئی ایسا ٹھوس قدم اٹھا سکے جس سے اس درخت میں جلد سے جلد پھل پھول لگ سکیں ـــ اور لوگوں کے مشورہ کے مطابق اس نے درخت کے چاروں طرف ایک خوبصورت حصار قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا جس سے وہ دنیا کے سرد و گرم تھپیڑوں سے محفوظ رہ سکے۔ اس نے اینٹوں کی مدد سے اس درخت کے چاروں طرف ایک اونچی مضبوط اور خوبصورت باؤنڈری کھڑی کر دی ـــ کچھ لوگوں نے بتایا کہ اس باغ کے قریب والے گاؤں میں ایک بہت ہی خوبصورت سنگ مرمر کا ٹکڑا ہے جس کے اوپر ایک خوبصورت قیمتی کپڑہ پڑا ہوا ہے، اگر اسے اس باؤنڈری کے وسط میں لگا دیا جائے تو اس کی اور اس درخت کی خوبصورتی اور انفرادیت کئی گنا زیادہ بڑھ جائے گی۔ لیکن اس کا حاصل کرنا ذرا دشوار مرحلہ ہے کیونکہ اس کے چاروں طرف بہت سے خوبصورت مگر زہریلے سانپ ہر وقت اپنا پھن پھیلائے رہا کرتے ہیں اس کے علاوہ اس سنگ مرمر کے ٹکڑے کا مالک بھی اچھا خاصہ ذی حیثیت جوہری ہے جسے ہیروں کی بہت اچھی پرکھ ہے لیکن باغباں بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا ـــ اس نے اپنی جد و جہد جاری رکھی اور آخر ایک دن کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر بڑی دھوم دھام سے اس سنگ مرمر کے قیمتی ٹکڑے کو لا کر اس باؤنڈری کے عین وسط میں لگا دیا۔ اس ٹکڑے پر اب وہی حسین و جمیل قیمتی ریشمی کپڑہ پڑا ہوا تھا جو اس کا حصہ تھا ـــ کئی روز تک وہ دوسرے کاموں میں مشغول رہا اور جب اسے تھوڑی فرصت ملی تو اس کے دل میں اپنے اس خوبصورت درخت کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی جس کے لئے اس نے اتنی تگ و دو کے بعد وہ قیمتی اور نایاب سنگ مرمر کا ٹکڑا حاصل کیا تھا ـــ جب وہ درخت کے پاس پہنچا تو اسے سخت حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلے تو اس نے سمجھا کہ شاید وہ کسی دوسری طرف کسی اور درخت کے پاس آگیا ہے لیکن غور کرنے کے بعد اسے پتہ چلا کہ نہیں وہ کوئی دوسرا نہیں بلکہ وہی درخت ہے جس میں پھل پھول دیکھنے کی تمنا میں اس کے چاروں طرف اس نے ابھی دو چار روز قبل ایک خوبصورت باؤنڈری بنائی تھی۔ لیکن درخت کی حالت دیکھ کر وہ سوچ رہا تھا کہ دو چار ہی دنوں میں ایسا کیسے ہو سکتا ہے ـــ اتنی تبدیلی کیونکر ممکن ہے ـــ درخت جیسے بے جان ہو کر رہ گیا ہو۔ اس پہ

کسی بھی پتے کا دور، دور تک نام ونشان باقی نہیں تھا۔ در ہر جگہ کی کھال تنے کو چھوڑ چکی تھی جس سے اس کی ساخت بگڑ کر اتنی خراب ہوگئی تھی کہ وہ جذام کا کوئی مریض معلوم ہونے لگا تھا — شاید اسے ان خوبصورت مگر زہریلے سانپوں میں سے کسی نے ڈس لیا تھا جو ہر وقت اس سنگ مرمر کے ٹکڑے کے آس پاس اپنا پھن پھیلائے رہا کرتے تھے — لیکن اب بھی درخت کے ہونٹوں پر وہی پہلے جیسی مسکراہٹ چپکی ہوتی تھی — نہ جانے اس مسکراہٹ سے اس کا کیسا تعلق تھا۔

حسن رضا (پوریہ)

# قصہ پانچ حروف کا

الکشن ــــ پرچے / پوسٹر / جھنڈے / بینڈبل / اعلان / اجلاس / تقاریر / جلوس / سرگرمی / وعدے / امیدیں / یقین / بے روزگاری / بیماری / بھوک / افلاس ........

جماعت / اچھی / بری / امیدوار / لائق / نالائق / اپنا / پرایا / علاقائی / غیر علاقائی / بھلا / برا / محنت کش / غنڈہ / محبوب / ہر دل عزیز / ہمدرد ........

اعتراض / جھوٹ / فریب / دھوکہ / دغابازی / ناکارہ / بالغ / نابالغ / مکاری / بے شرم / عیار / مصیبت / قسمت / پریشانی / الجھن / تھکن ........

بگاڑ / ووٹ / انکار / اقرار / پیروی / رسائی / اختلاف / کشاکش / اقتدار / دفعہ ۱۴۴ / نعرے / لڑائی / افراتفری / ہاتھاپائی / تماشہ / تماش بین ........

دوست / دشمن / مقابلہ / کمزور / طاقتور / قانون / نفرت / محبت / فیصلہ / ہار / جیت / سکون / بے سکونی / اطمنان / بے چینی / شراب / شباب / مفلسی / بے چارگی ........ !

محبوب اقبال فاران (پورینی)

# نئی صبح کا سفر

"مرچی کی بچی، دال تیری کچی۔ آٹے بین لون، تجھے پوچھے گا کون؟"

ارشی کہہ رہا تھا اور فری کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا اچانک فری نے زمیں پر پڑے اینٹ کے ایک ٹکڑے کو اٹھایا اور ارشی پر دے مارا۔ ارشی نے بچنے کی کوشش کی لیکن ڈھیلا پیشانی پر بیٹھ ہی گیا بس پھر کیا تھا خون کا آبشار بہہ نکلا۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ ارشی کے ابو کو خبر ہوئی تو وہ گھبرائے ہوئے آئے اور بینڈیج اور انجکشن میں لگ گئے۔ تب ماں کا خیال فری کی جانب ہوا اور انہوں نے اسے پیٹ ڈالا۔ ارشی کے ابو نے اسے گود میں اٹھا کر چمکارا اور سمجھایا۔ یہ تھا بچپن کا ایک یادگار واقعہ۔

ارشی اور فری دونوں ہم عمر تھے۔ فری ارشی کی پھوپھی زاد بہن تھی۔ دونوں بے حد شریر تھے لیکن ارشی زیادہ ہی شریر تھا اور اسکی شرارتوں کا نشانہ اکثر و بیشتر فری ہی بنتی تھی۔ ارشی کی پیشانی کا یہ زخم ایک ایسی ہی شرارت کی نشانی تھا۔ چند ہی دنوں بعد وہ اپنے پرانے فارم میں آگیا اور فری سے دوبارہ دوستی ہوگئی۔ شب و روز یوں ہی گذرتے چلے گئے۔ آہستہ آہستہ دونوں شباب کی سرحد میں قدم رکھ چکے تھے۔ فری تو سنجیدہ ہوگئی مگر ارشی ہنوز روز اول جیسا تھا۔ لیکن اب دونوں میں لڑائی کم ہوا کرتی تھی۔ ایک روز ارشی کالج سے واپس ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایک ڈبہ تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے آواز دی ــ "فری! او فری!! دیکھ میں تیرے لئے کیا لایا ہوں۔"

"کیا لے کر آیا ہے بیٹے؟" ارشی کی دادی ماں نے دریافت کیا۔ لیکن ارشی انہیں گول مول سا جواب دیتے ہوئے فری کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ فری کمرے سے نکل رہی تھی کہ ارشی پہنچ گیا۔ اس نے ارشی کے ہاتھ میں ایک خوبصورت ڈبہ پیک کیا ہوا دیکھا تو بیحد متحیر ہوئی اور ساتھ ہی خوش بھی کہ آج یہ پہلا موقع تھا جب ارشی اس کے واسطے کوئی تحفہ لایا تھا۔ اس نے جلدی سے ڈبہ لیا اور وہیں کھولنے لگی۔ گھر کے سارے بچے بھی جمع ہوگئے تھے۔ ارشی بھی ایک جانب کھڑا فری کو پر شوق نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ فری نے جیوں ہی ڈھکن اٹھایا، ڈبہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ڈبے سے ایک سانپ کا منہ جھانکنے لگا۔ سبھی بچے چلاتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے مگر فری وہیں دیوار سے لگ کر چلانے لگی۔ لیکن ارشی؟ ارشی تو وہیں پر کھڑا قہقہے لگا رہا تھا۔ بعد میں اس نے بتایا کہ یہ سانپ مردہ ہے اور وہ کالج کی لیبورٹری سے لایا ہے۔ اس کے باوجود ارشی کو خوب ہی ڈانٹ پڑی۔

اس واقعے نے فری کے دل میں ارشی کے لئے نفرت کے جذبات پیدا کر دیئے۔ اس نے ارشی سے بات چیت بھی بند کر دی۔ لیکن ارشی کی سیماب صفت طبیعت میں چین کہاں؟ فری کو چھیڑنا، ستانا، ڈرانا، آتے جاتے سر پر ٹھونگیں لگانا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اٹھارہ انیس برس کا ہونے کے بعد بھی سنجیدگی تو اسے چھو کر بھی نہیں آئی تھی۔

ایک روز فری کو موسمی بخار آگیا جو بد پرہیزی کی وجہ سے میعادی بخار میں تبدیل ہوگیا۔ یوں تو پریشان سبھی لوگ تھے مگر ارشی نے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا اور مکمل طور پر فری کی تیمارداری میں لگ گیا۔ تب فری کو احساس ہوا کہ بظاہر لاابالی اور غیر سنجیدہ نظر آنے والا یہ لڑکا کتنا حساس اور ہمدرد ہے۔ ارشی نے

[illegible] کے بہت جتن کئے اور ان سب باتوں نے فری کا دل موہ لیا۔ نفرت کے جذبات محبت کی نیرنگیوں میں بدل گئے اور فری دل ہی دل میں ارشی کو چاہنے لگی۔

[illegible] کے دن تھے اوائل ماہ کا چاند ضوفشانی کر رہا تھا۔ گھر کی عورتیں آنگن میں بیٹھی اپنی روایت کی پاسداری کر رہی تھیں ارشی بھی وہیں لیٹا اپنی امی سے سر میں تیل لگا دینے کو کہہ رہا تھا مگر امی گفتگو میں بڑی تندہی سے مصروف تھیں۔ ارشی کے مسلسل اصرار پر جھلا کر انہوں نے فری سے کہا کہ وہ ارشی کے سر میں تیل دے دے فری کو گویا دونوں جہان کی دولت مل گئی وہ فوراً اٹھی اور تیل کی شیشی لیکر ارشی کے سرہانے بیٹھ گئی۔ ارشی چند منٹ تو خاموش رہا۔ پھر چپکے سے ہاتھ بڑھا کر فری کی لٹکتی لمبی چوٹی کھینچ لی۔ پھر بار بار یہی حرکت کرنے لگا لیکن فری خاموش رہی۔ ارشی کو حیرت ہو رہی تھی اور وہ ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک فری نے ایک سوال کر کے اس کو چونکا دیا۔ فری کہہ رہی تھی: —

" ارشی تمہارے ساتھ کتنی لڑکیاں پڑھتی ہیں؟ "

" بہت سی۔" ارشی معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

" سب سے خوبصورت لڑکی کون سی ہے؟ "

" ایک تو ہے۔ لیکن تمہارے پوچھنے کا مقصد کیا ہے؟ "

" کچھ نہیں یوں ہی۔ اچھا اس سے دوستی بھی ہے؟ "

" یوں تو سب سے ہے لیکن اس سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہوں۔" ارشی اب بھی مسکرا رہا تھا۔

" ایک بات سچ سچ بتاؤ۔ وہ تمہیں پسند بھی ہے؟" جملے کا دوسرا حصہ فری نے آہستہ سے ادا کیا۔ کیونکہ بغل میں ہی دادی امی وغیرہ بیٹھی تھیں۔

" سچ کہوں گا تو برا مان جاؤ گی۔ کیونکہ تم بھی تو مجھے..."

" نہیں نہیں۔ میں بھلا کیوں برا ماننے لگی مجھے تم سے کیا ہے؟ "

" ارے چھوڑو بھی — یوں تو وہ میری ساری باتیں سمجھتی ہے لیکن پیار کی باتیں کرتا ہوں تو انجان بن جاتی ہے اور...."

فری زیادہ نہ سن سکی اور اٹھ گئی۔ وہ یہ سمجھے ہوئی تھی کہ ارشی بھی اسے چاہتا ہوگا لیکن آج کس صفائی سے اس نے دوسری لڑکی کی تعریف کرتے ہوئے اپنی محبت کا اعتراف بھی کر لیا تھا۔

دوسرے دن ارشی کالج سے واپس آ کر فری کے کمرے میں جا گھسا۔

فری بیٹھی ہوئی تھی آج اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور نہ ہی کالج ہی گئی تھی بلکہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے دن بھر پڑی رہی تھی ارشی نے اچانک پہنچ کر اسے چونکا دیا۔ فری جلدی سے آنکھیں پونچھتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ حالانکہ ارشی نے آنسو دیکھ لئے مگر چشم پوشی کر گیا۔

" فری میرا ایک کام کر دوگی؟ "

" کہو، کیا کام ہے؟ "

" رات جس لڑکی کا میں نے تذکرہ کیا تھا اسے ایک خط لکھ کر دینا چاہتا ہوں۔ زبانی کہنے میں شرم بھی آتی ہے اور کھل کر کہہ بھی نہیں سکوں گا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

" ٹھیک ہی ہے" فری نے دھیمی آواز میں کہا۔

" اچھا کاپی اور قلم اٹھاؤ اور میں جو کہوں لکھتی جاؤ۔"

فری کا دل چاہ رہا تھا کہ ارشی کو دھکے دے کر کمرے سے باہر نکال دے اور خوب جی بھر کر رو دے۔ لیکن دل پر پتھر رکھ کر اس نے ارشی کے حکم کی تعمیل کی۔ ارشی بتانے لگا —

" جانِ ارشی! لیکن فری ڈیر یہ تو فرسودہ طریقہ ہوا، کوئی نیا طریقہ بتاؤ۔"

" میں نہیں جانتی۔ نام ہی لکھ دو۔"

" اچھا چھوڑو القاب وغیرہ کا چکر۔" ارشی بولا اور پھر لکھوانے لگا۔

" ...... میں بہت دنوں بلکہ برسوں سے تمہارے قریب ہوں۔ بیشتر وقت تمہاری رفاقت میں بسر ہوتا ہے لیکن میں آج تک یہ نہیں جان سکا کہ کس خوش نصیب کے نام پر تمہارے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں اور عارض کا رنگ گلگوں

(بقیہ صفحہ ۲۳ پر)

رام لعل (لکھنؤ) سفرنامہ پاکستان (چھٹی قسط)

# زرد پتوں کی بہار

## انتظار حسین

منیشنل سنٹر میں انتظار حسین کے ناول "بستی" پر ہونے والی تقریب شروع ہو چکی تھی ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مشعود اشعر اپنا مقالہ پڑھنے میں معروف تھے۔ میری آمد کی وجہ سے ایک آدھ منٹ کے لئے انھیں رک جانا پڑا کشور ناہید نے میرے پاس آکر میرا سواگت کیا۔ اور مجھے آگے دوسری قطار کی ایک خالی کرسی پر بٹھا کر ڈائس پر لوٹ گئی مشعود اشعر نے اپنے ہم عصر افسانہ نگار پر پورے اپنا مقالہ پڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے ڈائس پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو پہچاننے کی کوشش کی۔ انتظار حسین کو تو میں نے فوراً پہچان لیا۔ ہم دونوں نے ہاتھ اٹھا کر ایک دوسرے کے ساتھ علیک سلیک بھی کر لی۔ آغا سہیل کو بھی میرے برابر کرسی مل گئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا جلسے کی صدارت آفتاب احمد کر رہے ہیں۔ اور ان کے پاس تیسرے شخص سویرا کے مدیر صلاح الدین محمود بطور پبلشر براجمان ہیں۔ میں لاہور کے اہل قلم حضرات کے اتنے بڑے اجتماع میں آزادی کے بعد پہلی بار شریک ہوا تھا۔ اسی لئے میں مسرت اور جذبات کی ملی جلی کیفیت میں مشعود اشعر کے خیالات سننے کی کوشش کرنے لگا۔

کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ تاریخ ان لوگوں کے لئے اپنے آپ کو دہراتی ہے جو اُسے فراموش کر دیتے ہیں۔ اور ناسٹیلجیا انتقام کی ایک شکل ہے اور انتقام ناسٹیلجیا کی دونوں صورتوں میں ہم کسی ایسی شئے کے متلاشی ہوتے ہیں جو ہمیں پسپائی سے بچائے۔ جس وقت ہم وہ زمانے اور وہ مقام یاد کرتے ہیں جہاں ہم محفوظ تھے اور کہتے ہیں عمر پہلے جو زیر قدم تھیں اب وہ گلیاں دل میں ہیں۔ تو در اصل ہم اپنے رحم اور ظالم حال سے انتقام لے رہے ہوتے ہیں۔

**آپ بھی کچھ کہیں گے:۔**

کشور ناہید نے میرے پاس آکر پوچھا آپ بھی کچھ کہیں گے؟ میں نے جواب دیا ناول تو میں نے نہیں پڑھا۔ انتظار حسین کی افسانہ نگاری کے بارے میں ضرور چند جملے کہہ دوں گا۔ لیکن ابھی کچھ اور لوگوں کو بھی سننا چاہتا ہوں۔ انور سجاد کی اسٹیج پر آمد لاہور کے بعض لوگوں کو پریشان کر سکتی ہے اس کا احساس مجھے ان کے یکایک پہلو بدل لینے سے ہوا بقول شخصے وہ فقرے مارنے اور جملے پھینکنے میں بڑا ماہر ہے۔ اس نے اپنے مقالے کے آغاز میں ہی نقادوں کے آئندہ استفادے کے لئے کچھ ضروری نوٹس مہیا کر دیئے اور پھر انتظار حسین کی ماضی پرستی پر یوں تبصرہ کیا —— انتظار کی طبیعت میں جو گر یہ ہے وہ ناول میں پوری طرح کارفرما ہے۔ اس میں وسطی ہند کی تہذیب کو وادیٔ سندھ کی تہذیب میں پیوست کرنے کی کوشش بھی معلوم ہوتی ہے۔ نشاۃ ثانیہ کا خواب خالی خولی تذکرہ اور یاد ماضی سے پورا نہ ہوگا۔ اور نہ ہی ماتم کرنے، مایوسی پھیلانے یا بے عمل ہونے کا کوئی فائدہ ہے۔ جہاں تک فن کا تعلق ہے فن صرف حقیقت کا عکاس بھی نہیں ہو سکتا بلکہ حقیقت کو جنم بھی دیتا ہے۔ یہ بھی حیرت انگیز بات ہے۔ کہ ہم تنقیدیں

سال بعد بھی اپنے تشخص کی تلاش میں ہیں لیکن یہ تلاش انہی
ہے جو ذمہ داریوں سے فرار کا بہانہ چاہتے ہیں لیکن
اس فرار یا بدلتا انداز کے بجائے معاشرتی اور معاشی
نظام کی تبدیلی کی جدوجہد کرنی چاہیئے۔ لیکن حقیقت
یہ ہے کہ انتظار بہت کائیاں ہے۔ وہ اپنی خوفزدگی
کو سکوت میں بدل دیتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ اس کی بے
کو زبان سمجھ لیا جائے۔

جیلانی کامران نے ناول کے ہر کردار کو قوت ارادی
سے محروم بتایا اور اردو کی امریکی ادیبہ فرانسیس پریچیٹ
نے امریکہ میں انتظار حسین پر ہونے والے کام کا مژدہ سنا
کشور ناہید نے جب مجھے بلانے سے پہلے یہ کہا
آج ہمارے درمیان ایک ایسا افسانہ نگار آیا ہے جسے ہم
تیس تین سال سے پڑھتے آ رہے ہیں۔ تو میں قدرے جذباتی
ہو گیا۔ میں جب ڈائس پر گیا تو لاہور کے اہل قلم واقعی
زور زور سے تالیاں بجا رہے تھے۔ یہ وہ گڑگڑاہٹ
جو اپنے وطن میں ہوتے ہی میرے کانوں میں پہونچ رہی تھی۔
میرے اندر عجیب سی کیفیت پیدا کر رہی تھی میرے ایک طرف
انتظار حسین تھے جس کا تمام تر افسانہ نگاری میری ہم عمر
بنی رہی تھی۔ اور اس کے وہ سارے تجربات بھی میرے
سامنے تھے، جو اس نے افسانے کے فارم کو اسلوب
کو بدلنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ میں اس بات سے بھی
باخبر تھا کہ وہاں اس کے ایسے نقاد موجود تھے جو اس کی
ماضی پرستی کو ہندوستان کی محبت سے جوڑ دیتے تھے۔
جس سے دو قومی نظریہ کو ضعف پہنچا تھا۔ میں نے پہلے تو
اس بات کے لئے معافی مانگی کہ میں گلا خراب ہونے کی
وجہ سے ٹھیک طرح سے بول نہیں پا رہا تھا۔ اور اس
سلسلے میں اس خدشے کا بھی اظہار کر دیا کہ شاید بزرگ
منزا نے انور سجاد کو میری پاکستان یاترا کے بارے میں پہلے
سے لکھ دیا تھا کہ میں وہاں بولنے نہ پاؤں۔ اسی لئے
انور سجاد نے مجھے جو دوا دی تھی اس سے مجھے ابھی تک
کوئی فائدہ نہیں پہونچ رہا تھا۔ حاضرین کی ہنسی کے درمیان
میں نے انتظار حسین کے دفاع میں کہا۔ میں ماضی کے اس کرب
سے واقف ہوں جسے انتظار حسین اپنے شعور کا حصہ بناتے
ہوئے ہیں۔ میں تینتیس برس کے بعد لاہور لوٹا ہوں اور
میرے اندر وہ شہر ایک بیدار ہو گیا ہے۔ جو درحقیقت
کبھی سو چا ہی نہیں تھا۔ میں اردو افسانے میں انتظار کے
اس کنٹری بیوشن سے انکار نہیں کر سکتا کہ اسی نے ہمیں
سکھایا ہے کہ ماضی کو فن کی سطح پر کس طرح پیش کیا جائے
اس ضمن میں وہ ہمارے آگے آگے چل رہا ہے۔ لیکن
میں اسے بقول راجندر سنگھ بیدی اردو افسانے کا
چودھری بننا پسند نہیں کروں گا۔ کیونکہ چودھری کو ادب میں
یا تو طاق پر جگہ دے دی جاتی ہے یا پھر اسے خود اپنے
وجود کے لئے لڑتے رہنا پڑتا ہے۔ حیرت ہے کہ انتظار
اپنی اس حیثیت سے باخبر ہوتے ہوئے بھی کسی کے ساتھ
لڑتا ہوا نظر نہیں آتا ہے۔ اس کے نقادوں نے اس کے گرد
ایک قلعہ سا تعمیر کر لیا ہے۔ خود اپنی شناخت کے لئے
اس کی حفاظت پر مجبور ہو گئے ہیں۔ انتظار حسین کو چاہیئے
کہ وہ خود قلعہ کو توڑ کر ایسے نقادوں کے حصار میں سے
باہر نکل آئے جن کی تنقیدیں اس کے ذہن کو چھوتی نہیں
ہیں۔ تعریف کا تجربہ کرنا بھی خود ادیبوں کی ذمہ داری ہوتی
ہے۔

## محبت بھائی

جلسہ ختم ہونے کے بعد میں کتنے ادیبوں سے ملا اس کی
تعداد مجھے نہیں معلوم۔ لیکن مجھے بے حد خوشی محسوس
ہو رہی تھی کہ تینتیس سال پہلے جب میں نے اس شہر کو چھوڑا
تھا تو قریب قریب نیا اور اجنبی تھا۔ اب وہاں مجھے سب
لوگ جانتے تھے۔ عبادت بریلوی نے تو مجھے کھینچ کر
گلے سے لگا لیا۔ اور ابھی ان سے بات بھی نہ کر پا

تھا کہ بے شمار لوگ آگے بڑھ آئے۔ طاہر تونسوی۔ صلاح الدین محمود۔ انتظار حسین، جیلانی کامران، امجد اسلام امجد، صفدر میر، شعود اشعر، مظہر الاسلام، یوسف کامران، شہرت بخاری، امجد حسین، عبداللہ ملک، منتظر حسین تارڈ، منور بھائی، ذوالفقار احمد تابش، جیلانی کامران، سہیل احمد خان، خدیجہ مستور، ظہیر بابر، سائرہ ہاشمی، سجاد رضوی، قائم نقوی، سلیم اختر، اظہر جاوید، محمود احمد قاضی، سید قاسم محمود، عطاالحق قاسمی، گلزار وفا، محمد مشتاق، غالب احمد، حسن رضوی، نکہت حسن اور کشور ناہید تو پھر کہیں تھی، ادھر سے اُدھر بڑی بے تابی سے آتی جاتی پھرتی تھی۔ سب کو چائے پلاتی پھرتی تھی، اور پھر اس نے مجھے سب سے الگ کرکے اپنے دفتر میں پہنچا دیا۔ جو اسی فلور کے ایک کونے میں بنا ہوا ہے۔ وہاں کچھ ادیب اور بھی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ فیض احمد فیض کی بیٹی منیزہ خدیجہ مستور بیگم انتظار حسین اور صلاح الدین محمود۔ ایم آر کا بجو نے وہیں آکر مجھ سے پوچھا کہ میں میانوالی کب پہنچ رہا ہوں۔ تاکہ وہ وہاں شہر کے لوگوں کو میری آمد کی خبر دے سکیں۔ اس نے کہا کہ پورا شہر میرے استقبال کے لیے اسٹیشن پر امڈ پڑے گا۔ میں بڑی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ میرے شہر کا ہی ایک نوجوان تھا۔ جسے اخبارات سے اور دوستوں کے نام بھیجوائے خطوط سے میری لاہور میں آمد کی اطلاع ہو چکی تھی وہ کہہ رہا تھا، میں آج رات کو میانوالی جا رہا ہوں۔ میں نے اٹھ کر اُسے گلے سے لگایا اور کان میں کہہ دیا میں چند روز میں اس کا فیصلہ کرونگا اور تار کے ذریعہ اطلاع دے دوں گا۔

وہ شکریہ ادا کرکے اور مسکراتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

ڈاکٹر آغا سہیل نیچے مجھے اور لوگوں سے ملانے کے لئے باہر لے گئے۔ اور پھر وہاں سے طاہر تونسوی اپنے دوستوں سے ملانے کے لئے کھینچ لے گئے۔ جن چہروں کو میں نے کبھی دیکھا نہ تھا یا کبھی کبھار ان کی تصاویر ہی رسالوں یا کتابوں میں دیکھنے کو مل جاتی تھیں، اب انھیں اپنی آنکھوں سے اپنے بہت قریب کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔ وہ ویسی ہی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ لیکن میری آنکھیں احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب، محمد طفیل اور احرار نقوی (لاہرہوم) انصار عبدالعلی کو اور کئی دوسرے لوگوں کو تلاش کر رہی تھیں۔ پتہ نہیں میں نے کسی سے پوچھا اور کسی نے مجھے جواب بھی دے دیا "قاسمی صاحب آئے تھے آپ سے ہی ملنے کے لئے۔ لیکن ہال بھرا ہوا دیکھ کر پیچھے سے لوٹ گئے۔"

آغا سہیل میرے قریب آئے تو میں نے انصار کے بارے میں پوچھا۔ بولے "اس وقت وہ ٹی وی پر نیوز سنا رہے ہونگے" کشور ناہید مجھے بھیڑ میں سے نکال کر باہر لے گئی اور اپنے میاں یوسف کامران کی موٹر میں دھانس دیا۔ اسی میں صلاح الدین محمود اور مشعود اشعر پہلے سے موجود تھے۔ وہ آغا سہیل کو بھی ڈھونڈ کر لے آئی اور موٹر گلبرگ کی طرف دوڑنے لگی۔ رات پوری طرح جگمگا رہی تھی لاہور کی اس جگمگاہٹ سے میں پہلے ہی سے واقف تھا۔ لیکن اب یہ کچھ زیادہ ہی دلنشیں اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ سڑکیں اور زیادہ فراخ اور سایہ دار ہو گئی تھیں۔ لاہور شہر دہلی کی طرح پھیل گیا تھا جدھر جدھر اس کے سینگ سمائے تھے۔ خدا جانے کتنے کھیت اور گاؤں نگل لئے تھے۔ شہروں کا اژدہا ایسے ہی آگے ہی آگے بڑھتا جاتا ہے۔

## سہگل کے پیرسی

صلاح الدین محمود کو اپنے گھر سے پاؤڈروں کا تسلہ اٹھانا تھا جو ان کی بیگم نے خاص طور پر کشور ناہید کے یہاں ہونے والی دعوت کے لئے تیار کر رکھے تھے۔ راستے میں صلاح الدین صاحب سہگل اور نیو تھیٹرس کی ان فلموں کا ذکر کرتے گئے۔ جنھیں وہ اور میں اپنی نوجوانی کے زمانے میں دیکھ چکے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے تو کئی فلمیں لاہور میں ہی رہتے ہوئے دیکھی تھیں۔ ۱۹۳۸ء اور ۱۹۴۷ء کے

درمیان لیکن انھوں نے علی گڑھ اور دہلی میں بھی کچھ دیکھی تھیں کچھ ایک کے صرف نام سن رکھے تھے۔ انہیں سہگل اور پنکج ملک کی آواز اور آر سی بورال اور تمربرن کا میوزک بہت پسند تھا۔ انھوں نے بتایا لاہور میں ایک شخص ہے جو ہر سال ۱۸ جنوری کو سہگل کی برسی مناتا ہے۔ اور کئی دوستوں کو بلاتا ہے۔ اس کے پاس سہگل کا ہر ایک گراموفون ریکارڈ اور چھپی ہوئی ہر ایک خبر موجود ہے۔ کوئی شخص اگر اسے کوئی سہگل کے بارے میں نئی کتاب یا اخبار کا چھپا پرانا تراشا دے جائے تو وہ منہ مانگے داموں پر خرید لیتا ہے۔

تھوڑی سی دیر کے لئے ہم لوگ صلاح الدین محمود صاحب کے گھر گئے تو وہ ہمیں اپنے اسٹیڈی روم میں لے گئے۔ جو ہزاروں کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہندو ازم کے علاوہ دنیا بھر کے مذاہب پر ان کے پاس کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ تیرہویں صدی کی تازہ ترین کتابیں انکی ٹیبل پر رکھی تھیں۔ انھوں نے اپنی بیگم سے بھی ملایا اور پھر ہم اقبال ٹاؤن کی طرف چل پڑے۔

اقبال ٹاؤن میں کشور ناہید اور یوسف کامران رہتے ہیں۔ اپنے ایک خوبصورت اور اسٹائلش مکان میں وہاں چالیس کے قریب وہی ادیب اور شاعر جمع تھے جن سے میں نیشنل سنٹر میں تھوڑی دیر پہلے مل چکا تھا ان سب سے پھر سے ملانے میں نہ کشور ناہید نے کوئی قباحت سمجھی نہ ہی میں نے۔ کشور نے اپنے دو جواں سال بیٹوں سے بھی ملایا۔ جو ڈرائنگ ٹیبل پر کھانا لگواتے پھرتے تھے۔ جہاں چالیس کے قریب اہل قلم جمع ہوں۔ وہاں کسی ایک موضوع پر کیونکر بات ہو سکتی تھی۔ میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے لئے ہر شخص سے مل لیتا تھا۔ انتظار کی بیوی نے بتایا۔ وہ بنارس کی رہنے والی ہیں۔ میں نے ان دونوں سے کہا جب وہ دہلی آرہے ہیں۔ تو لکھنؤ اور بنارس بھی ہو لیں۔ انتظار کی خواہش تو ایلورا اور اجنتا

اور پورا ہندوستان گھومنے کی تھی۔ فرانسس پریچٹ امریکا کر آنے والی ایولین اور لینڈا سے واقف تھیں۔ عبداللہ ملک احتساب کے مدیر ہیں۔ اور مشہور دانشور۔ ایسا لگا وہ ایسے اجتماعات میں صرف زور زور سے قہقہے ہی لگاتے ہیں۔ فیض صاحب کی بیٹی منیزہ کسی تعلیم گاہ میں پڑھاتی ہیں۔ پہلے تو منور بھائی کی مزاحیہ شاعری سے محظوظ ہوتے رہے پھر جب خواتین نے فیض کی نظمیں مل کر گائیں تو محفل کا رنگ ہی بدل گیا۔ انور سجاد بھی اس وقت تک آچکے تھے۔

اس محفل میں میں نے کشور ناہید کو بڑے فراٹے سے پنجابی بولتے ہوئے سنا۔ یہی یقین ہوا کہ وہ جنم سی پنجابی ہیں۔ لیکن انھوں نے بتایا وہ دراصل بلند شہر کی ہیں۔ پنجابی کو انھوں نے مادری زبان کی طرح قبول کر لیا ہے۔

رات ایک بجے آغا سہیل اور میں واپس آئے۔ انور سجاد کی گاڑی میں اب یہ ناممکن تھا کہ کچھ دیر انور سجاد کے ساتھ بیٹھتے اور افسانوں پر بات کرتے۔ اس بات کو پھر کسی شب کے لئے اٹھا رکھا گیا۔

(باقی آئندہ)

## بقیہ نقش ناتمام

سمجھتا ہوں، اور ان کی آواز کو اپنے عہد کی آواز مانتا ہوں اس لئے فطری طور پر میں ان کی شاعری کو فن کے جدید تر تقاضوں سے ہم آہنگ دیکھنا چاہتا ہوں۔

سید محمد حکیم الدین شیرازی (احمد آباد)

# حضرت زین العابدین بن امام حسینؓ

حضرت ابوالحسن علی زین العابدین بن امام حسینؓ المعروف علی اصغرؓ کے نام نامی سے کون واقف نہیں۔ ریاض نبوت کے گل تر تھے۔ کربلا کے میدان میں اہل بیت نبویؐ کا چمن اجڑنے کے بعد یہی ایک پھول باقی رہ گیا تھا جس سے دنیا میں شمع سیادت پھیلی ہے

محمد بن مسلم زہری کہتے تھے کہ میں نے مدینہ میں ان سے زیادہ افضل کسی کو نہیں پایا آپ کی ذات گرامی فضائل اخلاق کی ایسی نورانی شمع تھی جس سے دوسرے مستفیض ہوتے تھے آپ خلق نبویؐ کی صحیح تصویر تھے۔ آپ کا دل خشیت سے ہمیشہ لبریز رہتا تھا اور وہ اکثر اسی خوف سے بے ہوش ہو جاتے تھے۔

ایک دفعہ آپ حج کو گئے۔ احرام باندھنے کے بعد جب سواری پر بیٹھے تو مارے خوف کے آپکا رنگ زرد پڑ گیا (اور ایسا لرزہ طاری) ہوا کہ زبان سے لبیک تک نہ نکل سکا۔ لوگوں نے کہا کہ آپ لبیک کیوں نہیں کہتے فرمایا ڈر معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ میں لبیک کہوں اور ادھر سے جواب ملے لا لبیک (تیری حاضری مقبول نہیں) لوگوں نے کہا مگر لبیک کہنا تو ضروری ہے پھر ان کے اصرار پر "لبیک" کہا مگر اس لفظ کا منہ سے نکلنا تھا کہ وہ بیہوش ہو کر سواری سے گر پڑے (تہذیب التہذیب)

آپ زہد و عبادت کے پیکر تھے۔ شبانہ یوم میں ایک ہزار رکعتیں پڑھتے۔ اور آخر دم تک اس معمول میں فرق نہ ہوا۔ آپکی رگوں میں ان بزرگوں کا خون تھا جن کی عبادت زیر شمشیر بھی نہ چھوٹی۔ اخلاص فی العبادت کا یہ حال تھا کہ حضوری کے وقت سارے بدن میں لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ محویت کا یہ عالم تھا کہ نماز کی حالت میں کسی چیز کی خبر نہ ہوتی تھی۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اتنا اہتمام تھا کہ اس سے غفلت کو کتاب اللہ سے غفلت شمار کرتے۔

فیاضی اور دریا دلی آپکا خاص وصف تھا۔ تحمل عفو درگزر اور نرمی اور ملاطفت کا یہ نتیجہ تھا کہ آپکی محبت وعظمت لوگوں کی دلوں میں اتنی جاگزیں ہو گئی تھی کہ جدھر نکل جاتے تھے آپکو راستہ دینے کیلئے ہجوم چھٹ جاتا تھا۔

روایات میں بیان ہے کہ ہشام بن عبدالملک بن مروان اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں ایک سال حج کیلئے آیا اور خانہ کعبہ کے طواف کے بعد حجر اسود کو بوسہ دینے کے لئے اس طرف بڑھا لیکن ہجوم کی وجہ سے حجر اسود تک نہ پہونچ سکا مجبوراً رک گیا۔ اور ہجوم کا تماشا دیکھنے لگا تماشا دیکھنے کے لئے اس کے قریب ایک کرسی لگا دی گئی اور وہ اس پر بیٹھ گیا۔ ابھی وہ تماشا دیکھ ہی رہا تھا کہ اتنے میں امام زین العابدینؓ تشریف لائے اور وہ حجر اسود کا بوسہ دینے آگے بڑھے۔ انھیں دیکھتے ہی مجمع پیچھے ہٹ گیا اور جبتک وہ حجر اسود کا بوسہ دے کر واپس نہیں لوٹے مجمع ایک کنارے کھڑا رہا۔ ہشام کے ساتھ جو لوگ شام سے آئے تھے انھیں یہ دیکھ کر سخت حیرت

ہوئی انھوں نے ہشام سے پوچھا کہ یہ نوجوان کون ہے جس کی
عوام اس قدر تعظیم کر رہے ہیں اور آپ کی پرواہ تک نہ کی۔
ہشام نے اپنی سبکی پر پردہ ڈالنے کے لئے از راہ
تجاہل عارفانہ جواب دیا کہ میں تو اسے نہیں پہچانتا کہ یہ کون
ہے۔ فرزدق جو ایک درباری شاعر اور قصیدہ گو تھا وہ
بھی وہاں موجود تھا۔ ابھی تک اس کی غیرت ایمانی سوئی
تھی مگر ہشام کے منہ سے یہ اہانت آمیز کلمات سن کر
فوراً جوش میں آگئی۔ وہ بول پڑا کہ اگر آپ کو نہیں معلوم
کہ یہ کون ہے تو غور سے سنو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ
کون ہے

اسوقت فرزدق نے فی البدیہہ حضرت امامؑ کی
شان میں ایک قصیدہ پڑھا جس کے اشعار قابل غور ہیں
یہاں چند درج کئے گئے ہیں۔

هذا الذی تعرف البطحاء وطاته ٭ والبیت یعرفه والحل والحرم
(یہ وہ ہیں جن کے قدموں کے نشان تک وادی بطحا یہ گھر
یہ حرم اور حرم سے باہر کے علاقے سب پہچانتے ہیں)

هذا ابن خیر عباد الله کلهم ٭ هذا التقی النقی الطاهر العلم
(یہ خدا کے بندوں میں سے بہترین بندے کے فرزند ہیں سب
سے پرہیزگار سب سے پاکیزہ صفت اور سب زیادہ بے
داغ نشان والے ہیں) یہ ایک حدیث پاک کی ترجمانی ہے

اذا راته قریش قال قائلها ٭ الی مکارم هذا ینتهی الکرم
(یہ وہ ہیں جنہیں قریش (مکہ معظمہ کے لوگ) جب دیکھتے ہیں
تو بول اٹھتے ہیں کہ بخشش و عطا اور خصائل حمیدہ ان پر
ختم ہیں)

فلیس قولک من هذا بضائره ٭ العرب تعرف من انکرت والعجم
(اسلئے تیرا کہنا کہ تو نہیں جانتا کہ یہ کون ہے انہیں کچھ
نقصان نہیں دے سکتا جنہیں پہچاننے سے تو انکار کر رہا ہے
انہیں عرب و عجم سب جانتے ہیں)

کلتا یدیه غیاث عم نفعهما ٭ یستوکفان ولا یعروهما العدم
(ان کے دونوں ہاتھ ایسے ہیں جن کا فیض بارش کی طرح
عام ہے۔ ان کی بخشش ہر وقت جاری رہتی ہے حتیٰ کہ
سخت بدحالی میں بھی ختم نہیں ہوتی۔

عم البریة بالاحسان فانقشعت ٭ عنها الغیابة والاملاق والظلم
(تمام مخلوقات پر ان کا احسان عام ہے اور ان کی بدولت
جہالت و غفلت تنگدستی اور ظلم و زیادتی سب دور ہوگئے

لا یستطیع جواد بعد غایتهم ٭ ولا یدانیهم قوم وان کرموا
(کوئی بڑے سے بڑا سخی بھی ان کی برابری اور استطاعت
نہیں رکھتا اور کوئی گروہ بھی خواہ وہ کتنا ہی بخشش کرنے
والا ہو انکے مرتبے کے قریب نہیں پھٹک سکتا)

من معشر حبهم دین وبغضهم ٭ کفر وقربهم منجی ومعتصم
(یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کی محبت دین ہے اور جس
سے بغض کفر ہے اور جن کا قرب نجات اور پناہ دینے والا
ہے)

ان عد اهل التقی کانوا ائمتهم ٭ او قیل من خیر اهل الارض قیل هم
(اگر اہل تقویٰ اور خدا ترس لوگوں کو جمع کیا جائے تو یہی
ان کے امام ہونگے اور اگر یہ پوچھا جائے کہ دنیا میں
افضل ترین لوگ کون ہیں تو بھی جواب ملے گا کہ یہی
لوگ)

غرض بڑے بلیغ اشعار اور بھی ہیں لیکن طوالت کو
مدنظر رکھتے ہوئے یہاں درج نہیں کئے گئے جو حضرت امام
کی خوبیوں اور ان کے اخلاق حمیدہ و فضائل کو واضح
کر رہے ہیں۔

ان اشعار کو سن کر ہشام کو پسینے چھوٹ گئے۔
اس نے حکم دیا کہ فرزدق کو قید کر لیا جائے غرض کہ
فرزدق قید کر لیا گیا اور اسے عسفان جو مکہ معظمہ اور
مدینہ شریف کے درمیان ایک جگہ ہے مقید رکھا گیا
غور کرنے کی بات ہے کہ اس قسم کی امتناعی نظر بندی

کا طریقہ مسلمانوں میں شاید ہشام ہی نے جاری کیا تھا خلیفہ ثانی حضرت فاروق اعظمؓ نے تو اسلامی عدل کا یہ اصول صاف طور سے بیان فرما دیا تھا کہ اسلام میں کسی شخص کو عدل کے شرائط پورے کئے بغیر قید نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت امامؑ کو اس واقعہ کی جب اطلاع ملی تو آپ فرزدق کی جرأت ایمانی اور بے باکی سے محظوظ ہوئے اور فرزدق کی اسی ابتلاء میں اسکی مدد اور دلجمعی کے لئے بارہ ہزار درہم و دینار اس پیغام کے ساتھ بھجوائے کہ: اے ابو فراشی! ہم معذور ہیں۔ اگر اس سے زیادہ مال ہمارے پاس ہوتا تو وہ بھی ہم تجھے دیتے۔

فرزدق نے وہ مال واپس کرتے ہوئے عرض کیا کہ میں نے یہ کام کسی دنیوی لالچ یا انعام و اکرام کے لئے نہیں کیا، بلکہ میں بادشاہوں کے جھوٹے قصیدے اور ان کی جھوٹی مدح سرائیاں کر کے گناہوں کا پلڑا بہت بھاری کر چکا ہوں، میں اسی کو کسی حد تک کفارے کے طور پر یہ کام کیا ہے اور خدا ہی سے اجر کے لئے اس کے رسول کے اہل بیت کی دوستی اور محبت کی طلب رکھتا ہوں۔

جب حضرت امام عالی مقامؑ کو یہ پیغام ملا تو آپ نے [illegible]م اس کو اسی پیغام کے ساتھ واپس بھیجی کہ: اے ابو فراشی! [illegible]تجھے ہم سے سچی محبت ہے۔ تو جو چیز ہم نے بھیجی ہے اسے [illegible]ل کر لے۔ کیونکہ ہم نے اس کو خدا ہی کے لئے اپنی ملک [illegible]نکال دیا ہے۔ اب ہم اس کو واپس نہیں لے سکتے۔

اس پیام پر فرزدق نے وہ رقم رکھ لی سائل سیادت [illegible]س سے بہتر اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

ایک دفعہ ایک شخص بدکلامی آپکے سامنے کرنے لگا۔ [illegible]غلام اور خدام اس شخص کی طرف لپکے تو آپ نے انہیں [illegible]ک دیا۔ پھر اس شخص سے فرمایا میرے جو حالات تم سے [illegible]ی ہیں وہ اس سے زیادہ ہیں جو تم کہہ رہے ہو تمہاری کوئی [illegible]ورت ہے جس میں میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں؟ یہ جواب سن کر وہ شخص شرمندہ ہوا۔ آپ نے اپنا کرتا اتار کر اسی وقت اسے دیدیا اور ایک ہزار درہم سے زیادہ نقد عطا فرمایا۔ اس شخص پر آپکے اس "حسن انتقام" کا اتنا اثر ہوا کہ بے اختیار اس کی زبان سے نکل گیا "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی اولاد ہیں"

---

(بقیہ نئی صبح کا سفر)

ہو جاتا ہے۔ اس لئے آج وہی سب کچھ جاننے کے لئے قلم اور کاغذ کا سہارا لے رہا ہوں اور اعتراف محبت یا حماقت (جو بھی کہو) کر رہا ہوں۔ میرے لئے بہترین وقت وہ ہو گا جب تمہارا جواب میرے ہاتھوں میں ہو گا — فقط تمہارا (تم جو بھی سمجھو)

ارشی "

"فری تمہارا بہت بہت شکریہ۔" ارشی خط لے کر چلا گیا اور فری سسک پڑی۔

"فری جلدی سے میرے کمرے میں آ جاؤ ایک دلچسپ چیز دکھاؤں گا۔" ارشی دوسرے دن فری سے کہہ رہا تھا۔ اور فری نہ چاہتے ہوئے بھی کمرے میں چلی گئی۔ ارشی نے ایک پیکٹ اس کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا۔ "فری اس میں لڑکی کی تصویر اور خط ہے۔ تصویر دیکھ لو اور ہاں خط کا بھی جواب لکھ ڈالو۔ میں ابھی روم سے ابھی آیا۔"

ارشی کے جانے کے بعد فری کچھ دیر تو یونہی بیٹھی رہی پھر دل پر جبر کر کے اسے کھولا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی ایک خوبصورت آئینہ اس کے ہاتھوں میں تھا۔ اس نے جلدی سے خط کھولا تو اپنا ہی لکھا ہوا خط اس کے ہاتھ میں آ گیا اور ارشی کے آنے سے قبل ہی بھاگ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا اور ہونٹوں پر شرم و مسکراہٹ کا عجیب دلکش امتزاج تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد شہنائی کی آواز اس کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

●●

ڈاکٹر قمر رئیس

# نقشِ ناتمام

## (جگن ناتھ آزاد کا زیرِ ترتیب مجموعۂ کلام)

آزاد نے جب فرمائش کی کہ میں ان کے نئے مجموعے کا دیباچہ لکھوں تو مجھے حیرت ہوئی۔ اور جب تقاضے کرنے لگے تو مجھے ان کے خلوص اور معصومیت پر افسوس ہوا، اور یقین ہو گیا کہ ان کی یہ خواہش حقِ دوستی کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ان کے دوستوں اور قدر شناسوں کے حلقہ میں ایسے ویسے ۰۰ اہلِ قلم بھی ہیں جو ان کی شخصیت اور شاعری دونوں کو مجھ سے بہتر طور پر جانتے ہیں۔ اسکے باوجود انھوں نے مجھ جیسے کم نظر اور کو۔۔ ۰ فہم کو یہ شرف دے کر یا تو حقِ دوستی ادا کیا ہے یا پھر میری دوستی اور سخن فہمی کو آزمایا ہے۔

اب دوستی کی بات چلی ہے تو یہ بھی بتا دوں کہ آزاد سے میری دوستی کا آغاز سنہ ۱۹۵۰ء میں "بیکراں" کے واسطے سے ہوا۔ میں بی۔اے۔ کا طالب علم تھا۔ نئے خصوصاً ترقی پسند اور نظم گو شعراء کا کلام بڑے انہماک سے پڑھتا تھا "بے کراں" بھی اسی زمانے میں ہاتھ آئی۔ اب یہ کہنا تو مشکل ہے کہ میں نے اسے دوسرے شعرائے جدید کے کلام سے بہتر اور بلند پایا۔ تاہم اتنا یاد ہے کہ اسے پڑھ کر محسوس ہوا جیسے میں ایک نئے اور کشادہ ماحول اور نرم و لطیف تازہ ہوا میں سانس لے رہا ہوں۔ میرے گرد نئی خوشبوئیں نئے رنگ نئے منظر ہیں۔ اس تاثر کے ساتھ دل میں یہ خواہش بھی انگڑائیاں لینے لگی کہ کسی طرح آزاد سے دوستی کی جائے۔ شاید اس لئے کہ "بے کراں" کے صفحات میں آزاد کی شخصیت جس والہانہ اور بے نیاز انداز سے اور جیسے دلچسپ اور دل نشیں پیکر میں جلوہ گر ہوئی وہ دوسرے نوجوان شعراء سے مختلف تھا، انوکھا تھا۔ شاید اس لئے کہ آزاد کا ذہن اور طرزِ احساس دوسرے شعراء کی روشِ عام سے الگ اور اچھوتا تھا۔ میں اکثر سوچتا یہ کیسا شاعر ہے جو ہر مسلک اور ہر عقیدہ کی گرفت سے آزاد ہے۔ جو روایت پرست بھی ہے اور باغی ہے جس کا جذباتی اور معنوی وجود ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں پر پھیلا ہوا ہے۔ جو غزل کا رسیا بھی ہے اور نظم کے امکانات کا متلاشی بھی۔ جس کی بصیرت اور آگہی کے سرچشمے کالی داس، نانک اور سوامی رام تیرتھ سے لیکر حافظ، شیلے، ٹیگور، اور اقبال تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جو جانبازی اور روحانیت کا نقیب بھی ہے اور انقلابی بھی جسے زبان کی شستگی، بیان کی موزونیت اور خیال کی طہارت یکساں طور پر عزیز ہے۔ جس کی آواز میں ہندی سوز و درد بھی ہے، عجمی شان و شکوہ جذبہ کی گرمی بھی شعور کی گرفت بھی۔ الغرض ان دھندلے تاثرات نے (جنھیں اب میں قدرے وضاحت سے بیان کر رہا ہوں) میرے دل میں آزاد کی شخصیت سے ایک خاص دلچسپی پیدا کر دی۔

اس کے بعد مشاعروں میں ان کا کلام سنا ان کے دوسرے مجموعے پڑھے۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۵۹ء میں میری یہ خواہش کہ آزاد کی ہمہ رنگ شخصیت اور تخلیقی ذہانت کو قریب سے دیکھوں۔ پوری ہوئی۔

دس بارہ سال کی اس مدت میں آزاد کا جو کلام سامنے آیا وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس سفر میں ہر قدم پر آزاد کی تخلیقی صلاحیتیں سنورتی اور فکر کی راہیں روشن ہوتی گئیں۔ محرکات کا دامن وسیع تر ہوتا گیا۔ گرد و پیش کے مشاہدات اور جذباتی تہلکات ان کے

یل کی پہنائی میں نیا تموّج پیدا کرتے رہے۔ زندگی کے عام اور ادنیٰ
ظاہر سے ان کا تعلق استوار ہوتا گیا۔ فطرت کے لازوال ذخیروں
یہ تہذیب و تاریخ کے مادّی مجسموں اور نہ نشین تخلیقی دھاروں سے
ہ قوت اور نئی مسرتیں حاصل کرتے رہے، کبھی انھوں نے دیارِ
طن میں (جو ان کے شاداب تخیل کا اوّلین گہوارہ ہے) اپنے کو اجنبی
سا محسوس کیا۔ کبھی ہجوم نالہ و درد اور وفور کرب و الم میں انھیں
پنی نوا، نوائے پریشاں محسوس ہوئی کبھی عشق کی موجِ بلاخیز انھیں
نگ و بو کے اجنبی دیاروں میں بہالے گئی اور کبھی پیہم جستجو نے
ھیں انسانیت کی نئی منزلوں کا سراغ دیا۔ میرا موضوعِ سخن، عزائم
ے کشور ہندوستان، او کلا سے پیرس تک، ڈل کے کنارے،
لی کی جامع مسجد اور طلوعِ آزاد، کی ایسی نظمیں ہیں جو اردو نظم
سرمایہ میں مستقل اور انمول سرمایہ ہیں۔ اسی طرح غزل اور رباعی
ں بھی آزاد کی آواز حسن و لطافت اور خیال انگیز شعریت کے
سانچوں میں ڈھلتی رہی۔

مجھے اکثر یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایسے دور میں جب ان کے
کثر معاصرین کے فن کے سوتے خشک ہو رہے تھے۔ ان کے فن میں
تازگی اور نمو کی موجیں اٹھتی رہیں وہ زیادہ جوش و خروش سے
لکھتے رہے اور لکھ رہے ہیں (اگرچہ اب کچھ ٹھہراؤ آگیا ہے) یہ واقعہ
س لئے اور بھی حیرت کا باعث ہے کہ وہ پیشہ ور شاعر نہیں۔
وہ جس سرکاری منصب پر فائز ہیں اس کی ذمہ داریاں بڑی نازک
پُر اسرار اور کثیر ہیں۔ فرصت اور فراغت عنقا ہے۔ اظہار کی آزادی
بھی محدود ہے۔ ایسی حالت میں شاعرانہ محویت فنّی ریاضت
مطالعہ اور غور اور فکر کے لئے وقت نکالنا مشکل ہی نہیں ناممکن
نظر آتا ہے۔ لیکن اسے انکی وارفتگی، شوق یا مستیِ کردار کا افسوں
کہئے کہ ان میں سے کوئی بھی زنجیر ذہن آزاد کو پابند نہ بنا سکی۔

یوں تو سنجیدگی اور لگن کے ساتھ ۱۹۴۷ء کے بعد ہی آزاد
شاعری کی طرف متوجہ ہوئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی فکر اور
فکر سخن کا زمانہ گزشتہ پچیس سال کی مدت پر پھیلا ہوا ہے
یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ۱۹۵۰ء کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے
جس آسانی سے انھوں نے اردو کے نوجوان اور نامور شعراء کی صف میں
جگہ حاصل کرلی وہ محض آزادی کا افسوں یا تقسیم ملک کا کرشمہ نہیں
تھا بلکہ ان کے کلام میں فن کی جو پختگی اور معنویت اور خبر و نظر کی چونکا
دینے والی وسعت تھی وہ ان کی ایک عمر کی خاموش ریاضت، ذہنی
تربیت، مطالعہ کی وسعت اور نو بہ نو تجربات کا ماحصل اور ثمرہ تھی
اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ آزاد کی شاعرانہ شخصیت کا
ہیولیٰ دراصل آزادی سے قبل بن چکا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد رونما
ہونے والے حالات اور حوادث نے اس میں رنگ بھرا۔ اس میں نیا
خون دوڑایا اور مشاہدہ اور تخلیقی فکر کے ایسے جھروکے کھول دیئے جہاں
سے ہر منظر ایک بلندی پر نظر آنے لگا۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ میں یہ سطریں ارضِ وطن سے دور سوویٹ
سرزمین پر سائبیریا کی برفانی ہواؤں کی گود میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ وطن
کو چھوڑے ہوئے کم و بیش سوا سال ہوگئے۔ یہاں آزاد کا کچھ منتخب
کلام میرے پاس ہے۔ اس دوران کبھی مصروفیت اور کبھی فراغت
کبھی تنہائی اور کبھی ہجوم سے اکتا کر آزاد کا کلام میں نے اتنی بار پڑھا
ہے کہ اکثر اشعار حفظ ہوگئے۔ یہ بھی ہوا کہ اس دوران فن ادب کے بعض
مسائل کے بارے میں میری اپنی خام فکر اور میرے سیّال تصورات بھی
بدلتے رہے۔ اور اس طرح آزاد کی شاعری کے بارے میں بھی میرے
تأثرات اور خیالات بھی کروٹیں بدلتے اور صورتیں ڈھالتے ہوئے
نظر آئے۔

سچ تو یہ ہے کہ اب مجھے اپنے ذہن کی بہت سی گرہیں کھلتی
اور سلجھتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ طالب علم کی ذہنی الجھنیں اور
تعصبات ان پتھروں کی طرح ہیں جو دریا کو پُر شور اور تند خو
بنا دیتے ہیں۔ اگر یہ پتھر نہ رہیں، تو دریا میں سکوت سا پیدا ہو جاتا
ہے۔ ایسا سکوت چونکہ کبھی کبھی موت کی علامت ہو جاتا ہے۔ اس
لئے اکثر دانشوروں کو عمر کی اس منزل میں حاصل ہوتا ہے۔ جب وہ
'نروان' کے قریب ہوتے ہیں۔ میں بہک گیا۔ کہہ یہ رہا تھا کہ بعض
مسائل کے بارے میں میری بے یقینی یقین کا سا روپ دھار رہی ہے
مثلاً میں سوچتا تھا کہ ایک سچا وطن پرست اسی سچائی کے ساتھ

عالم گیر انسانی برادری اور آفاقی انسان دوستی کا علمبردار نہیں ہو سکتا یا پھر میرا خیال تھا کہ داخلیت پرستی کا رجحان اور انکشاف ذات کا عمل اجتماعی جذبات کی ترجمانی اور سماجی افادیت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ دوسرے ہیں جن کا درمیانی فاصلہ طے تو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن دونوں کو ملایا نہیں جا سکتا لیکن اب مجھے ان دونوں میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ اگر فن کار کے انفرادی تجربہ میں اس کے عہد کی سچائی کا جوہر شامل ہے تو وہ قابل قدر ہوگا۔ سچائی کی یہی رمق اس کی تخلیق کو سماجی معنویت اور فنی لطافت بخشے گی۔ اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ اس عہد میں کوئی فن کار وطن پرستی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ساری انسانیت کی آواز سے اپنی آواز نہ ملا سکے۔ نوجوان روسی شاعر یوتو شنکو (YUV TO-SHENKO) نے ایک نظم میں کہا ہے کہ "میں دنیا کی بعض چیزوں سے اس لئے نفرت کرتا ہوں کہ مجھے اپنے وطن سے محبت ہے، اور مجھے اپنے وطن سے اسلئے محبت ہے کہ مجھے دنیا کی بعض چیزیں عزیز ہیں"

اب میں سمجھتا ہوں کہ ساری دنیا میں فروغ پاتی ہوئی انسانیت اور آزادی، تہذیب اور ترقی کے آئینہ میں خود اپنا، اپنے وطن کا جمال و وقار دیکھنا اور دکھانا اس عہد کی ایسی سچائی، ایسی سادہ حقیقت ہے جس کے ادراک کے بغیر توانا ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔ وطن پرست وہ ہے جس کا دل کرۂ ارض کے کسی بھی گوشہ میں رونما ہونے والے ان حادثات پر دھڑک اٹھے، تڑپ اٹھے، جن کا تعلق انسان کی آزادی اور عافیت اور انسانیت کی بقا سے ہو۔ خواہ وہ نہر سوئز پر سامراجیوں کا حملہ ہو، ایران میں جمہوریت کا خون ہو۔ ویٹنامی قوم پرستوں کی جدوجہد ہو یا جوہری بموں کے دھماکے —— اگر یہ اور اس طرح کے دوسرے عالمی واقعات کسی فنکار کو متاثر نہیں کرتے تو اسکی وطن پرستی کو قدر افزائی کے لئے آسانی سے کسی میوزم میں رکھا جا سکتا ہے۔

آزاد کی شخصیت اس لحاظ سے بڑی بیدار، حساس اور آگاہ شخصیت ہے۔ ان کی محبت اور ہمدردی، دردمندی اور نفرت بغاوت اور بیزاری جغرافیائی اور مکانی قیود کی پابند نہیں۔ ان کی شخصیت خود اپنی ذات، قومی حیات اور کائنات کے تخلیقی شعور سے عبارت ہے۔ ان کی بظاہر سادہ و نرم آواز میں تینوں کا احساس ایسا گداز لہجہ اور لے پیدا کرتا ہے جو دلوں کو گرماتا ہے، دھڑکاتا ہے۔ آزاد کی شاعری کا یہ وصف اُن کے ہر دور کے کلام میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ہر عہد کا اپنا وجدان اپنا شعور ہوتا ہے، اور اس عہد کا فن اس کا بہترین مظہر ہوتا ہے۔ یہ شعور و وجدان جتنا گہرا ہوگا فنکار کا تجربہ اتنا ہی رچا ہوا حسن آفریں اور دل نشیں ہوگا۔ شرط یہ ہے کہ وہ خود اپنے تجربات سے تعصب نہ برتے۔ ان کی قیمت نہ لگائے۔ مصلحتوں اور مفروضوں سے سمجھوتہ نہ کرے اور سوائے جمالیاتی اقدار کے کسی شے کو میزان الاشعار نہ بنائے۔ صرف اسی طرح اس کے انفرادی تجربات اجتماعی روح میں اپنے آپ کو پا سکیں گے۔ اپنے معنی تلاش کر سکیں گے، اور اس طرح اپنے عہد کی تہذیبی بساط پر نئے نقش و نگار بنا سکیں گے۔ آزاد کی شخصیت اور شاعری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے عہد کے شعور و وجدان کی تلاش میں نہیں، بلکہ خود اپنی تلاش میں، اپنے ہی کو پانے کی فکر میں، اپنے عہد کے شعور و وجدان کی پُر پیچ راہوں سے گذر رہے ہیں۔ اُن کی بڑائی اس میں ہے کہ اس سفر میں ابھی تک کہیں بھی ان کے یہاں درماندگی اور اضمحلال کے آثار پیدا نہیں ہوئے وہ بچوں کی سی ان تھک توانائی اور شوقِ فراواں لئے آگے بڑھ رہے ہیں ان کا ہر تجربہ ایک نئی دریافت ہے۔ زندگی اور فطرت کے ایسے تہ در تہ حقائق کی دریافت جہاں سے نئے شعور، نئے وجدان کی کرنیں پھوٹتی ہیں ؎

نہ جانے کون سی منزل میں کھو گیا آخر
وہ دل چلا تھا جو اپنی ہی جستجو کیلئے

بھری بہار میں عالم ہے یہ مرے دل کا
ترس رہا ہوں تماشائے رنگ و بو کیلئے

سرخروئی کا ہے یہ شوق کہ دنیائے چمن
آج پھر خون بہاراں سے ہوئی سرخ کفن
غنچہ گل کی جگہ پھوٹ رہے ہیں شعلے
موسم گل! تری ممنون ہے ہر شاخ چمن

مرے سجود کو دیر و حرم کی قید نہیں
حرم ہو، دیر ہو کوئی فضا ہو کیف آمیز
بشر کی منزلِ مقصود ابھی ہے دور بہت
خرام گردشِ دوراں ابھی کچھ اور بھی تیز

ان رنگا رنگ تجربات کے پیچھے شعور کی روشنی کتنی روح افروز ہے لیکن کبھی آزاد وجدان کی گرد آلود دھندلی راہوں میں بھٹک بھی جاتے ہیں۔ سوادِ فکر کی تلاش میں بہک بھی جاتے ہیں۔

میں کون ہوں، کیوں ہوں، کس لئے ہوں آخر
اس بھید کو اے شعور کب کھولے گا؟

آزاد جانتے ہیں کہ یہ کوئی ایسی شاہراہ نہیں جو کسی منزل تک پہنچا سکے۔ ایک بے کراں، لق و دق صحرا ہے۔ اس میں کھو کر اگلے لوگوں کی طرح آزاد بھی کبھی کبھی پکار اٹھتے ہیں ؎

پرتو ہوں کسی کا میں کہ ہوں نقشِ دوام
حیرت ہے میں ہوں بھی کہ نہیں ہوں آزاد

یہاں آزاد کا سارا معنوی وجود اور مادی شعور تحلیل ہوتا نظر آتا ہے جیسے آبِ زلال کا ایک حیات بخش چشمہ کوہستانی وادیوں اور شاداب میدانوں میں سے گزرتا ہوا کسی ریگستان میں پہنچ کر غذب ہو جائے۔ یہاں پہونچ کر آزاد کو سوچنا تھا کہ ان کے یہ تجربات (یا خیالات) اس عہد کی ذہنی اور جذباتی رُو سے کس طرح کی مناسبت رکھتے ہیں اور وہ کہاں اپنی جگہ بنا سکیں گے۔ حیرت ہے کہ اقبال کا پرستار اقبال ہی کے توڑے ہوئے اصنامِ خیالی کو پوجنے لگا۔

اقبال کا ذکر آ گیا تو یہ بھی عرض کر دوں کہ آزاد نے اس مفکر شاعر کو بھی اپنے ڈھنگ سے تلاش کرنے اور پانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اسے میں محض سانحہ سمجھتا ہوں کہ آزاد کی یہ تلاش و جستجو عقیدت بنتی گئی کسی بڑے اور برگزیدہ شاعر سے اس طرح کی وابستگی اکثر چراغ تہ داماں بن جاتی ہے، جو روشنی بھی دیتی ہے لیکن دامنِ فکر کو جھلسا بھی سکتی ہے۔ اقبال کے فکر و فن نے جہاں آزاد کو تاب و تابش بخشی ہے وہاں اس نے ان کی اپنی "روشنیٔ طبع" کے فطری نکھار اور امکانات کو محدود بھی کیا ہے۔

بے شک اقبال نے آزاد کو متانت فکر دی۔ ہجر و وصال کی حدوں سے پرے فطرت اور زندگی کی معنویت اور نیرنگی کا احساس دیا۔ ہیجانی وفور اور اعصابی لذتیت کے بجائے فکر کا رچاؤ اور گدازِ قلب کی دھیمی دھیمی آنچ دی۔ لیکن مجھے آزاد سے شکایت ہے کہ انھوں نے اقبال سے یہ نہیں سیکھا کہ ہر اچھا شاعر اپنی فکر اور اپنے طرزِ احساس کے ساتھ ساتھ اپنا ذخیرۂ الفاظ بھی رکھتا ہے۔ اپنے تجربات کے مکمل و مؤثر ابلاغ کیلئے وہ اظہار و بیان کے بندھے ٹکے طریقوں پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ نئی علامتیں نئے اشارے نئی ترکیبیں اور نئے سانچے وضع کرتا ہے اور روایتی شعری لغات کو نئی معنویت دیتا ہے۔ اس راہ میں آزاد کے نقشِ قدم معدوم تو نہیں لیکن موہوم ضرور ہیں۔

مجھے بار بار محسوس ہوا کہ نظم کی ٹکنیک اور تعمیر کے سلسلے میں آزاد کی نظر اقبال اور جوش سے آگے نہیں بڑھتی۔ یہاں تک کہ معرّا نظموں میں بھی بیانیہ اور خطابیہ رنگ غالب ہے۔ اسی طرح غزل میں آزاد نے اپنی تخلیقی فکر کو کلاسیکی مزاج اور معیاروں تک ہی محدود رکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی نظموں میں بیانیہ سادگی تشبیہ و استعارہ کی ندرت اور تیزی سے بدلتے ہوئے تمثال (IMAGE) غزل کی طرح پُر کیف اور با مزہ ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں اس چستی و پیوستگی ارتقاءِ خیال اور تعمیری وحدت کی کمی ہے جو نظم کی جان ہے جوش کی طرح آزاد کی بھی چند نظمیں ہی اس فنی معیار پر پوری اترتی ہیں۔ اسی طرح غزل میں بھی اُن کا اسلوبِ اظہار غزل کے روایتی الفاظ علامتوں اور بندشوں کا اسیر نظر آتا ہے میرا یہ مطلب نہیں کہ غزل کی زبان اس کے مخصوص رموز و علائم کو یکسر ترک کر دیا جائے لیکن میرا عقیدہ ہے کہ نئے شعور اور نئے تجربات کی شدت اور گرمی انھیں سیّال بنا کر ایک خیابۂ غم ایک نئی وسعت ضرور دے سکتی ہے۔ دراصل غزل کی روایات سے محبت، اقبال سے عقیدت اور مشاعرہ کی مقبولیت نے آزاد کی غزلوں میں ایک ایسی ہمنگی پیدا کر دی ہے جو ان کے فن کی انفرادیت کے حصول میں مزاحم رہی ہے یا اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان عوامل کی کشاکش نے آزاد کی شخصیت اور تخلیقی فکر کو اپنے فطری مکمل اور مؤثر اظہار کا موقع نہیں دیا۔ یہ سب میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آزاد کو میں نئی فکر کا شاعر

(بقیہ صفحہ ۲۰ پر)

کرشن موہن (نئی دہلی)

## غزل

چاہیئے عشق خدا، حمد و ثنا سے پہلے
جذب و مستی کی ضرورت ہے دعا سے پہلے

حاصلِ شوق ہے سرمایۂ جان و دل ہے
وہ جو اک درد چمکتا ہے وفا سے پہلے

کر گئی تھی ترے بیمار کو اچھا اے دوست
نگہِ ہوش رُبا، تلخ دوا سے پہلے

لے گیا ساتھ ہی اپنے اسے چنچل بچپن
وہ مچلنے کی ادا تھی جو حیا سے پہلے

دھند میں لپٹا ہوا ایک جزیرہ ہے وجود
دُھند ہے بعد فنا، دھند بقا سے پہلے

جانفشانی ہے تمنا کی کہانی کا راز
رہ گئی پس کے حنا، رنگ حنا سے پہلے

ہے عبث باد صبا اپنے چلن پر نازاں
نکہتِ حُسن تو پھیلی ہے صبا سے پہلے

قُربِ منزل میں بھی اک خوف سا ہے دامن گیر
راہزن اتنے ملے راہنما سے پہلے

رازِ دل کھولتی ہے رخ کی ہر اِک رنگت
خامشی بولتی ہے صوت و صدا سے پہلے

کرشن موہن کو یہ توفیق عطا کر یارب
کر سکے ایک گنہ اور سزا سے پہلے

فرحت قادری (گیا)

## آزاد غزل

دیکھیئے اہلِ قلم کو دیکھیئے!
جانے کب سے لکھ رہے ہیں فکر و فن کے مرثیئے
کیوں روایت کا گلہ کرتے ہیں آپ
جب بدل سکتے نہیں اپنے نظر کے زاویئے
اب صحیفے تو اترنے سے رہے
دشتِ امکاں کی حدوں کو آپ خود ہی ڈھونڈیئے
آندھیوں سے کیوں نہ سمجھوتا کریں
اب ہمارا ساتھ دے سکتے نہیں بجھتے دیئے
شیش محلوں سے جو نکلے تھے کبھی
پھر رہے ہیں آج تک وہ ہاتھ میں پتھر لئے
جن سے تھے منسوب افسانے تمام
وہ کتاب زندگی میں بن گئے ہیں حاشیئے۔

صفدر صدیق رضی (پاکستان)

## غزل

پھر تری یاد سے دامن تر ہے
کل سے شب آج کی روشن تر ہے

ابر برسے گا تو جل جاؤں گا
اس کڑی دھوپ سے آنگن تر ہے

منتظر کون یہاں تھا شب بھر
اشکِ خوں رنگ سے چلمن تر ہے

خاک کا رزق تھا سو خاک ہوا
خونِ دشنام سے آہن تر ہے

اس کی آنکھوں میں تو جادو ہے مگر
جنبشِ لب میں بھی کچھ منتر ہے

اقبال دانش (الہ آباد)

## غزل

کبھی زمین کبھی چاند پر گئے حالات — حدود کون و مکاں سے گزر گئے حالات
کچھ اس ادا سے مرے دل پہ رک گئی وہ نظر — بہت خراب تھے لیکن ٹھہر گئے حالات
جو تیری چشم کرم کے فیوض پا نہ سکے — وہ شہر شہر گئے در بدر گئے حالات
قدم قدم پہ نشیب و فراز تھے لیکن — ہر ایک راہِ خطر سے گذر گئے حالات
فضا بنائی تھی ہر گام حادثوں کے لئے — تباہ کر کے مجھے اب کدھر گئے حالات
غبار اڑی تھی ابھی اس کے موت کی لیکن — خود اپنی موت زمانے میں مر گئے حالات
یہ کیا ہوا کہ ہماری تباہ حالی پر — ہمارے پاس سے با چشم تر گئے حالات
نہ چاندنی کی مہک ہے نہ گرم کرنیں ہیں — یہ کس مقام پہ آ کر ٹھہر گئے حالات
وہ مسکرا رہا نجموں کے سائے میں — جو دیکھا عزم مکمل تو ڈر گئے حالات
تغیرات زمانہ سے ہے مفر کس کو — فضائے دہر کو مغموم کر گئے حالات

مہ و نجوم کو شاید ہو کچھ خبر دانش
شبِ فراق جو ہم پر گزر گئے حالات

اسد رضوی (مظفر پور)

## غزل

وہ پھول میری ہی آنکھوں کے خواب جیسا تھا
کہ دھوپ دھوپ شگفتہ گلاب جیسا تھا
تمام عمر کی بے چینیاں تھیں کیف آگیں
وہ ایک لمحہ خوشی کا عذاب جیسا تھا
ہر ایک حرف' میں پوشیدہ اک کہانی تھی
ہر ایک لفظ' مکمل کتاب جیسا تھا
نشاط و کیف کے لمحے اُسی کے دم سے تھے
جو میرے دل میں کبھی اضطراب جیسا تھا
مرے عذاب کی ساعت تھی اک صدی کیطرح
مری نجات کا لمحہ حباب جیسا تھا

آمر سورتی (سورت)

## غزل

انہیں بہار کا پھر انتظار کیا ہوگا — جنہیں خبر ہے سلوک بہار کیا ہوگا
وہ حادثہ کہ جسے حادثہ کہا جائے — کسی طرح بھی کبھی خوشگوار کیا ہوگا
زیادہ آپ کے دیوانۂ محبت سے — کوئی بھی با اثر و با وقار کیا ہوگا
نہ تم کو پاس زباں ہے نہ خوفِ رسوائی — تمہارا وعدہ کوئی استوار کیا ہوگا
یہی نصیب رہا اہلِ دل تو وہ غم بھی — ہے جس پہ ناز تمہیں سازگار کیا ہوگا
زمانہ بے سبب آزار اور میں حساس — مجھے سکوں مجھے حاصل قرار کیا ہوگا

[illegible] ہو آمر ہما بھی غیرت کی
زمانہ مجھ بھی کہے شرمسار کیا ہوگا

مصطفیٰ مومن (دھنباد)

## غزل

کسی شجر کی طرح باغ میں چہکتا تھا
وہ دھوپ دھوپ بدن دل کو کیسا لگتا تھا
لچکتی شاخوں پہ بیٹھا تھا اک اداس پرند
پلٹ پلٹ کے گئے موسموں سا تکتا تھا
گلوں کی شاخ پہ سہمے ہوئے تھے سارے پرند
بھیانک ایسا تھا موسم کہ جی لرزتا تھا
ہوا کے خوف سے بادل تو دور بھاگ گئے
پہ ایک تنکا تھا جو ساتھ ساتھ چلتا تھا
ٹھٹھر چکا تھا بدن گرم گرم جھونکوں سے
فضا تھی سرد مگر میرا جسم جلتا تھا

قمر سنبھلی (دہلی)

## غزل

سبز رسم پہ حاشیہ لکھ دو
تھ لہرا کے تم حنا لکھ دو
ہ تو پڑھ لے گا ساری تحریریں
ہواؤں پہ مدعا لکھ دو
نہر یاروں سے رسم و راہ نہیں
جو چاہو اسے آنا لکھ دو
رے چہرے سے ان کے چہرے تک
رد موسم کا سلسلہ لکھ دو
یک اک حرف زہر ہے جس کا
ن کے حق میں قمر دعا لکھ دو

پریمی رومانی (سری نگر)

## غزل

دیکھ کر تجھ کو نہ جانے کیوں اِدھر
کھل رہے ہیں خود بخود دیوار و در
یا رقم کر پانیوں پر اپنی بات
یا سلگتی ریت پر آ کر بکھر
زندگی کا یہ حسیں منظر تو دیکھ
دو پرندے ہم سخن ہیں شاخ پر
یا خلا کو اپنی مٹھی میں سما
یا ندی بن کر سمندر میں اتر
فائدہ خالی گرجنے سے ہے کیا
چپکے سے اے ابر آوارہ گذر

سردار ایاغ (بنگلور)

# آزاد غزل

مری تخلیق پچھے تجربوں کی نیم عریاں جنتر کاری ہے
بہر صورت یہ کڑوی دعوید ارزاں ہے
جواں سالی، ضعیفی میں ہوئی تبدیر اپچھلی نسل کی لیکن،
ابھی تک فکر کی دیوی کنواری ہے
جو کرنوں کے بغیر اک ہاتھ بھر کا راستہ طے کر نہیں سکتا
زمانہ ایسے سورج کا پجاری ہے
جنوں کی سب سے اونچی اور عمدہ قسم کو الہام کہتے ہیں
نہے قسمت وہ فنکاروں پہ طاری ہے
ایاغ، آوارہ پتھر میں نشانِ میل بننے کی لگن دیکھی
مگر پھولوں کا دل جذبہ سے عاری ہے

یوسف راہی (بنگلہ دیش)

# غزل

دو سروں کو روشنی دیکر اندھیروں میں رہا
پھر کہیں جاکر سدا جلنے کا فن ہم کو ملا
آرزوِ منزل کی لے کر گھر سے نکلے تھے مگر
گمرہی ہم کو ملی، آوارہ پن ہم کو ملا
کھنچے ہیں آج پھر دھرتی کے ماتھے پر شکن
آگ برساتا ہوا نیلا گگن ہم کو ملا
اب بھلا تڑپائے گی کیا پیاس کی شدت ہمیں
اپنی ہی آنکھوں کا جب گنگ و جمن ہم کو ملا
کوئی مانے یا نہ مانے صرف راہی کے یہاں
وحدتِ فکر و نظر، معیارِ فن ہم کو ملا

اظہار مسرت (جے پور)

# غزل

سخت جانوں کا ہے برسوں سے مقدر صحرا — پی گیا پیاس کے کتنے ہی سمندر صحرا
استقامت کا دھنی مثلِ قلندر صحرا — تپ رہا ہے کئی صدیوں سے برابر صحرا
قافلے شہر سے صحرا کی طرف جاتے ہیں — جانب شہر ہوا کرتا ہے رہبر صحرا
تمتماتے ہوئے سورج کی نظر سے دیکھو — وادیٔ ریگ ہے یا دھوپ کا بستر صحرا
غم میں تپ تپ کے بنا ہوں میں مسرت یارو — میرے باہر ہے گلستاں مرے، اندر صحرا

**اظہر ادیب (پاکستان)**

## غزل

خود کو میں نقطۂ پرکار بنانا چاہوں
مرے ہی گرد رہے سارا زمانہ چاہوں

یوں خلاؤں میں بھٹکتا رہوں آخر کب تک
اپنی آواز ہوں اب لوٹ کے آنا چاہوں

اسکی آنکھوں میں نہیں رنگ شناسائی تک
اور اک میں کہ تعلق وہ پرانا چاہوں

گرتی دیوار کے سایے میں سمٹ کر اظہر
جسم کو دھوپ کے اژدر سے بچانا چاہوں

**شاہد جمیل (پٹنہ)**

## غزل

تو لفظ ہے تو صدا بھی ہو لے
مجھ سا ہے تو کچھ مرا بھی ہو لے

یوں بھی حقِ دوستی ہے واجب
کیا خوب جو کچھ وفا بھی ہو لے

ناکردہ سہی، مگر خطا تھی
اچھا ہے، کوئی سزا بھی ہو لے

پھولوں سے یہ چہرے کل نہ ہونگے
اس رسم کی ابتدا بھی ہو لے

کھڑکی کو نہ زنگ لگتے دیکھوں
اُبھرا ہوں تو کچھ خطا بھی ہو لے

**امان اختر (اورنگ آباد۔ مہاراشٹر)**

## غزل

یہ کرم ہے ترا مجھ پر مجھے پیاسا رکھا
اک اسی آگ نے اب تک مجھے زندہ رکھا

بے نظر لوگ بھلا کیسے سمجھ پائیں گے
نام کیا سوچ کے میں نے ترا دریا رکھا

کس سلیقے سے مجھے دھوپ کو سونپا تو نے
کس خوشی سے مری راہ میں صحرا رکھا

آئینہ مجھ کو دکھانے کی نہ کوشش کیجے
آئینے ہی نے تو برسوں مجھے اندھا رکھا

دور جاؤ نہ کہیں ڈھونڈنے قاتل کو مرے
میری گردن پہ ہے اس شخص کا چہرہ رکھا

رحمت امروہوی (احمد آباد)

یادِ رفتگاں

# وہ عیسیٰ خان نشتر تھا

مونچھیں اتنی بڑی کہ ہندوستان میں نمایاں حیثیت کی حامل
بھی مہندی اور کبھی خضاب سے مزین داڑھی صاف سر پر ترکی ٹوپی کوٹ
پتلون زیب تن پاؤں میں کبھی پٹھانی چپل کبھی بوٹ آواز پاٹ دار
دانت صاف اور چمکدار اور سب سلامت ہونٹوں پہ دبا ہوا کٹورے
سگریٹ یہ تھے عیسیٰ خان نشتر جو ہمیشہ اپنا نام
"سرِ پنچ افغانِ ہند عیسیٰ خان نشتر کالو پورٹا در احمد آباد"
..س طرح لکھتے تھے اور دوسروں کو بھی تاکید کرتے تھے کہ میرا پورا
نام اسی طرح لکھا جائے دنیا بھر کے سیاسی رہنما صدر شہنشاہ
علم استار و شعرار کو تعزیتی پیغام و مبارکباد کے خطوط بڑے اہتمام
کے ساتھ خوبصورت کتابت کرا کے بھیجتے تھے۔ اور جوابات بھی بہت
اہتمام کے ساتھ اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے۔ اپنے ملنے والوں دور سے
آنے والے مہمانوں کو وہ خطوط دکھاتے تھے۔ دنیا کے عمائدین و
.برین کے خطوط کا بہت بڑا ذخیرہ مرحوم کے پاس موجود تھا اور یہ
ان کا اپنا ذاتی شوق تھا۔ انتقال سے کچھ سال قبل مرحوم نے اپنی
سوانح حیات مرتب کرنی شروع کی تھی لکھنے کیلئے یکے بعد دیگرے
کئی آدمی مقرر ہوئے۔ سوانح حیات کا کتنا حصہ لکھا جا چکا تھا۔
اور کتنا باقی رہ گیا اس سلسلے میں کوئی تفصیل نہ مل سکی۔ مرحوم صبح
بیت نکلنے سے قبل کافی وقت خود کو بنانے اور سنوارنے میں صرف
کرتے تھے۔ ان کی سج دھج اور بانکپن سے انکی عمر کا اندازہ نہیں ہو
پاتا تھا۔ حالانکہ ان کی عمر کافی تھی مجھ سے اکثر کالو پورٹا در پر کبھی
صبح کبھی شام ملاقات ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے مرحوم سے
ازراہ مذاق — پوچھا خانصاحب آپ کی عمر تو کافی ہے پھر آپ
اتنی عمر میں اس قدر میک اپ اور یہ بناؤ سنگار کیوں کرتے ہیں
انھوں نے جواب دیا کہ — رحمت صاحب دراصل جو شخص
ہر وقت یہ محسوس کرنے لگے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے تو وہ وقت
سے پہلے بہت جلد بوڑھا ہو جاتا ہے۔ میں خود میں بڑھاپے
کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتا ہر روز صبح کو آئینے کے سامنے
کھڑا ہو کر خود کو سنوارتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ میں ابھی جوان
ہوں اور اپنے دل کو جوانی کا یقین دلاتا ہوں ہمہ وقت چاق و چوبند
رہتا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ مجھ میں بڑھاپے کے آثار نمایاں نہیں ہیں
نشتر صاحب کو دیکھ کر ان کے خیال کی تائید کرنی پڑتی تھی۔ وہ
جس طرف سے گذر جاتے لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھ جاتی
تھیں۔ اتنی بارعب شخصیت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ اگر کسی
بچے کی طرف نظر اٹھا کر غور سے دیکھ لیتے تو وہ یا تو بھاگ جاتا یا
پھر ڈر کر رونے لگتا۔ ایک مرتبہ اخبار میں مونچھوں کے مقابلے کا
اشتہار شائع ہوا۔ مرحوم نے اپنی بھی ایک تصویر اس مقابلے
میں بھیجی اور تیسرے انعام کے مستحق ہوئے۔

گاندھی جی کی سودیشی تحریک کے حامی اور ہمنوا تھے لیکن
اس پر عمل کرتے میں نے انھیں نہیں دیکھا۔ لوگوں سے سنا
ہے کہ مرحوم نے مشاعروں کے لئے عمدہ قسم کے ٹاٹ کا

ایک لمبا کوٹ سلوایا تھا جسکو گجرات میں کفتان کا کوٹ کہتے ہیں
وہ یہی لمبا کوٹ یا امامہ پہن کر مشاعروں میں جاتے تھے ۔ کچھ عرصہ
تک " نشتر" نام کا ایک اردو پرچہ بھی نکالا اور ایک کتاب
"حساب القرآن" کے نام سے گجراتی رسم الخط میں شائع کی یہ کتاب
منظوم تھی ۔ قرآن میں ہر حرف کتنی کتنی بار استعمال ہوا ہے اس
کا شمار کرکے انھیں نظم کیا تھا ۔ اس کتاب کے خریدنے والے کو
اپنی فل سائز تصویر جو آرٹ پیپر پر چھپی تھی مفت دیتے تھے مرحوم
شہرت کے ضرورت سے زیادہ دلدادہ تھے کافی پیسے خرچ کرکے
رسائل میں اپنی تصویریں شائع کراتے تھے اور اس رسالے کی کاپیاں
کافی تعداد میں منگا کر لوگوں میں تقسیم کرتے تھے ۔ مرحوم نے اس طرح
کا ایک رسالہ مجھے بھی دیا تھا ۔

یہ ۱۹۴۷ء کے بعد کی بات ہے اس وقت اردو زبان کا
جھگڑا ابھرا تھا اور مرحوم کی ایک غزل بھی اس پرچے میں شامل
تھی جس کے دو شعر ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں ؂

عربی فارسی بھاشا کی دکاں ہے اردو
ہند کے واسطے موزوں زباں ہے اردو
اسکو دینی جو ترقی ہے تو میدان میں آؤ
ورنہ پھر ہند سے بے نام ونشاں ہے اردو

عیسیٰ خان نشتر

مرحوم نے ایک کل ہند مشاعرے کا بھی اہتمام کیا تھا جس میں
اس وقت کے کئی مشاہیر شعرائے شرکت کی تھی ۔ غالباً حسرت موہانی
بھی اس مشاعرے میں شریک تھے یہ مشاعرہ ہٹی سنگھ کی واڑی میں
ہوا تھا اور کافی دنوں تک اس مشاعرے کا چرچا رہا ۔

مناظر عاشق ہرگانوی

# عکس ریز

(تبصرہ کے لئے کتاب کی دو جلدیں بھیجئے)

**مطالعہ سحر البیان** — سید نجم الحسن انجم ادیب۔
صفحات ۱۱۴ — قیمت چار روپے پچاس پیسے۔
ناشر: نسیم بکڈپو، ۲۵ لاٹوش روڈ، لکھنؤ
مصنف کا پتہ: شہسوار منزل، بالمقابل بازار گیٹ، ایم بی روڈ کولار 563101

میر حسن نے یوں تو کئی مثنویاں لکھیں لیکن "سحر البیان" بجا مشہور ہوئی۔ یہ ان کی آخری تخلیق ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اس میں ان کے ادبی اور ذہنی تجربوں کا نچوڑ ملتا ہے۔ اس میں مختلف رسومات، عقائد، رہن سہن کے طریقے، پیشے بازار، محل، دربار، عوام وغیرہ سب کا حال مل جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک 'سحر البیان' کے قصے کا تعلق ہے، وہ مکمل طور پر منفرد نہیں ہے۔ اس مثنوی کے کچھ اجزاء "باغ و بہار" "چار درویش" "لعل و گہر" "گل بکاؤلی" "سنگھاسن بتیسی" اور الف لیلیٰ، وغیرہ میں بھی ملتے ہیں۔

مثنوی 'سحر البیان' ملک و بیرون ملک کی بیشتر یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔ سید نجم الحسن ادیب نے 'مطالعہ سحر البیان' لکھتے وقت اس پہلو کو سامنے رکھا ہے اور ۲۲ عنوانات کے تحت اس مثنوی کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ مثنوی اور اس کی تکنیک، دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا، شمالی ہند میں مثنوی، کچھ میر حسن سے متعلق، تصانیف میر حسن، مثنوی سحر البیان، سحر البیان کی تکنیک، سحر البیان کے متعدد تراجم، سحر البیان کا اخذ، سحر البیان ایک مطالعہ، سحر البیان کے کردار، زبان و بیان، تشبیہات، مکالمہ نگاری، جذبات نگاری، منظر نگاری، سراپا نگاری، سحر البیان میں ہندی الفاظ، مافوق الفطرت عناصر سحر البیان میں ضرب المثل اشعار، سحر البیان کی مقبولیت اور ارباب علم کی نظر میں سحر البیان جیسے عنوانات پر بحث کی گئی ہے۔ لیکن یہ بحث اور جائزہ بیحد تشنہ ہے۔ اس مثنوی کی اہمیت کے پیش نظر تفصیلی تجزیہ کی ضرورت تھی۔

کتابت، طباعت اور کاغذ گوارا ہے۔

---

**آب بقا** — ش، م، عارف ماہر آروی
صفحات ۳۸ — قیمت دو روپے
پتہ: ۵۷۶، ہائی کورٹ فلیٹس، لال بہادر شاستری نگر پٹنہ ۱

عارف ماہر آروی بہار کے پُرگو شاعر ہیں۔ شاعری کے علاوہ عروض پر بھی مہارت رکھتے ہیں۔

"آب بقا" میں غالب کی زمین میں عارف صاحب کی ۲۵ غزلیں شامل ہیں۔ غالب کے آہنگ شعری کو اپنانے والے شعرا کی تعداد کم نہیں ہے لیکن عارف ماہر آروی کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے حیات و کائنات کی نودئی کو ایک واضح اور مثبت شکل دینے کی کوشش کی ہے، ساتھ ہی اپنی غزلوں میں تشکیک، بے یقینی، بے اطمینانی اور نت نئی محرومیوں کو اجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔ غالب کی نزاکتوں کو فن میں سمونے کی کوشش میں اکثر شعراء لڑکھڑا گئے ہیں لیکن ماہر صاحب چونکہ ماہر عروض ہیں اس لئے بڑی مہارت سے اس پل صراط سے گذر گئے ہیں۔ ان کی غزلوں کی تازہ کاری کی دو ایک مثال ملاحظہ فرمائیے ؎

زمیں تانبے کی ہوتی جارہی ہے
سوا نیزے پہ سورج آگیا ہے

(باقی صفحہ ...)

خواجہ عبد الغفور (بمبئی)
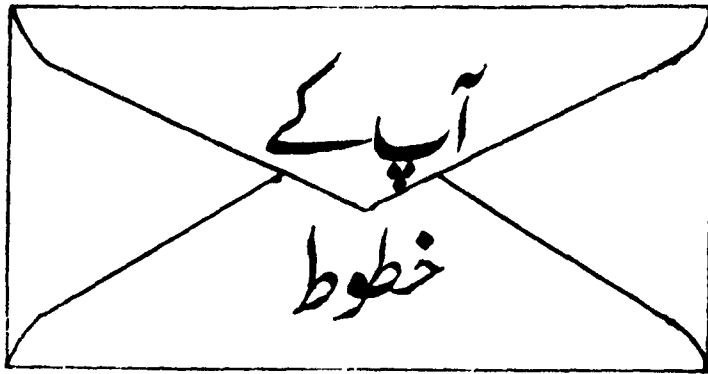
آپ کا موقر جریدہ گلبن پابندی سے موصول ہوتا ہے۔ اور اس کے معیار اور دیدہ زیبی کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ آپ کی مساعی اور ادبی ذوق و شوق کا یہ سارا کارنامہ ہے جس کے لئے آپ لائق مبارکباد ہیں حسب فرمائش ایک مختصر سا انشائیہ مرسل ہے۔

یوسف ناظم (بمبئی)

(۱) آپ کا کرم نامہ آج ہی موصول ہوا۔ گلبن پابندی سے مل رہا ہے۔ میں آپ کا ممنون ہوں۔ سالنامے کی اشاعت کی خبر دلِ خوش کن ہے آپ کی دعوت کا شکریہ۔ جلد ہی کوئی مضمون بھیجوں گا۔ پسند نہ بھی آئے تو بھی شائع کر دیں۔ اور وہ کیسے ہیں مناظر عاشق ہرگانوی۔ اُن کا کالم "پوسٹ مارٹم" معلوم نہیں کہاں کہاں سف ماتم بچھا رہا ہے۔

(۲) آپ کو میرا پوسٹ کارڈ مل گیا ہوگا۔ آپ کو خط لکھنے کے بعد دوسرے دن ہی مناظر عاشق ہرگانوی کا خط مجھے ملا۔ یہ ڈاک سے تو آیا لیکن ذرا رک رک کر ۲ ستمبر کا خط تھے، استمبر کو ملا۔ میں نے انھیں بھی خط لکھ دیا ہے۔ اُن کے خط میں میرے متعلق پوسٹ مارٹم کے شائع کرنے کی خبر تھی۔ میں نے ان سے معذرت کرلی ہے۔ اور لکھا ہے کہ جو کچھ بھی وہ چھاپنا چاہتے ہیں ابھی نہ چھاپیں۔ آپ بھی میرا پوسٹ مارٹم ابھی نہ کریں — سالنامے کے لئے مضمون بھیج رہا ہوں۔ اور ایک تصویر بھی تاکہ آپ یقین کر سکیں کہ مجھے ابھی اس سلوک کی ضرورت نہیں ہے۔

مہدی پرتاپ گڈھی (پرتاپ گڈھ)

گلبن کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ کرم فرمائی کے لئے مشکور ہوں۔ جولائی کا اداریہ پڑھنے کے بعد احساس ہوا کہ گلبن کی اشاعت پر خریداروں (یا پھر اردو والوں) کی چشم پوشی اثر ڈال رہی ہے۔ یہ اردو کے اُن پرچوں کا المیہ ہے جن کے ساتھ فلموں اور اشتہاروں کی بیساکھی نہیں لگی ہے۔ ادبی پرچے ایک ایک کرکے بند ہو رہے ہیں۔ خدا کرے "گلبن" اِن مشکلات سے عہدہ برآ ہو سکے۔

غنی رتلامی (بڑودہ)

گلبن کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ نہایت پاکیزہ نعتوں کے ساتھ، پوسٹ مارٹم، نظمیں، سیر حاصل غزلیں، افسانے،

جناب رام لعل کا سفر نامہ، کے علاوہ دلکش مضامین، جناب رحمت امروہوی کا "یادرفتگاں" وغیرہ پسند آئے۔ یقیناً آپ کی محنت اور علمی سوجھ بوجھ قابلِ ستائش ہے۔

بدیع الزماں خاور (داپولی)

گلبن ملتا رہا ہے۔ آپ نے صلاح الدین پرویز کا خوب پوسٹ مارٹم کیا ہے۔

اعجاز (نئی دہلی)

گلبن بدستور مل رہا ہے۔ مسرت ہے کہ اس بار راون کا پوسٹ مارٹم ہوا۔

ظفر ہاشمی (جمشید پور)

جولائی نیز اگست ستمبر ۲ ماہ گلبن نظر نواز ہوا شکریہ۔ حسب روایت یہ شمارے بھی اپنی شناخت لئے ہوئے ہیں۔ ٹائٹل پیج کی خوشگوار تبدیلی نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ پرویز کا پوسٹ مارٹم ٹھیک وقت پر ہوا ہے گلبن کے پوسٹ مارٹم سے بے باکی اور حق گوئی کی ایک تابناک مثال سامنے آتی ہے۔ یہ سلسلہ بڑی جگرکاری چاہتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ مناظر صاحب اس پل صراط سے اب تک بے خوف وخطر گذر رہے ہیں۔ ... ... ... ثمینہ راجہ کی نظم "شدت کے موسم" انتہائی نازک احساسات کی حامل ہے۔ جو اپنی ندرت اور تاثیر کی وجہ سے مدتوں یاد رہیگی۔

نور ملت پوری۔ (بھوپال)

گلبن کا تازہ شمارہ اگست ستمبر ۲ ماہ بصد خلوص نظر نواز ہوا۔ طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ ادارہ کی دوربین نگاہیں ادبی اور ثقافتی انتخاب کے لئے ماہر ہیں۔

منظر اعجاز (مظفر پور)

گلبن کے حالیہ شمارہ میں میرا ایک مضمون ہے۔ میرے نام میں مظفر پوری جوڑ دیا گیا ہے۔ میں منظر اعجاز کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں لکھتا۔ مظفر پور میرا آبائی شہر نہیں۔ یہاں چند برسوں سے مقیم ہوں۔

سردار ایاغ (بنگلور)

گلبن پابندی سے مل رہا ہے۔ تازہ شمارہ میں آزاد غزل کی اشاعت کے لئے تہہ دل سے ممنون ہوں۔ اس مرتبہ نام و مقام کی کتابت صحیح ہوئی ہے۔ لیکن غزل میں کتابت کی لغزش سے کچھ تبدیلیاں پیدا ہوگئیں جن میں سب سے نمایاں مقطع کے مصرعہ اولیٰ میں "رہگذار ہنر" کی جگہ "رہگذار شہر" کی ترکیب ہے۔ مناسب سمجھیں تو تصحیح فرمادیں پرچہ سے متعلق صرف اتنا کہوں گا کہ آپ کی عرق ریزی نے گٹ اپ سے لیکر معیار تک کو زندگی بخش دی۔

گجرات سے نکلنے والا واحد علمی ادبی اور ثقافتی

ماہنامہ

# گلبن

## احمد آباد

سالنامہ قیمت ۵/ روپئے

دسمبر سنہ ۱۹۸۲ء
جنوری سنہ ۱۹۸۳ء

جلد ۶
شمارہ ۵
۶۱ واں، ۶۲ واں

نگراں
سید محمد حکیم الدین شیرازی

منتظم اعلیٰ
سید احمد مختار غوثی

مشیر
سید علی احسن بخاری

ایڈیٹر
ثریا ہاشمی

مینجنگ ایڈیٹر
ظفر ہاشمی

ترتیب کار
مناظر عاشق ہرگانوی

### بدل اشتراک

| | | |
|---|---|---|
| لائف ممبری | | ۲۵۰ روپے |
| زرتعاون (سالانہ) | | ۲۵ روپے |
| زر سالانہ | | ۲۰ روپے |
| غیر ممالک میں | بحری ڈاک سے | ۲ پونڈ |
| | ہوائی ڈاک سے | ۵ پونڈ |
| عام شمارہ | | ایک روپیہ پچہتر پیسے |

پتہ: ۱۶۹/۲۰ گجرات ہاؤسنگ بورڈ کالونی، شاہ عالم، احمد آباد ۳۸۰۰۲۸ (گجرات)

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: ثریا ہاشمی

مطبع نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد یوپی (انڈیا)

# فہرست



## نظمیں



## رُباعیات۔ گیت۔ قطعات



## افسانے

## طنز و مزاح



## غزلیں / آزاد غزلیں / دوہے



## یادیں



## سفر نامہ



## مضامین



## یاد رفتگاں



## بچوں کے لئے



## عکس ریز

اداریہ

# آبلہ پا

لیجئے گلبن کا سالنامہ حاضرِ خدمت ہے۔ اس کے ساتھ آپ کے رسالے نے نصف دہائی کا سفر مکمل کر لیا ہے اور جلد ششم کی دو منزلوں کو بھی پار کر گیا۔

بڑا کٹھن اور پُرخار رستہ تھا۔ یہاں تک آتے آتے پیروں میں آبلے پڑ چکے ہیں مگر چہرہ؟ — ہاں چہرہ۔ وہ تو آپکے سامنے ہے۔ لیکن صحتمندی کا بھرم کب تک قائم رہے گا ان چھالوں کو دیکھنے والے کتنے ہیں۔

اگر صورتِ حال یہی رہی تو چاہے ہم شہید ہوں یا غازی مگر جنگ ہار ضرور جائیں گے۔

مجبوراً زیرِ نظر شمارہ سے زرِ سالانہ اور قیمت فی پرچہ میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ ہم پہلے بھی اپنے قارئین کو مطلع کر چکے ہیں کہ آپکے ہاتھوں میں پہنچنے تک گلبن پر فی کاپی دو روپے خرچ ہو چکے ہوتے ہیں پھر یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ اسکی قیمت محض سوا روپے رکھی جائے۔ یہ بظاہر معمولی سی بات ہماری سمجھ میں اب آئی — یعنی پانچ سال بعد

ہمیں امید ہے کہ کم از کم ایسے قارئین جو اب تک ادبی یا اخلاقی جذبے سے متاثر ہو کر یا ازراہ ہمدردی گلبن کو اپنا پُرخلوص تعاون عنایت کرتے رہے ہیں وہ اس معمولی اضافے کو خوش دلی سے برداشت کر لیں گے تاکہ سفر جاری رہے — آبلہ پا ہی سہی۔

ثریا ہاشمی

سید ظفرالحسن ہاشمی۔ایم۔کام
(مینجنگ ایڈیٹر)

مناظر عاشق ہرگانوی۔ایم۔اے۔
(ترتیب کار)

سید محمد محیم الدین عموازی (ریقانو ملحقو)

پیرزادہ سید احمد مختار غونی
(منتظم اعلیٰ)

سید علی احسن بخاری ایم اے
(مشیر)

# مجھے بھی کچھ کہنا ہے

"گلبن" کی ترتیب و تہذیب میرے ذمے ہے ۔ "کوہسار" (بھاگلپور) میں خود نکالتا ہوں. ماہنامہ "خوشبو" (دہلی) اور ماہنامہ "اسحاق" (پٹنہ) سے بھی وابستہ ہوں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی تخلیق کسی مخصوص رسالہ کے لئے آتی ہیں اور میں اسے کسی دوسرے رسالہ میں شائع کر دیتا ہوں، آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ اس لئے کہ اپنی سہولت کے مطابق اور معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں تخلیقات کو جگہ دیتا ہوں ۔ بعض قلمکار حضرات نے اس پر اعتراض کیا ہے ۔ جواب میں صرف اتنا کہنا ہے کہ معیاری تخلیقات کی اہمیت کا احساس خود مجھے ہے اور میں انہیں باذوق قارئین تک ہر حال میں پہنچاتا ہوں۔ ویسے میری کوشش ہوتی ہے کہ شکایت کا موقع کسی کو نہ دوں ۔

مجھے یقین ہے کہ نئے پرانے تمام قلمکار حضرات کا تعاون اسی طرح ملتا رہے گا ۔ شکریہ !

مناظر عاشق ہرگانوی

مارواڑی کالج ۔ بھاگلپور ۔ (بہار)

# حمد

اختر آفاق (سورت)

نوائے صبحِ ازل لا الٰہ الا اللہ ✦ صدائے ختمِ رسل لا الٰہ الا اللہ
فروغِ ذہنِ فروزاں عروجِ فکر و نظر ✦ کمالِ حسنِ عمل لا الٰہ الا اللہ
نشاطِ قلب و سرورِ نگاہ و دیدہ وراں ✦ عروجِ قوم و ملل لا الٰہ الا اللہ
خروشِ صبحِ بہاراں فروغِ روحِ حیات ✦ سکوتِ شامِ اجل لا الٰہ الا اللہ
تمام شورشِ الحاد و شورِ عصیاں میں ✦ ہے ایک موجِ خلل لا الٰہ الا اللہ
گراں ہے کفر کے ہر فلسفے کی ندرت پر ✦ بس ایک حرفِ علل لا الٰہ الا اللہ
نہیں ثبات جہاں میں کسی بھی شئے کو مگر ✦ ہے ایک بات اٹل لا الٰہ الا اللہ
کہی جو بات رسالتمآب نے اس کی ✦ مثال ہے نہ بدل لا الٰہ الا اللہ

ہزار بَل ہیں زمانے میں پھر بھی اے اختر
بلوں میں ایک ہی بَل لا الٰہ الا اللہ

نذیر فتح پوری (پونا)

حرف ہر نرم و سخت ہے تیرا ✦ ہم رہیں بے بخت، بخت ہے تیرا
پہلے آسان تھی رفاقت بھی ✦ اب تو ملنا بھی سخت ہے تیرا
صرف خرقہ مرا مقدر ہے ✦ تاج ہے تیرا، تخت ہے تیرا
اِک مرے ٹوٹے دل کی بات نہیں ✦ ہر دلِ لخت لخت ہے تیرا
میں مسافر ہوں چند سانسوں کا ✦ میرا سب بخت و رخت ہے تیرا
ہے زمینوں پہ حکمرانی تری ✦ آسمانوں پہ تخت ہے تیرا

کیوں ہے بے سایہ پھر بھی تیرا نذیرؔ
ڈالی، ڈالی، درخت ہے تیرا

# نعت

## عابد حشری

نازشِ آدم فخرِ دوعالم
مظہرِ اول مرسلِ خاتم

اصلِ ظہورِ جلوۂ پنہاں
وجہِ بنائے بزمِ دوعالم

خالق کی آیات کا مظہر
فطرت کے اسرار کا محرم

فرشِ زمیں پر ماہِ درخشاں
عرشِ علی کا نیّرِ اعظم

مُردہ دلوں کو عیسیٰ دوراں
خشک لبوں کو جرعۂ زمزم

روحِ تصور جانِ تمنا
حسنِ سراپا عشقِ مجسم

مخبرِ صادق مظہرِ خالق
معنیٰ قرآں آیۂ محکم

بابِ کرم محرابِ ترحم
خیرِ مکمل خُلقِ مجسم

ساقیٔ کوثر شافعِ محشر
قاسمِ جنت رحمتِ عالم

مالکِ دنیا ناظمِ عقبیٰ
سرورِ ذی شان سیدِ اکرم

ہر منزل پر مشعلِ منزل
ہادیٔ کامل رہبرِ اعظم

آپ کا حشری بے سروساماں
سایۂ رحمت، رحمتِ عالم

# آزاد نعت

## خواب افلاکی (بجنور)

اے رسولِ خدا

ابھی تو

کمندِ ہوا میں گرفتاریوں کی سمتوں کا کوئی تعین نہیں

ابھی

نفیٔ حق کو تردید و تنسیخ کے ان گنت مرحلوں سے گزرنا پڑے گا

بازگشتوں کے مہمل تصادم کی ہر چاپ

صدیوں سے یونہی چلی آرہی ہے

میں عصیاں زدہ

کچھ نہیں جانتا

پھر بھی مجھکو یہ معلوم ہے

کہ لکیریں حسیں زاویوں کی تگ ودو میں آکر جہاں

نقطۂ آخری پر ٹھہر جاتی ہیں

بس وہی آپ ہیں

اے رسولِ خدا

شبنم سبحانی (ٹانڈہ)

# ارمغان خلوص

## بحضور خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ

دلوں کو ساغرِ عرفاں پسند ہے اب تک
لبوں سے نعرۂ وحد بلند ہے اب تک

تری نگاہ محبت تری ادائے خلوص
دلِ بشر کے لئے نقش بند ہے اب تک

برس گیا ہے کچھ اس طرح تیرا ابر کرم
یہ سرزمیں تری احسان مند ہے اب تک

وہ کیمیائے سعادت ہے تیری ذات سے اُنس
کہ زہر بغض و حسد بے گزند ہے اب تک

وہ مشت خاک کو رفعت ملی ہے تیرے طفیل
فصیلِ عرش بھی زیرِ کمند ہے اب تک

تری نگاہ نے ذرّوں کو آفتاب کیا
غبار خاک نشیں سربلند ہے اب تک

تری نظر نے وہ بخشے ہیں گنج ہائے نبات
کہ آب گنگ و جمن مثلِ قند ہے اب تک

کسی کو یاد نہیں خسروانِ عقل کے نام
فقیر عشق کا پرچم بلند ہے اب تک

غرور کبر کے ساغر چھنک کے ٹوٹ گئے
سفال فقر مگر ارجمند ہے اب تک

خرد کا یہ چم و خم یہ ہوس کا قصر بلند
تری نگاہ میں مثلِ سپند ہے اب تک

وہ ناخدا خو سفینے ڈبو دے ساحل پر
ترے حضور وہی ہوشمند ہے اب تک

عطا ہو دولتِ غم تیرے اس سوالی کو
یہ شہسوار ترا بے سمند ہے اب تک

اِدھر ہے نور یقیں سے مری نظر محروم
رخ گمان پہ اُدھر زہر خند ہے اب تک

خدا نواز دے پھر جست و خیز غوری سے
کہ یہ غزال ترا بے زغند ہے اب تک

مجھے نصیب ہو سرمایہ گداز عمل
کہ یہ خزینہ ترا مہر بند ہے اب تک

# "پوسٹ مارٹم"

(اس بار 'پوسٹ مارٹم'، کے تحت منیب الرحمٰن کی نظم "اس کی آواز میں"، پر، مشہور ناقد شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید ملاحظہ فرمایئے۔ ہرگانوی)

## منیب الرحمٰن

"اس کی آواز"

اس کی آواز میں
آئینے سے بدن
جھلملانے لگے
دھوپ چھاؤں کے ہلتے ہوئے پیرہن
سرسرانے لگے
اور دل نے کہا
اس کے ایسے خدوخال ہیں
اس کے اعضا کے خم
ریشمی موج کے زیروبم
اس کے شانوں پہ بکھرے ہوئے بال ہیں
وادی وکوہ میں!
رنگ وبو کے سراسیمہ انبوہ میں
وہ جھلکتا ہوا راز تھی
صرف آواز تھی

## شمس الرحمٰن فاروقی

میں اس نظم کو ایک مخصوص معنوں میں اپنی طرح کی واحد نظم سمجھتا ہوں۔ آواز کے حسن EVOCATIVE اور انسلاک کی قوت اسکے جذباتی اثر، اس طرح کے موضوعات یا تجربات نے شاعروں کو ہمیشہ اپنی طرف کھینچا ہے۔ لیکن آواز کے ساتھ ہمیشہ کسی بولنے والے کا تصور موجود رہا ہے یعنی جس آواز نے شاعر کو متحرک کیا ہے شاعر اسکے مالک سے واقف ہے اس لئے آواز کی دلکشی میں موضوعی تعصب کو بھی دخل ہے۔ میں الف کو عزیز رکھتا ہوں۔ اس کی آواز بھی مجھے عزیز ہے، لہٰذا جب میں الف کی آواز سے متاثر ہو رہا ہوں تو اس میں داخلی تعصب کو بھی دخل ہے جو الف کے لئے میرے دل میں ہے گویا میں الف کے حسن یا دلکشی یا قوت کا ایک انعکاس بھی اس کی آواز میں دیکھتا ہوں۔ منیب الرحمٰن کی اس نظم میں وہ کیفیت نظر آتی ہے۔ جب دیکھنے والا دوربین کے الٹے سرے سے کسی چیز کو دیکھتا ہے یعنی یہاں الف کے حسن میں دیکھا جا رہا ہے۔

اس صورتِ حال پر یوں غور کیجئے: آپ کسی جگہ سے گزرتے ہوئے قریب کے مکان سے کسی کے گانے، بولنے یا ہنسنے کی آواز سنتے ہیں یا آپ ٹیلیفون پر کسی کی آواز سنتے ہیں۔ آپ آواز کے مالک سے واقف نہیں ہیں اور نہ اس سے واقفیت کا کوئی امکان ہے بلکہ واقفیت کبھی پیدا بھی نہیں ہوتی بس گزرتا ہوا روشنی کا جھماکا ہے جو اس لمحہ کو منور کرتا چلا جاتا ہے۔ آواز کی نقرئی کھنک آپ کے تخیل میں خود بخود صاحبِ آواز کی شکل تراشنے لگتی ہے۔ اس خودکار شکل تراشی میں اس بات کا بھی دخل ہے کہ صاحبِ آواز سے ملاقات کا کوئی امکان نہیں ہے اس لئے خیال پیکر کا حقیقت سے ٹکراؤ

بھی بعید از قیاس ہے۔ اس ٹکراؤ کے بعید از قیاس ہونے کے۔ باعث حقیقت سے دوچار ہونے اور خیالی پیکر سے اس کے مختلف ہونے کا امکان جو لاشعور کی شکل تراشی میں ایک حد تک احرام و تحریم کا کام کرتا وہ امکان بھی موجود نہیں ہے۔ اس طرح شکل تراشی اپنی تمام قوتوں کو بروئے کار لاتی ہے اور الینے سے بدن، دھوپ چھاؤں سے جھلملاتے ہوئے سرپن اور خدوخال اور زلف وگیسو اپنی پوری ہیئتی تکمیل کے ساتھ متشکل ہوتے ہیں۔

اس طرح شکل تراشی کی جو مینی اور داخلی کیفیت نمودار ہوتی ہے، وہ بڑی حد تک واقعیت سے ٹکراؤ کے امکان کے بعید از قیاس ہونے کی مرہون منت ہے۔ لیکن نظم کا بنیادی مسئلہ صرف یہی نہیں ہے۔ اگر بات صرف اتنی ہوتی تو بھی نظم مکمل تھی، لیکن اس میں وہ رومانی تمنائیت نہ پیدا ہوتی جو غیر جسمانی حسن سے دوچار ہونے اور اس کو متشکل دیکھنے کے سنہرے لمحے میں پیدا ہوتی ہے۔ اس صورت میں نظم صرف ایک تاثر پر شروع اور ختم ہوتی اور اس میں وہ فنکارانہ قطعیت نہ ہوتی جو اس نظم کا خاصہ ہے۔ اس قطعیت تک پہنچنے کے لئے ہمیں تھوڑی دور چلنا ہوگا کیونکہ نظم کا کلیدی مصرع اس قدر برسبیل تذکرہ طور پر آخر میں ڈال دیا گیا ہے کہ اس پر دھیان فوراً نہیں جاتا میں سمجھتا ہوں یہ شاعر کی چابک دستی کی دلیل ہے کہ اسکے غیر شعوری فنکارانہ انتخاب نے نظم کے مرکزی مسئلہ کو اس طرح ظاہر کیا ہے کہ اس کا "مسئلہ پن" یہ یک نظر عام قاری کو نہیں نظر آتا اور وہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ نظم اس قدر مکمل کیسے نظر آتی ہے۔

میرے خیال میں نظم کا کلیدی مصرع ہے ؏

رنگ و بو کے سراسیمہ انبوہ میں

اور دوسرا کلیدی لفظ ہے "صرف"، آواز کو سن کر صاحبِ آواز کو متشکل کرنے کے بعد وہ خیالی پیکر روزمرہ زندگی کے۔ اژدہام میں فوراً ہی دھندلا جاتا ہے۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ وہ خیالی ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ رنگ و بو کا ایک سراسیمہ انبوہ۔ ایک بہتا ہوا دریا ہے جو ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ زندگی رنگ و بو سے عبارت ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اسے سراسیمہ انبوہ نہ کہا جاتا۔ سراسیمہ انبوہ کہنے کا مدعا دراصل یہ ہے کہ زندگی عکس در عکس آپس میں الجھتے ہوئے ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے نا تمام، دوڑتے بھاگتے تخیلی اور واقعی PERCEPTIONEI سے عبارت ہے۔ یہ ایسا جم غفیر ہے جس کا سرا نہیں ملتا۔ ایک لمحے کے لئے بالکل اتفاقیہ ایک خوبصورت آواز سنائی دیتی ہے۔ لیکن وہ صرف آواز ہے شاعر اس کو متشکل کرنا چاہتا ہے، کر بھی لیتا ہے لیکن کچھ ہی دیر کے لئے کیونکہ وہ کوئی اکیلا نافر نہیں ہے۔ یہ بھی ایک نا تمام خلش رہ جاتی ہے کہ آواز، صرف آواز نہ ہوتی بلکہ متشکل اور مجسم بھی ہوتی ہے۔ آواز سے دوچار ہو کر اسے ایک لمحے کے بعد کھو دینے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی راز تھا، جسے شاعر حل نہ کر پایا۔ لیکن جو خود حل کا متمنی تھا اس طرح خوبصورت آواز کا احساس ایک تجربہ بن جاتا ہے شاعر صاحبِ آواز کو تلاش کرتا ہے۔ شاید آواز بھی اس کی متمنی ہے کہ اس کا راز حل کیا جاتا اور صاحبِ آواز سامنے آجاتا۔

روز کی کھردری، الجھی ہوئی زندگی میں حسن سے اس لمحاتی ٹکراؤ نے جو نظم خلق کی ہے اسکے آہنگ میں بھی ایک تمنائی کیفیت ہے جو نون غنہ اور یائے معروف و مجہول کی تکرار سے پیدا ہوئی ہے خود یہ بحر جو عام طور پر بہت تیز رفتار ہے، اس نظم کی کیفیت کی تابع ہو کر خاصی آہستہ رو۔ ہو گئی ہے۔

هوا جعفری (پاکستان)

## "آج بھی"

ہم نے جانا کہ
اپنے ہر قرض سے اب سبکسار ہیں
ہر تبسم کی قیمت ادا کر چکے
دل سے عذرِ وفا کر چکے
عزمِ ترکِ خطا کر چکے
اب تو جینے کے ہم بھی سزاوار ہیں
اور یہ دل کہ ضدی ہے، نادان ہے
آج کے دور میں
جب خلوص و وفا و محبت بھی فرمان ہے
ہر تبسم کی قیمت ہے میزان ہے
اور یہ دل، اسے آج بھی
ایک بے ساختہ، بے محابا تبسم کا ارمان ہے

★ ★

صبا اکرام (پاکستان)

## "قطرہ قطرہ تشنگی"

کنوارے کھیت میری خواہشوں کے
تشنگی کی دھوپ میں جلتے ہیں
سیم اور تھور مایوسی کے
کالے ناگوں کی صورت، لہو کا ایک ایک قطرہ
رگوں سے چوستے جاتے ہیں
سیلے موسموں کی چپ بنی ہے بھاگ کی ریکھا
کہ صدیوں سے پڑا ہے قحط گیتوں کا
جو فصل کٹتے وقت گاتی ہیں
تھرکتی، ناچتی بستی کی بالائیں
یہاں صدیوں سے برکھا رُت کو
جیون کا ہر اک لمحہ، ترستا ہے
یہاں کھیتوں کے لب کی پپڑیوں پر
تشنگی کا
قطرہ قطرہ بیں ٹپکتا ہے !

★ ★

انور سدید (پاکستان)

## "نروان"

ابلتے ہوئے تند لاوے کا مسکن
یہ تپتا بدن
پیڑ کے نرم سائے کا طالب
ہزاروں برس سے برہنہ پڑا ہے !
مرے گھر کے آنگن سے
معصوم بچوں کا اک شور سا اٹھ رہا ہے
ڈھلی عمر کی ایک عورت کی آواز
اٹھتے ہوئے شور میں ڈھل گئی ہے
تبسم کی لہروں میں اک روتے بچے کی سسکی بھی شامل ہو
وہ سسکی
بھرے گھر کی دھڑکن میں تحلیل ہونے لگی ہے
اور اب سارے معصوم پنچھی چہکتے ہوئے
اپنے رنگین پروں کو سمیٹے
مری پھیلی شاخوں میں سستا رہے ہیں
میں گوتم نہیں ہوں
مگر جانتا ہوں
مری پھیلی شاخوں کا آنند
گوتم کے دل کی تہوں تک اتر کر
بدن کے ابلتے ہوئے تند لاوے کو
اک گھونٹ میں پی گیا ہے۔

★ ★

# الجھن

مناظر عاشق ہرگانوی

آج کچھ زیادہ اندھیرا ہے
ہوا بوکھلائی ہوئی ہے
کرن باغی ہو گئی ہے
آنگن کا درد بڑھ گیا ہے
میں تنہا اکیلا
اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں
نہ جانے کس کا انتظار ہے!

# پسند اور مانگ

ڈاکٹر بیچن (بھاگلپور)

کیا میری مانگ تمہیں پسند نہیں آئے گی ؟
دیوار پر تمہارے حسن کو ٹانگ دینا چاہتا ہوں
پکاسو کی تصویر کی طرح اسکا بلاک بنوا لوں گا
اگر ممکن ہوا تو اسے اخبار میں چھپوا دوں گا
اگر ممکن ہوا تو اسے اپنے دیوان کا سرورق بنالوں گا
اور اگر ممکن ہوا تو اسکی
پبلیسیٹی بھی کروا دونگا
کیونکہ میں تمہیں پیار کرتا ہوں
کیا تمہیں یہ ساری چیزیں پسند آئینگی ؟

# "بہتے لمحے"

جلیس سہسوانی (سہسوان)

ذکر کسی کا، پیار کسی سے
درد سے خالی رات کے نالے
ساز نیا اور راگ پرانے
ریت انوکھی گیت نرالے

برق تپاں سب پھونک چکی ہے
گلہائے تہذیب و تمدن
رسم وفا بھی بدل چکی ہے
بگڑ چکا ہے جگ کا توازن

داؤ پڑے تو فوراً ڈس لیں
مار سیہ یہ بھولے بھالے
اپنا پرایا کس کو سمجھوں؟
من میلے اور منہ اُجیالے

زرداروں کی بات حقیقت
ناداروں کا پیار فسانہ
وقت پڑے تو بال نہ کاٹے
کاٹھ کی تلوار زمانہ

پھولوں سے افسوس ملا ہے
رنج ملا ہے اب یاروں سے
غیروں سے تسکین ملی ہے
پیار ملا ہے سب خاروں سے

# نئے سال کا استقبال

ڈاکٹر راجندر پرساد (بھاگلپور)

گھر آنگن پھول کھلے
خوشی کے
ٹھنڈی چاندنی
اور روپہلی دھوپ
کر دے سنگار
نئے سال کے
گھر آنگن پھول کھلے
خوشی کے !

نظم

# سہمناک رات

شفیع اللہ خاں ساحر آنولوی (اٹاوہ)

شب میں : ـــــ
وحشی سپیروں کے نیلے بدن،
زہر میں ڈوب کر
جب
نکھر آئیں گے : ـــــ
آبنوسی فضاؤں کو،
مہکائیں گی ۔
پیار کی راگنی سن کے،
لہرائیں گی ۔
مرمریں فرش پر،
صندلی ناگنیں ۔
زندگی ـــــ
رشکِ تریاق بن جائے گی

# ارادہ

رفعت النساء رفعت (مظفرپور)

ہر گھڑی خوف یہ
محیط ہے ذہن کو میرے
ژولیدہ ژولیدہ خیالات کے جھاڑ میں
الجھ کے رہ نہ جاؤں کہیں
کیونکہ ہر گھڑی
اک صدی کا قافلہ سا گزر جاتا ہے
اس سے قبل کہ
روح بیدار میری
ہر احساس کھو بیٹھے اپنا
کیوں نہ میں بھی
ان قافلوں کے ساتھ ہو جاؤں !

# اپنی بات

سلیمہ شہلا (بھوپال)

میں جھجک گئی
ٹھٹھک گئی
کچھ بولی
کچھ بول نہ پائی !
اس راستے پر
بکھیر آئی
پیار کے پھول
جہاں سے تم جا رہے تھے !
میرے اور تمہارے
راستے الگ تھے !!

# یاس

نینا جوگن

سر بہ زانو ہوں
آنکھوں میں
ستارے پیہم !
کوئی مونس
کوئی محرم
کوئی ہمدم
مجھے اب تک نہ ملا !
مثلِ بیگانہ
گزرتی ہوئی
آوارہ صبا ہوں !

# رُباعیات

## سجاد رضوی (پاکستان)

آنکھوں میں اتر آئے ہیں یادوں کے مکیں
اِک حشر تماشا ہے تمنا کی زمیں
پھر شیشۂ دیدے کے نکلی ہے نگاہ
پھر دشتِ خیال ہو نہ جائے رنگیں

---

یادوں کے دیئے طاقِ نظر میں روشن
جاگے ہیں بیابانِ تصور میں چمن
ہیں قریۂ اظہار کی گلیاں خاموش
ملتا ہی نہیں نشانِ مے خانۂ فن

---

صحرائے تمنا میں یہ کیا دیکھتے ہیں
ہر ذرہ میں عکس دوسرا دیکھتے ہیں
لے آئیں کہاں ہم کو نگاہیں سجادؔ
تخیل کو یاں آبلہ پا دیکھتے ہیں

---

# قطعات

## اسحاق آشفتہ (پاکستان)

مجھکو پاگل، بے غم، بے حس کہتا ہے
یعنی جھوٹ فریب کا دریا بہتا ہے
یہ اُس شخص کی باتیں ہیں تُو غور تو کر
ہفتے میں جو دس دِن روٹھا رہتا ہے

★

غم کو اِس خاطر میں خوش خوش رکھتا ہوں
اِس سے بہتر فن کا کوئی بھی ساتھ نہیں
اُس کے شعر کو ہر جانب سے خطرہ ہے
جِس کے شعر کی پشت پہ غم کا ہاتھ نہیں

★

اِک دِن چند حسیناؤں کی ٹولی مِلنے آئی تھی
جِن کو دیکھ کے میرے جذب کا تانا بانا روتا ہے
چاند سے چہروں پر آشفتہ غازہ یوں لگتا تھا مجھکو
جیسے ہر اخبار کے اندر کچھ کچھ جھوٹ بھی ہوتا ہے

---

# گیت

## ندا فاضلی (بمبئی)

تجھ بن مجھ کو کیسے کیسے
چھیڑے کالی رات

کٹیا پیچھے چوڑی کھنکی
دو آوازیں ساتھ
جامن پہ، چھم سے آ بیٹھی
کوئی پرانی بات!
سونا آنگن، کون بتاؤ—!
ریشم ریشم ہاتھ!
تجھ بن مجھ کو کیسے کیسے
چھیڑے کالی رات

نیل گگن بادل کے ٹکڑے
کیا کیا روپ بنائیں!
اڑتا آنچل، کھلتا جوڑا!
ننھی منی باہیں!
جلتا چولھا، بھری کڑاہی!
بھیگی بنی برسات!
تجھ بن مجھ کو کیسے کیسے
چھیڑے کالی رات

انتظار حسین (پاکستان)

# بیریم کاربونیٹ

یہ تو یہاں کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ شک اندیشے اور شکایتیں ضرور تھیں لیکن وہ دوسری قسم کی تھیں، اور وہ بھی بعد میں پیدا ہوئیں۔ شروع میں تو جسے یہاں کوارٹر مل گیا سمجھا کہ جنت مل گئی۔ حالانکہ اسوقت شکایتوں کی زیادہ گنجائش تھی۔ بجلی ابھی نہیں آئی تھی۔ سڑک بھی نہیں بنی تھی۔ آدھ پون میل تک کچے پکے رستے طے کرتے ہوئے سڑک تک جاتے تب کہیں بس اسٹینڈ کی صورت نظر آتی اور بس کا یہ عالم کہ کھڑے کھڑے ٹانگیں دکھ جاتیں اور اسکی شکل دکھائی نہ دیتی مگر اشرف چاچا یہ خبر لائے تھے کہ سڑک اگلے مہینے سے بننا شروع ہو جائے گی اور اس کے بعد بس یہاں اندر تک آیا کرے گی اور پندرہ منٹ کے بعد چلا کرے گی۔ ان معاملات میں اشرف چاچا سے زیادہ باخبر کون ہو سکتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے مان لیا اس سے قطع نظر امپروومنٹ ٹرسٹ والے آخر آدمی تھے۔ اللہ دین کا چراغ تو ان کے پاس نہیں تھا کہ راتوں رات کوارٹر بھی بن جائے اور بجلی بھی لگ جاتی اور سڑک بھی تیار ہو جاتی اور بس سروس بھی شروع ہو جاتی۔ یوں اگر سوچو تو اللہ دین کا چراغ بھی اس سے زیادہ کیا تاثیر دکھاتا۔ ہم نے کیا تعمیر ہوتے دیکھی نہیں ہے دوپہر کو یہ دوپہریاں گذری چلی جاتیں اور مزدور اسی ایک رفتار سے روڑے توڑتے رہتے۔ بجری تیار کرتے رہتے، اینٹوں سے لدے پھندے گدھے اور گارا بھری پراتیں اٹھائے مزدور قطار قطار آتے رہتے جاتے رہتے لگتا کہ یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا، پر بالآخر ایک دن مکان بن کر تیار ہو جاتا۔ پھر اسی رفتار سے کنوئیں کی کھدائی شروع ہوتی اور جب زمین کھدتے کھدتے پانی کی تہہ دکھائی دیتی تو بتاشے بٹتے۔ پھر ایک رات وہاں گیس کے ہنڈے رکھے جاتے، جاجم اور چاندنی بچھتی، اگربتیاں سلگتیں اور میلا منعقد ہوتا۔ اس کے بعد گھر آباد ہونا شروع ہوتا۔ مگر ہمارے یہ کوارٹر دیکھتے دیکھتے تیار ہوئے اور تیار ہونے سے پہلے آباد ہوئے۔ کتنے کوارٹر تو ایسے تھے کہ قلعی تو کیا پلستر تک نہیں ہوا تھا اور لال رنگ دیواریں ننگی ننگی نظر آتی تھیں! ایسے بھی کوارٹر تھے کہ چوکھٹیں تو لگ گئی تھیں مگر کواڑ نہیں چڑھے تھے اور اجلے برآمدوں میں بڑھئی دن رات ٹھوک پیٹ کرتے تھے۔ مگر جنھیں آباد ہونا تھا بہرصورت آباد ہوئے جیسے قصبوں میں شام پڑے کسی کسی دوکان میں اندھیرا ہونے سے پہلے ہی چراغ جل جاتا ہے۔ پھر اسکی دیکھا دیکھی تین چار دکانیں چھوڑ کر کسی دوکان کا لیمپ روشن ہو جاتا ہے اور پھر دکانوں کی لالٹینیں اور لیمپ اور سرسوں کے تیل والے چراغ جلتے چلے جاتے ہیں اور اندھیرا ہوتے ہوتے سارا بازار منور ہو جاتا ہے۔ اسی انداز سے ہماری کالونی آباد ہوئی۔ کاٹھ کباڑ سے بھرے ٹھیلے اور ٹمبر سے بھرے تانگے آج اس کوارٹر کے سامنے کھڑے ہیں۔ کل اس کوارٹر کے سامنے جا کر رکے ہیں۔ بس ہماری کالونی دیکھتے دیکھتے آباد ہو گئی اور اب کسی کو یہ بھی یاد نہیں کہ کون کب آیا تھا البتہ بعض خاص واقعات سب کے ذہنوں پر نقش ہیں مثلاً یہ سب کو یاد ہے کہ اس کالونی میں پہلی لڑائی وہ تھی جو سیدانی جی کی انبالہ والی سے ہوئی تھی۔ سیدانی جی پہلے انبالا والی سے لڑیں پھرتی والی سے ٹھنیں مگر وہ دونوں زیر نکلیں۔ سیدانی جی چند دنوں تنی رہیں مگر پھر آپ ہی آپ پانی

ہوگئیں اور اعلان کر دیا کہ بیوی مجھے یہاں کتنے دن رہنا ہے میں تو کربلائے معلیٰ بھی گئی ہوتی مگر محسن کی پڑھائی بیچ میں آپڑی۔ امریکہ والا اسے وظیفہ پر بلا رہا ہے وہ امریکہ ہو آوے تو میں تو یہاں گھڑی پانی نہیں پیوں گی۔ وہ بول تمام کرکے پڑھوا کے کہہ دوں گی کہ بیٹیا اپنا گھر سنبھالو، ماں کو عاقبت کی فکر کرنے دو۔ عجیب بات ہے کہ کربلائے معلیٰ جانے کی بات ہمارے سبھی کے ذہن سے اتر گئی یا تو یوں کہیے کہ انبالا والی اور دلی والی نے دوسری بات کا پرچار زیادہ کر دیا کہیں کوارٹر گئیں یہ اطلاع پہونچانا اپنا فرض سمجھا کہ سیدانی کا پوت امریکہ جا رہا ہے یا یوں سمجھ لیجئے کہ بیٹے کے ارادے میں ماں سے زیادہ خلوص اور گرمی تھی۔ محسن کو ہر چند کچے رستے اور بسوں سے سخت شکایت تھی مگر سائیکل خریدنے کا سوال کبھی نہ اٹھا یا کہ کہیں وہی اس کے اٹھے ہوئے قدم نہ پکڑ لے، اور سیدانی جی تھیں کہ کربلا جانے کا اعلان بھی کرتی رہتی تھیں اور گھر کا کاروبار بھی پھیلاتی جاتی تھیں مرغیاں تو انھوں نے پہلے آتے ہی خرید لی تھیں۔ پھر نیم بھی لگایا تھا کہ جب یہ بڑا ہو جائے گا تو اس کے سائے میں تندور کھو دیں گی۔

ہمیں تو یوں لگتا ہے کہ یہ واقعہ نہ ہو گیا ہوتا تو سیدانی جی کربلائے معلیٰ کو بھول بھی چکی ہوتیں۔ یہاں کی رہائش میں جو دقتیں تھیں ان سے تو محسن کو دوچار ہونا پڑتا تھا۔ سیدانی جی کے لئے تو آرام ہی آرام تھا۔ سب سے بڑا آرام تو یہ تھا کہ پچھواڑے رام گڑھ کے کھیت سے لگے ہوئے تھے جہاں سے سبزی ترکاری تازہ اور سستی مل جاتی تھی۔ ایک سبزی ترکاری پر کیا موقوف ہے، کھانے پینے کی بہت سی چیزیں سستی مل جاتی تھیں۔ باریک چاول کی مثال لیجئے۔ کتنا مہنگا ہو رہا ہے اور جن دنوں سیدانی جی نے خریدا ہے ان دنوں تو وہ کسی بھاؤ بھی ملتا تھا۔ مولا کا حوالہ اور ثواب کی رشوت دے کر انھوں نے ایک کاشتکار سے خریدا تھا یہ چاول کس اہتمام سے خریدے گئے اور کس احتیاط سے سنبھال کر رکھے گئے مگر جو ہونا ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے۔ پہلے وہ باورچی خانے میں رکھے گئے تھے مگر جب باورچی خانے میں چوہوں کا عمل دخل ہونے لگا تو بوری سے نکال کر انھیں دیگچے میں رکھا گیا۔ دیگچا سامان والے کمرے میں لکڑی کے بڑے صندوق میں جس میں چینی کے برتن رکھے گئے تھے، رکھا گیا۔ اس پر رکابی ڈھکی گئی اور صندوق میں تالا پڑ گیا۔

ہمارے کالونی میں چوہوں کا آنا اور پھیلنا بھی ایک داستان بن گیا۔ ان کی ابتدا بھی عجیب تھی، انتہا بھی عجیب ہے۔ ابتدا سیدانی جی کے باورچی خانے میں رکھی ہوئی جالی کے نیچے کے خانے سے ہوئی۔ جالی اس رات کھلی رہ گئی تھی۔ صبح کو ڈھکن کئی دیگچیوں کے گرے ہوئے اور ادھر کھلے پلے گئے۔ رات کی چائے سے بچا ہوا تھوڑا دودھ کہ دودھ دانی میں رکھا تھا اڑھا ہوا تھا اور دودھ دانی لڑھک گئی تھی۔ سیدانی جی نے اس کا سارا الزام انبالا والی کی منڈلی بلی کے سر تھوپ دیا جس پر اس روز سے اس گھر کے دروازے بند ہو گئے۔

پھر ایک دن دودھ کی دیگچی سے دودھ دانی میں دودھ انڈیلتے ہوئے کالا کالا نقطہ سا نظر آیا۔ سیدانی جی کو شک پڑا، غور سے دیکھا تو شک یقین سے بدل گیا، اس کی بلا دودھ والے کے سر گئی۔ سیدانی جی اس پر بہت بگڑیں کہ پیسے کیلئے ہمارا ایمان خراب کرتا ہے۔ اس نے اپنی صفائی بہت پیش کی لیکن سیدانی جی کے سامنے ایک پیش نہ گئی وہ یہ کیسے تصور کر سکتی تھیں کہ ان کے نئے کوارٹر میں جس کے ہر کمرے کا اور باورچی خانے کا فرش پکا ہے اور کہیں کوئی بل نہیں ہے۔ چوہے بھی ہو سکتے ہیں۔ ہاں کوارٹر کے پچھواڑے جہاں جھاڑیاں اور گھاس پھونس ہیں اور اب آس پاس کے کوارٹروں کا کوڑا مستزاد ہے کہ دن بھر سیدانی جی کی مرغیاں اسے کریدتی اور دانا دنکا چگتی رہتی ہیں۔ باورچی خانے کی کھڑکی سے کوڑا پھینکتے ہوئے انھوں

## شکریہ

ایک صاحب نے اپنے شاعر دوست سے کہا "کیا تم نہیں سمجھتے کہ تم ایسا کام کر رہے ہو جس کے لئے کوئی شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتا"

شاعر بولا— "تم غلط سمجھ رہے ہو، حقیقت تو یہ ہے کہ جو بھی چیزیں میں شائع ہونے کے لئے بھیجتا ہوں سب کی سب شکریہ کے ساتھ واپس آجاتی ہیں۔"

نے ایک لمبی سی دم جھاڑی میں بل کھاتی ضرور دیکھی تھی مگر ہر چند کی
زندگی میں انھیں بار ہا چوہے کی دُم پر سانپ کی دم کا اور سانپ کی
دم پر چھپکلی کی دم کا شک ہوا ہے۔ اس دُم کو دم کے دم میں پیلی
سے لال پڑتے دیکھ کر وہ پہچان گئی تھیں کہ گرگٹ ہے اور اگرچہ وہ
گرگٹ کو جس نے حضرت عباس کا مشکیزہ کترنے کا گناہ کیا تھا
زندہ چھوڑنے کے قائل نہیں ہیں۔ مگر اسوقت باورچی خانے کی
دیوار بیچ میں حائل ہونے کی وجہ سے وہ کوئی کاروائی اسکے خلاف
نہیں کر سکی تھیں۔ بہرحال لے دے کے یہ ایک دُم تھی جو انھیں
اس کوارٹر میں رہتے ہوئے دکھائی دی تھی۔ وہ دودھ والے کا
اعتبار کیسے کر لیتیں۔

مگر ایک دن یوں ہوا کہ جب انھوں نے باورچی خانے
میں قدم رکھا تو ایک اضطراب کیساتھ برتن بجے اور اک شے
بجلی کی تیزی سے برتنوں سے نکل کر جالی کے نیچے جاتی دکھائی دی سیدانی
بی بھی اس پھرتی سے پلٹیں، صحن میں رکھا ہوا لمبا بانس اٹھایا اور باورچی
خانے میں جاکر جالی کو کھٹکھٹانا شروع کیا۔ نتیجہ صرف اتنا نکلا کہ وہ لمبی
دُم جو پہلے جالی کے نیچے دکھائی دی تھی نالی میں دکھائی دی اور دم کے
دم میں گم ہو گئی۔ اس روز انھیں معلوم ہوا کہ خرابی باہر کی نہیں باورچی
خانے کے اندر ہو رہی ہے مگر اسوقت بھی وہ یہی سمجھیں کہ نہیں باہر سے
کوئی چوہا بھٹک کر آ گیا ہے اور اگر اس کا قلع قمع کر دیا جائے تو باورچی
خانے میں پھر سے امن قائم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ انبالہ والی صندلی بلی جو
کل تک معتوب تھی خاص طور پر انبالہ والی سے منگوا کر رات کو باورچی
خانے میں بند کی گئی۔

صبح کو جب باورچی خانے کا دروازہ کھولا گیا تو خرابی کی جڑ کے
مٹنے نہ مٹنے کے متعلق تو تحقیق نہ ہو سکی، ہاں یہ پایا گیا کہ خود صندلی
بلی کی بدولت باورچی خانے کی ہنڈیوں، دیگچیوں اور رکابیوں کا نظم
ونسق تباہ ہو چکا ہے۔ دوسری رات سیدانی جی نے، ہنڈیاں، دیگچیاں
اور چینی کے برتن احتیاط سے جالی میں بند کر دیئے۔ پس صندلی بلی باورچی
خانے کے امن میں اس رات خلل نہ ڈال سکی، البتہ صبح باورچی خانے سے
نکلتے ہوئے وہ آنگن میں گھومتی ہوئی بے پرواہ مرغیوں میں خوف و ہراس
پیدا کر گئی۔ سیدانی جی کی بروقت مداخلت نے جانی نقصان نہیں
ہونے دیا مگر مرغیاں دیر تک ہراس کے ساتھ چلاتی رہیں۔ اس روز
سے سیدانی جی کا بیرونی امداد سے اعتبار اٹھ گیا۔

دوسرے دن انھوں نے محسن کو روپیہ دیا اور کہا کہ نحوست
مارا چوہا کہیں سے آ گیا ہے، تو مجھے چوہے دان لا دے۔ محسن کو تو خیر
چوہے دان خریدنا اور ہاتھ میں لیکر چلنا گوارا نہ ہوا۔ اشرف چاچا اس
موقع پر کام آئے اور نصیر الدین ساز کی دوکان سے ایک چوہے دان
خرید کر سیدانی جی کو پہنچا دیا۔ سیدانی جی نے اسی رات روٹی کا ٹکڑا
اس کے کانٹے میں لگایا اور باورچی خانے میں رکھ دیا۔ صبح کو اٹھیں
تو ایک موٹے سے چوہے کو چوہے دان میں مقید پایا۔ اس قیدی کو
ٹھکانے لگانے کا ذمہ دلی والی
کے لونڈے نے لیا چوہے دان
ہاتھ میں لئے آگے آگے جاتا تھا
پیچھے لونڈوں کا ایک ہجوم تھا
اور کئی کوارٹر والیاں باہر نکل
آئی تھیں، اور سیدانی جی کے
مجرم کو یوں دیکھ رہی تھیں
جیسے مسجد سے کوئی جوتیاں
چراتا ہوا پکڑا گیا ہو۔ لونڈوں
کی یہ پلٹن کوارٹروں کے پچھواڑے دور کھیتوں کی طرف نکل گئی۔ جب یہ
پلٹن واپس آئی تو سیدانی جی کو اپنے مجرم کے انجام کا تو پتہ چل گیا
مگر یہ پتہ نہ چل سکا کہ چوہے دان کا کیا ہوا۔

اس کے بعد باورچی خانے کا امن واقعی کچھ بحال ہوتا نظر آنے لگا
ویسے اب سیدانی جی ہر چیز سنبھال کر جالی میں بند کرتی تھیں، چوہے
کا اندیشہ نہ سہی، انبالہ والی کی صندلی بلی کا کھٹکا تو بدستور تھا۔ ایک
مرتبہ دال کی ہنڈیاں رات کو جالی سے باہر رکھی رہ گئی تھی، صبح سیدانی جی
نے دیکھا کہ ڈھکن الگ پڑا ہے اور دال کی جمی ہوئی تہ پر زنجیر بنا ہوا ہے۔
انھوں نے نظر اٹھا کر روشن دان کی طرف دیکھا اور سوچا کہ شاید کوئی چڑیا
اندر آ گئی تھی۔ اس زنجیرے کو وہ چڑیا کے پنجوں اور چونچوں کے نشان

### دھوکہ

کچھ مہینے پہلے ایک اخبار میں یہ اشتہار چھپا
ایک خوبرو صحت مند کردار کا نوجوان ایک
ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے جو ناول
"دھوکہ" کی ہیروئن جیسی ہو"
چوبیس گھنٹے کے اندر ناول "دھوکہ"
کی ساری جلدیں فروخت ہو گئیں۔

بجھیں۔ پھر جب انہوں نے غسل خانے میں محسن کی میلی قمیص کو کترا ہوا پایا تو یاد آیا کہ وہ پچھلی مرتبہ اسے دھوبی کے ڈالنا بھول گئی تھیں، اور بڑبڑانے لگیں کہ طاعون مارا غسل خانے تک پہنچ گیا تھا۔ نچلی ساری قمیص چھلنی کر دی۔

اصل حال کہیں محرم میں کھلا۔ سیدانی جی نے آٹھ کی شب کو پلاؤ کی حاضری کرنے کا اعلان کر رکھا تھا۔ یہ اعلان وہ عجب ماتمی انداز میں کرتیں۔ انھیں اپنا امام باڑہ یاد آ جاتا۔ اس میں سجے ہوتے سونے چاندی کے علم اور چھت میں ٹنگے ہوئے جھاڑ فانوس ہانڈیاں اور لیمپ یاد آتے وہاں ہونے والی مجلسوں کا تذکرہ کرتیں کہ دسوں دن نان قیمہ تقسیم ہوتا تھا۔ آٹھ کی شب کو ہونے والی حاضری کا نقشہ کھینچتیں جس میں خلقت ٹوٹتی تھی اور شیرمال قورمے سے سیر ہو کر جاتی تھی۔ عجب بات ہے کہ پہلے کوارٹر والی وہیں کی رہنے والی ہے۔ وہ کہتی کہ سیدانی جی کے یہاں نان قیمہ بٹنا تو اسی سال بند ہو گیا تھا جس سال راشن ہوا تھا۔ اور شیرمال قورمے کی حاضری کے متعلق کہتی جھک میاں ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا سیدانی کے گھر پلاؤ کی حاضری ہوتے دیکھی۔ کہتے ہیں جب ان کے خسر زندہ تھے تو شیرمال قورمے کی حاضری کرتے تھے۔ بہرحال عذاب ثواب کہنے والوں کی گردن پر، ہم نے جو سنا ہے دہراتے ہیں۔ ویسے سیدانی جی نے اس کوارٹر میں آ کر بھی دسوں دن مجلسیں کیں اور جلیبیاں بانٹیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان مجلسوں کی وہ دھوم نہ تھی جو اپنے امام باڑے کی مجلسوں کی بیان کرتی ہیں۔ اول تو وہ مردانہ سے زنانہ مجلسیں بنیں اور زنانہ مجلسیں بھی اس طرح کہ بس آس پاس کی کوارٹر والیاں وہاں پہنچتی تھیں اور رقت بہت کم ہوتی تھی۔ البتہ آٹھ تاریخ کی حاضری کی شہرت کالونی بھر میں ہو گئی تھی۔ اور ہم سب پلاؤ کھانے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو چکے تھے۔ مگر آٹھ تاریخ کو جو ہوا اس کا کسے گمان تھا۔ سیدانی جی ایسی سہم گئی تھیں کہ اور کوئی انتظام نہ کر سکیں۔ جب شام ہونے لگی تو انہوں نے اشرف چاچا کو بلایا اور جلیبیوں کے لئے روپے دے دیئے ہم حاضری کے نام ایک ایک دو دو جلیبی کھا کر چلے آئے۔ کسی کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم سب دہل گئے تھے۔

پہلے کوارٹر والی کو کچھ اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ انبالہ والی نے اسے یقین دلانے کے لئے اپنی عینی شہادت پیش کی "میاں میں تو خود دیکھ کے آئی ہوں، صندوق میں یہ بڑا سا کھلا ہوا تھا" اور ساتھ میں اس نے دونوں ہاتھ کے انگوٹھوں اور شہادت کی انگلیوں کو جوڑ کر دائرے کا نشان بنایا۔

"بہنو، میں یہ پوچھوں ہوں کہ انہوں نے صندوق کو کیسے کتر لیا؟"

"اے لو صندوق کو کیسے کتر لیا" انبالہ والی "صندوق آخر لکڑی کا تھا اور میاں یہ نحوست مارے تو عذاب الٰہی ہیں۔ کیا کھانے پہننے کی چیز کیا برتنے کی چیز، کتر کے برباد کر دیتے ہیں۔"

دلی والی گم سم بیٹھی رہی۔ پہلے کوارٹر والی بھی سوچ میں پڑ گئی۔ چپ بیٹھی رہی، پھر بولی۔ "کمبختوں کا پیٹ تھا یا مشک تھی۔ اتنے بہت سے چاول......"

انبالہ والی بات کاٹتے ہوئے بولی "میاں مجھے بھی اعتبار نہیں آیا تھا۔ سیدانی میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئیں اور صندوق کھول کے دکھایا۔ جھوٹ مت جانیو، کوئی مٹھی بھر چاول پڑے ہوں گے۔ باقی منگنیاں"۔ انبالہ والی کو جھرجھری آ گئی۔

دلی والی نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "اللہ رحم کرے"۔ چپ ہو گئی پھر بولی "جب ناویں لٹی تھیں تو عین میں یہی ہوا تھا۔ ہماری پھوپھی جان اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، سنایا کریں تھیں کہ قلعہ معلیٰ سے برس کے برس رمضانوں میں تیسوں دن جامع مسجد افطاری جایا کرے تھی۔ اس برس کیا ہوا کہ پہلے ہی روزے پہ جب خوان پکوا کے بھرے اور خوان پوشوں سے ڈھکے جامع مسجد کی طرف جا رہے تھے تو ایک چیل نے جھپٹا مارا۔ خوان الٹ گیا...... تیسرے دن خبر آئی کہ اناج سے بھری ناویں لٹ گئیں۔ اے بی پھر کال پڑ گیا...... وہ کال پڑا کہ حرام حلال کی تمیز اٹھ گئی۔ لوگوں نے گدھے، بکری کے گوشت کی

## بیٹو کون

ایک ڈنر کی پارٹی میں بیوی نے شوہر کو جھڑکا "چار بار آپ مزید کھانا لے چکے۔ کتنی بری بات ہے لوگ آپ کو کیا سمجھیں گے کہ کتنا پیٹو ہے"۔

شوہر مسکرایا۔ بولا "تم یہ سمجھتی ہو کہ میں یہ کہہ کر لاتا ہوں کہ مجھے چاہئے۔ — نہیں — میں ہر بار یہ کہتا ہوں کہ میری بیوی کو چاہئے"

## تین سالہ شناخت

"تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"
لڑکی نے حیرت سے لڑکے سے پوچھا۔
"ہاں" لڑکے نے جواب دیا
"مگر ہماری ملاقات صرف تین
دن کی ہے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر اس
بینک میں جس میں آپ کا اکاؤنٹ
ہے تین سال سے کام کر رہا ہوں۔"

---

بجائیے...... بجائے گائے بکری کے......" دلی والی سر سے پیر تک کانپ گئی اور چپ ہو گئی۔ پھر بولی "اے بی پھر غار پڑ گیا۔"

انبالہ والی اور پیلے کوارٹر والی کی آنکھوں میں ہراس کی کیفیت پیدا ہو گئی انبالہ والی بولی "میاایسی آواز منہ سے مت نکالو۔ اناج پہلے ہی بہت مہنگا ہو رہا ہے۔"

پیلے کوارٹر والی آنکھیں پھاڑے دلی والی کو تکتی رہی۔ منہ سے کچھ نہیں بولی۔

اس رات سیدانی جی کی مجلس میں دور دور کے کوارٹر سے بیبیاں آئیں۔ مجلس دیر تک رہی اور بہت رقت ہوئی۔

سیدانی جی کے واقعہ نے آس پاس کی کوارٹر والیوں کو چوکنا کر دیا۔ دلی والی نے دوسرے ہی دن اپنی بیٹی جہیز کھولا اور ریشمیں کپڑوں کو دھوپ دینے کے لئے چارپائیوں پر پھیلا دیا۔ یہ کپڑے تو سب سلامت تھے۔ ہاں اپنا دوپٹہ جو کلف دیکر ادھ کھلی دراز میں رکھ دیا تھا کہ محرم بعد اس پر ستارے ٹانکے جانے والے تھے وہ جگہ جگہ سے کترا ہوا پایا گیا۔ انبالہ والی نے آٹا چھانا تو اس میں بھی کم اور مینگنیاں زیادہ نکلیں۔ انبالہ والی اور دلی والی کو یہ بات سخت ناگوار گذری کہ سیدانی کے گھر کے چوہے ان کے گھر آجاتے ہیں۔ ان کا غصہ اور شکوہ جائز تھا مگر حیرانی تو اس بات پر ہے کہ پیلا کوارٹر سیدانی جی سے بہت فاصلے پر ہے۔ مگر پیلے کوارٹر والی کے کتنی میلے کپڑے کترے ہوئے پائے گئے۔ اور کمال تو اشرف چاچا کے ساتھ ہوا۔ کلیم کے لئے جو درخواست وہ دے رہے تھے اس میں کاغذات کی تعداد اب اتنی ہو گئی تھی کہ پن جوڑ تو پہلے ہی گیا تھا، آپ دو ٹکڑے ہو گیا۔ انہوں نے کاغذوں کے کونوں پر آٹا لگایا اور چپکا دیا۔ صبح کو ان سب کاغذوں کے کونے غائب تھے اور ان کی جگہ بھسی میز پر بکھری ہوئی تھی۔ اشرف چاچا نے یہ ذکر ننوا پر چونئے کی دوکان پر آکر کیا۔ وہاں اس وقت مولوی عثمان علی مونڈھے پر بیٹھے عینک لگائے پیلے ورقوں والی اس کتاب کو دیکھ رہے تھے جس کے تین چوتھائی صفحے ننوا پڑیاں باندھنے میں صرف کر چکا تھا۔ انہوں نے کتاب سے نظر اٹھائی اور بولے "اماں، کیا پوچھتے ہو، مثنوی مولانا روم کا ایک نادر نسخہ مطبوعہ تہران میرے پاس تھا۔ بے ایمانوں نے اسے کتر کر برادہ بنا دیا۔"

اشرف چاچا ننوا کی دوکان سے سیدھے نصر و تین ساد کی دوکان پر گئے اور ایک چوہے دان خرید لیا۔ ان کے اس اقدام کی ہم سب نے پیروی کی اور چوہے دانوں کی خریداری عام ہو گئی۔ نصر و تین سا نے ایک دن کے اندر اندر اتنے چوہے دان بیچے کہ دوسرے دن جب سیدانی جی نے دلی والی کے لونڈے کو برا بھلا کہنے کے بعد چوہے دان منگایا تو قیمت اس کی ایک روپے سے سوا روپے ہو چکی تھی۔ سیدانی جی نے چوہے دان واپس کرا دیا اور پھر نصرو کی بے ایمانی کی علی الاعلان مذمت شروع کر دی۔ دلی والی نے انہیں سمجھایا کہ "سیدانی جی چوہے دان مہنگے ہو گئے ہیں مجھے بھی سوا روپے کا ہی ملا ہے۔ بی بی کیا کیا جائے میں نے تو چار چوہے دان منگا لئے ہیں اور ہر کمرے میں ایک ایک رکھ دیا ہے۔"

سیدانی جی کا پارہ اس وقت اتنا چڑھا ہوا تھا کہ دلی والی کی بات نے ذرا اثر نہ کیا۔ دوسرے دن پارہ خود بخود اتر گیا اور انہوں نے سوا روپیہ لے کر محسن کو نصرو کی طرف بھیجا۔ مگر اس وقت چوہے دان کا بھاؤ ڈیڑھ روپے ہو چکا تھا۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ چوہے دان اس بھاؤ بھی سیدانی جی کو سستا ہی پڑا۔ اس کے بعد تو یہ حالت ہوئی کہ ڈھائی ڈھائی روپے کا چوہے دان بکا ہے۔ اور خریداروں کا وہ ہجوم کہ خدا کی پناہ نصرو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ اعلان کر دیا کہ قطار بناؤ۔ سب کو نمبر واری دونگا۔ اس روز سے نصرو کی دوکان کے آگے قطار بننے لگی اور جوں جوں دن گذرے یہ قطار لمبی ہوتی گئی۔ ایک دن یہ قطار

## دھمکی

گلبن کی ایڈیٹر کو ایک محترمہ نے خط لکھا ہے اگر آپ بدمزہ لطیفے چھاپیں گی تو میں گلبن مانگ کر پڑھنا بند کر دوں گی۔

اتنی لمبی ہوئی کہ بکھر گئی اور مجمع دوکان پر ٹوٹ پڑا۔ اس پر نمرود نے تھانے والوں کو خبر کی جنھوں نے آکر ملکان لاٹھی چارج کیا اور مجمع منتشر ہو گیا۔

اشرف چاچا کو نمرود کی یہ روش بہت ناگوار گذری۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ نمرود نے بہت چوہے دان بیچے۔ اب اس کے لئے چوہے دان تیار کرنا پڑے گا چنانچہ اسی دن انہوں نے ہم سب کے دستخط لے کر نمرود کے خلاف ایک درخواست داغ دی۔ اس درخواست پر فوری کارروائی ہوئی اور چوہے دالوں کا کنٹرول ہو گیا۔ چوہے دان کا کنٹرول ریٹ ڈیڑھ روپیہ مقرر ہوا تھا مگر اس ریٹ پر کالونی کے بس دو تین آدمیوں کو چوہے دان مل سکے۔ اس کے بعد نمرود نے اعلان کر دیا کہ مال ختم ہو گیا۔ نمرود نے صاف جھوٹ بولا کیونکہ اسی شام کو اس نے مولوی عثمان علی کو ڈھائی روپے میں چوہے دان دیا ہے۔ مولوی عثمان علی کی ایمانداری اور پرہیزگاری کا لحاظ کر کے اس نے یہ قیمت لگائی تھی ورنہ اس کے بعد اس نے تین تین روپے میں بیچا ہے۔

ہم نے کہا "اشرف چاچا چوہے دانوں کی بلیک ہو رہی ہے"

معلوم ہوا کہ اشرف چاچا پہلے ہی پھنکے بیٹھے تھے۔ بولے "بیٹا کیا بتائیں باہر بلیک گھر میں اسمگلنگ ہم دو کے بیچ پس گئے۔ میں نے کلیمز والوں سے کہا کہ یارو خدا کے بندو، نہ دینا کچھ، درخواست تو رکھ لو ورنہ یہ جائداد کے کاغذ چوہے اسمگل کر لیں گے۔ مگر وہاں ایک سے ایک بڑا فرعون بیٹھا ہے، کسی نے نہیں سنا۔"

اصل میں اشرف چاچا بہت جلد بول گئے ورنہ شاید مسن کو ان سے زیادہ ہی دفتروں کے چکر لگانے پڑے تھے۔ امریکہ کے لئے وظیفے کی درخواستوں پر ابھی تک کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ وہ روز وہاں جاتا۔ سانولی ریسپشنسٹ کو اپنے نام کی چٹ دیتا اور سامنے والی شیشہ سے چمکتی گول میز پر بیٹھ جاتا اور اس پر بکھرے ہوئے کتابچے بغور پڑھنا شروع کر دیتا۔ اس کی باتوں سے یہ پتہ چلتا تھا کہ ایک چھوڑ کئی افسروں سے وہ مل چکا ہے مگر باتیں کیا ہوتیں۔ اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ مگر اشرف چاچا کلیمز آفس کے کلرک تک بھی بس ایک ہی مرتبہ پہنچ سکے۔ دوسرے دن انھیں چپراسی نے اندر جانے سے روک دیا۔ اس میں کچھ خطا خود اشرف چاچا کی بھی ہے جو اب تک کچہریوں کی فضا میں رہتے ہیں چپراسی کو اٹھنی سے زیادہ دینے کے روادار نہیں ہیں۔

کلیمز آفس کے چکر کاٹنے کا ایک فائدہ تو یقیناً ہوا کہ اشرف چاچا کو بسوں کا تجربہ اور سڑک سے کالونی کے اندر تک کے کچے راستے کی طوالت کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ کالونی کے کوارٹروں کے متعلق بھی بہت کچھ معلوم ہوا۔ اشرف چاچا کی روایت یہ ہے کہ ٹھیکیدار نے سمنٹ میں آدھے راونت ریٹ ملایا ہے۔ اس معاملہ میں ٹولی والی اشرف چاچا سے بھی زیادہ قنوطیت پسند نکلی۔ اس نے دیوار کو انگوٹھے سے بجا کر کہا "اے بی یہ ورقاسی دیواریں کے دن کھڑی رہیں گی؟" جب اس کالونی میں پہلی بار بارش ہوئی اور سیدانی جی کی دیوار ٹپکنے لگی تو انہوں نے بگڑ کر کہا "کمبختی ماروں نے چھت پانی سے یا جھلی منڈھ دی ہے۔" اور پیلے کوارٹر والی اپنی رنگ والی چھت کو ٹپکتے دیکھ کر برملا یہ کہتی تھی کہ "خدا انہیں سمجھے۔ کاپیں کھڑی کر کے پتنگیا کاغذ منڈھ دیا ہے۔"

اشرف چاچا کو اس سارے جھمیلے کا بڑی شدت سے احساس تھا۔ اس کے باوجود وہ اٹھنی سے نہیں بڑھے۔ ہم پوچھتے "اشرف چاچا آپ کا کلیمز داخل ہونے کا کوئی پیونت ابنا؟"

اشرف چاچا جواب دیتے "بیٹا چوہے دان لگا رکھا ہے۔ آگے اللہ مالک ہے۔"

تماشے کی بات سنئے کہ اب ہمارے سب کے چوہے دان اشرف چاچا کا چوہے دان بن کر رہ گئے تھے۔ شروع میں تو ان میں بہت چوہے پھنسے لیکن اب عالم یہ تھا کہ کانٹے میں روٹی کا ٹکڑا لٹکا رہتا تھا۔ منہ اسی طرح کھلا ہوا، کانٹا اٹھا ہوا اور چوہوں کی

ٹھروں میں وہی ریل پیل۔ انبار والی بولی "میاں یہ چوہے چالاک ہو گئے ہیں طرح کھلا ہوا" ہیں۔ اب چوہے دان میں نہیں آتے۔"

دبی والی نے ٹکڑا لگایا "اے بی۔ بیوقوف تو ہم ہیں کہ جو الا بلا لی نگل لی۔ مجبور جو ہوتے۔ چوہوں کو کیا مجبوری ہے کہ میٹھے لکڑی کے برادے کے لئے چوہے دان میں آئیں۔"

سیدانی جی کے جی کو یہ بات بہت لگی۔ انہوں نے دوڑ دھوپ کر کے گیہوں کے خالص آٹے کا انتظام کیا اور اس کی روٹی چوہے دان میں استعمال کی۔ مگر چوہے ایسے بدکے تھے کہ خالص آٹے کی روٹی پر بھی نہیں آئے۔ تب انہوں نے چند اور تجربات کئے۔ مثلاً خالص آٹے میں توتیا کی ملاوٹ کی اور گولیاں بنا کر باورچی خانے میں جالی کے نیچے رکھ دیں۔ اس تجربے نے دو دن اپنا اثر دکھایا، تیسرے دن فیل ہو گیا۔ چوہے باورچی خانے کے ایک ایک گوشے کو ٹٹولتے اور جو ہری گیلی چیز پاتے کتر ڈالتے، کھینچ کرلے جاتے اور توتیا ملی آٹے کی گولیاں اسی طرح رکھی رہتیں، سوکھتی رہتیں۔

محسن کی دانست میں چوہوں کو مارنے کے یہ بڑے دقیانوسی طریقے تھے۔ اس نے کتابچوں کے ذریعہ امریکہ کے زرعی نظام کے بارے میں جو نئی نئی معلومات حاصل کی تھی۔ اسکی روشنی میں اس نے اس مسئلہ پر غور کیا تھا اور ماں کو بتایا تھا کہ یہ چوہے تو کچھ بھی نہیں شکاگو کی فارموں میں اتنا چوہا آیا تھا کہ وبا کی صورت اختیار کر لی تھی۔ مگر وہاں کے تعلیم یافتہ کاشتکاروں نے بیریم کاربونیٹ سے دنوں میں ان کا قلع قمع کر دیا۔

سیدانی جی تو بیٹے کی بات سے متاثر نہ ہوئیں، پا شہر سے واپسی میں بس میں اشرف چاچا سے یہ بات ہوئی تو وہ قائل ہو گئے۔ وہ بس سے اتر کر گھر گئے، گھر سے منور میڈیکل اسٹور گئے۔ اب تو خیر یہ بہت بڑا میڈیکل اسٹور ہے اور ڈاکٹر منور لمبی چمکیلی موٹر کار میں بیٹھ کر آتے ہیں۔ مگر ان دنوں یہاں گنتی کی دوائیوں کی شیشیاں اور پیکٹ رکھے تھے، باقی خانے خالی تھے۔ انھوں نے اشرف چاچا کو بتایا کہ بیریم کاربونیٹ نہ صرف یہ کہ ان کے یہاں نہیں بلکہ شہر کے کسی میڈیکل اسٹور پر نہیں ملے گی کیونکہ اسکی امپورٹ کم ہوئی تھی اور مانگ یکایک بڑھ گئی مگر یہ کہ انھوں نے آرڈر دے رکھا ہے اور جلدی عنقریب آنیوالی ہے۔

اشرف چاچا نے جب اس نے تریاق کا ذکر کیا تو ہم نے سمجھا کہ اشرف چاچا نے کوئی امریکہ دریافت کیا ہے ہمارے لئے یہ دریافت اور منور میڈیکل اسٹور پہ اس کے آنے کی خبر ایک بہت بڑا واقعہ تھی۔ بات یہ ہے کہ اب ہم سب کی حالت سیدانی جی کی سی تھی۔ چوہوں نے ہمیں بہت خراب کیا۔ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور برتنے کی کوئی چیز ان سے محفوظ نہیں تھی دن میں ہر چند اپنی جگہ پہ قرینے سے نظر آتی، رات کو جانے کیا ہوتا کہ صبح ہونے پر چیز جو بہت تھی تھوڑی نظر آتی، جو تھوڑی تھی غائب ہوتی، جو باورچی خانے میں رکھی جاتی وہ سامان کے کمرے میں اور جو سامان کے کمرے میں ہوتی وہ لان میں پڑی دکھائی ہوتی۔ صحیح و سالم چیزیں ادھ کتری اور پاک و صاف چیزیں ناپاک معلوم ہوتیں۔ جو رات کے پردے میں آتے اور صبح ہوتے ہوتے غائب ہو جاتے۔ بس نشانات باقی رہ جاتے کہیں آٹے کے کنستر میں چند مینگنیاں، کوئی روٹی کتری ہوئی، کاغذوں کتابوں کی کسی الماری میں کترے ہوئے کاغذ جیسی کی چھوٹی سی ڈھیری کی صورت، پھر کبھی کبھی یوں ہوتا کہ ہم سوتے سوتے اچھل پڑتے، کوئی بدبدی چیز لحاف پہ گر پڑتی، سرسراتی ہوئی زمین پر اتر جاتی، اور پچے تکیے کی سی آواز پیدا ہوتی، پھر خاموشی

## استقلال

مشہور اموی گورنر حجاج بن یوسف نے ایک بار جمعہ کے خطبے کو اتنا طول دیا کہ لوگ بے چین ہو گئے اور سرگوشیاں کرنے لگے ان میں سے ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا:

"اے حجاج بن یوسف! وقت تیرا انتظار نہیں کریگا اور نہ ہی تیرا رب تجھے معاف کریگا"

حجاج بن یوسف نے جب یہ سنا تو اسے بہت غصہ آیا اور اس نے اس شخص کی گرفتاری کا حکم دیا۔ جب اس شخص کے رشتہ داروں کو اس بات کا علم ہوا تو وہ حجاج بن یوسف کے پاس آئے اور درخواست کی کہ وہ شخص مجنوں دیوانہ ہے اور دیوانہ کی بات قابل گرفت نہیں ہے، اسلئے براہ کرم اسے رہا کیا جائے۔

حجاج بن یوسف نے کہا:- اگر وہ شخص اپنی زبان سے اس بات کا اقرار کر لے کہ وہ دیوانہ ہے تو میں اسے رہا کر دونگا۔" یہ سن کر اس شخص نے جواب دیا "خدا کی قسم میں ایسا ہرگز نہیں کرونگا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس آزمائش میں ڈالا ہے اور وہی میری حفاظت کریگا۔"

چھا جاتی اور ایک گجگجاہٹ کے احساس کے ساتھ ہم لحافوں میں دبکے پڑے رہتے۔ پھر کسی کمرے میں آواز پیدا ہوتی جیسے کسی نے چلغوزہ کٹکا۔ ایک چلغوزہ کٹکا جاتا، پھر چلغوزے کٹکنے کا تار بندھ جاتا۔ پھر یوں لگتا کہ چلغوزے نہیں کٹکے جا رہے، دور نہیں کسی درخت کے تنے پہ آہستہ آہستہ آری چل رہی ہے یا شاید حضرت عباس کا مشکیزہ کترا جا رہا ہے۔ رات کے پچھلے پہر میں درخت کے تنے پہ آہستہ آہستہ آری چلتی رہتی اور رات لمبی ہوتی چلی جاتی۔ صبح اٹھتے تو یاد کئے یہ بیتی رات ایک لمبا ڈراونا خواب معلوم ہوتی۔ ہم دن کے کاموں میں لگ جاتے اور رفتہ رفتہ گذری رات آئی گئی بات ہو جاتی۔ مگر رات پھر آتی اور پھر درخت کے تنے پر دھیرے دھیرے آری چلتی پھر دن میں بھی آثار پیدا ہونے لگے۔ دیکھتے دیکھتے کالونی کے ہر کوارٹر کے لان میں بل بن گئے تھے۔ یکایک کسی بل میں دو بدرنگ لمبے بال سینگوں کی طرح اٹھے ہوئے اور دو آنکھیں چمکتی دکھائی دیتیں اور آن کی آن میں بل سے نکل کر باورچی خانے میں داخل ہوتا اور رادھل ہو جاتا۔ سیدانی جی آنگن میں رکھا ہوا املاس اٹھاتیں اور کبھی باورچی خانے میں کبھی سامان کے کمرے میں کبھی سونے بیٹھنے کے کمرے میں جاتیں اور ایک ایک صندوق پر پٹختا تیں۔ پھر سیدانی جی تھک گئیں روٹی پکاتے پکاتے ان کی نظر نالی پہ پڑتی جہاں سینگوں ایسے دو بدرنگ بال اور شیشہ ایسی آنکھیں چمکتی نظر آتیں، اور وہ اس طرح روٹی پکاتی رہتیں۔ پھر آس پاس رکھے برتنوں میں سٹر پٹر ہوتی اور جب سیدانی جی مڑ کر دیکھتیں تو روٹی ڈلیا سے نکل کر گھسیٹتی نالی کے پاس پہنچ چکی ہوتی۔ وہ بے دلی سے اٹھتیں اور روٹی اٹھا کر الگ مرغیوں کے لئے رکھ دیتیں آنکھوں کے سامنے کبھی ایک کبھی دو کبھی ایک پوری لین دوڑی کمرے کمرے دوڑتی پھرتی رہتی اور وہ بیزار بیٹھی رہتیں۔ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے

## بھائی چارگی

ایک بزرگ بھائی چارگی کی اہمیت بتا رہے تھے "میری عمر ۸۵ سال کی ہے یقین مانئے میرا ایک بھی دشمن اس دنیا میں نہیں ہے۔"

"سچ واقعی بات قابل تعریف ہے مگر آپنے ناممکن کو ممکن کسطرح کیا"۔ ایک صاحب نے بڑی حیرت سے پوچھا

بزرگ نے جواب دیا

"جتنے تھے سب مر چکے ہیں"۔

ان کی نظر لان کے کسی بل پر پڑتی اور ایک لمبی سی دم باہر نکلی دکھائی دیتی انھیں لگتا کہ گرگٹ کی دم ہے اور جسم میں جھرجھری دوڑ جاتی اور اپنی جگہ پر سہمی کی سہمی رہ جاتیں کوارٹر انھیں میلا میلا اور برتن بھانڈے نجس نظر آتے۔ دیگچیوں رکابیوں اور پیالوں کو وہ راکھ سے خوب مانجھتیں، پانی کے تریڑے دیتیں، تین تین دفعہ پاک کرتیں اور پھر بے اطمینانی رہتی۔ کمروں کے فرش کو جمعہ کے جمعہ دھوتیں۔ بالٹیاں کی بالٹیاں پانی کی بہاتیں اور اس کے باوجود اب وہ گھر کے پکے فرش پر ننگے پیر نہیں پھرتی تھیں۔ سیدانی جی پر موقوف نہیں ہم سب کی یہی حالت ہو گئی تھی۔ مولوی عثمان علی نے جوانِ دنوں کلام پاک اور انجیل اور قصص الانبیاء کے حوالے سے پرانی امتوں کے قصے بہت سناتے تھے۔ آل فرعون کے عذاب کا قصہ سنایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون سے کہا کہ دیکھ میں تیرے ملک کی سب اطراف کو مینڈکوں سے بھر دوں گا، اور دریا بے شمار مینڈک پیدا کریگا، اور وہ اوپر آ کے تیرے گھر میں اور تیری آرام گاہ میں اور تیرے پلنگ پر اور تیرے ملازموں کے گھروں میں اور تیری رعیت پر اور تیرے تنوروں میں اوپر تیرے آٹا گوندھنے کے لگنوں میں داخل ہوں گے۔ اور مینڈک تجھ پر اور تیری رعیت پر اور تیرے سب نوکروں پر چڑھیں گے۔ یہ قصہ سن کر ہمیں عجب گجگجاہٹ کا احساس ہوا۔ بعد میں یہ گجگجاہٹ ہمارے احساس کا حصہ بن گئی۔ ہمارے حواس میں رس بس گئی۔ اجاڑ زمینوں کے اور عذاب سے تباہ شہریوں کے گرد سے اڑے رخنے اور نجاست سے بھرے سوراخ کھل گئے تھے اور چوہے نکل نکل کر ہمارے گھروں

## پروگرس رپورٹ

ایک صاحب اپنے بیٹے کی اسکول کی پروگرس رپورٹ پڑھ رہے تھے۔

تاریخ میں کمزور، انگریزی میں بہت کمزور حساب میں مایوس کن حد تک کمزور، جغرافیہ بہت خراب، سارے مضامین میں فیل انھوں نے پروگرس رپورٹ پھینک دی "نالائق — ہر چیز میں کمزور"

بیٹے نے پروگرس رپورٹ اٹھائی اسے باپ کے پاس لایا۔

بولا — "جو کچھ خراب تھا آپنے پڑھ لیا لیکن آخری جملہ نہیں پڑھا" — "صحت بہت اچھی"

میں، ہماری آرام گاہوں میں، ہمارے بستروں میں، ہمارے جوتوں اور
جوتے اور آٹا گوندھنے کے لگنوں میں داخل ہو رہے تھے اور ہم پر
گھگیاہٹ طاری تھی۔

سیدانی جی کو اکثر امریکہ والے پر اور کبھی کبھی محسن پر غصہ آتا۔
روز پانچوں وقت کی نماز کے بعد وہ محسن کے امریکہ جانے اور اپنے کربلائے
معلیٰ جانے کی دعا کرتیں۔ روز ہم منور میڈیکل اسٹور پر بیریم کاربونیٹ
کی ٹکیا کا پتہ لینے جاتے۔ روز ہمیں ناکام واپس ہوتے دیکھ کر مولوی
عثمان علی مایوسانہ انداز میں سر کو جنبش دیتے اور خبردار کرتے کہ جب
تک مسلمان اپنے اعمال کی اصلاح نہیں کریں گے۔ بیریم کاربونیٹ سے
کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ پھر وہ واعظانہ لہجہ میں قصے سناتے ان امتوں
کے جن کی کھیتیاں ٹڈیاں چاٹ گئیں۔ ان شہروں کے جنہیں سیلابوں
نے آلیا ان بستیوں کے جن کے باسی جون بدل کر آدمی سے بندر بن گئے
روز ہم قصے سنتے اور وہی باتیں کرتے۔ ان قصوں اور باتوں سے ہم بیزار
ہو جاتے اور پھر وہی قصے سنتے اور وہی باتیں کرتے۔ دونوں کا فرق
ختم ہو گیا۔ ہر نیا دن وہی پرانا دن اور ہر صبح وہی پچھلی صبح ہوتی دنوں
کے رنگ اور راتوں کی رنگا رنگی جاتی رہی۔ لگتا کہ زمین کیلی پر گھومتے
گھومتے رک گئی ہے اور سب کچھ ٹھہر گیا ہے۔ سب کچھ ٹھہر گیا ہے۔
بیریم کاربونیٹ کا گیا ہوا آرڈر، بجلی کا آیا ہوا سلسلہ، پکی بنتی
بڑی سڑک، اور خود ہم، ہمارے احساسات اور رد عمل، بجلی ہماری
کالونی میں اب آ گئی تھی اور بڑی سڑک پکی سڑک بن گئی تھی مگر جو
رستے کچے رہ گئے تھے اور جو کوارٹر ادھ بنے کھڑے تھے اور جہاں
بجلی کے کھمبے تاروں اور چینی کی گھنٹیوں کی آرائش سے محروم کھڑے
تھے وہ لگتا تھا کہ کالونی کی تعمیر کے نقشے کا حصہ ہیں کہ اب ان کی صورت
یہی رہے گی۔ حرکت کو تصور میں لانے کے لئے ہم اپنی کالونی سے پرے
اس شیشہ ایسی چمکتی کالی سایہ دار سڑک کو دیکھتے جہاں تھوڑے تھوڑے
وقفے کے بعد بس شور کرتی ہوئی گزرتی۔ اسے رکتے اور کھڑکھڑاتے کے
ساتھ چلتے دیکھتے تو جانتے کہ دور بلندی پر کوئی الگ دنیا ہے جہاں
ہر چیز روشن اور رواں دواں ہے اور کبھی کبھی عجب خیال آتا کہ اشرف
چاچا کلیئر کے دفتر کا چکر لگانے کے بعد واپس آئیں گے تو ہماری
بدلی ہوئی صورتیں دیکھ کر ہماری
چپال ایسی آنکھیں اور منہ پر
سینگوں کی طرح اٹھے ہوئے
بد رنگ بال دیکھ کر ششدر
رہ جائیں گے اور ہراساں
و پریشاں واپس ہو کر
پھر بس میں سوار ہو جائیں گے
اور پھر ہم سوچتے کہ کیا چکر
الٹا بھی چل سکتا ہے کہ آدمی
مکانوں کو چھوڑ کر درختوں پر بسیرا کرنے لگے اور درختوں سے اتر کر بلوں
اور سوراخوں میں رہنے لگے۔ ہمارے سوچنے کی بھی ایک ڈگر مقرر ہو
گئی تھی، ہر پھر کر وہی باتیں سوچتے تھے اور وہی کیفیتیں محسوس کرتے
تھے۔ بس ذہن کے اندر ایک دائرہ سا بن گیا تھا اور خیالات کی چکی سی
چلتی رہتی تھی۔ اب تو رات اور دن بھی سیاہی اور سفیدی کا دائرہ
تھے۔ رات ابتدا ہوتی تو ختم ہونے میں نہ آتی اور دور درخت کے تنے
پر آری لگاتار دھیرے دھیرے چلتی رہتی، اور پھر آس پاس کبھی پلنگ
کے نیچے کبھی لحاف کے اوپر کوئی بد بری سی چیز سرسراتی اور آناً فاناً
گم ہو جاتی اور ہم پر یہ گھگیاہٹ طاری ہوتی کہ دم رکنے لگتا۔ بدرنگ
گجلی رات رینگتی رہتی۔ رینگتی رہتی اور آخر پھیکی پڑنے لگتی اور آسمان
پر اجالے کی لکیر دم کی طرح رینگتی ہوئی پھیلتی۔ خدا خدا کر کے دن نکلتا اور
ہم اپنے بلوں سے نکلتے اور انہیں روزمرہ کے رستوں پر رینگنے لگتے۔ پکی
اب پکی نہیں لگتی تھی، اور کچے رستے زیادہ کچے دکھائی دیتے تھے۔ اور
کیا پکی سڑک اور کیا کچے رستے، ہر روش خاک اڑتی رہتی اور ہمارے
کوارٹر جو برسات سے پہلے تک اجلے اجلے تھے اب مٹیالے مٹیالے نظر
آتے اور لگتا کہ آہستہ آہستہ بیٹھے جا رہے ہیں کہ کسی رات وہ نیچے دھنس
جائیں گے اور صبح کو ہم پنجوں کے بل سکڑ کر روشندانوں کی راہ رینگتے
ہوئے نکلیں گے۔

خیالات کے اس رینگتے دائرے کو بیریم کاربونیٹ نے توڑا
بیریم کاربونیٹ سچ مچ آ گئی۔ جب یہ خبر ملی ہے کہ بیریم کاربونیٹ کی

### بستر اور جوتا

ایک عقل مند آدمی نے ایک بار
کہا ہر شخص کو کم از کم دو چیزوں کا حق
ہے ایک تو اچھا بستر اور دوسرا ایک
جوڑا جوتا اس لئے کہ ہماری زندگی
کا تقریباً سارا وقت بستر اور جوتے
کے اندر ہی گذرتا ہے۔

کی بلی آگئی ہے تو کچھ نہ پوچھو کیا حال ہوا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ کیلی پر ٹھہری ہوئی زمین پھر یکا یک گھومنے لگی ہے۔ جس کوارٹر والے کو دیکھو منور میڈیکل اسٹور کی طرف چلا جاتا ہے۔ جب ہم وہاں پہنچتے ہیں تو ایک مجمع جمع تھا اور ڈاکٹر منور کہہ رہے تھے "بیریم کاربونیٹ ختم ہو گئی۔"

ہم نے اشرف چاچا سے کہا "اشرف چاچا بیریم کاربونیٹ ختم بلیک میں چلی گئی۔"

اشرف چاچا غصے میں بھرے مجمع کو چیرتے ہوئے اسٹور میں داخل ہوئے۔ تڑخ کر بولے "ایک دن میں ختم ہو گئی۔ آج بلٹی آئی ہے۔ آج ہی ختم ہو گئی۔"

ڈاکٹر منور نے سکون سے جواب دیا "بات یہ ہے کہ رام گڑھ کے زمینداروں نے لمبے آرڈر بک کرا کر رکھے تھے۔"

"رام گڑھ کے زمینداروں نے....." اشرف چاچا اسی غصے سے بولے "آپ نے میڈیکل اسٹور کالونی والوں کے لئے قائم کیا ہے یا رام گڑھ کے زمینداروں کے لئے۔ مصیبت ہم پر آئی ہوئی ہے۔ بیریم کاربونیٹ رام گڑھ کے زمیندار لے گئے۔"

"اشرف چاچا وہاں زیادہ مصیبت آئی ہوئی ہے۔"

"کیا مصیبت آئی ہوئی ہے۔"

"رام گڑھ کے کھیتوں میں چوہا آ گیا ہے۔"

"رام گڑھ کے کھیتوں...... میں...... چوہا....."

اشرف چاچا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ڈاکٹر منور اطمینان سے کرسی پر بیٹھا اور فاؤنٹین پن نکال کر لکھنا شروع کر دیا۔ اشرف چاچا سٹپٹائے سے کھڑے رہے، پھر دوکان سے نیچے اترے اور کھوئے کھوئے سے چلنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے مجمع چھنٹ گیا اور منور میڈیکل اسٹور کے سامنے کی سڑک بالکل خاموش ہو گئی۔

اشرف چاچا منور میڈیکل اسٹور سے نتھو کی دوکان پہ پہنچے۔ وہاں یہ خبر پہلے پہنچ چکی تھی۔ مولوی عثمان علی خاموش حقہ پی رہے تھے۔ نتھو لا ہیں تک رہا تھا۔ اشرف چاچا بھی مونڈھا گھسیٹ کر خاموش بیٹھ گئے۔

نتھو بولا "اشرف چاچا میرا تو کل ہی ماتھا ٹھنک گیا تھا۔ جب رام گڑھ سے گھی والا آیا تو کہنے لگا کہ تم شہر والوں نے ہمیں بھی بیماری لگا دی۔"

نصر ڈین ساز جو اشرف چاچا کو سنجیدگی سے چلتے دیکھ کر ساتھ لگ گیا تھا، بولا "کہتے ہیں جی کہ بہت چوہا آیا ہے۔"

اشرف چاچا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مولوی عثمان علی نے حقے کی نے کو ایک طرف کیا۔ بولے "اللہ مسلمانوں پر رحم کرے۔" چپ ہو گئے۔ آنکھیں پھاڑے کچھ سوچتے رہے پھر فرمایا "جب آدمی کے حصے کا رزق دوسری مخلوق کھا جائے تو سمجھنا چاہئے کہ عذاب آ گیا۔"

اشرف چاچا اس پر بھی کچھ نہیں بولے۔ مولوی عثمان علی چپ بیٹھے رہے۔ زمین کو تکتے رہے۔ پھر کھڑے ہوئے۔ "اللہ رحم کرے۔" اور اپنے گھر کو ہو لئے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ہم میں سے کوئی بھی تو کچھ بات نہیں کر سکا بس گم سم بیٹھے رہے۔ پھر ایک ایک کر کے گھر چلے گئے۔ وہ رات بھی بھاری گزری۔ سیدانی جی کہتی ہیں کہ رات بھر ایسی آواز آتی رہی، جیسے پانی کی بھری مشک کوئی کتر رہا ہے۔

دوسرے جب ہم جاگے تو سیدانی جی کو چلاتے سنا کہ "کمبخت نتھو کے طاعون کی گلٹی نکلے۔ بے ایمانی پہ کمر باندھ رکھی ہے۔ آخر کل بھی تو میں نے اسی سے اُرد کی دال منگائی تھی۔ سٹے نے ایک دن میں اگنے سے دوگنا بھاؤ کر دیا۔"

سیدانی جی کے احتجاج کے باوجود اُرد کی دال اور اُرد کی دال کے ساتھ دوسری دالیں اور دالوں کے ساتھ دوسری چیزیں مہنگی ہوتی چلی گئیں اور سیدانی جی نے اعلان کر دیا کہ "نا بھیا میں تیرے امریکہ والے کا کب تک انتظار کروں۔ میں اب یاں نہیں رہوں گی۔"

اس اعلان کے باوجود سیدانی جی ابھی تک کربلائے معلیٰ نہیں جا سکی ہیں اور محسن جیسے چوہے دان میں کوئی چوہیا پھنس گئی ہو اور نکلنے کے لئے بیقرار ہو۔ روز کالونی سے شہر جاتا اور انٹرویو دیتا ہے مگر ابھی تک وظیفے کی صورت پیدا نہیں ہوتی ہے۔ ہاں مولوی عثمان علی کے متعلق طے ہے کہ وہ عید

# مسلمانوں کے بازار اور دوکان

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا۔ کہ جبن یعنی پنیر کے بارے میں اگر معلوم نہ ہو کہ کس نے تیار کیا ہے اور اس میں دودھ کے علاوہ اور کیا چیز ڈالی ہے تو ہم اس کو خریدیں یا نہ خریدیں۔ اور جو پنیر بناتے ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں اس کے جواب میں حضرت ابن عمر نے فرمایا۔

"میرا دستور ہے کہ مسلمانوں کے بازار میں جو چیز بکتی ہے اسے خرید لیتا ہوں اس کے متعلق سوال نہیں کرتا۔"

اس کے راوی حضرت نافع رحمتہ اللہ جو حضرت ابن عمرؓ کے غلام ہیں کہتے ہیں کہ اگر بن عمر مجوسیوں کے بارے میں وہ مشاہدہ رکھتے جو میں رکھتا ہوں تو میرا خیال ہے۔ کہ وہ مجوسیوں کی بنائی ہوئی پنیر کو مکروہ سمجھتے۔ حضرت نافع ایران جا چکے تھے۔ اور مجوسیوں کے طور طریقے سے واقف تھے اسی طرح امام زہری رحمتہ اللہ سے ۔فت کیا تو انھوں نے بھی یہی جواب دیا کہ جو پنیر مسلمانوں کے بازار میں بکتی ہے اس کو خرید لیتا ہوں اور اس کے بارے میں پوچھ گچھ نہیں کرتا۔ ایک صحابی اور ایک تابعی کے قول و فعل سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا بازار حلال و حرام چیزوں کے بارے میں مشتبہ نہیں ہوتا ہے۔ اور جو چیز اس میں بکتی ہے پاک و صاف ہوتی ہے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کرنا مسلمان دوکان دار اور تاجر کے ایمان پر بے اعتباری ہے۔

نیئر

### سب سے اچھی کتاب

ٹیچر نے ایک طالب علم سے پوچھا تمھیں سب سے اچھی کون سی کتاب لگتی ہے۔

طالب علم بولا — پیک بک

### بری عادت

ٹیچر — بری عادتوں کے بارے میں بچوں کو سمجھانا چاہتی تھی۔ اس نے پوچھا۔ وہ کیا چیز ہے جسے ہم بڑی آسانی سے پا جاتے ہیں مگر چھوڑنی مشکل سے ہے۔

ایک لڑکا جلدی سے بولا — بستر

جوگندر پال (دہلی)

# چوبیس کہانیاں

## رسائی

سب تدبیریں آج دم توڑ چکی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ
ری کہاں آپہنچا ہے۔"
" آپ کو معلوم نہیں؟ — خلا میں!"

## نظر

میں نے قسم کھائی کہ جب تک مجھے بند آنکھوں سے دکھائی
دینے لگے گا میں اپنی آنکھیں نہ کھولوں گا، اور آپ مانیں، یا نہ
مانیں، پیہم ریاض کے بعد آخر میں نے یہ معجزہ کر دکھایا مگر اس
کے بعد یہ ہوا کہ مجھے کھلی آنکھوں سے دکھائی دینا بند ہو گیا!

## بے موت

اپنے راکٹ میں ساتویں آسمان پر پہنچ کر انسان کو
سب ہونے لگا کہ یہاں تو کوئی بھی نہیں۔ خدا مسکرانے لگا کہ
بیچارے کو کیا معلوم، مرے بغیر موت نہیں آتی؟ اک اپنے
آپ کو سپرد کر دینے کا گر جان لیتا تو مرنے سے آپ ہی
یہاں آپہنچتا اور سب کچھ عین بعین دیکھ لیتا۔

## آدمیت

نہیں بھائی، نہیں: آدمی کو آدمی ہی سمجھو، جانور نہیں
جانور کے ذہن کہاں، جو وہ کسی کی جان لینے سے پہلے سوچ سمجھ
سکے؟ وہ تو دودھ پیتے بچے کی طرح معصوم ہوتا ہے۔ ہاں، ہاں
جانور جان لیتا بھی ہے تو نہایت معصومیت سے — آدمی کو
آدمی ہی سمجھو، صرف آدمی کی ذات ہی ہے جو نیتاً جان لیتی ہے

## آپا دھاپی

اندھے نے لنگڑے سے اس کی ٹانگیں چھین لیں اور
لنگڑے نے اندھے سے اس کی آنکھیں، اور پھر دونوں بڑے
وثوق سے اپنی اپنی منزل کو ہولئے، اور اندھا وہاں آپہنچا
جہاں لنگڑے کو پہنچنا تھا اور لنگڑا وہاں جہاں اندھے کو!

## تشخیص

ایک روبو نے ڈرتے ڈرتے اپنے ڈاکٹر سے کہا۔
" میں بہت تھک گیا ہوں ڈاکٹر صاحب۔ میرا جی چاہتا
ہے میرے جسم کے فولاد کو پگھلا کر ڈھیر کر دیا جائے۔"

ڈاکٹر فکر مند ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ کہیں تمہارے جسم میں جان تو نہیں پڑ گئی ؟ ۔

## شناخت

"محبت کرو بابا، محبت ہی محبت کئے جاؤ ۔"

"کس سے ، بابا؟ — بغض اور مکر اور خود غرضی اور بد دیانتی سے ؟ — دنیا اتنی بگڑ چکی ہے کہ نیک آدمی کی پہچان آج صرف اُس کے غصے اور نفرت سے ہوتی ہے ۔"

## عالمِ خواب

وہ کسی بہت بڑے شہر کے بہت بڑے کارخانے میں معمولی ملازم تھا۔

گھر اور کارخانے آتے جاتے اُسے ٹرین میں پانچ گھنٹے کھڑے کھڑے سفر کرنا پڑتا اور دونوں وقت تھکن کے بوجھ سے وہ کھڑے کھڑے سو جاتا۔ کارخانے میں بھی اُس کا کام کھڑے رہنے کا تھا۔ یہاں بھی شاید وہ آنکھیں کھولے کھڑے کھڑے سو جاتا مگر اس حالت میں بھی وہ بڑی تن دہی سے اپنا کام کر رہا ہوتا — مگر اس سے بھی حیرانگی کی بات یہ ہے کہ رات کو جب تک وہ اپنی چارپائی سے اٹھ کر سیدھا کھڑا نہ ہو جاتا اُسے اُس وقت تک نیند نہ آتی ۔

## "کارگزاری"

شیطان کو تنبیہہ کی گئی ۔ "تم اپنے فرض کی ادائگی میں کوتاہی برت رہے ہو ۔"

"مگر میں نے کیا کیا ہے ؟ ۔"

"یہی تو مصیبت ہے ، تمہارے کچھ نہ کرنے سے جنت میں اتنی بھیڑ ہو گئی ہے کہ وہاں بھی جہنم کی ہڑ بونگ کا سماں بندھ گیا ہے ۔"

" یہ امر تو میری کارگزاری کے اقرار کے مترادف ہے ۔"

## چپ

اس بار دیوی کے کرنے سے کیا ہوا کہ برسات کا موسم گزر جانے کے دن آ پہنچے مگر گاؤں میں پانی کی ایک بوند بھی نہ گری پہلے تو لوگ دیوی کے گن گا، گا کر کوشش کرتے رہے کہ اس کا من پسیج جائے ، پھر بھی بارش نہ ہوئی تو بعضوں نے کھلے بندوں اس کی شکایت کرنا شروع کر دیا

انہی دنوں گاؤں کے پروہت نے رائے دی کہ

گاؤں میں جسے سب سے زیادہ بولنے کا شوق ہے اس کی زبان کھینچ کر دیوی کی مورتی کی بھینٹ چڑھا دیا جائے ۔

اُسی رات دیوی کے بھگتوں نے ایک ایسے شخص کو گھیرے میں لے لیا اور اس کی چیخوں سے بہرہ پن اختیار کر کے اس کی زبان کو تالو سے کھینچ لیا اور بڑے ادب سے اسے دیوی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔

ماننے والی بات تو نہیں مگر دوسرے ہی دن گاؤں کے لوگ جب نیند سے جاگے تو دیوی رام ہو چکی تھی اور آکاش میں بادل ہی بادل چھائے ہوئے تھے ۔

## ادبی تنقید

سب لوگ کہانی سن کر جھوم رہے تھے کہ نہایت

مغرور نقاد نے ٹوک دینے کے انداز میں کہا "بڑی لطف آفریں کہانی ہے مگر اپنے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے"
سبھلانے ڈر کر اپنا جھومنا روک لیا اور ان میں سے ایک نے گویا نقاد کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کہا
ہم آپ سے متفق ہیں۔"

---

# ایک دھارمک بات

دیوتاؤں نے بھگوان سے لوک راجیہ کی مانگ منوانے کے لئے بھوک ہڑتال شروع کر دی اور یوں جان سے ہاتھ دھو کر ہماری دنیا میں پیدا ہو گئے اور یہاں کے انسانوں پر راج کرنے لگے۔ اب ان کی من مانی سے تنگ آ کر انسان بھوک ہڑتالوں پر اتر آئے ہیں، حالانکہ انہیں دھارمک پستکوں میں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ دیوتاؤں سے لڑ بھڑ کر منش کو مکتی پراپت نہیں ہوتی۔

---

# شرافت

"مادام، آپ سگریٹ مت پیا کریں۔"
"مجھے خود سگریٹ سے بے حد نفرت ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ نہ پیوں تو لوگ مجھے شریف سمجھنے لگیں گے۔"
"تو اس میں برائی کیا ہے؟"
"بہت برا ہے۔ میرا دھندا آدھا بھی نہ رہے گا۔"

---

# مسخرے

آج پارلیمنٹ میں کسی وزیر کا انداز تکلم نرا تفریحی تھا سامعین لطف اندوز تو ہوئے لیکن ہاؤس میں کوئی کام کی بات طے نہ ہو پائی۔
ہمارا ایک دوست کہنے لگا۔
"پرانے زمانے میں بادشاہوں کے درباروں میں مسخرے ہوا کرتے تھے جو کام دام کرنے کی بجائے لطیفے سنایا کرتے تھے اور وزراء دل ہی دل میں کڑھتے تھے کہ یہ مسخرے خواہ مخواہ دربار کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"
"اور آج؟"
"آج ہمارے باکمال بھانڈ کڑھتے رہتے ہیں کہ وزراء کے انتخاب میں ان خام لطیفہ گوؤں کو ہم پیشہ ورں پر کیوں ترجیح دی جاتی ہے۔"

---

# چور

میں اچانک اس انگور بیچنے والے بچے کے سر پر آ کھڑا ہوا۔
"کیا بھاؤ ہے؟"
غریب بچہ چونک پڑا اور اس کے منہ کی طرف اٹھتے ہوئے ہاتھ سے انگور کے دو دانے گر گئے۔ "نہیں صاحب! میں کھا تو نہیں رہا تھا صاحب!"

---

# گڑبڑ

ایک مشین نے دوسرے سے کہا۔ "شکر کرو ایکس تو، تم ماں کی کوکھ سے پیدا نہیں ہوئے ٹیسٹ ٹیوب میں بنائے گئے"
مگر ایکس وان۔ ایکس ٹو نے اسے جواب دیا۔ "اگر ہم پیدا ہوتے تو اس طرح پیدا ہونے کی خواہش نہ ہوتی۔"
"نان سنس! خواہشوں سے ہم کیوں بے حال ہیں...۔"

"مگر میری بڑی خواہش ہے مجھے کوئی خواہش ہو ۔
ہائے بیک ورڈ!" ایکس وَن نے اُسے حقارت سے
ٹوک دیا۔ "تمہارے بنانے میں سائنس دانوں سے ضرور کوئی
گڑبڑ واقع ہوئی ہوگی ۔"

## میلے ملاقاتیں ۲۶

ہاں، میں ہر ایک سے نفرت کرتا ہوں، ماں باپ
سے، بھائی بہن سے — دوستوں سے — ہر ایک سے
— نہیں، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کہ کسی سے نفرت مت
کرو؟ — نہ بابا، آپ کی بات مان لوں تو اکیلا ہو کر رہ
جاؤں ۔

## اطمینان

ہمارے بھائیا جی مرحوم کو سفر کے دوران گاڑیاں بدلنے
سے بڑی کوفت ہوتی تھی ۔ اپنے آخری سفر سے تھوڑی دیر پہلے
وہ ہمیں سمجھا رہے تھے، ٹھیک ہے، لمبا سفر ہے لیکن میں
نے راستے میں کونسی گاڑی بدلنی ہے؟ آرام سے لیٹے لیٹے
جا پہنچوں گا۔

## سچائی

دوسروں کو چھوڑیئے، کم سے کم میرا اپنا آپ ہی میرا
ساتھ دیئے جاتا۔ جب میں عین بین سچ بولنے کی ٹھان لیتا تو میرا
اپنا آپ بھی منہ موڑ کر سبھوں کے ساتھ جا کھڑا ہوتا اور میرا
مذاق اڑانے لگتا — نہیں، سچائی اتنی بھی نہیں ہوتی کہ اُس
میں ہمارا اپنا آپ بھی شریک نہ ہو۔ ایسی سچائی سے تو وہ
کھلا کھلا جھوٹ بہتر ہے جسے بولتے ہوئے کسی سے بے اختیار
گلے ملنا ہو جائے ۔

## اپنے بیگانے

نہیں، گاڑھے خون کا محاورہ بھول جاؤ اور جیسے ہے ویسے
ہی اپنے پتلے خون کو کھلے بندوں رگوں میں بہنے دو۔ خون بہتا
رہے تو دل میں سے گزر گزر کر صاف ہوتا رہتا ہے اور بیگانے
بھی اپنے معلوم ہوتے ہیں — نہیں، بابا، خون گاڑھا ہو کر
کسی نالی میں جم کر رہ گیا تو اُسی دم ڈھیر ہو جاؤ گے

## آگے آگے

وہ اپنی موٹر کار میں بیٹھے ایک جنازے کے پیچھے پیچھے آ
رہا تھا اور بار بار ہارن بجا رہا تھا کہ تیز تیز آگے نکل جائے۔
آخر وہ جنازے کے آگے راہ بنا لینے میں کامیاب ہو گیا اور
اطمینان کا سانس لے کر گاڑی کو کھلی سڑک پر بے رکاوٹ
چلانے لگا۔
آنکھ جھپکتے ہی وہ یہاں قبرستان کے موڑ پر آ پہنچا اور
عین یہیں ایک برق رفتار ٹرک سے بے تحاشہ ٹکرا گیا۔
وہ مردہ اُس سڑک پر ابھی بہت پیچھے تھا ۔

## مرے ہوئے لوگ

مرنے والا اتنا پوکس تھا کہ ہر دم اپنی آنکھیں کھلی رکھتا تھا، سو بھی جاتا تو کھلی آنکھوں سے ـــــ دیکھئیے، مر کے بھی، پوری آنکھیں کھولی ہوئی ہیں، مگر کیا فائدہ ؟ اتنی سی نظر تو بھی عاری ہے کہ اپنی موت کی واردات سے بے خبر نہ ہو۔

---

## پگلے کی بات

چند ہی روز پہلے میں اپنے محلے کے مندر میں گیتا کا پاٹھ سن رہا تھا۔ پنڈت جی رقت بھرے لہجے میں کرشن کے الفاظ دہرا رہے تھے کہ جب پاپ ہی پاپ کا دور دورہ ہونے لگتا ہے تو میں جنم لیتا ہوں ـــــ

ہمارے جوتوں کے قریب بیٹھے ہوئے ایک پاگل نے پنڈت جی کو ٹوک کر کہا۔ "میں تو پیدا ہوئے پاگل بھی ہو چکا ہوں پنڈت جی، مجھے کوئی پہچانے بھی۔"

---

## جو ئندہ

میری گاڑی جہنم کی طرف منہ کئے ہوئے ہے۔

پیٹرول پھنک رہا ہے اور انجن چل رہا ہے مگر گاڑی گیئر میں نہیں آپا رہی اور یوں کی توں راستے میں کھڑی ہے اور میرا دم اس خوف سے خشک ہو رہا ہے کہ میرا سارا تیل اسی طرح کھڑے کھڑے پھنک گیا تو میں اپنے جنم تک کیسے پہنچوں گا اور میری نجات کیسے ہوگی ؟

---

رشید امجد (پاکستان)

# "طناب ٹوٹا خیمہ"

یہ شہر بہت پراسرار ہے۔ یہاں لوگ جاگ رہے ہیں، پھر بھی سو رہے ہیں یا سو رہے ہیں پھر بھی جاگ رہے ہیں۔

سڑک کے بیچوں بیچ اس منڈیر پر جو اس چوڑی سڑک کو دائیں بائیں تقسیم کرتی ہے، پنجوں کے بل توازن درست کرتی ایک عورت۔ ایک مرد۔ ان کے درمیان ایک گول مٹول بچہ ــ سڑک پار کرنے کی کوشش میں ایک قدم اٹھاتے ہیں لیکن سنسناتی گاڑیوں کی سیٹیاں انہیں پیچھے دھکیل دیتی ہیں۔

چوک میں ٹریفک کا سگنل سرخ ہوتا ہے۔

دونوں، بچے کو بازوؤں سے پکڑ لیتے ہیں اور ڈول ڈنڈا ــ ڈول ڈنڈا کرتے سڑک کی پھیلی بانہوں میں اتر جاتے ہیں۔

بچہ بازوؤں میں جھولتے ہوئے ہنستا ہے ــ غوں غوں غوں

ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر پھولی سانسوں کو ٹھیک کرتے ہوئے وہ دور تک پھیلے خلا میں نظر دوڑاتا ہے۔ دائیں ہاتھ ٹیلے کے ساتھ جڑے پانچ چھ کیکر کے درخت ہیں۔ اوپر سے یہ دکھائی دیتے ہیں لیکن نیچے جا کر ایک ہو جاتے ہیں۔ زمین دور دور تک کٹی پھٹی ہے۔ اونچے نیچے ٹکڑے گندم کی سبز بالیاں جن میں پھیلاہٹ جھلملا رہی ہے۔ بائیں طرف درختوں کا ایک خاموش بند کھیتوں کے درمیان خاموش سوئی ہوئی پگڈنڈی۔

تینوں سڑک کے دوسری طرف پہنچ گئے ہیں۔ بچے کو ــ فٹ پاتھ پر کھڑا کر کے مرد گزرتی ٹیکسیوں کو ہاتھ دے رہا ہے۔

ایک ٹیکسی ان کے قریب رک جاتی ہے۔

وہ بچے کو بازوؤں میں جھلاتے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاتے ہیں۔

بچہ اچک اچک کر کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے ٹیکسی کی رفتار تیز ہوتی ہے، پھر کم ہونے لگتی ہے۔

برابر کی گلی میں سے بھینسوں کا ایک قافلہ نکلتا ہے اور سڑک عبور کرنے لگتا ہے۔

مرد ہنستا ہے ــ عورت اسکی طرف دیکھتی ہے تو کہتا ہے "اس سڑک پر چھٹی اور بیسویں صدی ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔"

ٹیکسی بھینسوں کے درمیان سے راستہ بنانے کی کوشش میں ایک اور گاڑی سے رگڑ کھاتی ہے۔ دونوں ڈرائیور نیچے اتر آتے ہیں اور ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہرانے کے لئے زور زور سے بولتے ہیں۔ پیچھے دور تک ٹریفک رکی ہوئی ہے۔

بھینسوں والا بڑے مزے سے ــ ہو ہو کرتا چلا جا رہا ہے ٹیلے کے چاروں طرف ایک پُراسرار خاموشی ہے۔

اِکا دکا درختوں کے ساتھ چلتی پگڈنڈی ڈھلوان کی طرف مڑنے لگتی ہے۔ اس سے آگے گہری کھائی ہے۔ اتنے سالوں میں بھی اس پر پل نہیں بن سکا۔ کھائی کے دوسری طرف جرنیلی سڑک ہے جس پر سارا دن ٹرک بسیں اور کاریں دوڑتی رہتی ہیں۔ کھائی سے اس طرف خاموش کھیت ہیں، جہاں رات پھسلتی ہوئی آتی ہے اور پاؤں پسار کر لیٹ جاتی ہے صبح آنکھ کھلتے ہی سورج گھر کے آنگنوں میں جھائیاں مارنے لگتا ہے

گٹکوں گٹکو، کی آواز وقفوں وقفوں سے چاروں طرف گونجتی ہے۔ ایک ہی لے۔ ایک ہی سُر میں ٹیکسی ایک جھونکا۔

سڑک پر دوسری گاڑیوں کے ہجوم میں

گمری قدم قدم چل رہی ہے۔ بچہ اچھل اچھل کر کھڑکی کی طرف لپکتا ہو
" دیکھو، دیکھو شیشے سے سر نہ ٹکرا جائے " مرد عورت کو۔
خبردار کرتا ہے۔
اونچے ٹیلے پر بیٹھا وہ
سامنے والے کھیت
میں کام کرتی ایک
عورت اور اسکے بچے
کو دیکھ رہا ہے عورت
چھولئے کے پکے پودے
توڑ رہی ہے اور بچہ
انھیں گڈیوں میں
باندھ رہا ہے۔
سورج کے کرنوں
میں جوانی کا گرم خون
دوڑنے لگا ہے۔
وہ جسموں میں چٹکیاں لینے لگی ہیں۔

## نشانہ

ایک شخص گولف کے کھیل کا بہت۔
شوقین تھا۔
ایک بار وہ اپنی خوش دامن صاحبہ
کو اپنا کھیل دکھانے لایا۔ اور اپنے دوست
سے کہا
" میں بہترین ہٹ لگانا چاہتا ہوں ۔۔
میری ساس گیلری میں بیٹھی ہیں "
" بے وقوف مت بنو " دوست نے ۔
سنجیدگی سے کہا ـــ " اتنے فاصلہ سے تم
انھیں نشانہ نہیں بنا سکتے "

پسینے میں ڈوبی ہوئی عورت اور بچہ ـــ چھولئے، مسور
اور گیہوں کی مسحور کن خوشبو ـ اور مسلسل ـ ٹکو ٹکو ٹیکسی آگے
پیچھے کے رش میں اب تقریباً رک گئی ہے۔
بچہ شیشے میں سے جھانکتے ہوئے مسلسل، "غوں غوں ـ
غوں" کر رہا ہے۔
عورت کہتی ہے " جان دیکھو منا باتیں کرنے کی کوشش
کر رہا ہے "
بچہ یہ سن کر " اُکاں ـ کناں ـ کاں " کرتا ہے۔
" دیکھا ـ دیکھا " عورت خوشی سے پھولے نہیں سماتی۔
مرد مسکراتا ہے ـــ ایک گہری پُراسرار مسکراہٹ۔
" بس بولنے کا جادو ہی ہوتا ہے " وہ مسکراتا رہتا ہے " ہم بول
سکتے ہیں مگر کیا واقعی بول سکتے ہیں ؟ " بچہ اس بات سے بے نیاز
شیشوں میں سے جھانکتے ہوئے ـ " غوں ـ غاں، آکناں ـــ

کاں کاں " کرتا رہتا ہے۔ آگے ایک تانگے والا بدکے ہوئے
گھوڑے کو رام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔
پیچھے مسلسل پوں پوں میں پر دلی ہوئی لمبی گاڑیوں کی قطار
ایک موٹر سائیکل ٹیکسی کے برابر آکر رکتی ہے۔ موٹر سائیکل
پر ایک نوجوان جوڑا بیٹھا ہے۔ لڑکے نے جین کی جیکٹ اور
پتلون پہنی ہوئی ہے۔ لڑکی نے پتلون نما پائجامہ۔
اسٹیرنگوں کے پیچھے بیٹھے سارے مرد اسے دیکھتے ہونٹوں پر زبان
پھیرتے اور مزے سے ہارن بجاتے رہتے ہیں سڑک کے دوسری
طرف فٹ پاتھ پر دو عورتیں سفید ٹوپی دار برقعہ پہنے سڑک پار
کرنے کی جستجو میں کبھی اِدھر کبھی اُدھر جاتی ہیں۔ ان کے لمبے
خیمہ نما برقعے ان کے لئے مصیبت بنے ہوئے ہیں اور بار بار ان
کے پاؤں میں الجھتے ہیں۔
ٹیلہ پر بیٹھا وہ خاموش چپ نظروں سے چاروں طرف
دیکھتا ہے، عورت اور بچے نے چھولئے کی گڈیاں سروں پر رکھ
لی ہیں اور مزے مزے پگڈنڈی پر چلے جا رہے ہیں
گھوڑا تانگے والے کی مسلسل کوششوں کے باوجود نہیں مان
رہا۔ سٹیرنگ کے پیچھے بیٹھے سارے پوں پوں کر رہے ہیں برابر کی
سڑک میں سے ایک بیل گاڑی نکل کر ٹیکسی کے دوسری طرف
آن کھڑی ہوتی ہے۔
بچہ شیشوں میں سے جھانکتے ـــ " اُکاں ـ کاں کاں "
کر رہا ہے۔ اسکے پیچھے گاڑیوں، بیل گاڑیوں، موٹر سائیکلوں
کی قطاریں رفتہ رفتہ ساکت ہوتی چلی جاتی ہیں۔
ایک پراسرار شور ـ شور ہی شور ـــ دفعتاً ٹیکسی ڈرائیور
کو احساس ہوتا ہے کہ پچھلی سیٹ پر گہری خاموشی ہے۔
وہ تیزی سے مڑتا ہے ـــ پچھلی سیٹ خالی ہے ـ وہ
حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور اس کی نظر دکانوں پر
لگے سائن بورڈوں پر جا رکتی ہے۔ عورت چائے کے ایک اشتہار
پر چپکی ہوئی ہے۔ مرد سگریٹ کے ایک اشتہار پر کھڑا ہے
اور بچہ دودھ کے ایک اشتہار پر گلاس ہاتھ میں لئے کچھ

بقیہ صلاہ پر

ڈاکٹر قمر التوحید (دربھنگہ)

# پہاڑیوں کے اس پار سطح مرتفع پر

(MY FLESH IS CLOTHFD WITH WOR S AND CLODS OF DUST; MY SKIN IS BROKEN, AND BECOME LOATHSOME ___ JOB)

---

آدرہ اسٹیشن پر اترنے کے بعد ہی بلراج کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ایک عجیب سی دنیا میں چلا آیا ہے۔ پلیٹ فارم پر بے شمار قلی لنگوٹی باندھے، ننگے بدن، ان کے جسم سیاہ، چہرے گول اور لمبوترے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ بلراج نے تھوڑی دیر تک انلوگوں کا جائزہ لیا یہ لوگ ایسی زبان بول رہے تھے جو ہندی اور بنگلہ کا امتزاج معلوم ہوتی تھی۔ پلیٹ فارم کے باہر اس کی کار کھڑی تھی۔ وہ اس پر سوار ہو کر فوراً ہی پرولیا کے لئے روانہ ہو گیا۔ چھوٹا ناگپور کی سڑکیں مشہور ہیں۔ یہ سیاہی لئے ہوئے گہرے نیلے رنگ کی ہزاروں بل کھاتی ہوئی اس سطح مرتفع کے جنگلات میں نہ جانے کہاں کہاں گم ہو جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر میں اس کی کار بھی جنگلوں میں کھو گئی۔ پھر گھاٹیوں کے درمیان سے گذرتی ہوئی یہ بستیوں میں نکل آئی۔ یہ بستیاں بظاہر بلراج کو خاموش اور ویران نظر آئیں۔ صبح کا وقت ہوتے ہوئے بھی ان میں سے دھواں نہیں اٹھ رہا تھا۔ جابجا گاؤں کے لوگ، ہل اٹھائے ہوئے بیلوں کو ہانکتے ہوئے جلدی جلدی بھاگے جا رہے تھے۔ کچھ مشرق کی طرف اور کچھ مغرب کی طرف۔ یہ لوگ سڑک کے بغل سے گذر رہے تھے۔ ان میں جوان اور بوڑھے دونوں ہی قسم کے لوگ تھے۔ بوڑھے مانجھیوں کی چال سے پتہ چلتا تھا ان کے اعضا معطل اور بے کار نہیں ہوئے ہیں۔ جوان مانجھیوں کے قدموں میں لپک تھی، پختگی تھی۔ ان کے بازو مضبوط تھے یہ سب کے سب بھاگ رہے تھے، مشرق و مغرب کی طرف۔ شاید وقت کا ساتھ پکڑنے کے لئے اس لئے کہ اس نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا ان کا محبوب دیوتا، سورج دیو مشرق کی پہاڑیوں کے عقب میں، نارنگی کے رس میں ڈوبا ہوا تھرک رہا تھا۔ ان پہاڑیوں کے دامن میں پھیلے کھیت اور ان کی بیشمار منڈیریں، شبنم کی بوندوں میں تر، نارنگی کے رس سے نکلتے ہوئے دیوتا کی منتظر تھیں۔ تھوڑی دور کے بعد، ایک گاؤں کے نزدیک ڈرائیور نے گاڑی روک لی اور اتر کر اس میں نہ جانے کون سی خرابی ڈھونڈنے لگا۔ بلراج بھی نیچے اتر پڑا۔ رات بھر جاگنے کے بعد، اس کی آنکھیں بوجھل ہو گئی تھیں۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا نے اسے فرحت دی۔ سڑک پر دیہاتی عورت اور مرد اسی طرح سے بھاگے جا رہے تھے۔ نوجوان اور ادھیڑ عمر کی عورتیں سر پہ بوجھ اٹھائے کمان کی طرح سے جھکی ہوئی بھاگی جا رہی تھیں۔ ان کی چھاتیاں ننگی تھیں۔ بلراج نے انھیں دیکھا مگر ان میں جزیرۂ بالی کی اپسرا جیسی دوشیزاؤں کا حسن نہیں پایا۔ یہ لٹکتی ہوئی، بدنما، بے بسی سے خلا میں جھولتی ہوئی چھاتیاں تھیں۔ بعض بعض عورتوں کی پیٹھ پر ان کے سیاہ فام بچے چمگادڑ کی طرح چمٹے ہوئے رو رہے تھے۔

انکی ساڑیاں، پنڈلیوں کے اوپر سے اٹھی ہوئی۔ ان کے کولہوں پر کسی ہوئی تھیں۔ انکے چہرے اس سطح مرتفع کی ہیئت کی طرح ناہموار تھے ان ناکیں چپٹی یا پھیلی ہوئی چینیوں جیسی تھیں۔ انکی آنکھیں بڑی بڑی مگر گول تھیں جیسے مچھلی جیسی۔ ان کی پیشانیاں چوڑی تھیں جیسے کنکریٹ سے پٹی ہوئی سڑک۔ یہ سب کی سب اپنے بچوں کے مستقبل کی طرف دوڑ لگا رہی تھیں۔ بلراج کی آنکھیں دور دور تک انکا تعاقب کرتی رہیں۔ مگر یکایک بچوں کے شور نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ سڑک کی دوسری طرف ایک چھوٹا سا گندہ تالاب تھا۔ اس میں ننگے بچے صبح سویرے نہا رہے تھے۔ وہ سب کے سب اس پھیلے تالاب میں ادھم مچاتے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں بلراج کو ان سے نفرت ہو گئی۔ ان غلیظ، میلے اور ننگے بچوں سے، جو تالاب کی کیچڑوں سے لپٹ کر پروان چڑھ رہے تھے۔ ان بیکار، مریض بچوں سے جنکے پیٹ ڈھول کی مانند پھولے ہوئے تھے اور جنکی ٹانگیں سوکھی ہوئی ٹہنیوں جیسی تھیں۔ اور سڑک کے کنارے کنارے کمان کی طرح سے جھکی ہوئی یہ عورتیں ابھی تک بھاگ رہی تھیں جنہوں نے ان بچوں کو جنم دیا تھا اور بس۔ جنہوں نے خلا میں جھولتے ہوئے تھنوں سے انہیں کیچڑ پلا کر کادے الجھنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ بلراج انہیں حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ "ایسی مائیں اف" وہ منمنایا۔ "اور ان ماؤں کی مائیں۔ سیاہ اور غلیظ"..... اس کی آنکھیں یکایک بوجھل ہو گئیں۔ "ڈرائیور" اس نے زور سے کہا۔

"ہاں جی"

"کیا درست ہو گئی گاڑی"

"درست ہی ہے۔ کوئی خرابی نظر نہیں آتی"

"تو پھر چلو"

فوراً ہی گاڑی سڑک پر پھسلنے لگی۔ سڑک کے دونوں طرف بڑے قدیم برگد اور پیپل کے جٹا دار درخت ان کی جڑوں سے لپٹی ہوئی شاخوں کو چومتی ہوئی، سانپ جیسی لتریں، اور پھر ان درختوں کے درمیان کی گرپائی ہوئی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں، اپنی آبادی سے ایک عجیب تضاد پیدا کر رہی تھیں۔ جب کار شہر کے اندر داخل ہوئی تو بلراج نے دیکھا کہ مکانوں کے در بیچے بند ہیں۔ شہر پر باسی پن ابھی تک قائم تھا جیسے کسی دیوتا کے گلے سے پھینکا ہوا باسی پھولوں کی مالا ہو۔ بعض دروازوں پر کچھ مرد، بیٹھے ہی ہوئے، دوبارہ سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر سڑک پر بہت سی عورتیں ایک ہی سمت کو شاید پانی لانے کے لئے جلدی جلدی قدم اٹھا رہی تھیں۔ ان سارے مکانوں کو پار کرتی ہوئی، کار، بلراج کے چچا کے مکان پر پہنچ گئی۔

بلراج کے مکانوں کے سامنے احاطہ تھا۔ اس احاطہ کے فوراً ہی بعد ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس میں ایک طرف دھوبی کپڑے صاف کیا کرتے تھے۔ ایک طرف لوگ نہایا کرتے تھے اور ایک طرف شہر کے آفیسروں کی گاڑیاں دھوئی جاتی تھیں۔ اس کے بعد میدان تھا تھوڑی دور مشرق کی طرف بڑھنے کے بعد ایک جھیل تھی جسکا پانی نہ جانے کس چیز کے پتوں سے ڈھنکا ہوا تھا۔ یہ جھیل صرف پینے کے پانی کے لئے مخصوص تھا۔ جھیل کے بغل ہی سے نصف دائرہ کی شکل میں ایک سڑک مغرب کو جاتی تھی۔ بلراج اسی سڑک پر ایک دن نکل گیا۔ جھیل میں بہت سے مچھوے، جال ڈالے ہوئے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ ان لوگوں نے ایک طرف جال ڈال رکھا تھا اور دوسری طرف سے دس بارہ مچھوے اپنے ہاتھ پانی کے اندر ڈالے ہوئے، اور اس میں زور کی حرکت دیتے ہوئے ایک ساتھ جال کی طرف بڑھ رہے تھے جیسے ہی وہ جال کے نزدیک پہنچے، ایک عورت نے فوراً ہی جال کی رسی کو اوپر کھینچ کر بٹوہ کی طرح اس کا منہ بند کر دیا۔ مچھلیاں جال کے اندر پھڑپھڑانے لگیں۔ مگر ان مچھلیوں کو دیکھنے کے بعد یہ سب کے سب مایوس ہو گئے اور ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ بلراج کو یہ عجیب سا معلوم ہوا۔ اس نے ان سے پوچھا "تمہیں کیا ہوا جو اس طرح سے چپ ہو گئے؟"

وہ سب شاید چونک گئے اور پھر اسے گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ ایک نے آسمان کو دیکھتے ہوئے نہ جانے کیا کہا جس پر یہ لوگ جلدی جلدی اپنے جال سمیٹنے لگے۔ جاتے وقت ایک نے بلراج سے کہا "آپ نئے کے یہاں نیا آیا، بابوجی" اور وہ آگے بڑھ گیا۔ انکی عورتیں بھی بلراج کو ایک بیگانگی اور ویران آنکھوں سے تکتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ یہ سب کے سب

بالکل سیاہ تھے۔ دھوپ میں ان کے جسم چمک رہے تھے۔ جیسے کسی نے ان پر روغن مل دیا ہو۔ عورتوں کے سینے بڑے بڑے تھے اور ان کے جسم سڈول۔ وہ سڑک پر آتے ہی تیزی سے دوڑنے لگے۔ پھر بلراج بھی آگے بڑھ گیا۔ اسے 'ایارکٹر' جانا تھا۔ وہاں اس کا ایک دوست بزجی رہتا تھا جس سے اس نے تین سال سے ملاقات نہیں کی تھی سڑک پر سے گذرتے ہوئے وہ عجیب عجیب مناظر دیکھ رہا تھا۔ یہاں کے لوگ ایک ہی قسم کے تھے۔ لنگوٹیاں باندھے، انکے سورج میں چمکتے ہوئے سیاہ جسم، یہ سب کے سب زمانے کا تعاقب کر رہے تھے۔ بلراج کو انکی آنکھیں جنگلی جانوروں جیسی معلوم ہوئیں۔ ان کے دانت سفید اور نوکیلے تھے۔ آدم زادوں جیسے۔ مگر بلراج کو یہ وحشی معلوم نہ ہوئے۔ ان میں آدم زادیت نہیں تھی۔ یہ اپنی ماؤں کے پیٹ سے ہی وحشیانہ چمک لے کر آئے تھے۔ ان ماؤں نے تہذیب کے گہوارہ میں کبھی بھی پینگیں نہیں لگائی تھیں۔ وہ وحشی تھے مگر بلراج کو یقین تھا کہ ان میں بھی محبت کرنے کا بے پناہ جذبہ ہے۔ ان کی ویران آنکھیں، ان مچھلی مارنے والی عورتوں کی ویران آنکھیں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں۔ ان میں بلراج کو معصومیت کی جھلک نظر آئی۔ مگر ان میں کسی شئے کی کمی تھی۔ وہ متلاشی تھیں۔ قریب قریب یہاں کے سارے لوگوں کی آنکھیں متلاشی تھیں۔ شاید اسی کی کھوج میں یہ سب کے سب شب و روز مشرق اور مغرب کی طرف بھاگتے رہتے تھے۔ جس طرح سے آدھ سے آتے ہوئے، سڑکوں پہ کمان کی طرح سے جھکی ہوئی عورتیں بھاگ رہی تھیں۔ یہ لوگ صدیوں سے اسی طرح بھاگ رہے تھے۔ آگے کی طرف مگر پیچھے کی طرف۔ زمانہ کے ہمدوش ہونے کے لئے تنہا، اس ویران بھومی میں جس کے جگر کے اندر سیاہی میں لپٹے ہوئے سونے تھے۔ جس نے مغرب کے بہت سے جہازیوں کو ہندوستان کی بندرگاہوں پر اکٹھا کر دیا تھا تاکہ وہ اس کے جگر کو پاش پاش کر کے کوئلے اکٹھا کریں اور سونے جمع کریں یہ ایک عجیب کھیل تھا۔ زندگی کا رقصِ حسین یا رقصِ مجنونانہ۔ زندگی اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ، اس بھومی کے جنگلوں میں، جابجا بسی ہوئی عمارتوں کے اندر جلوہ فگن تھی۔ بلراج یہ جانتا تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس بھومی کی کوکھ سے نکلی ہوئی، اس کی بیٹیاں، باہر، پہاڑوں کے دامن میں سورج کی روشنی میں یا اپنی جھونپڑیوں میں بیمار اور غلیظ بچے جن رہی تھیں۔

بلراج بہت ہی خاموشی سے ان ماؤں اور باپوں کو دیکھتا ہوا خاموشی سے چل رہا تھا۔ جھیل کی دوسری طرف سیکڑوں کنسٹر پانی سے بھرے رکھے تھے۔ ایک شخص انہیں اٹھا اٹھا کر ایک گاڑی پر رکھ رہا تھا جسے کھینچنے کیلئے دو انسانی جانور تیار تھے۔ چوک کے نزدیک اس نے دیکھا کہ لوگ پیسے دے کر پانی سے بھرے کنسٹر خرید رہے ہیں۔ "تو اس میں پینے کا پانی ہے جو بک رہا ہے" وہ دل ہی میں بول بول اٹھا۔ اور اسکے ذہن میں دوسرے شہروں کی واٹر ٹنکیاں گھوم گئیں جن میں لاکھوں گیلن پانی شہریوں کے لئے اکٹھا ہو رہتے تھے۔ اور یہاں کے بیوقوف انسان جھیل کے گندے پانی خرید کر پیار کرتے تھے۔ وہ اب سمجھ گیا کہ یہ لوگ مشرق سے زیادہ مغرب کی طرف کیوں بھاگ رہے ہیں۔ صدیوں کا چکر گھوم چکا تھا۔ اب ان کے سر کے اوپر اشوک کا چکر رقص کیا کرتا تھا۔ سکھ اور شانتی کا ضامن چکر۔ گوتم بدھ نے کہا تھا دھرم کرو، دھرم کرو، ——— مگر یہ تو جھیل کے گندے پانی پیتے تھے، خرید کر ان کی عورتیں جنگلوں میں، یا سڑک کے کنارے ہی لڑکے جنتی تھیں

## خوشی کے آنسو

ایک پرانا شادی شدہ جوڑا دیوان خانہ میں بیٹھا تھا۔ شوہر پہ غنودگی طاری تھی۔ وہ کرسی میں بیٹھا آنکھیں بند کئے ہوئے تھا۔ بیوی نے بے لطفی سے ٹیلی ویژن دیکھ رہی تھی۔ یکایک انتہائی شدید طوفان آگیا جس نے پورے گھر کو ہلا کر رکھ دیا۔ اور اُن دونوں کو اڑا کر گھر سے ایک میل دور میدان میں لا پٹکا۔

بیوی سسکیاں لے کر رونے لگی تو شوہر نے دلاسہ دیا۔

"خدا کا شکر ادا کرو کہ ہم لوگ سلامت ہیں۔"

بیوی بولی "میں تو خوشی سے رو رہی ہوں۔ دس سال بعد ہم دونوں ایک ساتھ گھر سے باہر نکلے ہیں۔"

## غلط چابی

قدیم یونان میں ایک فوجی لام پر جانے لگا تو اس نے اپنی نوجوان اور خوبصورت بیوی کو گھر میں بند کر دیا اور چابی اپنے ایک عزیز دوست کو دیتے ہوئے بولا

"اگر میں چھ مہینے کے اندر واپس نہ آؤں تو تم اس چابی کا استعمال کر لینا مجھے تم پر بھروسہ ہے میرے دوست"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

تقریباً دس میل دور گیا ہو گا کہ اس نے ایک گھوڑا دیکھا جو گرد و غبار اڑاتا اس کی طرف آ رہا تھا سوار قریب آیا تو اس نے پہچان لیا۔ وہ اس کا وہی عزیز دوست تھا۔

"کیا بات ہے؟"

فوجی نے پوچھا۔

"تم نے غلط چابی دے دی۔" دوست نے ہانپتے ہوئے کہا۔

---

دھم کرد، دھم کرد — اور ابھی لئے اشوک کا چکر ان کے سر کے اوپر رقصاں، ان کی جنم بھومی کے اوپر رقصاں ان گاڑیوں کے پہیوں کی طرح گھوم رہا تھا جن پر قیمتی پانی کے کنستر، گندے اور تعفن آمیز جھیل سے نکالے ہوئے، شہر کی گلیوں میں گھوما کرتے تھے پھر ان کنستروں کو گاہک کا بہت زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے کہ زمانہ یہاں کے لوگوں کی زندگی سے کھسک کر جنگلوں میں بسی ہوئی بڑی بڑی عمارتوں میں جا گھسا تھا جہاں سے ماضی میں کوئلہ سونا بن کر سمندر کے اس پار نہ جانے کہاں کہاں گم ہوتا تھا۔ اور ان کے کوئلے جیسے اجسام، امراض کے تنوروں میں پکے ہوئے ان کی رنگی ہوئی مدقوق و مفلوج زندگیاں ان سیاہ سڑکوں پر دوڑ لگا رہی تھیں۔ اسی وقت سے، اسی طرح۔ ان میں یکسانیت تھی بلراج اس یکسانیت کے تسلسل سے گھبرا گیا۔ اس کی خواہش ہوئی کہ وہ ان کنستروں کو جا کر الٹ دے، اس جھیل کو خشک کر دے اور پھر بیٹھ کر ان لوگوں کی حالت دیکھے۔ جب وہ بازار میں پہنچا تو دوکانیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی تھیں لوگوں کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان میں گھر پہنچنے کی جلدی ہے۔ اس نے دیکھا کہ بہت سے دوکاندار اپنی دوکانوں کو بند کر کے، اسی کے اندر دبک پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بازار قریب قریب سنسان ہو گیا۔ اُدھر، بغل کے محلوں سے مندروں میں بجتے ہوئے گھنٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ بلراج ڈرنے لگا۔ اس نے اپنے کو تنہا پایا۔ ایک شخص سے اس نے پوچھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اس نے اسے غور سے دیکھا اور کہا "جلدی سے چلے جاؤ بابو۔ وہ سب آتا ہے" یہ کہہ کر وہ بھی چلا گیا۔ بلراج کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون لوگ آ رہے ہیں جن کے خوف سے دوکانیں بند ہو رہی ہیں اور لوگ بھاگے جا رہے ہیں: "کیا ڈاکو آ رہے ہیں؟" "اگر نہیں تو پھر کون ہیں یہ لوگ؟" خوف کے ساتھ ساتھ اسے یہ اشتیاق ہو رہا تھا کہ وہ ان لوگوں کو دیکھے۔ وہ ایک پنجابی کی دوکان کے سائبان میں کھڑا ہو گیا۔ کافی دیر گذر جانے کے بعد بھی وہ لوگ نہ آئے۔ اسکا اشتیاق اور بڑھتا جا رہا تھا۔ دوکانیں قریب قریب بند ہو چکی تھیں۔ بس اسٹینڈ میں چند بسیں کھڑی تھیں۔ ان کے ڈرائیور اندر بیٹھے ہوئے شاید سو رہے تھے مگر بازار میں لوگ پھر بھی آ جا رہے تھے۔ ان آنے جانے والوں میں تھوڑی سی دیر میں جو تبدیلی واقع ہوئی بلراج نے اسے نہیں دیکھا۔ ان لوگوں کی رفتار میں تیزی نہیں تھی۔ یہ لوگ رک رک کر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ ان کے ارد گرد مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں جس طرح سے چوسے ہوئے آم کی گٹھلیوں پر بھنبھنایا کرتی ہیں۔ ان کے ہاتھوں کی انگلیاں غائب تھیں۔ بعض کی ناک کا نچلا حصہ ہی مکمل جا چکا تھا۔ کچھ بیٹھے ہی بیٹھے چل رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ چیتھڑے لپیٹے ہوئے ننگی عورتیں۔ جنکے چہرے بگڑے ہوئے تھے۔ جن کی چھاتیاں کریہہ المنظر تھیں۔ ان کے گالوں پر بڑے بڑے داغ تھے۔ جیسے خون منجمد ہو گیا ہو۔ جیسے ابر آلود آسمان کے پس منظر میں تانبے کے پہاڑ ہوں۔ انکی ٹانگوں پر میلی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ بلراج نے ان آنے والوں کا خیال چھوڑ دیا اور انہیں دیکھنے لگا۔ یہ سب کے سب کوڑھی تھے۔ ان کے چہروں پر کوڑھ کے بدنما قدیم دھبے تھے۔ ان کی زندگی اپنے

رکز سے پرواز کر چکی تھی۔ یہ خلا میں لاٹھی ٹیک کر چلتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ ساتھ ان بے شمار کیڑوں کی بھی پرورش کرتے تھے جو ان کے زخم سے چمٹے ہوئے تھے۔ یہ زخم زردی مائل سفید تھے۔ یہ سرخ بھی تھے پیپ سے بھرے ہوئے، رستے ہوئے اور بہتے ہوئے تھے۔ یہ گندی پٹیوں سے بندھے تھے۔ بلراج دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔ پھر بلراج کو ان آنے والوں کا خیال آگیا جنکا وہ منتظر تھا۔ اس نے دوکاندار سے پوچھا "آخر وہ کون لوگ ہیں جن کے خوف سے دوکانیں بند ہو گئی ہیں۔ وہ ابھی تک آئے نہیں۔" دوکاندار نے اسے غور سے دیکھا

"نئے آئے ہو یہاں بابو جی"

"ہاں صاحب، مجھے یہاں آئے چند ہی روز ہوئے ہیں۔"

"جبھی تو آپ آنے والوں کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"کیوں؟ کیا وہ ہمیشہ آتے ہیں؟"

"ہاں جی ہمیشہ آتے ہیں، آج ہی کے دن۔ سنیچر کے روز۔ اسی لئے دوکانیں قریب قریب بند ہو جاتی ہیں۔ وہ آج سے نہیں آتے بلکہ برسوں سے۔"

"تو حکومت انہیں روکتی کیوں نہیں۔" دوکاندار ہنسنے لگا

پھر اس نے کہا

"حکومت کے افراد ہم آپ ہی تو ہیں۔ اور پھر جان کا ڈر۔"

"مگر حکومت کی طاقت اور پھر لوگوں کا خیال......"

"حکومت کی طاقت۔ بابو جی ان لوگوں کے پاس......"

وہ جملہ ختم بھی نہیں کرنے پایا تھا کہ سڑک پر سے آواز آئی "آ آ آ... پوئینہ بابو جی "..... پنجابی چپ ہو گیا۔ بلراج نے دیکھا تو ایک عورت ہاتھ بڑھائے، اسے تک رہی تھی۔ وہی گھلی ہوئی انگلیاں، میلی پٹیاں اور بھنبھناتی مکھیاں اور جلا ہوا چہرہ۔ بلراج نے ایک اکنی نکال کر جلدی سے اسے دے دیا۔ جب وہ چلی گئی تو دوکاندار ہنسنے لگا۔

"بابو جی، تم نے اسے پیسے کیوں دیئے۔ واقعی تم نئے آئے ہو۔"

"کیوں؟" بلراج نے پوچھا۔

"تم آنے والوں کا انتظار کر رہے تھے نا، یہی وہ لوگ ہیں اور تم نے انھیں پیسہ دے دیا۔"

بلراج نے جلدی سے الٹ کر اس جاتی ہوئی عورت کو دیکھا۔ پھر ان تمام لوگوں کو دیکھا جو بازار میں رینگ رینگ کر چل رہے تھے۔ "مگر انہیں پیسہ دینے سے کیا ہوا؟ تم ان سے ڈرتے کیوں ہو؟" اس نے پنجابی سے پوچھا۔

"ڈرتے کیوں ہو؟" وہ ناراضگی سے بولا "کیا آپ ان سالوں کی پٹیاں نہیں دیکھتے ہو۔ اور ان کے اردگرد کی مکھیاں۔"

"ہاں دیکھتا تو ہوں۔ یہ سب کے سب کوڑھی ہیں۔"

پھر وہ خاموش ہو گیا۔ بلراج ان کا مطلب سمجھ گیا۔ ان سارے دوکانداروں کا مطلب سمجھ گیا جو ان رینگتے ہوئے کیڑوں کے خوف سے دوکانیں بند کئے ہوتے تھے۔ وہ سڑک پر چلا آیا۔ سارے بازار پر ان روگیوں کا یلغار تھا۔ بلراج نے سنا کہ یہ لوگ بھگوان کے نام پر بھیک مانگ رہے ہیں۔ اس کی خواہش ہوئی کہ وہ ان کے سامنے قہقہے لگائے اور تالیاں بجائے۔ یہ بھگوان کے نام پر بھیک مانگ رہے تھے۔ جو انہیں نہیں پہچانتا تھا۔ اور نہ ہی انھیں دنیا کا بھگوان پہچانتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ نہ جانے کب سے اسی طرح بھیک مانگ رہے تھے، بچے پیدا کر رہے تھے اور سڑک کے کنارے مر رہے تھے۔ وہ ان سب سے کتراتا ہوا "امار کٹر" پہنچا۔ "امار کٹر" کے دروازے بند تھے۔ اس کے بہت کھٹکھٹانے پر ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر اس سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ بلراج نے کہا، "بنرجی بابو یہاں رہتے ہیں۔"

"او۔ جلدی سے اندر چلے آیئے۔"

## خطرہ

ایک نوجوان نے پانی میں ڈوبتی لڑکی کو جان پر کھیل کر بچایا تو لڑکی کے باپ نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا،

"میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا آپ نے سخت خطرہ مول لے کر میری لڑکی کی جان بچائی ہے۔"

"کوئی خطرہ نہیں۔" نوجوان بولا، "میں شادی شدہ ہوں۔"

بلراج کے اندر آتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اب دونوں آمنے سامنے تھے۔ اس نے اسے بیٹھنے کو کہا۔

"بنرجی تو یہاں نہیں ہے......"

"نہیں ہے......" مگر بلراج کی نگاہیں غیرارادی طور پر اس ادھیڑ شخص کا معائنہ کئے جا رہی تھیں۔ اس کے داہنے گال پر تانبے جیسی چمک تھی۔ پھر اس کی نظر اس کے ہاتھ کی انگلیوں پر رک گئی۔ ادھیڑ شخص نے بلراج کی آنکھوں کو اپنی پوراتی آنکھوں سے دیکھا۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ اپنی انگلیوں کو دھوتی میں چھپالیا۔

مگر بلراج انھیں تکتے ہی جا بولا "نہیں ہے، کہاں گیا"

"وہ تو ایک دن ہوا گیا۔ دھنباد میں رہتا ہے۔"

"یہاں کب آئے گا؟"

"یہاں تو وہ آتا نہیں۔ اسکا اں بھی وہیں رہتا ہے۔"

بلراج بنرجی کے یہاں نہیں آنے کی وجہ سمجھ گیا۔ اس شخص پر ترس آنے لگا۔ اس نے یکایک پوچھا "آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں؟"

"ہاں"

"آپ دھنباد کیوں نہیں چلے جاتے؟"

"دھنباد۔ لیکن....." پھر وہ چپ ہو گیا۔ اس کے کمرہ میں آتش دان کے اوپر کرشن جی کی ایک چھوٹی سی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ وہ انھیں دیکھنے لگا جیسے اس کی خاموش آنکھیں کہہ رہی ہوں "دیکھا کرشن کنہیا، یہ شخص ہمارے زخم پر نمک چھڑکتا ہے۔" بلراج نے اس کی آواز سن لی۔ وہ بھی چپ ہو گیا۔ دونوں چپ تھے۔ تھوڑی دیر تک دونوں نہ جانے کہاں پرواز کرتے رہے

"آپ نے دروازہ کیوں بند کر دیا"

"دروازہ" ادھیڑ شخص سہم گیا۔ اس نے اپنی انگلیوں کو چھپاتے ہوئے دھوتی جو کھینچی تو بلراج نے دیکھا کہ اس کے پیر پر پٹیاں بندھی تھیں۔ اس نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ اس کی ناک پھیلتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے اس کے جسم کو دیکھا۔ وہ آہستہ سے بولا "ہاں دروازہ۔"

"آج سنیچر ہے نہ۔ آج کے دن یہ سب کوڑھی سب سے زیادہ بھیک مانگتا ہے۔" ادھیڑ آدمی رک رک کر، آہستہ آہستہ بولا۔

"لیکن آپ ان سے کیوں ڈرتے ہیں؟" بلراج نے 'آپ' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہم ڈرتا ہے۔ وہ سب بھیک منگا کوڑھی ہے۔" بلراج نے اپنے دل میں جملہ پورا کر دیا "اور آپ امیر کوڑھی ہے۔ روگ ایک ہی ہے۔"

پھر وہ 'امار کٹر' سے نکل کر اپنے مکان کی طرف چل پڑا۔ ایک روگی کے یہاں سے نکل کر وہ ان سیکڑوں روگیوں کے ہجوم میں گم ہو گیا جو ابھی تک بھگوان کے نام پر بھیک مانگ رہے تھے۔ لاٹھی ٹیکتے ہوئے، رینگتے ہوئے، یونہی اپنی زندگی گھسیٹ رہے تھے۔ گوتم بدھ نے کہا تھا "دھرم کرو، دھرم کرو....!"

---

### بقیہ جمیل فاروقی

جوگل کھلایا ہے، دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اس بات کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ ویسے انہیں دیکھنے کا کوئی ٹکٹ نہیں ہے بس آپ کو اکولا آنے کے لئے ریل یا بس کا ٹکٹ خریدنا ہوگا۔ ہوائی سروس یہاں نہیں ہے۔ ممکن ہے مستقبل قریب میں اُن کی شہرت کی وجہ سے ہنگامی صورتحال میں ہوائی سروس شروع کرنی پڑے۔

### پھیکے لطیفے

بڑا افسر موڈ میں تھا۔ اُس نے اپنے ماتحتوں کو بلایا اور کچھ لطیفے سنائے۔ جس پر ہر شخص نے قہقہہ لگایا مگر ایک لڑکی پر ان لطیفوں کا کوئی اثر نہ پڑا۔ وہ خاموش بیٹھی رہی

اس پر افسر نے پوچھا—

"کیا بات ہے؟ کیا تم میں لطیفوں سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں"

"مجھے ہنسنے کی ضرورت نہیں"— لڑکی بولی—

"میں نوکری چھوڑنے والی ہوں۔"

# تحریک

عبید قمر (پٹنہ)

"ابو، کیا یہ سچ ہے کہ بہت پہلے لوگ اپنی بچیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے ؟"

"نہیں بیٹی، یہ لغویات تمہیں کس نے بتادی ؟"

"میں نے کتاب میں پڑھا ہے ابو" اسکی دس سالہ بچی کی۔ آنکھوں میں عجیب سا خوف و ہراس تھا۔

"اوہ، اچھا۔ ارے اس وقت انسان کا وجود ہی کہاں تھا۔ یہ تو وحشی جانوروں کی باتیں ہیں بیٹی تم نے یہ بھی پڑھا ہوگا کہ پہلے انسان بندر تھا۔ پڑھا ہے نا ؟!" "جی ہاں، یہ بھی پڑھا ہے۔"

"ہاں بیٹی تو انسان پہلے سچ مچ جانور تھا۔ جنگل میں رہتا تھا۔ پتوں سے بدن ڈھانپتا تھا۔ پتھروں سے شکار کیا کرتا تھا۔ اسے اچھے برے کی کوئی تمیز ہی نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ اسے عقل آتی گئی۔ اور پھر وہ اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق بن گیا۔

"اشرف المخلوقات کسے کہتے ہیں ابو ؟"

"دنیا کے تمام جانوروں میں سب سے بہتر اور افضل" جو ان کلرک نے نابالغ بیٹی کو اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کی تھی بچی جیسے بہت کچھ نہ سمجھ کر بھی سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ اور خموشی سے سکنڈ ہینڈ کتاب کی ورق گردانی میں لگ گئی تھی۔

"ابو، میں ابھی ستی سسٹم کے بارے میں پڑھ رہی تھی۔ اوہ تاریخ کا یہ کتنا بھیانک دور تھا۔ نہ جانے کتنی بے زبان عورتیں زندہ جلادی گئی ہوں گی۔ آپ نے تو ایسے کیس دیکھے یا سنے ہوں گے۔ ؟" اسکی پندرہ سالہ لڑکی نے کتاب کی ورق گردانی کے دوران سراسیمہ لہجے میں استفسار کیا تھا۔

"ہاں بیٹی، تہذیب یافتہ دور میں بھی انسانوں کے اندر چھپی درندگی نہ جانے کیسے کیسے بھیس بدل کر حملہ آور ہوتی ہے۔ چند ذی شعور انسانوں نے اسکے خلاف تحریک چلائی تھی۔ تم نے تو آزادی کی تحریک کے بارے میں بھی پڑھا ہوگا ؟"

"جی ہاں پڑھا تو ہے ابو۔"

انسانیت کی بقا اور سماج کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی ایک پہلے آواز اٹھاتا ہے۔ پھر دیکھتے دیکھتے کارواں بن جاتا ہے۔ اب دیکھو نا موجودہ زمانے میں جہیز کی لعنت ......" ادھیڑ کلرک بالغ بیٹی کو زمانہ شناس انداز میں سمجھاتے سمجھاتے یکایک چپ ہو گیا۔ لڑکی جیسے سب کچھ سمجھ کر بھی کچھ نہ سمجھی تھی۔ اور کتاب کو بند کر کے باپ کے سیاہ ہوتے چہرے کو پڑھتی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

وہ بڑی شدت سے ابو کا انتظار کر رہی تھی۔ جو بقر عید کی نماز پڑھنے عیدگاہ گئے ہوئے تھے۔ اس کی نگاہ ٹیبل پر رکھے اخبار کی جانب اٹھ گئی۔ مختلف سرخیوں پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ایک سرخی پر اسکی نگاہ جمی ہوئی تھی — "ایک باپ نے بیٹی کو ذبح کر دیا"

"خبر ملی ہے کہ کم جہیز لانے کی بنا پر زدوکوب کرنے کے بعد ایک نوبیاہتا کو شوہر میکے چھوڑ گیا تھا۔ وہ اور اسکے رشتہ دار برابر آکر لڑکی کے باپ سے طرح طرح کا مطالبہ کیا کرتے تھے۔ روز روز کی بک بک جھک جھک سے تنگ آکر باپ نے یہ کہتے ہوئے لڑکی کو ذبح کر دیا کہ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری! عصر کی نماز کے دوران، جب اس کا باپ آفس سے لوٹتا تھا تو وہ گڑگڑا گڑگڑا کر اپنی موت کی دعا مانگ رہی تھی ...." وہ بار بار

بقیہ صفحہ ۱۴۴ پر

ریاض انگلی (برن پور)

# فائرنگ

کمرے میں ماضی کی یادیں ذہن میں سموئے میں بستر پر دراز تھا۔ چاروں طرف اندھیرے کی حکمرانی قائم ہو چکی تھی۔ میونسپل کارپوریشن کے لیمپ پوسٹ پر تبیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ سڑکوں پر زندگی کی جدوجہد بند ہو چکی تھی۔ جاڑے کی سرد رات۔ سنسناہٹ اپنے عروج پر تھی۔ ایسے حالات میں لحاف سے باہر نکلنا، جسم کے اندر دوڑتے ہوئے خون کو منجمد کرنا ہے۔

باہر۔ کمرے کے باہر۔ شہر کے کسی علاقے سے فائرنگ کی آواز سکوت کو توڑ کر سارے شہر میں گشت کرنے لگتی ہے۔ میں خوف سے لرز اٹھتا ہوں۔ ماضی کی یادیں ٹوٹ کر منتشر ہو جاتی ہیں۔

۔ باہر نکل کر پتہ لگانا چاہئے آواز کدھر سے آئی ہے؟" میرے ذہن نے سوال کیا۔ لیکن اس سے کیا فائدہ ۔؟ رات کے دوسرے اور تیسرے پہر کے درمیان روزانہ فائرنگ کی آواز آتی ہے۔ اس صنعتی شہر کا تو یہ معمول بن چکا تھا۔ میں خواہش نہ ہونے کے باوجود کمبل کا بوجھ اٹھائے لان سے سڑک کے اس پار دیکھتا ہوں۔ کچھ خبر نہیں ۔ مسلسل چھ فائر ۔ پھر سکوت ۔ جیسے سارے شہر کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ کارپوریشن کے لیمپ پوسٹ کی تبیاں اب بھی ٹمٹما رہی ہیں۔ کیا فائدہ ایسے لیمپ سے جس سے روشنی ہی نہ ہو۔ کل اس خیال کے ذہن میں آتے ہی الیکٹرک مستری سے دریافت کیا تھا بھئی راستے کی تبیاں ٹمٹماتی رہتی ہیں آخر ایسا کیوں ۔ ؟۔ وہ میری باتوں کو سنتے ہی بول اٹھا تھا۔

سا ب یہ بتیاں جو ہیں اسے ٹیوب لائٹ کہتے ہیں۔ یہ چوک اور اسٹارٹر کی مدد سے جلتی ہیں۔"

اوہ ۔ میں ٹیوب لائٹ کا فنکشن دریافت نہیں کر رہا ہوں ۔ میں تو پوچھ رہا ہوں کہ یہ ٹھیک سے جلتی کیوں نہیں ؟" میں اس کی بات کو کاٹتے ہوئے پھر سوال کرتا ہوں۔

" ساب آپ گھبرا گئے۔ میں تو وہی بتانا چاہتا ہوں۔ جو آپ کا سوال ہے۔" وہ میری بات سنکر مایوسی سے کہتا ہے۔

" تو ٹھیک ہے بتاؤ بھئی" میں اس کی عقلمندی پر مسکراتے ہوئے کہتا ہوں۔

" ساب ۔ اس بتی کے اندر سادہ رنگ کا پاؤڈر ہوتا ہے جب وہ پاؤڈر کم ہوتا ہے۔ تو ٹیوب بتی اس طرح بھک بھک کرتا ہے" وہ ہاتھ ہلا ہلا کر فاتحانہ انداز میں کہتا جا رہا تھا۔

میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا، تو کیا یہ ٹھیک نہیں ہوگا ۔؟

" نہیں ۔ ساب ۔ یہ خراب ہو گیا۔ اس کو بدلنا ہوگا۔ وہ کہتے کہتے کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھتا ہے اور سلام کر کے چلا جاتا ہے۔ میں اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہتا ہوں۔

میں لان میں کھڑا بتی کو تک رہا ہوں۔ جواب بھی ٹمٹما رہی ہے۔

رات کا آخری پہر ہے۔ چند لمحہ بعد اس سنسان سڑک پر کاروں، موٹر سائیکلوں اور لوگوں کی بھاگ دوڑ شروع ہو جائے گی۔ ہر روز کی طرح کل صبح آفس جانے سے قبل جب میں بس اسٹینڈ پر بس کا انتظار کروں گا، تو وہی منحوس خبریں سنوں گا۔

" شہر میں ڈاکہ ۔ ہزاروں روپئے کی لوٹ ۔ پولس ناکام ۔"

میں نے کسی سے اس کے متعلق دریافت نہیں کیا ہے۔ مگر ہر روز قیمتی کپڑے میں ملبوس، توانا جسم کا مالک مجھے آکر خبر سناتا ہے گویا یہ انسان نہیں اخبار ہے۔ جیسے شہر کی ساری خبریں اس کے پاس موجود ہیں۔ وہ خبریں سنا کر رکتا نہیں بلکہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ جیسے یہ خبریں کسی اور کو بھی سنانی ہوں۔ ساری رات ماضی اور حال کی یادوں میں گذر گئی۔ آج دو روز سے رات جاگ کر کاٹتا ہوں۔ رات سگریٹ کے سہارے گذرتی ہے۔ صبح جب جھاڑو دینے والی گھر کی صفائی کرتی ہے تو یہ ضرور کہتی ہے۔

"بابو دو روج سے آپ بہت جادہ سگریٹ پیتے ہو؟"

میں اسے کیا کہوں شاید اسے نہیں معلوم کہ آج دو روز سے مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔ کس قدر پریشان رہتا ہوں۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہو رہا ہے۔؟

کھڑکی کی جالیوں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر کمرے کے اندر داخل ہو رہی ہیں حسب معمول میں تیار ہو کر آفس کے لئے چل پڑتا ہوں۔ قریب کے بس اسٹینڈ پر بس کا انتظار کرتا ہوں۔ مگر ہر روز کی طرح وہ شخص جو رات کی خبریں سناتا تھا۔ آج نہیں آیا۔ جبکہ رات بھی فائرنگ ہوئی ہے۔

"تو پھر وہ کیوں نہیں آیا۔ کیا وہ شہر سے باہر ہے۔؟"

میرے ذہن نے سوال کیا۔ اتنے میں ایک بس آ کر رکی۔ بس کے رکتے ہی تخیل کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور میں بس میں سوار ہو کر آفس کیلئے چل پڑا۔

لمحہ بعد آفس کے قریب بس رکتی ہے۔ میں بس سے اتر کر اندر داخل ہوتا ہوں۔ حسب معمول روزانہ کی طرح گیٹ پر کھڑا دربان سیلوٹ مارتا ہے۔

ابھی میں کرسی پر بیٹھا بھی نہ تھا کہ اخبار کی سرخی پر میری نظر پڑتی ہے۔ میں اخبار کو حیرت و استعجاب سے دیکھنے لگتا ہوں۔

• شہر کا نامی ڈاکو مارا گیا۔ جو رات بینکوں، بڑے بڑے ہوٹلوں اور دفتروں میں ڈاکہ ڈالتا اور صبح شہر کے ہر بڑے عہدے داروں کو اس کی اطلاع خود جا کر دیتا تھا۔ کل رات پولس فائرنگ سے ہلاک ہو گیا۔

میں کبھی شائع شدہ رپورٹ کو پڑھتا اور کبھی اس کی تصویر کو دیکھتا ہوں۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ تصویر بول اٹھی ہے۔

• کل رات شہر میں ایک اور ڈاکہ۔ ڈاکو فرار۔ ایک معصوم انسان کی موت •

## بہتر شوہر

دوران ہنی مون دولہے نے اپنی دلہن کے خوبصورت ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑے پیار سے کہا۔

"ڈارلنگ۔ اب جبکہ ہم ایک دوسرے کے ہو گئے ہیں اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں تمہاری چند چھوٹی چھوٹی خامیاں بتا دوں۔"

"ضرور۔ ضرور۔ میرے سرتاج۔" دلہن بڑی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "مجھے کیا اعتراض ہوگا۔ دراصل انہیں چھوٹی چھوٹی خامیوں سے ہی میں بہتر شوہر نہ پا سکی۔"

## بقیہ "تحریک"

اس خبر کو پڑھتی جا رہی تھی اور ہراساں نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتی جا رہی تھی۔ بوڑھا باپ کمرے میں داخل ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ سے اخبار پکڑے، خبر پر نظریں جمائے، بے زبانی بے زبان میری، کی تصویر بنی بیٹی سامنے متوحش سی کھڑی تھی۔ بوڑھا باپ عمر دراز کنواری بیٹی کی بغل میں کھڑا موٹے حرفوں سے چھپی اس خبر کو پڑھنے لگا۔

ڈھلتی عمر کی کنواری بیٹی نے اس بار کوئی سوال نہ کیا تھا۔ لیکن اس کی سہمی نظریں جیسے پوچھ رہی تھیں۔

"ابو، یہ بھی کوئی تحریک چلی ہے کیا؟"

اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ بوڑھا کلرک نہیں۔۔ ہاں، کے درمیان جھولتا بن بیاہی بیٹی کو گلے سے لپٹائے بس اشک بہاتا رہا۔

الیاس قریشی (کلکتہ)

# اندر کی شناخت

الجھاؤ کے بحر ذخار سے نکل کر اس نے بے معنی نظر سے مُرشد
دیکھا تو مُرشد نے پوچھا یاد آیا۔
اس نے نفی میں گردن ہلایا اور بولا میں ہمیشہ اس دستک
وسی آشنا چہرے سے منسوب کرنا چاہتا ہوں مگر مجھے کوئی بھی چہرہ
ایسا نہیں لگتا جو آشنا ہو اور کسی طرح دستک سے وابستہ ہو۔
مُرشد نے آنکھیں موندے ہوئے کہا۔ تم اپنے اندر کی گرد
کو جھاڑ کر دیکھو۔

ہم مدتوں سے اپنے اندر
تہہ بہ تہہ
جمتی ہوئی گرد کو محسوس کر رہے ہیں
اور ہمیشہ سوچنے سمجھنے
اور کوشش کرنے کے باوجود
اس جمتی ہوئی گرد کو
صاف کر پاتے ہیں اور
نہ ہی اس سلسلے کو روک پاتے ہیں
ہاں اس عمل میں اپنے آپ کو
اندر سے کچھ کھوکھلا کر گئے ہیں

کہیں الیکٹرک پول کے پرندے تو نہیں کھڑکی کے پٹ پر اپنی
پانچ گڑانے ہیں یا کھڑکی کے پٹ دستک کی خواہش لئے خود تو نہیں
بجتے ہیں اور تمہیں کھڑکی پر کسی کے دستک دینے کا گمان ہوتا ہے
بہکتے ہوئے مُرشد تسبیح کے دانے گننے لگا اس نے صوفے پر دراز ہو کر
آنکھیں موند لیں۔
میں کون ہوں؟ اور کیوں ہوں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ
میں ہوں ہی نہیں آپ آج کل کافی پریشانی دکھائی دیتے ہیں۔
سامنے والے صوفے پر بیٹھی عورت نے پوچھا؟
اُوں.. آواز سنکر وہ چونکا اور اس عورت کو مشکوک
نگاہوں سے گھورنے لگا۔
عورت کے چہرے سے بےچینی نمایاں ہونے لگی
ذرا میری مدد کریں گی آپ وہ عورت سے مخاطب ہوا۔
میرے اندر گرد کافی مقدار میں جمع ہوگئی ہے کیا آپ اسے صاف
کرنے کا طریقہ جانتی ہیں۔
عورت کی پیشانی پر مکالمہ سنکر سلوٹیں آگئیں
تو وہ بےچین ہوکر بولا آپ جواب کیوں نہیں دیتیں؟ کیا میری
آواز آپ تک نہیں پہونچ رہی ہے یا میں سرے سے موجود ہی نہیں ہوں
مجھے کافی کام ہے میں بعد میں بات کرونگی یہ کہکر وہ عورت صوفے
سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔
اور وہ ایک بار پھر الجھاؤ کے بحر ذخار میں غوطے کھانے لگا اور اپنے
ہونے اور نہ ہونے پر سوچتے سوچتے ہونے اور نہ ہونے کے درمیانی جگہ
پر آکر جکڑ سے لگا کہ تبھی کھڑکی کے پٹ پر کوئی دستک دینے لگا۔
ٹھہرو جانا مت میں آتا ہوں
لپک کر اس نے اندر سے کھڑکی کے پٹ کھولے اور سلاخوں
سے چہرہ سٹا کر باہر دیکھنے لگا نظر کی حد تک آدم زاد تو کوئی بھی نہیں
تھا۔ شائد نظر نہ آنے والی خدا کی ذات پر سمت منڈلا رہی تھی
اور اس جیسے کئی لوگوں کو توڑ انداسی کی طرح کسی نہ کسی مرض کا
شکار ہیں اپنے وجود کا احساس دلا رہی ہے۔
کون ہو بھائی کس نے میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے؟

آواز نظر کی حد سے آگے گئی یا نظر کی حد کے اندر ہی گھٹ کر رہ گئی میں
کون ہوں؟ اسنے صوفے پر لیٹے لیٹے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
تم ایک معصوم روح ہو مرشد نے کہا
پھر میں اس ہڈی و گوشت کے پہاڑ میں قید کیوں ہوں؟ اس
نے پوچھا آگہی و عرفان تک جانے کا یہ راستہ بڑا ہی دلچسپ ہے اور تم
اسے قید سے تعبیر کرتے ہو۔ مرشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔
ان کیلئے مجھے اور کتنا سفر درپیش ہوگا؟ اس نے پوچھا
بہت اور ویسے کچھ بھی نہیں۔ مرشد نے الجھی ہوئی سوت کا
ایک سرا اس کی طرف بڑھایا اور پھر کہا۔ اپنے اندر کی گرد اچھی
طرح صاف کرو تو اندر باہر ہر چیز صاف پانی کی طرح دمکنے لگے گی۔
وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل
گیا
میں ایک معصوم روح ہوں
جو شجر ممنوعہ کے قریب گیا
اور اس کے پھل کو چکھا
جکی پاداش میں
ہڈی و گوشت کے پہاڑ میں
قید کر کے
آگہی و عرفان تک پہونچنے کی
سزا دی گئی
اور میں ایک معصوم روح
ہوتے ہوئے بھی
اپنے ہونے اور نہ ہونے کے
متعلق
شک میں مبتلا ہوں
اس کے باوجود
ایک نہ معلوم منزل کی طرف رواں ہوں
بڑے خود غرض ہو گئے ہو یار دیکھ کر بھی کترا کر چلے جا رہے
ہو۔ ایک شخص نے روک کر پوچھا۔

## گدھا

ایک مقرر نے سامعین سے
پوچھا۔
مان لیجیے اس اسٹیج پر ایک
تھالی پانی سے بھرا ہوا ہے۔
دوسرا شراب سے اور آپ
ایک گدھا لائیں تو وہ کیا پئے
گا۔ شراب یا پانی؟
پانی۔ ایک آواز آئی
کیوں؟ مقرر نے پوچھا
اس لیے کہ وہ گدھا ہے

میں اپنے اندر کی گرد صاف کرنے کا طریقہ سوچ رہا ہوں۔
اسنے کہا۔
عجیب آدمی ہو کبھی تو اپنے خول کے باہر آ کر ملا کرو۔ وہ شخص
منھ بنا کر بولا۔
معاف کیجئے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ اس نے کہا
واٹ نان سنس۔ وہ شخص بھنا کر آگے بڑھ گیا
اور وہ اپنی سوچ میں مگن راستہ ناپنے لگا۔
کافی دیر کے بعد تھکن سے چور ہو کر گھر میں داخل ہوا۔
آپ آ گئے۔ عورت نے ساڑی کے پلو سے پسینہ پونچھتے ہوئے
پوچھا
اور وہ آواز کی طرف دھیان دیئے بغیر کمرے میں داخل
ہو کر بیڈ پر جا لیٹا
اور کمرے کی سفید دیواروں کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا
جب کہ ان پر کچھ بھی نہیں لکھا تھا شائد مستقبل میں کوئی ان پر نیا رنگ
چڑھا دے یا کوئی منچلا ان پر کوئی شوخ عبارت تحریر کر دے
اس سے قبل وہ کچھ نہ کچھ پڑھ لینا چاہتا تھا جو لکھا ہوا دکھائی نہیں
پڑ رہا تھا اس کے باوجود دیوار کی سفید رنگت اپنے پیچھے ایک
انجانی چھپی ہوئی تحریر کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔
صبح کو آپ کیا پوچھ رہے تھے؟ عورت نے کمرے میں داخل
ہوتے ہوئے پوچھا۔ کیا پوچھا تھا میں نے؟ اس نے حیرت زدہ
ہو کر پوچھا
بھول گئے؟ خیر جب یاد آ جائے تو پوچھ لینا میں یہیں
ہوں۔ عورت یہ کہتے ہوئے بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔
اور وہ نزدیکی کو محسوس کر کے بیڈ پر تھوڑا سا سمٹ
وہ عورت اس کی ایک ایک حرکت کا سنجیدگی سے جائزہ
لینے لگی
تم نے ابھی کہا تھا کہ میں یہیں ہوں۔ اس نے پوچھا
ہاں میں نے کہا تھا۔ عورت بولی
تمہیں اپنے یہاں ہونے کا یقین کیسے ہوا اس نے پوچھا

اسس لئے کہ میں اس کمرے میں موجود سانس لے رہی ہوں۔ عورت نے جواب دیا۔
پھر مجھے کیوں یقین نہیں ہوتا۔ وہ بڑبڑایا
کس بات کا۔ عورت نے پوچھا
میں موجود ہوں یا نہیں ہوں۔ وہ بولا
تم موجود ہو۔ عورت نے ٹھوس لہجے میں کہا شائد اسکی تمیری آنکھ آگ آئی تھی اور آگہی و عرفان کے دہلیز تک جا پہونچی تھی۔
ایک آٹھ سالہ بچہ روتی صورت بنائے کمرے میں داخل ہوا اور بیڈ کے قریب آکر اس سے مخاطب ہوا "ابو پرویز نے مجھے مارا"
وہاٹ ابو میں ابھی اپنے وجود کے ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ ہی نہیں کر پاتا ہوں پھر یہ بچہ کہاں سے آگیا ابو کہنے لگا
چلو بیٹا میں دیکھتی ہوں تمہارے ابو ابھی پریشان ہیں۔ وہ عورت بچے کا ہاتھ پکڑ کر باہر جانے لگی۔ اور وہ۔ عورت و بچے کو کمرے سے باہر جاتے ہوئے ہونقوں کی طرح دیکھنے لگا۔

---

(بقیہ کچھ اردو شاعری کے بارے میں)

ہیں اور شاعر، بھانڈ، مراسی اور جملہ ارباب نشاط کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں۔ اسی سبب سے بڑے شاعر بھی شاعر کہلانے کو عار سمجھتے ہیں اور ان کے مداح انہیں مفکر، حکیم، فلسفی وغیرہ کہنا پسند کرتے ہیں۔

---

نیک خواہشات کیساتھ
اروند مِل انڈسٹریز
نزد کلیان مِل
نروڈا روڈ — احمد آباد ۳۸۰۰۲۵
مینوفیکچرز
کوالیٹی گرے آئرن کاسٹنگس
فون
374468
374519
گرام
ENGICAST

خواجہ عبدالغفور (بمبئی)

# عمر رواں

عمر رسیدہ ہونے پر کے بعد انسان ہمیشہ یہ سوچتا ہے

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

بالعموم یہ یاسیت اور قنوطیت کی سوچ ہے کہ گزری ہوئی جوانی اور بیتے ہوئے دنوں کو سب کچھ سمجھ لیا جائے اور حال کی ناگواریوں کو بڑھا چڑھا کر غیر مطمئن محسوس کرے۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

بے شک کم عمری اور جوانی میں توانائی اور ترنگ ایسے ہوتے ہیں کہ ہر چیز اچھی دکھائی دیتی ہے اور ہر بات کا احساس ولولہ انگیز ہوتا ہے لیکن محض روانی عمر سے سب کچھ تو نہیں کھو جاتا۔ دلچسپیاں اگر قائم رہیں اور انسان لطف اندوزی کے شعور سے اپنے آپ کو توڑ نہ لے تو پچھلے تجربات کی بنیاد پر خوش تر اور خوش گوار زندگی معمول کے مطابق رواں دواں رہ سکتی ہے۔

ہمارا معاشرہ اور سماج بھی ایک حد تک ذمہ دار ہے کہ معمر لوگوں کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے ہیں۔ ان کے قدم لڑکھڑاتے ہیں۔ ہاتھوں میں رعشہ ہے، بینائی کمزور ہے، سماعت اور دیگر حواس اس قابل نہیں کہ انہیں فعال رکھے۔ بلکہ بڑی حد تک ان کو از کار رفتہ اور خاندان پر ایک بوجھ سمجھا جاتا ہے ان کی معمولی کا بیماری کو بھی سب کے لئے تکلیف دہ قرار دے دیا جاتا ہے حالانکہ آج کل طب، سائنس اور حکمت کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کے جملہ حواس برقرار رہتے ہیں اور اس کی ہوش مندی خرد و دانش میں اضافہ ہو جاتا ہے کہ ان کی پیرانہ سالی کے ساتھ ساتھ زمانہ بھر کا تجربہ اور ان کی کارگذاریاں ان کو زیادہ کارآمد اور محترم بنا سکتی ہیں لیکن ان سب خرابیوں کی بنیاد یہ ہے کہ ہم نے اپنے معاشرے سے مشترکہ خاندان اور امداد باہمی کے شعار زندگی کو ہٹا دیا ہے۔ اب سارے نو عمر، مستعد اور کام کرنے کی صلاحیتیں رکھنے والے نہ صرف اپنے دیس میں بلکہ دیش بدیس میں اس طرح بکھر گئے ہیں کہ ایک دوسرے کی صورت کو ترس جاتے ہیں اور جو ایک شہر میں ہیں بھی تو اپنے کاروبار میں اس قدر منہمک اور مصروف ہیں کہ لمحات فرصت نصیب ہی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بزرگوں کو احساس تنہائی اور سب سے بچھڑنے کا احساس تنگ کرتا ہے کہ وہ باوجود ساری آسائشوں کے اپنے آپ کو از کار رفتہ اور درماندہ محسوس کرتے ہیں۔

مغربی ممالک میں ان کے لئے Home for the aged بنائے گئے ہیں کہ وہ روزانہ کے آرام سے محروم نہ رہیں لیکن انہیں یہاں پر بھی اپنے عزیز و اقارب کی جدائی تنگ کرتی ہے انہیں ننھے منے نواسے اور پوتے یاد آتے ہیں کہ جن کی معصوم حرکتوں سے وہ ہر لمحہ محظوظ ہو سکتے ہیں۔ یہی احساس دنیا کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر ہوتا ہے

ترقی یافتہ ملکوں میں سن رسیدہ لوگوں کے لئے وظیفہ پیرانہ سالی منظور ہوتے ہیں، تاکہ انہیں معمولی اور اوسط درجہ کی آسائش سے محروم نہ ہونا پڑے لیکن یہاں پر بھی، یہ ہم جانتے ہیں کہ محض آسائش تو خوش و خرم زندگی کی بنیاد نہیں۔ ان کے لئے ان میں ایک گھٹن سی رہتی ہے کہ وہ یک و تنہا ہیں۔

کہتے ہیں کہ انسان اتنا ہی عمر رسیدہ ہوتا ہے کہ جتنا وہ محسوس کرتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک خاتون اپنے معمر شوہر کو مشکل سے

کام پر صرف اٹھنے سے جلد سے اکساد رتی سے کتاب رہنے بھی دیجئے آپ
اس عمر میں اس قسم کی مشقت طلب کام کیا کریں گے۔ اور اس جملہ پر
وہ بھاری سے بھاری اور وزن دار فرنیچر کو ایک کمرہ سے دوسرے
کمرہ میں پہنچا سکتے ہیں۔ باغبانی کے سارے محنت طلب کام کرسکتے ہیں
ایک لڑکی نے اپنی سہیلی سے کہا دیکھنا زندگی میں تو اس وقت
تک شادی نہیں کرونگی جب تک کہ میری عمر ۳۰ سال کی نہ ہو جائے بچی
نے کہا، اور تو بھی سن رکھ کہ میں اس وقت تک ۳۰ سال کی عمر کو نہیں
پہنچونگی جب تک کہ میں شادی نہ کرلوں۔
سرونسٹن چرچل آخر عمر تک چاق و چوبند رہے۔ ان کی دماغی صلاحیتیں
ہمیشہ تازہ دم رہیں چنانچہ ان کی عمر کے ۸۰ برس ہونے پر سالگرہ کا جشن
بڑی دھوم دھام سے منایا گیا، اس موقع پر کچھ نوجوان صحافیوں نے
خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنی اس تمنا کا اظہار کیا کہ وہ چرچل
کے صد سالہ جشن کو بھی دیکھنا چاہتے ہیں، سرونسٹن نے بڑی
خود اعتمادی سے کہا، کیوں نہیں، اگر تم لوگ اپنی تندرستی کا خیال
رکھتے ہوئے صحت مندانہ زندگی پر قائم رہو تو میرا صد سالہ جشن ضرور
دیکھ سکوگے۔ برخلاف اس کے قنوطیت پسند اور مردہ دل لوگ
بیمار الگ الاپتے ہیں،

آگئی پیری جوانی ختم ہوتی ہے
صبح ہوتی ہے کہانی ختم ہوتی ہے

ایک سوال ہمیشہ اٹھایا جاتا ہے کہ کوئی شخص بڑی لمبی عمر کے
باوجود بھی صحت مند و مستعد رہتا ہے تو اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔
ایسے ہی ایک آدمی سے جب یہی سوال کیا گیا تو اس نے کہا
کچھ دن صبر کیجئے اس کا جواب میں ضرور دونگا، دوائیوں کی دو چار
کمپنیاں مجھ سے اپنی اپنی کمپنی کی مقویات دوائیوں کا نام دوں تاکہ
وہ اس کا فائدہ اٹھا سکیں، جس کمپنی کے آخر کو میں قابل قبول سمجھوں
گا اس کا نام دونگا، گو وہ قدرتی اور طبی طور پر اس عمر کو پہنچ چکے
ہیں مگر زیادہ سے زیادہ انھیں مالی فائدہ پہنچانے والی کمپنی کا نام
دیں گے تاکہ وہ اشتہار کے ذریعہ اپنی کمائی کریں۔
ایک اور لڑکی فخریہ کہہ رہی تھی کہ "میرے نوجوانی پر قائم رہنے

کا صحیح راز جانتی ہو؟" اسکی
سہیلیوں نے کہا "ہاں تمہاری
دروغ گوئی کر صحیح عمر ہمیشہ چھپاتی
رہتی ہو یہی نا؟"
درازیٔ عمر کی دواؤں کو
ایک شخص فروخت کرنے کی نکر
میں بڑی بڑی ڈینگیں مار رہا
تھا اور بار بار کہتا تھا دیکھئے
نا اب میری عمر ڈیڑھ سو سال
کی ہے۔ میں ان دواؤں کی
مدد سے بالکل بوڑھا نہیں لگتا
وہ بمشکل ۴۵۔۴۶ سال کا
دکھائی دیتا تھا۔
کسی شخص نے اسس
دوا فروش کے ساتھی سے پوچھا کیا یہ صحیح
ہے کہ یہ ڈیڑھ سو سال کا ہے
اس آدمی نے بڑی بے اعتنائی
سے کہا، میں یقین سے نہیں کہہ
سکتا اس لئے کہ میں اسس کو
صرف سو سال سے جانتا ہوں،
اشتہار بازی کی یہ دلچسپ
ادا ہے۔
یہ کچھ لوگ اپنی پیرانہ سالی کو اسطرح محسوس کرتے ہیں اور
واویلا مچاتے ہیں

ہر چیز پر بہار تھی ہر شے حسین تھی
دنیا حسین تھی مرے عہد شباب میں

جوش ملیح آبادی کو اپنی عمر کا اس قدر احساس تھا کہ وہ دعا مانگتے تھے

مرضی ہو تو سولی پہ چڑھانا یارب
سو بار جہنم میں تپانا یارب

× انسانی زندگی کی حیثیت ایک
ڈائری سی ہے جس میں انسان کچھ
لکھنا چاہتا ہے اور کچھ لکھ دیتا
ہے۔
× حد سے زیادہ غصہ کرنا لوگوں کو
متنفر کر دیتا ہے اور بے وقت کی
مہربانی رعب کو زائل کر دیتی ہے۔
× جس شخص نے اپنی پوری عمر
بے فائدہ گزاری وہ اس گاہک
کی طرح ہے جس نے بازار سے
کچھ نہ خریدا اور اپنا روپیہ بھی کھو
دیا
× جو شخص پیٹ کے لالچ کا
قیدی ہوتا ہے اسے دو رات
نیند نہیں آتی ایک رات گرانی معدہ
کی وجہ سے اور دوسری رات تنگی
دل کی وجہ سے۔
× جو نرمی سے محروم ہے وہ بھلائی
سے محروم ہے
× جو بغیر بلائے دعوت میں گیا
وہ چور بن کر داخل ہوا اور لٹیرا
بن کر نکلا

معشوق کہیں آپ ہمارے ہیں بزرگ
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یا رب

درازیٔ عمر کے باوجود بلند حوصلہ اور ہمت کی بات تو یہ ہے کہ آدمی کہے

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

بالعموم عورتیں اپنی عمر اتنی ہی کم کرتی ہیں جتنے سال وہ اپنی سہیلیوں کی عمروں میں اضافہ کرنا چاہتی ہیں۔

کسی خاتون نے سوال کیا " اچھا بتائیے تو آپ کی دانست میں میری عمر کیا ہے ؟ " سمجھدار آدمی نے کہا " مجھے یہ تشویش ہرگز نہیں ہے کہ میں آپ کی عمر صحیح نہیں بتا سکوں گا۔ میرے لئے یہ سلسلہ بہت پیچیدہ ہے کہ میں آپ کے حسن و جمال کے پیش نظر آپ کی عمر دس سال گھٹاؤں یا آپ کی عقل مندی اور فراست کو دیکھتے ہوئے آپ کی اصل عمر میں دس سال کا اضافہ کروں ؟ "

ایک خاتون نے دعوئے کیا کہ " میں دن بدن جوان ہوتی جارہی ہوں " سننے والی سہیلیوں نے کہا " یہ بات تو ہم بھی جانتے ہیں کیونکہ برسوں پہلے تم تیس سال کی تھیں اور امسال تم نے اپنی پچیسویں سالگرہ منائی ہے "

ایسے ہی تفاوت کے مدنظر ایک خاتون نے اپنی سہیلی کے متعلق کہا کہ میں تو اس کو اس وقت سے جانتی ہوں کہ جب ہم دونوں ہم عمر تھے۔

کبھی یہ سوال حل طلب ہو کہ ۱۹۷۰ء میں پیدا ہونے والے کی آج کیا عمر ہوگی تو الٹا یہ سوال کرنا ہوگا " مرد کی یا عورت کی ؟ "

عدالت میں ایک خاتون کی گواہی کے وقت حلفاً یہ جواب مانگا گیا کہ اس کی عمر کیا ہے۔ اس خاتون نے برجستہ کہا، " تیس سال اور کچھ مہینے " جب اس بات کی وضاحت طلب کی گئی کہ کچھ مہینوں سے کیا مراد ہے، اس نے سچ سچ کہا، " ۰۰ مہینے " گویا محترمہ کی صحیح عمر ۳۵ سال تھی۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر یو این او نے اس سال ورلڈ ہیلتھ ڈے کے موقعہ پر یہ موضوع پیش کیا ہے کہ

add life to the years

مطلب یہ کہ عمر کی روانی کے ساتھ ساتھ زندگی کی دلچسپیاں اور صحت مند مشاغل اس طرح اپنائیے کہ بیرانہ سالی کے تکلیف دہ عواقب آپ کے سامنے نہ آئیں اور آپ اس طرح اپنی معمولی اوسط زندگی سے لطف اندوز ہوتے رہئے کہ جو کم عمری اور نوجوانی میں آپ کے ساتھ تھیں، اپنے تجربہ اور عمر کی اکتسابی خصوصیات سے پورا پورا استفادہ کرنا اور خوشگوار ماحول بناتے دکھنا اپنا اختیاری فعل ہے صرف اس احساس پر جیے ذہنا اچھی زندگی کا راز ہے

## ڈنڈے کی مجبوری

ایک شخص بدعقیدہ کہتا تھا کہ بندہ مجبور محض ہے اور ذاتی طور پر اس کو کچھ اختیار نہیں۔ اس لئے خیر و شر کی ذمہ داری مجھ پر نہیں۔ ایک دن یہ ملعون باغ میں پہنچا اور مالک باغ کی اجازت کے بغیر پھل توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ مالک نے یہ دیکھ کر کہا کہ اے چور و کمینے یہ کیا کر رہا ہے۔ اس پر وہ شخص بولا۔ یہ باغ خدا کا ہے اور میں خدا کا بندہ ہوں اور عطا حق سے کھاتا ہوں تو کیا گناہ ۔ مالک نے اسے پکڑ کر رسی سے باندھ دیا اور ایک مضبوط موٹا ڈنڈا لے کر اس کی پٹائی شروع کر دی۔ وہ شخص چیخنے چلانے لگا کہ اے ظالم مجھ بے گناہ کو کیوں مار رہا ہے۔ اس پر باغ کے مالک نے کہا کہ یہ ڈنڈا خدا کا ہے اور میں بھی خدا کا بندہ ہوں جو دوسرے بندے کی پٹائی کر رہا ہے۔ مجھے کچھ اختیار نہیں۔ میں بھی مجبور ہوں میرا ڈنڈا بھی مجبور ہے۔ یہ سب خدا کرا رہا ہے۔

( بقیہ طناب ٹوٹا خیمہ )

کہہ رہا ہے۔
یہ شہر بہت پراسرار ہے۔ یہاں لوگ جاگ رہے ہیں، پھر بھی سو رہے ہیں، سو رہے ہیں پھر بھی جاگ رہے ہیں۔ !

یوسف ناظم (بمبئی)

# اردو کی پہلی کتاب (جدید) کے چند سبق

(۱) باپ ابھی ابھی باہر سے آیا ہے۔ خوب پی رکھی ہے۔ نہ کھڑا ہو سکتا ہے نہ بیٹھ سکتا ہے کیچڑ اور غصے میں بھرا ہے (میونسپلٹی کا ہے غصہ اس کا ذاتی ہے) رات کے ۱۱ بج گئے ہیں گلی میں سناٹا ہے۔ کھانا مانگتا ہے۔ بیوی اپنے بچوں کو رلا کر اور سلا کر ابھی لیٹی تھی (یہ بھی کوئی لیٹنے کا وقت ہے)۔ اب شوہر آگیا ہے تو اونگھتی ہوئی اٹھی ہے۔ کھانا نکال کر سامنے رکھتی ہے۔ شوہر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ہے تھوڑا تھوڑا لیٹا بھی ہے لیکن زیادہ تر بیٹھا ہی ہے کھانا سامنے دیکھ کر حیرت سے دیکھتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے۔ کھانا کم بھی ہے اور ٹھنڈا بھی۔ شوہر کھانا اٹھا کر باہر پھینک دیتا ہے۔ دسترک پر لیٹے ہوئے کتنے خوش ہو جاتے ہیں۔ ان کی دعوت ہوگئی۔ یہ کتے ہر رات ۱۱ بجے کے قریب یہاں آکر لیٹ جاتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ اس وقت یہیں کھانا مل سکتا ہے۔ شوہر کھانا پھینکنے کے بعد بیوی کے بال پکڑ لیتا ہے (لمبے بالوں کا اس کے علاوہ فائدہ ہی کیا ہے) اسے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ بیوی کھنچی چلی آتی ہے (دنیا کا یہی دستور رہا ہے)۔ بیوی جب بالکل قریب آجاتی ہے تو شوہر دو ہتڑ مارتا ہے۔ پیٹھ پر بیوی مار کھاتی ہے (کھانا ہی چاہئے اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا)۔ بیوی چیخنے لگتی ہے۔ شوہر اور زیادہ مارتا ہے۔ یہ اس کا روز آنہ کا کام ہے بچے اٹھ جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ماں پٹ رہی ہے۔ جان جاتے ہیں کہ باپ گھر میں آگیا ہے وہ بھی رونے لگتے ہیں۔ باپ، بیوی کو چھوڑ دیتا ہے۔ وہ کافی پٹ چکی۔ اب بچوں کی باری ہے۔

وہ سوتے سے اٹھے ہی کیوں اور اٹھے تو روئے کیوں۔ پٹنے سے پہلے رونا بُری بات ہے۔ باپ باری باری سے [illegible] سب کو ٹھوکتا ہے۔ دھوں دھوں۔ دھوم مچ جاتی ہے۔ محلّے والے جاگ جاتے ہیں۔ کچھ گھر کے سامنے جمع ہو جاتے ہیں۔ بڑا لڑکا سب لوگوں سے کہتا ہے اپنے اپنے گھر جاؤ ورنہ ٹکٹ لگا دوں گا۔ مفت تماشہ دیکھنے کی عادت ہوگئی ہے۔ محلّے والے وہیں کھڑے رہتے ہیں۔ اب سو کر اٹھ گئے ہیں تو اور کیا کریں۔ شور بڑھتا جاتا ہے۔ اتنے میں پولس آجاتی ہے۔

سوال ۱: بتاؤ کہ پولس وہاں کیوں آئی۔ میاں بیوی کے ذاتی معاملات سے پولس کا کیا تعلق؟

سوال ۲: سوچ کر لکھو کہ پولس نے آخر وہاں پہنچ کر کیا کیا ہوگا؟

سوال ۳: باپ جب گھر پہنچا تو اس کی جیب میں کچھ روپئے تھے۔ وہ روپئے کون لے گیا؟

(۲) دیکھو وہ لڑکا مدرسے جا رہا ہے۔ (کتنا غمگین ہے) اسکی پیٹھ پر خاکی رنگ کا ایک بڑا سا بستہ ہے۔ اس بستے میں ۲۰ عدد اکسرسائز بک ہیں۔ ان بیاضوں کو اٹھائے اٹھائے پھرنے سے اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے۔ یہ سب بیاضیں سادی ہیں۔ یہ سب ایسی ہی رہتی ہیں۔ اگلے سال کام آئیں گی۔ بستے میں کتابیں بھی ہیں۔ کتابوں میں جگہ جگہ فوٹو رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ہیرو ہیروئینوں کے فوٹو ہیں۔ یہ بھی نصاب میں شامل ہیں۔ لڑکا ساتویں جماعت میں پڑھ رہا ہے ۲ سال سے اسی جماعت میں ہے (یہاں اس کا دل لگ گیا ہے)۔ بستے میں کھانے کا ڈبا بھی ہے۔ اسکول پہنچتے ہی لڑکا پہلے کھانا کھائے گا (اسکول پہنچتے پہنچتے اسے ۲ گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے راستے میں اسے کتنے کام ہیں) کھانا کھانے کے بعد ہو سکتا ہے

کہ وہ کلاس میں بھی جائے۔ کھانے کے بعد اسے سگریٹ بھی تو پینی ہے۔ وہ کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد سگریٹ ضرور پیتا ہے (غریب لڑکا ہے صرف سگریٹ پیتا ہے)۔ شام میں گھر واپس ہوگا تو اس کے کپڑے پھٹے ہوں گے۔ اسے کشتی بھی تو لڑنی پڑتی ہے۔ یہ بھی نصاب میں داخل ہے۔

سوال ۲: اس سبق میں پہلا سوال نہیں ہے؟

سوال ۳: دوسرا بھی نہیں ہے۔

(۳) لو مونگ پھلی کھاؤ

بہت مزے دار ہے۔ مونگ پھلی ہوتی ہی مزے دار ہے جو مونگ پھلی اور مونگ کی دال میں بہت فرق ہے۔ دال پکا کے کھائی جاتی ہے۔ پھلیاں بھی طرح طرح کی ہوتی ہیں جیسے گوار کی پھلی، سیم کی پھلی اور دو چار پھلیاں ایسی ہی ہیں جن کے نام اس وقت ہمیں یاد نہیں آرہے ہیں۔ ان سب پھلیوں کو پکا کر کھانا پڑتا ہے اور جس طرح یہ پکائی جاتی ہیں اس کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کون سی پھلی پکی ہے۔ یہ سب پھلیاں ترکاری ہوتی ہیں لیکن ہماری مونگ پھلی تو میوہ ہے میوہ۔ اس کے کھانے سے منہ خشک ہو جاتا ہے۔

دوسری پھلیاں زمین کے اوپر پیدا ہوتی ہیں اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہو سکتی ہیں لیکن مونگ پھلی زمین کے اندر رہتی ہے اور انڈر گراؤنڈ ہی رہ کر ترقی کرتی ہے (کافی سیاسی ذہن رکھتی ہے)۔ یہ پھلی مجلد ہوتی ہے۔ اس کے اوپر جو چھلکا ہوتا ہے وہ کافی دبیز اور سخت ہوتا ہے۔ حشرات الارض اس میں داخل نہیں ہو سکتے ورنہ حشرات الارض مدراس میل ہو یا تاج محل ہر جگہ داخل ہو سکتے ہیں (حشرات الارض کے معنی لغت میں اور نہیں چلتا پھرتا کہیں بھی دیکھ لو) اس چھلکے کے اندر مونگ پھلی کے دانے ہوتے ہیں کسی میں ۲ اور کسی میں ایک دانہ بھی نہیں ہوتا (اسی مونگ پھلی کو وعدۂ فردا بھی نہیں کہا جا سکتا) مونگ پھلی کے دانوں پر ایک اور جلد، بہت ہی ہلکی جلد چڑھی ہوتی ہے کتاب کے سرورق کی طرح اور واقعی ورق ہوتی ہے۔ یہ کھائی بھی جا سکتی ہے اور ہوا میں اڑائی بھی جا سکتی ہے۔ ٹرین میں سفر کرتے وقت یا سینما دیکھتے وقت مونگ پھلی کھاؤ تو چھلکے وہیں پھینک دو۔ وہاں نہیں پھینکو گے تو کیا جیب میں رکھو گے۔ چھلکوں سے کافی کچرا جمع ہو جاتا ہے اور اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ یہاں ہر شخص کو کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ ملتا ہے۔

گوار کی پھلی یا سیم کی پھلی اور ان پھلیوں کا جن کے نام ہمیں یاد نہیں آرہے ہیں۔ تیل نہیں نکل سکتا بلکہ ان پھلیوں پر تو تیل خرچ کرنا پڑتا ہے۔ مونگ پھلی یہاں بھی کام آتی ہے۔ اس کا تیل نکلتا ہے اور خوب نکلتا ہے۔ اس لئے مونگ پھلی کے دانے دانے کو تیل کا کیپسول سمجھا جاتا ہے (کیپسول کے معنے کیپسول) اسی تیل میں ہمارا کھانا پکتا ہے۔ اسی تیل کی مٹھائی بھی بنتی ہے اور خالص گھی کی مٹھائی کے نام سے فروخت ہوتی ہے۔ زیادہ مزے دار مٹھائی بنانی ہو تو مونگ پھلی کے تیل میں ایک اور تیل ملا دیا جاتا ہے۔ اس مٹھائی میں صرف تیل کا مزا آتا ہے اور مٹھائی کے ذائقے کے لئے دوسری مٹھائی خرید کر کھانی

## کنجوسی

ایک اسکاٹش پروفیسر اپنے طالب علموں کو تیزاب کی خاصیت سمجھا رہا تھا۔ اس نے جیب سے ایک سکہ نکالا اور اسے تیزاب کی بوتل میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"کیا یہ گل جائے گا؟"

"نہیں" ایک طالب علم جلدی سے بولا

"کیوں؟" پروفیسر نے حیرت سے پوچھا

"اس لئے کہ اگر گل جانے کا خطرہ ہوتا تو آپ کبھی نہ ڈالتے۔"

## انجام

ایک ٹیچر اپنے طالب علموں کو عمل کی اہمیت سمجھا رہی تھی۔

"بچو! تمہیں چیونٹی سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ وہ روزآنہ کام کرنے جاتی ہے دن بھر کام کرتی رہتی ہے۔ صبح سے شام تک تھکتی نہیں۔ مسلسل کام، مسلسل جد وجہد صبح سے شام تک مشغول۔ اور آخر میں جانتے ہو کہ کیا ہوتا ہے۔"

"اس پر کوئی پاؤں رکھ دیتا ہے" پیچھے سے ایک آواز آئی۔

ڈتی ہے۔ حلق کا علاج بھی کروانا پڑتا ہے

مونگ پھلی کئی طریقوں سے کھائی جاتی ہے چھلکوں کے ساتھ یوں پر سینکی ہوئی مونگ پھلی اچھی ہوتی ہے۔ ایک پڑیا میں ۸ مونگ پھلیاں ضرور ہوتی ہیں مونگ پھلی چھیلنے سے انگلیاں کالی ہو جاتی ہیں تھوڑی سی کالک ہونٹوں پر بھی لگ جاتی ہے۔ گھر جا کر دونوں چیزیں صاف کر لینی چاہئیں۔ (خاص طور پر ہونٹ) بغیر چھلکوں کے سینکی نرم گرم مونگ پھلی بھی اچھی ہوتی ہے۔

ان میں ۵، ۶ نرم اور ۵، ۶ جلی ہوئی مونگ پھلیاں ضرور ملتی ہیں۔ آخری مونگ پھلی عموماً بدمزہ ہوتی ہے۔ گھر جا کر پہلے کلی کر لینا چاہیئے۔ اور پھر وہ ہلدی اور نمک کے پانی میں نہلائی ہوئی پیلی پیلی۔ مونگ پھلیاں تو بہت شان دار ہوتی ہیں یہ بھی تل کر بکتی ہیں۔ کچھ مونگ پھلیوں میں صرف پانی ہوتا ہے لیکن اس میں ذائقہ ہوتا ہے اور ایک مونگ پھلی وہ بھی ہوتی ہے جس کے خوبصورت پیکٹ ملتے ہیں اور ان میں مونگ پھلی کے سفید سفید دانے موتیوں کی طرح رکھے ہوتے ہیں اس پیکٹ کے خاصے دام ادا کرنے پڑتے ہیں اور مونگ پھلی کھاتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کاجو کھا رہے ہیں۔

مونگ پھلی جب بھی خرید کر کھاؤ کھانے کے بعد وہ کاغذ ضرور پڑھ لو جس میں یہ مونگ پھلی ہوتی ہے۔ ممکن ہے۔ یہ کسی سرکاری آفس کی فائل کا کوئی اہم صفحہ ہو جس کے فائل میں نہ ہونے کی وجہ سے کسی غریب کی وظیفہ کی کارروائی رکی پڑی ہو۔ مونگ پھلی کھانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آدمی کی عام معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

سوال ۔ کیا مونگ پھلی امریکہ میں پیدا ہوتی ہے اور کیا وہاں مونگ پھلی پیدا کرنے والے لوگ بڑے آدمی بن سکتے ہیں ایک دو کے نام لکھو اور یہ بھی بتاؤ کہ یہاں ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟

(۱۰) دیکھو سڑک پر کتنی رونق ہے۔ ہزاروں لوگ جمع ہیں۔ ٹرک گاڑیاں، موٹریں، بسیں، آدمی سبھی رکے ہوئے ہیں۔ کوئی آگے جا نہیں سکتا اور پیچھے بھی جا نہیں سکتا پیچھے تو گاڑیوں کی ایک کئی میل لمبی قطار ہے۔ اوہو۔ کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں تو پتھر بھی ہیں۔ چہرے اور پتھر دونوں چمک رہے ہیں۔ لو وہ چلے پتھر۔ بسوں کے شیشے ٹوٹ رہے ہیں۔ بسوں اور گاڑیوں سے مسافر گرتے پڑتے اتر رہے ہیں۔ عورتیں پسی جا رہی ہیں (اچھا ہوا انہیں اب معلوم ہوا کہ آٹا کیسے پستا ہے)۔ یہ راستہ روکو مہم ہے۔ اس مہم میں شہر کی سبھی انجمنیں حصہ لے رہی ہیں۔ لینا ہی چاہیئے۔ دوسرا کوئی کام ہے بھی نہیں۔

لوگ اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر چڑھ گئے ہیں۔ ان میں کچھ ضرور نیچے گریں گے۔ کیا تعجب چھت ہی بیٹھ جائے ایک چھت پر کتنے لوگ سما سکتے ہیں اور ہاؤسنگ بورڈ کے بنائے ہوئے گھر کی غریب چھت کتنوں کا وزن سنبھال سکتی ہے لوگ بچارے کریں بھی کیا۔ نیچے کھڑے رہیں تو کچھ دیکھ ہی نہیں سکتے تماشہ پھر کیا نظر آئے گا ٹی وی پر تو صرف چھایا گیت کا پروگرام ہوتا ہے۔ یوں بھی روز روز تھوڑے ہی راستہ روکا جاتا ہے۔ (ترقی کا راستہ البتہ مستقل طور پر رکا ہوا ہے)۔ پتھر خانگی گاڑیوں پر بھی برس رہے ہیں۔ کتنا نقصان ہو رہا ہے۔ لیکن اس میں نقصان کی کوئی بات نہیں۔ اس مہم کا فائدہ بعد میں ملے گا اور بہت ملے گا۔

دو گھنٹے سے راستہ رکا ہوا ہے اور دو گھنٹے سے پتھر

## پریشانی میں ساتھی

ایک کرایہ دار دو بجے رات میں بستر سے اٹھ پڑا اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اپنے مکان مالک کے فلیٹ کے دروازہ پر جا پہنچا اور ایک لمحہ انتظار کئے بغیر گھنٹی دبا دی تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ نیند سے بوجھل آنکھیں لئے دروازہ کے اس طرف مکان مالک کھڑا تھا۔ اس نے پوچھا "کیا ہے؟" کرائے دار نے سانسیں درست کرتے ہوئے کہا "میں یہ بتانے آیا ہوں کہ اس مہینے میں کرایہ نہ دے سکوں گا"

"صرف اتنا کہنے کے لئے آپ دو بجے رات میں نازل ہو گئے۔ صبح تک انتظار نہیں کر سکتے تھے" مکان مالک غصہ سے بولا

"کر سکتا تھا" کرایہ دار نے اطمینان سے کہا۔ "مگر سوچا کہ اکیلا کیوں پریشان رہوں"

چھینکے جا رہے ہیں۔ اب پولس آتا ہی چاہیئے — وہ دیکھو پولس آ رہی ہے سیٹیاں بجا رہی ہیں۔ سائرن کی بھی آواز سنائی دے رہی ہے۔ اب مزا آئے گا۔ پولس یونہی خالی ہاتھ تھوڑے ہی چلی آئی ہے پوری طرح تیار ہو کر آئی ہے۔ اس میں تو تھوڑا وقت لگتا ہی ہے ورنہ اس سے پہلے بھی آ سکتی تھی۔ پولس جلد آ جائے تو مشکل یہ ہوتی ہے کہ لوگ کچھ کر نہیں پاتے۔ اتنے سارے لوگ جمع ہوں اور کچھ کر نہ پائیں تو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ہر مہم سے کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ بسوں کے نقصان کی زیادہ فکر نہیں کرنی چاہیئے اگر بسوں میں سفر کرنے کے جرمانہ کی رقم میں اضافہ کر دیا جائے تو یہ نقصان پورا ہو جاتا ہے — ہر سال یہی ہوتا ہے۔

"راستہ روکو" مہم کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں لیکن ایک چھوٹے سے سبق میں ان سارے فائدوں کی فہرست نہیں دی جا سکتی — سبق بہت ہو چکا اب سوال پڑھو اور جواب لکھو۔

سوال ۱: کیا تم معاوضہ لے کر ایسی مہم میں شریک ہونا پسند کرو گے!

سوال ۲: تم نے اپنی آئندہ زندگی یعنی مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ کیا یہ کام تمہیں پسند ہے؟ بطور پیشہ!!

(۵) آج پہلی تاریخ ہے کیلنڈر میں سب سے اچھی تاریخ یہی ہوتی ہے۔ آج تنخواہ ملے گی کسی کو کم کسی کو زیادہ اور کسی کو بہت زیادہ۔ کم تنخواہ قابلیت کی وجہ سے ملتی ہے اور بہت زیادہ تنخواہ قسمت کی وجہ سے۔ آج بسوں اور ریلوں میں سفر کرنے والے لوگوں کی جیبیں کٹیں گی (عام دنوں میں کٹتی رہتی ہیں اور اب تو گردنیں کٹنے کے دن آ گئے ہیں) جو لوگ صحیح سالم جیبوں کے ساتھ گھر پہنچیں گے شام میں خرید و فروخت کے لئے باہر جائیں گے۔ خوب خریداری ہوگی۔ سینما کے ٹکٹ خوب بکیں گے۔ سینما ہاؤز کے دروازے پر "ہاؤز فل" کا بورڈ لگا ہوگا لیکن ٹکٹ ضرور ملیں گے — ہاں یہ مل جاتے ہیں۔ نہ ملیں تو لوگوں کو کتنی تکلیف ہوگی۔ آنے جانے کی تکلیف اور سینما نہ دیکھ سکنے کا غم۔ یہ بہت ہوتا ہے۔ اس لئے ٹکٹ مل جاتے ہیں — وہ دیکھو ہر جگہ کسی نہ کسی فلم کا پوسٹر لگا ہوا ہے۔ بڑا بھی ہے اور رنگین بھی — فلموں کے جو پوسٹر ہوتے ہیں ان کے لئے کوئی سنسر بورڈ نہیں ہوتا اس لئے نہیں ہوتا کہ فلموں کے سنسر بورڈ نے کون سا تیر مار لیا (تیر مار لیا محاورہ ہے) یہ سب کو معلوم ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو کسی بھی فلم کا کوئی بھی پوسٹر بڑا نہیں ہوتا۔ بڑی تو آدمی کی نظر ہوتی ہے۔ اسے درست ہونا چاہئیے۔

سوال۔ آدمی کی نظر درست ہونے کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہ عینک لگانے سے درست ہو سکتی ہے؟

> ## گورکھ دھندا
>
> ایک محترمہ نے دوسری سے کہا
> تم نے وہ راز کی بات اپنی سہیلی کو بتا دی حالانکہ میں نے تاکید کر دی تھی کہ تم کسی سے نہ کہنا "
> "تمہیں کیسے معلوم کہ میں نے بتا دیا" دوسری نے حیرت سے پوچھا۔
> "تمہاری سہیلی نے مجھے بتا دیا"
> "لعنت ہے اس پر میں نے اس سے تاکید کر دی تھی کہ وہ تم سے نہ کہے "
> خیر جانے دو۔ مگر برائے کرم اس سے نہ کہنا کہ اس نے مجھ سے جو کہا تھا میں نے تم سے کہہ دیا۔ پہلی بولی۔

(۶) یہ کتابوں کی دوکان ہے!
یہاں اسکول کی کتابیں بھی ملتی ہوں گی؟
ملتی تو ہیں لیکن ابھی نہیں ملیں گی!
اسکول تو کھل گئے پر کتابیں نہیں ملیں تو طالب علم پڑھیں گے کیا؟
اسکول کھل گئے تو کیا ہوا۔ ان کے بند ہونے میں تو ابھی ۸، ۹ مہینے ہیں۔ اس وقت کتابیں ضرور آ جائیں گی۔
اس وقت تک کیا اسکول میں پڑھائی نہیں ہوگی؟
نہیں۔ کتابیں ہوتیں تو بھی تو پڑھائی نہیں ہوتی:

کیوں نہیں ہوتی ؟
شروع کے دنوں میں خوب بارش ہوتی ہے۔ کبھی مدرس نہیں آتے کبھی طالب علم نہیں آتے اور کبھی تو چھٹی ہی دے دینی پڑتی ہے
اس کے بعد کے دنوں میں اسکول کا عملہ ہڑتال پر چلا جاتا ہے
یہ عملہ کیا چیز ہے ؟
عملہ سے مطلب ہے کہ اسکول کے دفتر میں کام کرنے والے لوگ جیسے سپرنٹنڈنٹ، اکاؤنٹنٹ، کلرک آفس بوائے، چوکیدار وغیرہ جب یہ لوگ ہڑتال سے فارغ ہو کر اسکول واپس آتے ہیں تو استاد اسٹرائک پر چلے جاتے ہیں۔
اچھا یہ لوگ بھی ہڑتال کرتے ہیں ؟
ہاں ہاں یہ بھی کرتے ہیں۔ جب ڈاکٹر ہڑتال کر سکتے ہیں۔ انجینیر کر سکتے ہیں۔ پائلٹ کر سکتے ہیں تو کیا ٹیچر نہیں کر سکتے۔ ان کی ہڑتال ذرا لمبی چلتی ہے کیونکہ یہ جو کہنا چاہتے ہیں سننے والوں کو ٹھیک سے سمجھا نہیں سکتے۔
تو کیا اس کام کے لئے بھی کوئی گائڈ چھپتی ہے ؟
نہیں نہیں گائڈ تو نہیں چھپتی لیکن ۲، ۴ ہفتوں میں ان کی بات سمجھ میں آجاتی ہے !
یہ تو کوئی زیادہ دقت نہیں ہوا۔ اتنا وقت تو سمجھنے کے لئے چاہیئے ہی ــ اس کے بعد تو اسکول میں تعلیم شروع ہو جاتی ہوگی ؟
اسے وہ کیسے شروع ہوگی۔ اسٹاف ہڑتال کرے۔ ٹیچر اسٹرائک کریں تو طالب علموں نے کیا گناہ کیا ہے کہ وہ ہڑتال نہ کریں۔ اب انکی ہڑتال شروع ہوتی ہے
تو پھر اسکول بند ہو جاتے ہوں گے ؟
اسکول کھلے ہی کب تھے جو بند ہوں گے !

سوال: تمہیں یہ انتظام کیسا لگا ؟ سچ سچ لکھو

### حکومت کرنے کی اہلیت

تیمور نے ترکی کے فرمانروا بایزید سے لڑنے کیلئے انگورا پر چڑھائی کی۔ بایزید نے یورپ میں شاندار فتوحات حاصل کی تھیں اسکی بہادری کا بہت چرچا تھا۔ تیمور اس پر حملہ کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ اس کے سپاہیوں نے اسے متفکر دیکھا تو ان کی ہمتیں بھی پست ہونے لگیں انھوں نے تیمور سے پریشانی کا سبب پوچھا۔
تیمور نے جواب دیا۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ بایزید سے ہم جو سلطنت حاصل کریں گے اس پر بایزید کی جگہ حکومت کرنے کی اہلیت ہم میں سے کس کو زیادہ ہے۔

### تاجر کا رقص

نائیجیریا میں آپ کسی دوکان پر جائیں۔ مثلاً کپڑا خریدنے کیلئے تو دوکاندار آپ کو دیکھتے ہی خوش آمدید کہے گا۔ اور پھر کوئی تیز موسیقی لگا کر خوشی سے رقص کرنے لگے گا۔ اب آپ ساری دوکان میں گھوم پھر کر کپڑا پسند کرلیں۔ اس عرصے میں دوکاندار محو رقص رہے گا آپ کاونٹر پر مطلوبہ رقم پیش کریں گے۔ تو دوکاندار اپنا رقص چھوڑ کر قیمت وصول کرلے گا اور بقایا واپس کرتے ہوئے آپ کا شکریہ بھی ادا کرے گا۔

### مرد کا مقام

ایک خاتون جو بڑی اچھی مقررہ تھیں انھیں ایک جلسے میں تقریر کرنی تھی۔ تقریر کا موضوع تھا عورت کی برتری۔ جوش میں آکر کہنے لگیں "میں پوچھتی ہوں ان مردوں سے کہ عورت نہ ہوتی تو تم کہاں ہوتے"
پیچھے سے آواز آئی ــ "جنت میں"

### سچی رائے

میں عورت کے بارے میں سچی رائے اس وقت دوں گا جب میرا پاؤں قبر میں ہوگا پھر جب میں اپنی رائے دے چکوں گا تو تابوت میں کود پڑوں گا۔ اور اس کا ڈھکنا اندر سے بند کر کے پکاروں گا کہ اب میرے سامنے ہو جائے جو کرنا ہو
ٹالسٹائی

شیخ رحمٰن اکولوی (اکولہ)

# میرا یار جمیل فاروقی

**عام** خیال ہے (اور عام خیالات عام طور پر غلط ہوتے ہیں) کہ خیالات کی ہم آہنگی دوستی کی بنیاد ڈالتی ہے۔ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ یا کم از کم میرے اور جمیل فاروقی صاحب کے معاملہ میں ایسا نہیں ہوا ہے اس کے باوجود ہم برسوں سے اچھے دوستوں کی طرح رہ رہے ہیں۔ لوگ ہماری دوستی کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ جمیل صاحب کو میں نے جیسا پایا انکی شخصیت کو ویسا ہی اس خاکے میں پیش کیا ہے۔ جب میں نے ان میں کوئی کمی (یا زیادتی) نہیں پائی تو میں اس سلسلے میں کیا لکھتا۔ وہ ایک انسان ہیں اس لئے یقیناً اُن کی کچھ شخصی کمزوریاں ہوں گی لیکن یہ کمزوریاں خالصتاً ذاتی نوعیت کی ہوں گی جن کا علم صرف انہیں ہے۔ یہ بات میں اس لئے آپ کے گوش گذار کر رہا ہوں کہ اس تعلق سے آپ میرے خاکے کو یک رُخی کہہ کر کمزور نہ قرار دے دیں۔

آیئے اب آپ کو جمیل فاروقی صاحب سے ملاؤں۔ سعادت مندی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ بچوں کے تئیں ان کی سعادت مندی دیکھنے اور محظوظ ہونے کے قابل رکھتی ہے۔ ایک دن میں ان سے ملنے گیا۔ دیکھا کہ بیٹھک میں چارپائی پر بیٹھے ہیں اور ان کے سامنے فرش پر صاحبزادے سہیل فاروقی کھیل رہے ہیں۔ سلام کیا تو بڑی نحیف آواز میں جواب ملا۔ آواز کی کمزوری اور چہرے کی مردنی دیکھ کر میں نے پوچھا "کیا طبیعت ناساز ہے؟" اُن کے چہرے کے زاویے مزید منحنی ہوگئے۔ بیٹے کی طرف دیکھ کر گویا ہوئے "نہیں یار۔ اس لڑکے نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ میں بیت الخلا جانا چاہتا ہوں۔ اور یہ نالائق یہاں سے ہٹنے نہیں دے رہا ہے۔ اٹھ بھی نہیں سکتا ہوں تو بری طرح بلبلا کر رونے لگتا ہے۔ دس منٹ ہوگئے ہیں اب تو حالت خراب ہونے لگی ہے۔" میں نے کہا "سعادت مند اولادیں تو بہت دیکھی تھیں، سعادت مند باپ آج پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔" اسی لئے کہتے ہیں کہ زیادہ لاڈ پیار بچوں کو بگاڑ دیتا ہے سرد آہ بھر کے بولے "نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ یہ جیسی کرنی ویسی بھرنی والا معاملہ ہے یار"

"کیا مطلب؟"

"میں چھوٹا تھا تو ابا حضور کو تنگ کیا کرتا تھا۔"

بڑھیا (یعنی عمدہ یا نفیس) ان کا تکیہ کلام ہے۔ جب کبھی کسی چیز کی تعریف کرنی ہوتی ہے، اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں اب تو ان کے متعلق کلام کرتے وقت یار دوست لفظ "بڑھیا" پر تکیہ کرنے لگے ہیں۔ یعنی ان کا نام لینے کے بجائے 'بڑھیا' کہہ کر انکو یاد کرتے ہیں۔ ایک دن اسی وجہ سے ان کے دو دوست مصیبت میں پڑ گئے تھے۔ وہ دونوں سڑک سے گذر رہے تھے کہ ان میں سے ایک نے کافی فاصلے پر جمیل فاروقی صاحب کو سامنے آتے ہوئے دیکھا۔ اسے اپنی بینائی پر بھروسہ نہیں تھا۔ اس لئے اس نے اپنے ساتھی سے پوچھا

"جو میں دیکھ رہا ہوں، کیا تم بھی دیکھ رہے ہو؟"

"ہاں بڑھیا ہے۔" دوسرے ساتھی کے منہ سے یہ جوابی فقرہ نکلا ہی تھا کہ دو ہاتھ ان کی کنپٹیوں تک پہنچ گئے۔ وہ بوکھلا گئے۔ پھر جب انھوں نے دیکھا کہ یہ ہاتھ ایک خوبصورت لڑکی کے ہیں تو سارا معاملہ معاً ان کی سمجھ میں آگیا۔ پھر اس سے پہلے کہ لڑکی کی بالو سے پبلک کی لاتوں تک پہنچتی، کچھ راہ گیروں نے بیچ بچاؤ کر کے

رفع دفع کر دیا۔ قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جسے وہ جیل فاروقی سمجھے تھے وہ کوئی اور شخص نکلا تھا۔ جب وہ ان کے پاس سے گزرا تو وہ لے دل ہی دل میں) گالیاں دینے لگے کہ اُس کی وجہ سے ان کی عزت پر بن آئی تھی۔

ڈیوٹی کے معاملہ میں Punctual ہیں۔ لیکن ایک مرتبہ صبح کی shift میں کچھ دن لگاتار دیر سے اسکول پہنچے تو میں نے ان سے پوچھا "دیکھ رہا ہوں کہ آجکل آپ خلاف توقع دیر سے اسکول پہنچ رہے ہیں اور آپ کی دستخطوں سے حاضری رجسٹر کا چہرہ سرخ ہو جا رہا ہے۔ کیا بات ہے؟" بولے "میرے دیر سے اسکول پہنچنے کی وجہ ریڈیو ہے۔ جیسے صبح ہوتے ہی وکیل میاں آن کر دیتے ہیں"!

"آپ نے فاروقی ٹوتھ پاؤڈر کا اشتہاری گیت تو سنا ہی ہوگا؟"

"ہاں بالکل، کئی بار"

"ادھر میں اسکول جانے کے لئے تیار ہوتا ہوں اور اُدھر ریڈیو سیلون سے فاروقی ٹوتھ پاؤڈر کا اشتہاری گیت بجتا ہے"

سب سے پہلی بات صبح کی فاروقی ٹوتھ پاؤڈر
سانسوں کو مہکائے۔ دن بھر دانتوں کو چمکائے فاروقی ٹوتھ پاؤڈر
فاروقی فاروقی......

میری اہلیہ جو اس وقت عموماً چولھے کے پاس ہوتی ہیں اس گیت کو سنتی ہیں تو ان کے اندر کی بیوی عود کر آتی ہے اور وہ اس گیت کو تصور میں ایڈٹ کر کے، اس طرح سنتی ہیں اور محظوظ ہوتی ہیں۔

سب سے پہلی بات صبح کی ————

————————

فاروقی فاروقی

پھر وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتی ہیں، لجاتی ہیں۔ میں بوکھلا جاتا ہوں اور مجھے دیر ہو جاتی ہے

فلمیں دیکھنے کا انہیں جنون ہے اور فلموں کی اچھی خاصی پرکھ بھی۔ ایک دفعہ میں سنجے اور راکھی کی ایک فلم دیکھ کر سنیما ہال سے نکلا تو باہر ان سے ملاقات ہوگئی۔

پوچھا "کیا آپ بھی فلم دیکھ کر آرہے ہیں؟"

انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا

"بہت بور فلم تھی۔ سر میں درد ہو گیا،" میں نے اظہار خیال کیا۔

"میں نے یہ نوبت ہی نہیں آنے دی"

"وہ کیسے؟"

"میں نے سینما ہال میں جانے سے قبل سیریڈون کی گولی لے لی تھی"

"میں کچھ سمجھا نہیں؟"

"یہ فلم آج میں نے دوسری دفعہ دیکھی ہے" انہوں نے معصومیت سے جواب دیا۔

۴۴ دوست کو لکھا اگر اس کے پاس بھی کچھ نہ تھا اور اس نے تم سے مانگا اور تم نے یہ تھیلی اُسے دے دی اور اس نے مجھ کو۔

## دوستی

امام واقدی کا بیان ہے کہ میرے دو دوست تھے۔ ہم تینوں ایک قالب تین جان تھے۔ ان میں سے ایک ہاشمی نسل تھا۔ ایک سال عید ایسے وقت آئی کہ میرے پاس کچھ نہیں تھا بیوی نے مجھ سے کہا کہ اس موقع پر ہم تو صبر و شکر سے کام نکال لیں گے مگر بچوں کا کیا ہوگا۔ اس تصور سے میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ اگر آپ ان بچوں کے لئے کپڑ کا کوئی انتظام کر دیتے تو بڑا اچھا ہوتا میں نے اپنے ہاشمی دوست کو لکھا کہ عید آنے والی ہے اور میرے گھر کا حال یہ ہے کہ کچھ نہیں ہے اگر تم اس موقع پر میری مدد کرتے تو بہت اچھا ہوتا چنانچہ اس ہاشمی دوست نے ایک مہر بند تھیلی بھیج دی جس میں ایک ہزار درہم تھے۔ یہ رقم پاکر میں ابھی مطمئن بھی نہیں ہوا تھا کہ میرے دوست نے مجھے خط لکھ کر اسی قسم کا اپنا حال ظاہر کیا جیسا کہ میرا حال تھا میں نے وہ تھیلی اس کے پاس بھجوا دی۔ کچھ دیر بعد میرا ہاشمی دوست وہی تھیلی مہر بند میرے پاس لے کر آیا اور کہا کہ سچ سچ بتاؤ تم نے کیا کیا ہے۔ میں نے پورا واقعہ اس سے بیان کر دیا تو وہ بولا کہ تم نے اپنی تنگ حالی لکھ کر میرے پاس بھیجی اس وقت اس رقم کے علاوہ میرے پاس کچھ نہ تھا۔ پھر اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے میں نے اس ۴۴

## بوڑھا بچہ

ایک چھوٹا بچہ سڑک کے کنارے بیٹھا رو رہا تھا۔ اُدھر سے ایک بزرگ گذرے انہوں نے بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے پوچھا۔ "ننھے بیٹے۔ کیوں رو رہے ہو؟"
بچہ بولا۔ "میں وہ کام نہیں کر سکتا جو بڑے لڑکے کر سکتے ہیں۔"
یہ سن کر بڑے میاں بھی وہیں بیٹھ گئے اور رونے لگے۔

سیر و تفریح کے رسیا ہیں پچھلے دنوں بمبئی گئے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ ایک شام ہم سیر کرنے کی غرض سے جوہو بیچ گئے اور کنارے پر کھڑے ہو کر سمندر کے نظارے سے لطف اندوز ہونے لگے۔ ہمارے بالکل سامنے دو خوبصورت اور نوجوان لڑکیاں سمندر میں تیر رہی تھیں، نہا رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد ایک لڑکی پانی سے باہر نکلی اس نے ٹیوب والے سے ٹیوب لیا اور دوبارہ سمندر کی طرف جانے لگی جب وہ ہمارے پاس سے گذری تو اس نے جمیل صاحب کی طرف شرارتی نظروں سے دیکھا اور مسکراتی ہوئی بولی "آپ بھی آجائیے۔" اس کا یہ فقرہ سن کر جمیل صاحب کچھ بوکھلائے کچھ شرمائے، پھر اپنی ریشمی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑبڑائے "استغفراللہ، اس لڑکی کو میری داڑھی کا تو لحاظ رکھنا چاہیے تھا۔ میں نے کہا "اسی داڑھی کی وجہ سے اسے شرارت سوجھی وہ سمجھتی ہے کہ تم شریف آدمی ہو۔ اس کی دعوت پر لپکو گے نہیں۔ ورنہ یہی بات وہ مجھ سے نہ کہتی۔"

جمیل صاحب ان شخصیتوں میں سے ہیں۔ دلچسپ واقعات جن کے آس پاس ہوتے رہتے ہیں۔ میرا دل رکھتے ہوئے یہ واقعہ بھی برداشت کر لیجیے۔ ان کے ایک پڑوسی کے ہاں چوری ہو گئی۔ پولیس انسپکٹر اپنے دو ماتحتوں کے ساتھ جائے واردات پر پہنچے اور پوچھ گچھ کی تو انہیں معلوم ہوا کہ اس گھر میں چوری ہونے کے ایک دن پہلے سے ایک مہمان قیام پذیر ہیں۔ شک کی بنیاد پر شک کرنا پولیس کا پیدائشی حق ہے۔ انسپکٹر نے مہمان سے پوچھ تاچھ کی تو جواب میں اس نے کہا "لگتا ہے آپ اس محکمے میں نئے نئے آئے ہیں۔ آدمی کی پہچان نہیں ہے آپ کو۔ ورنہ آپ مجھ پر شک کرتے کسی کی پیشانی پر شریف لکھا نہیں ہوتا۔ تو چور بھی لکھا نہیں ہوتا۔ یاد رکھیے اگر آپ نے مجھ پر شک کیا تو ہتکِ عزت کا دعویٰ کر دوں گا۔ کیا میں صورت سے آپ کو چور نظر آتا ہوں؟" آخری جملہ ادا کرتے کرتے وہ اپنا چہرہ انسپکٹر کے چہرے کے اتنا قریب لے گیا کہ دونوں کی ناکیں مل گئیں۔ انسپکٹر نے اپنی ناک اس کی ناک سے الگ کی اور سر کی جنبش سے اپنے ماتحتوں کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ وہ جیسے اشارے کے منتظر ہی تھے۔ انہوں نے مہمان کی دھلائی شروع کر دی۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں مہمان نے ہانپتی ہوئی، خفیف سی آواز میں اقرار کر لیا کہ چوری اسی نے کی ہے۔ لہٰذا اسے تھانہ لے جا کر بند کر دیا گیا۔ دوسرے دن اصل چور پکڑا گیا تو معلوم ہوا کہ مہمان بے قصور ہونے کے زعم میں انسپکٹر سے الٹی سیدھی باتیں کر لی تھیں۔ لیکن جب دُھلائی ہوئی تو مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اسے ناکردہ جرم کا اقرار کر کے اپنی جان چھڑانی پڑی۔

تعجب نہیں کہ یہ خاکہ پڑھ کر آپ جمیل صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل کرنا چاہیں تو آیئے میں آپ کو ان کے چہرے کا آؤٹ لائن بتا دوں۔ لمبوترہ چہرہ جیسے 70 mm کے چہرے کو 35mm کے اسکرین پر دکھایا جا رہا ہے۔ سلیقے سے جمے ہوئے چھوٹے چھوٹے ملائم بال۔ کرکٹ پچ کی طرح متناسب اور ہموار پیشانی۔ کمانی دار بھنویں کرکٹ اسٹمپ جیسی ستواں ناک کہ اس پر نظر رکے تو بھی مجموعی چہرہ معلوم ہو۔ شربتی آنکھیں۔ آپ کہیں گے کہ یہ آؤٹ لائن عام ہے۔ تو حضرات میری بات پوری نہیں ہوئی۔ ان کی داڑھی (ہائے ایسی داڑھی کوئی کہاں سے لائے) انہیں اوروں کی نسبت انفرادیت بخشتی ہے۔ اس کی Speciality یہ ہے کہ یہ اصل ہوتے ہوئے نقلی معلوم ہوتی ہے۔ (جب انسانوں کے دل مصنوعی ہونے لگے ہیں تو اصل چیزوں کا یہی حال ہوگا) انہیں داڑھی کے ساتھ دیکھ کر اس کہاوت کے توڑ پر کہ "بڈھا سینگ کٹا کر بچھڑوں میں مل گیا" یہ متضاد کہاوت ذہن میں آتی ہے کہ "بچہ داڑھی لگا کر بڈھوں میں مل گیا۔" اس مٹھی بھر داڑھی نے ان کے چہرے پہ

بقیہ صفحہ [illegible] پر

ڈاکٹر وزیر آغا (پاکستان)

## غزل

چھوٹا ترا نگر تو ہم اپنے نگر گئے
گہرے سمندروں کی تہوں میں اتر گئے

شاید کہ تو نے کھول دی مٹھی بھری ہوئی
طشتِ فلک میں نقرئی سکّے بکھر گئے

ہونٹوں کے سیپ سوکھے پڑے ہیں تو غم نہیں
آنکھوں کے خشک کھیت تو پانی سے بھر گئے

جھونکے نے بڑھ کے پیڑ کو چھیڑا تو دفعتاً
اڑتے ہوئے فضا میں پرندوں کے پر گئے

کہنے لگا کہ میں نے تمہیں کتنا دکھ دیا
سپنے تمہارے چھین لیے سب سحر گئے

خود سے کہا کہ میں یہ نہیں وہ ہے ہم سفر
یوں ہم ہوا میں اڑتے ہوئے اپنے گھر گئے

★

ناصر شہزاد

## غزل

رُتوں کا روپ، سموں کی پھبن چرا کے نہ جا
سکھی چلی ہے کہاں تو، نیَن چرا کے نہ جا

کچھ اور تپاک، کچھ اور پیار، میری سانسوں میں
بسے بسے ہوئے جھونکے، بدن چرا کے نہ جا

یہ سرکنڈوں سے گھری جھیل، ایک پل تو ٹھہر
ابھرتے چاند کی پہلی کرن چرا کے نہ جا

جلے گا چولی میں، دے گا مہک ہتھیلی پر
چھپائے گی کہاں اس کو یہ من چرا کے نہ جا

جنم مرن کا ترا میرا ساتھ ہے نہ بچھڑ
یہ انگ سنگ کی پونجی، یہ دھن چرا کے نہ جا

رفاقتوں کی رُتیں، رتجگے، پلٹ کے تو دیکھ
کھنکتے ہنستے دنوں کی تھکن چرا کے نہ جا

"یہ پھول ہیں انہی انگنائیوں کے" اس نے کہا
"رسیلے ہونٹوں کی مدا من چرا کے نہ جا ★

---

اختر ہوشیار پوری (پاکستان)

## غزل

اب کے وہ ابر تھے کہ سراسر بھگو گئے
لیکن ہمارے چہرے شرر رنگ ہو گئے

ہر موڑ پہ تھا شہر چراغاں سجا ہوا
ہم بے بصر تھے کوئے تمنا میں کھو گئے

مقدور ہو تو ان کو بھی ہمراہ لے چلو
جو چاند بن کے اٹھے سحر بن کے سو گئے

حیراں ہوئے ہیں آئینہ خانوں میں جا کے لوگ
ہم اک کھنڈر ہیں نقش بہ دیوار ہو گئے

جن گہرے پانیوں میں اترتا نہ تھا کوئی
وہ خود امنڈ امنڈ کے در و بام ہو گئے

اب میں ہوں اور روزنِ دیوارِ شہر
وہ شہر جس کے راستے سب بند ہو گئے

اب ان کے دیکھنے کو بھی اختر ترس گیا
رگ رگ میں غم جو زہر کی صورت سمو گئے

# آزاد غزل

عتیق احمد عتیق (مالیگاؤں)

(نذرِ اطہر نفیس)

کردو آباد اُجڑے ہوؤں کے مکاں دوستو
ورنہ ویران ہو جائیں گی بستیاں دوستو
ہو تو ہونے دو جاں کا زیاں دوستو
میرا کیا ہے تمہیں تم رہو شادماں دوستو
بیتے لمحوں کی اُڑتی ہوئی راکھ میں
بھر گیا کون یادوں کی چنگاریاں دوستو
اپنے پیروں تلے اک دہکتی زمیں ہی نہیں
میں سروں پر بھی شعلوں میں پلتے کئی آسماں دوستو
ڈوبنے کو تو میں ڈوب جاؤں خود اپنے جنوں میں مگر
رک نہ جائے کہیں وقت کا بادباں دوستو
رنگ، خوشبو، دھنک، روشنی
اپنی راہوں کی سب کہکشاں دوستو
میں نہیں ہوں تو یہ کتنا بے کیف و بے رنگ ہے
میری سانسوں سے تھا خوشبوؤں کا جہاں دوستو
وقت سمٹے تو اک دوسرے کیلئے
پھیل جاتا گراں تا گراں دوستو

**********

# غزل

ماجد الباقری
(پاکستان)

آئینۂ خیال میں لمحوں کی لاش ہے
انسان کا وجود ابھی قاش قاش ہے

معلوم ہے کہ وہ نہیں آئیگا اب یہاں
ملتا ہی جو نہیں مجھے اسکی تلاش ہے

شہرِ منافقت میں ہے تنہائیوں کا راج
گر ساتھ ہے تو اک یہی فکرِ معاش ہے

دستک گھروں پہ دیتی پھری ہے مری انا
شہرت بھلی ہے جسکی وہی بد قماش ہے

اک اور شہر ذہن میں سب نے بسا لیا
جس جا کوئی نہیں ہے وہاں بود و باش ہے

منصف کے دل کی بات گواہوں نے لوٹ لی
انصاف کی جبیں پہ ابھی تک خراش ہے

ماجد علامتوں سے بھی حاصل نہ ہوگا کچھ
اک راز وہ جو گونگوں کی بستی پہ فاش ہے

**********

# غزل

کرشن کمار طور (دھرم شالہ)

ہم پرندے تھے درختوں پہ چھا گئے
آنے والی رُت کی زد میں آ گئے

رات دیکھا تھا انہیں دل آشنا
دن جدائی کے قریب اب آ گئے

مجھ پہ کیا موقوف میں دیوانہ ہوں
شہر والے بھی تو اب صحرا گئے

کون کس کا ساتھ دیتا ہے یہاں
وہ جو تنہا آئے تھے تنہا گئے

کیا کہیں کیوں ہے وفا کی ضد تجھے
طورؔ اب یہ عکس تو دھندلا گئے

**********

کرشنا موہن (دہلی)

# غزل

ایک سکوتِ حیرت ہے حیوانوں میں
کتنی وحشت پھیل گئی انسانوں میں

لطف آئے کیا عشرت کے افسانوں میں
سوزِ حرماں ہے میرے ارمانوں میں

لاوا بہتا ہے میری شریانوں میں
دل محصور ہے آتش خیز چٹانوں میں

گونج رہا ہے حرماں کا سناٹا بھی
جھرنوں کی آواز ہے میرے کانوں میں

جن کو راس نہ آئی راہ و رسمِ جہاں
کتنے دانا پنہاں ہیں نادانوں میں

چنچل من کو خواہش بیکل رکھے گی
گھومو خواہ پہاڑوں پر، میدانوں میں

کیسا غضب ہے مجھ کو بنا کر دیوانہ
اس نے میرا نام لکھا فرزانوں میں

ہوش و خرد سے شہرِ جنوں ویران کیا
موسم بدلا، دھول اڑی ہیجانوں میں

میری حدیثِ باغی، کمنیٔ طاغی سے
ہلچل پیدا ہے اونچے ایوانوں میں

کرشنا موہن جذبِ شرارت غالب ہے
کیف حرارت اب ہے کہاں ایمانوں میں

*

لطف الرحمٰن (بھاگلپور)

# غزل

[illegible]ے یہ مرحلہ برگ و ثمر کیسا ہے
بھری برسات میں جلتا ہے شجر کیسا ہے

[illegible] کا خوف مجھے چین نہ لینے دیگا
دل کے قدموں سے لپٹتا ہوا ڈر کیسا ہے

[illegible] دیا ہم نے چراغ اپنا ہوا کی زد پر
خودکشی کا یہ ہمارا بھی ہنر کیسا ہے

[illegible] آنکھوں میں ہے دریا کی روانی بنکر
یہ سلگتا ہوا سینے میں شرر کیسا ہے

[illegible] پتھر پہ نہیں نام کسی کا لکھا
میری تنہائی کا مدفن یہ کھنڈر کیسا ہے

[illegible] فرصت جو ملے دیکھ لو آکر اک دن
ایک ویران خرابہ مرا گھر کیسا ہے

[illegible] ہونے بھی نہ دے اور سنبھلنے بھی نہ دے
کس مصیبت میں صفینہ ہے بھنور کیسا ہے

کوئی دل کھول کے ملتا نہیں ہر دیسی سے
کیسے یہ لوگ ہیں یہ تیرا نگر کیسا ہے

*

رحمت امروہوی (احمد آباد)

# غزل

غیر کا کب تک سہارا چاہیے
بازوؤں پر بھی بھروسہ چاہیے

گالیاں دینا بھی مشکل کام ہے
گالیوں میں بھی سلیقہ چاہیے

آپ بھی تعریف فرمانے لگے
آپ کو تو زہر اگلنا چاہیے

کھڑکیاں، دیوار و در جسکے رقیب
اس کی مجبوری بھی دیکھا چاہیے

ایک تنکے کا سہارا بھی بہت
ڈوبنے والے کو اور کیا چاہیے

آج کل شہرت بھی گالی ہو گئی
اب تو شہرت سے بھی بچنا چاہیے

نازش پرتاپگڈھی (پرتاپ گڈھ)

## غزل

لکھے جاتے ہیں سبھی ہانپنے والے الفاظ
چھوڑیں میراث میں ہم کچھ تو جیالے الفاظ

لے گئے لوگ انھیں افسانہ بنانے کے لئے
دوستوں نے مری جانب جو اچھالے الفاظ

تھا جہاں گہری خموشی کا اندھیرا برپا
سرپھروں نے اسی محفل میں اُجالے الفاظ

سر اُچھلتے تھے جہاں جسموں سے ہو ہو کر الگ
کچھ جیالوں نے وہاں جا کے اچھالے الفاظ

جیسے اب کوئی اجالوں کا پیمبر ہی نہ ہو
جیسے اس دور کی تقدیر ہوں کالے الفاظ

یوں تو خوشبو کی طرح نرم ہیں لیکن یارو
وقت پڑتا ہے تو بن جاتے ہیں بھالے الفاظ

ٹوٹتے رشتوں کے ماتم میں ہیں مصروف سبھی
کس کو فرصت جو سرِ بزم اچھالے الفاظ

علم والوں میں بھی اب کوئی نہیں صاحبِ ظرف
کس طرف جائیں کتابوں کو سنبھالے الفاظ

زندگی روپ بدلتی ہی چلی جاتی ہے
اے غزل اپنے لئے اور بنالے الفاظ

کتنی چپ چاپ ہیں بدلی ہوئی قدریں نازش
سرِ قرطاس لکھو، بولنے والے الفاظ

مظہر امام (سری نگر)

## غزل

یہ کھیل بھول بھلیّوں میں ہم نے کھیلا بھی
تری تلاش بھی کی اور خود کو ڈھونڈا بھی

مرا نصیب تھی ہموار راستے کی تھکن!
مرا حریف پہاڑوں پہ چڑھ کے اُترا بھی

یہ آرزو تھی کہ یکرنگ ہو کے جی لیتا
مگر وہ آئینہ جو شیطاں بھی ہے، فرشتہ بھی!

سمندروں سے گہر کب کے ہو گئے ناپید
تمھارے ساتھ میں گہرائیوں میں اُترا بھی

برہنگی پہ بھی گذرا قبائے زر کا گماں
لباس پہ ہوا حیز فرِ بدن کا دھوکہ بھی

گرجنے والے برستے نہیں، یہ سنتے تھے
گذشتہ رات وہ گرجا بھی اور برسا بھی

وقار واثقی (احمد آباد)

## غزل

کون ہے، جو آشنا تیرا نہیں
کون ہے، جس سے ترا رشتا نہیں

ڈالیوں میں چھپ گئی ہیں پتیاں
ہے گھنا جنگل، مگر سایا نہیں

آج کا وہ کامیاب انسان ہے
جس کے شانوں پر کوئی چہرا نہیں

کیا بتاؤں، ہے شریکِ جرم، کون
مُرتکب اِس جرم کا تنہا نہیں

غیر کے نقشِ قدم ہیں، اور میں
کیا کروں میں، دوسرا رستا نہیں

وقت کی رفتار بے آواز ہے
اور یہ کہہ کر کبھی آتا نہیں

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا گناہ
دوسروں سے مشورہ لیتا نہیں

دشمنی کا شائبہ جب تک نہ ہو
دوستی کا حق ادا ہوتا نہیں

سادہ لوحی اسقدر بھی کیا وقارؔ
اپنی شخصیت کا اندازہ نہیں

# آزاد غزل

## ظفر ہاشمی (جمشید پور)

کشتیوں کی گود بھی ہے آب نم تابی لیے
اور ساحل پر بھی ہیں کچھ لوگ بے تابی لیے

آتے جاتے موسموں کی یورشوں کے باوجود
چل رہی ہے روح انگارہ بنے اور جسم برفابی لیے

لمحہ لمحہ جل رہے ہیں ہم جلیانِ طلوعِ آفتاب
قطرہ قطرہ ڈھل رہی ہیں ہانپتی تنہائیاں بھی رات مہتابی لیے

اِک سمندر جامد و ساکت سہی !
اِک سمندر ہے ابھی تک سرخ مرغابی لیے

دھنس رہا ہوں میں اکیلا ہی نہیں
شہر کا باقی علاقہ بھی ہے آخر ارضِ سیلابی لیے

اندر باہر چیختا ہے انگ انگ
ہر بشر ہے مرضِ اعصابی لیے

ہر طرف پاگل ہوا کا زور آخر کیوں نہ ہو
جو صدی ہو رس بھری باتیں لیے اور ذہن تیزابی لیے

لمسِ شوریدہ کا ایسے آگے پیچھے ہے جلوس
آج بنجر کھیت میرا بھی ظفر ہے فصلِ شادابی لیے

---

# آزاد غزل

## بدیع الزماں خاور (داپولی)

ہے کہاں فرصت کہ سوچیں صبح کیا ہے، شام کیا؟
کیا بتائیں ہم کہ ہے یہ گردشِ ایام کیا ؟

جب عدالت کی نظر میں بھی کوئی مجرم نہیں
ہم جو دیں تو دیں کسی کو قتل کا اِلزام کیا؟

میکدے میں آخر اتنی بے دلی سے دوستو !
لے بیٹھے ہو یہ خالی جام کیا ؟

اِن مسیحاؤں سے کب ہوگا محبت کا علاج ؟
اِن دواؤں سے ملے گا اب بھلا آرام کیا؟؟

چاہے بولے وہ کسی لہجے میں، بولے تو سہی
اُسکی جانب سے ملے تو پھول کیا۔ دشنام کیا؟

آدمی اچھا ہی خاور مگر جاؤ گے اُسکے پاس تو کیا پاؤ گے
شعر گوئی کے سوا آتا ہے اُس کو کام کیا؟؟

# غزل

علیم صبا نویدی (مدراس)

تری آنکھوں پر پڑے پردۂ بادہ سے نکل
دھوپ ہی دھوپ ہے تاریکیٔ بادہ سے نکل
نیم مقام کو ترے سامنے بکھرے ہیں ورق
قید کو توڑ کے تو دستِ ارادہ سے نکل
دھوپ آنگن میں اُتر آئی ہے تجھ سے ملنے
شب کے پہنائے ہوئے کرب لبادہ سے نکل
مختصر قرب ہی دیتا ہے اُمنگوں کو حیات
لذتیں طول ہی لطف زیادہ سے نکل
ورنہ لے ڈوبے گی تجھ کو بھی صبا تیری روش
وسعتِ فکر میں احساس اعادہ سے نکل

★

# غزل

حیدر قریشی (پاکستان)

یہ کیا ہوا کہ دعاؤں کے ہاتھ چھوٹ گئے
نئے دنوں کی صداؤں کے عکس ٹوٹ گئے
ہوا پہ لمس دھنک کے اُتارنے والے
جواں رتوں کے بدن خوشبوؤں کو لوٹ گئے
مجھے یقین ہے اِک روز لوٹ آئے گا
وہ جس کی یاد کے بھی حرف حرف روٹھ گئے
میں اپنی کرچیاں اب کس طرح سمیٹوں گا
کرن کرن مری آنکھوں کے خواب پھوٹ گئے
وہ بے قصور تھا میری منافقت ہی سہی
چلو خلوص کے جھوٹے بھرم تو ٹوٹ گئے

★

# غزل

اقبال دانش (الہ آباد)

کوئی نئی نہیں تھا سوالوں کے شہر میں ✤ خالی تھے ہاتھ مانگنے والوں کے شہر میں
رہنے دے آج مجھ کو خیالوں کے شہر میں ✤ بزمِ طرب میں زہرہ جمالوں کے شہر میں
تاریکیوں نے بڑھ کے سہارا مجھے دیا ✤ جس وقت لٹ رہا تھا اجالوں کے شہر میں
ہو کر نڈھال آیا ہوں میں غم کی دھوپ سے ✤ رہنے دے تھوڑی دیر غزالوں کے شہر میں
اُمڈا ہوا تمام ہے سیلابِ رنگ و بو ✤ رعنائیٔ صنم ہے شوالوں کے شہر میں
گفتار پر لگی ہے یہاں مہرِ خامشی ✤ کھلتی نہیں زبان سوالوں کے شہر میں
فرطِ جنوں میں لے کے چلا ہوں شبیہ دوست ✤ تشبیہہ کے نگر میں مثالوں کے شہر میں
اے دل بچھا کہ تو بھی صنم آشنا نہ ہو ✤ پتھر کے بت ملیں کے شوالوں کے شہر میں

دانشؔ کو تم جو ڈھونڈھنا چاہو تو ڈھونڈھ لو
خوابوں کی سرزمیں میں خیالوں کے شہر میں

# غزل

## ڈاکٹر نازؔ قادری (برورا‌ج)

(آقائی و نعمتی والد بزرگوار کے سانحۂ ارتحال پر)

کسی سایا نہ شجر میں گم تھا — میں سرابوں کے سفر میں گم تھا
موج در موج بھنور میں گم تھا — آئینہ عکسِ دگر میں گم تھا
کسی دیوار نہ در میں گم تھا ق — اپنے گرتے ہوئے گھر میں گم تھا
گردشِ شام و سحر میں گم تھا — صحنِ جاں، زیر و زبر میں گم تھا
لفظ بے صوت، صدا بے مایا — دل دعاؤں کے اثر میں گم تھا
ریت در ریت بدن اندر سے — خواب در خوابِ سفر میں گم تھا
چشمِ لمحات میں روشن تھے چراغ — دل کہ یادوں کے کھنڈر میں گم تھا
آج سر جوڑ کے بیٹھے تھے سبھی — اور میں کل کی خبر میں گم تھا
کھو گیا لذتِ منزل کا سراغ ق — قافلہ زادِ سفر میں گم تھا
ہائے وہ لمحۂ رخصت کا سماں — ہر نفس دیدۂ تر میں گم تھا
سر بہ زانو تھا تعلق اس کا — اور میں خوفِ خطر میں گم تھا
کوئی منزل نہ کوئی راہ نما — راستہ، راہ گزر میں گم تھا

سینۂ سنگ سے ٹپکا تھا لہو
نازؔ اعجازِ ہنر میں گم تھا

★

# غزل

## شبابؔ للت (شملہ)

ہم بھری بزم سے ہر چند نکل کر آئے
پھر بھی اُس بزم کے معیار بدل کر آئے

اُس نے دل چھلنے کا انداز نیا اوڑھ لیا
ہم بھی جذبات کا آہنگ بدل کر آئے

خواہ رسماً ہی سہی پرسشِ احوال تو کر
ہم ترے پاس بڑی دور سے چل کر آئے

گُل رُخوں کا یہ نگر ہے کہ کھلونوں کی دکاں
ہر کھلونے پہ دلِ سادہ مچل کر آئے

میں وہ صحرا ہوں کہ پیاسا ہوں کئی جنموں سے
تیری چاہت کی ندی اور مچل کر آئے

جنکا اعلان تھا مجھ کو نہ بلائیں گے کبھی
میرے دروازے پہ خود کس لئے چل کر آئے

میں ہزاروں میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا شبابؔ
چاہے اب کتنے بھی وہ بھیس بدل کر آئے

★

# غزل

## شہپرؔ رسول (علی گڈھ)

اُس کی باتیں کیا کرتے ہو وہ لفظوں کا بانی تھا — اُسکے کتنے لہجے تھے اور ہر لہجہ لافانی تھا
جب میں گھر سے نکلا تھا تب خشک زبان پہ کانٹے تھے — اور جب گھر میں واپس آیا گردن گردن پانی تھا
نامِ خدا اب بھی جاری ہے سب کی زبانوں پر لیکن — جس جذبے نے پار لگایا وہ جذبہ شیطانی تھا
جب کچھ معصوموں کی جاں تھی حیوانوں کے نرغے میں — تب ہر صورت ہو سکتی تھی ہر خطرہ امکانی تھا

آج کی محفل میں اے شہپرؔ نکتہ چینی تھی مجھ پر
تیرا تو کچھ ذکر نہیں تھا تو کیوں پانی پانی تھا

# آزاد غزل

فرحت قادری (گیا)

میں نے بگڑے ہوئے حالات سے سمجھوتا کیا
اپنے ٹوٹے ہوئے بکھرے ہوئے جذبات سے سمجھوتا کیا

رات بھر دیدۂ نمناک نے پلکوں پہ جلائیں شمعیں
اِس طرح نور نے ظلمات سے سمجھوتا کیا

مالکِ ارض و سماوات نے جب دی نہ توجہ کوئی
میں نے خود ارض و سماوات سے سمجھوتا کیا

میرا ہی ظرف تھا صدیوں تک ترے ساتھ نباہی میں نے
تیرے اِقرار سے انکار سے ہر بات سے سمجھوتا کیا

جب نہ میں جان سکا تیرے اشاروں کی زبان
میں نے پھر سارے اشارات کنایات سے سمجھوتا کیا

وقت نے مجھکو خلاؤں میں اُچھالا جس روز
بس اُسی روز سسکتے ہوئے لمحات سے سمجھوتا کیا

اپنی ہی ذات بنی خُلد میں دشمن میری
اور جب خُلد سے نکلا تو اسی ذات سے سمجھوتا کیا

جب یہاں بھی بلی غسِ خانۂ ماضی کی روایات کی بو
شہرِ امروز نے ماضی کی روایات سے سمجھوتا کیا

تیری جو بات زمانے کی سمجھ میں نہیں آئی فرحت
کتنے لوگوں نے اُسی بات سے سمجھوتا کیا

---

# غزل

رئیس الدین رئیس (علی گڑھ)

(جوشؔ ملیح آبادی کی نذر)

حق نوا کوئی صداقت کی سزا پانے کو ہے
یا صلیبوں پر چراغاں صرف بہکانے کو ہے

آنکھ کے سادہ ورق کو دے کوئی تصویرِ خواب
رات کا پچھلا پہر بھی اب گذر جانے کو ہے

بوڑھے برگد کی سلگتی شام نے مجھ سے کہا
اب ہر اِک طائر مری شاخوں سے اُڑ جانے کو ہے

تیرتی ہیں پیش منظر میں کئی پرچھائیاں
آنکھ کی پُتلی مجھے پھر خواب دکھلانے کو ہے

میں بھی اپنے خوف کے پیکر میں چھپ جانے کو ہوں
میرا سایہ بھی بضد مجھ میں سما جانے کو ہے

عمر بھر اوروں کی خاطر رنگ برسایا رئیس
گو مرا ہر اِک ورق بے رنگ کہلانے کو ہے

---

# غزل

مہندر پرتاپ گڈھی (پرتاپگڑھ)

بادل ہٹے تو اور بھی سردی فزوں ہوئی
نشتر چبھوئے جسم میں پُروا ہوا چلی

مجھ سے حیات ایسی لجاتی ہوئی ملی
آئی ہو جیسے شہر میں دوشیزہ گاؤں کی

جیسے میں قرض خواہ سے آنکھیں بچاتا ہوں
کترا کے مجھ سے ایسے گذرتی ہے ہر خوشی

وہ سازشوں کے جال بچھاتا رہا مگر
مٹھی میں اس کے قید نہ ہو پائی روشنی

ہم ظلمتوں میں ایک کرن کی طرح رہے
جھوٹے نگر میں سچ کی کوئی ساکھ تو بنی!

پچھتا رہا ہوں اس کو جگہ دے کے زیست میں
"آدرش واد" قصے کہانی کی بات تھی

لو گوری گوری دھوپ اُتر آئی صحن میں
اپنے نواحِ جاں میں اُتارو یہ روشنی

احساس نے رُلایا ہے مجھ کو لہو ہر آن
اب تک چکا رہا ہوں میں قیمت حیات کی

مہندر ہجوم شہر میں تنہا تھا فرد فرد
ماتم کناں تھی اپنے ہی لاشے پہ زندگی

---

## غزل

**شانؔ بھارتی (دھنباد)**

کیا خبر تھی وہ متاعِ بے بہالے جائے گا..
چھین کر آنکھوں سے خوابوں کی ردالے جائے گا

میں کفِ افسوس ہی ملتا رہوں گا عمر بھر
وہ مری غیرت کی دستار و قبالے جائے گا

کیا خبر تھی، اِس طرح بدلے گا فطرت کا نظام
وقت کے گلشن سے غنچوں کی صدالے جائے گا

جانتا تھا کون، محفل میں وہ آئے گا مگر
چھین کر کتنے ربابوں کی نوالے جائے گا

پار کرنا ہے اسے دریا مگر یہ دیکھنا.....
کہہ رہا تھا ساتھ اِک کچّا گھڑالے جائے گا

اس قدر اترا رہے ہیں کس لئے اہلِ چمن
آئے گا اک اجنبی رنگِ حنالے جائے گا

صورتِ قزّاق کوئی آئے یا مانندِ دوست...
شانؔ کوئی بھی ہو میرے گھر سے کیالے جائے گا

★

## غزل

**آمرؔ سورتی (سورت)**

منزلِ خیر سے یا منزلِ شر سے گزرے
گزرے بے داغ کوئی چاہے جدھر سے گزرے

تم بھی چیخ اٹھو یہ منظر جو نظر سے گزرے
موجِ غم بڑھ کے کسی کے بھی نہ سر سے گزرے

پڑ گئے جان کے لالے نگہِ لطف کے بعد
یوں گزرنے کو کئی تیر جگر سے گزرے

یہ کوئی اور نہیں راہ یہ ہے راہِ وفا
جس کا ایمان قوی ہو وہ اِدھر سے گزرے

کون سی راہِ محبّت میں نہ تھے خوف و خطر
یہ ہمیں تھے کہ جو بے خوف و خطر سے گزرے

کوئی رستا کوئی منزل ہو نہ کھائے گا فریب
اُن کے دیوانوں کو حق ہے وہ جدھر سے گزرے

کوچۂ دوست ہے پھر کوچۂ دوست اے آمرؔ
سر جھکائے ہوئے گزرے جو اِدھر سے گزرے

★

## غزل

**پروین کمار اشکؔ (پٹھان کوٹ)**

کھلونے دیکھتا ہے چیختا ہے!
وہ بچپن ہی میں بوڑھا ہو گیا ہے!

کبھی ہم جس کی چھت پر کھیلتے تھے
سُنا ہے آج وہ گھر ڈہ گیا ہے!

وہ کیا جانے کہ بادل کیسے برسیں۔
جو واٹر پروف چادر اوڑھتا ہے!

وکالت بھی ہے یارو کیسا پیشہ ؟
وہ سچ کو جھوٹ ثابت کر رہا ہے!

ہوا کا آدمی آیا کہ آیا ـــــ
فقیرِ شہر مجھ سے کہہ گیا ہے!

مجھے بھوتوں کے کمرے میں بٹھا کر
مداری اشکؔ جی! خود چھپ گیا ہے!

## غزل

عزیز قادری (بڑودہ)

ڈستے ڈستے یک بیک اک ہاتھ اُٹھا خنجر چلا
دوستی کے نام پر کاٹا گیا کوئی گلا

لوگ بہرے ہو گئے ہیں کوئی سُنتا ہی نہیں
چیختا ہے ایک اندھا کر بھلا ہو گا بھلا

پوچھتا پھرتا ہوں اپنے گھر کا لوگوں سے پتہ
میرے جیسا شہر میں کوئی نہیں ہے منچلا

دیکھ کر ہم دل جلوں کا حال خوش ہوتا ہے کیوں
گر تماشہ دیکھنا ہو تو خود اپنا گھر جلا

مصلحت کے نام پہ نزدیک ہیں ہم تم مگر
دن بدن بڑھتا ہی جاتا ہے دلوں کا فاصلا

جان ہر اخبار کی ہیں اب یہ ساری سُرخیاں
آگ آندھی روگ طوفاں قتل ڈاکہ زلزلہ

شام گہری ہو رہی ہے آؤ گھر لوٹیں عزیزؔ
دل بھی چورا ہے یہ اُکتایا ہے سورج بھی ڈھلا

★

## دوہے

اعجاز (نئی دہلی)

موسم ہے سیلاب کا، مشکل میں ہے جان
گھر اپنا ہے ریت پر، ندیوں کے درمیان

اور جئیں گے چار دن، ڈھول ملے سب خواب
گھر کے بھیتر آگ ہے، باہر ہے سیلاب

ابھی وقت ہے تو سنبھل، سرمت دشمن نادان
چلو موت کے گھر چلیں، مانگیں جیون دان

منزل کتنی دور ہے، کہاں پڑے گی رات
کانپے میرے پرش پر، کو جوان کے ہات

ساتھ میرے نہ رو سکی، گونگی بہری رات
پگلا من کرتا رہا، آسمان سے بات

شہر گرا بھوکنپ سے، وہی بچا کل رات
بھول کے رستہ پیڑ پر، جس نے کاٹی رات

ہار کے بازی جیت لی، پھر ہم نے اِس بار
اُجڑی بستی ہو گئی، بسنے کو تیار

★

## غزل

شمیم قاسمی (سہسرام)

ہر لحظہ قریب آنے کا ارمان بہت ہے
اُس پھول کے اطراف میں طوفان بہت ہے

لمحاتِ گریزاں پہ پشیمان بہت ہے
اک شخص کا اک شخص پہ احسان بہت ہے

ہمدرد کوئی شہر میں مشکل سے ملے گا!
کہنے کو تو ہر شخص سے پہچان بہت ہے

رستہ کوئی جینے کے لئے ڈھونڈنا ہوگا
مرنے کیلئے شہر میں سامان بہت ہے

چڑھ جاؤں نہ شہرت کی بلندی پہ کسی دن
یہ سوچ کے دل اپنا پریشان بہت ہے

موسم کے تھپیڑوں میں گرفتار ہے سلمیٰ.....
دل ایک جزیرہ ہے جو ویران بہت ہے....

سردار ایاغ (بنگلور)

## آزاد غزل

گالیوں کی کثافت سے اپنی زباں کو بچا گندی نالی نہ بن
تربیت خود کی کر لاابالی نہ بن
تجھ کو عزت کے مخصوص آداب کا واسطہ
بادشاہوں کے دربار میں مدعی کی طرح جا سوالی نہ بن
دیکھنے والا بھرپور منظر کہے شکل کچھ اس سلیقے کی کر اختیار
یعنی بے سبزہ و برگ ڈالی نہ بن
فالتو وقت میں فن پہ زورِ قلم صرف کرنا بری بات ہے
چند زرّیں لمحے بچانے کی خاطر موالی نہ بن
آج کے خاک اُگلتے ہوئے دور میں شوقِ نظارگی جرم ہے
آنکھ بن جا سراپا مگر کھلنے والی نہ بن
ہلکا پھلکا سا اک فلسفہ نسلِ نو کو ہے مطلوب سردار ایاغ
ایسی سطحی مہم کے لئے تو غزالیؔ نہ بن

مصطفےٰ مومن (دھنباد)

## غزل

کیا ملا وقت رائگاں کر کے
کیا ملا ختم داستاں کر کے

راستے سے بچھڑ گیا ہے کوئی
فاصلوں کو قریبِ جاں کر کے

میں بکھر جاؤں گا ہواؤں میں
صرف اک لمحہ رائگاں کر کے

میری خستہ تنی کو ڈھانپ لیا
خاک کو تنگ آسماں کر کے

لفظ و آواز کا شکار ہوئے
گونگے لفظوں کو ہم زباں کر کے

شاہد نعیم (جدہ)

## غزل

خانۂ دل میں ہے اور نظروں سے دور
چھین لے یارب میری آنکھوں کا نور

دل مثالِ نو شگفتہ اک کلی
وقت کے ہاتھوں لٹا کیف و سرور

جرم ہے ناآشنا تحریر کا
ان کے بابِ شک میں کیا میرا قصور

روز کٹ جاتے ہیں سایہ دار پیڑ
شہریارِ وقت کا حسنِ شعور

وقت رکتا ہی نہیں شاہد کبھی
ٹوٹتا رہتا ہے انساں کا غرور

# غزل

نثار محمود نشاس (دہران)

آتش شوق میں جلتا ہوں غزل کہتا ہوں
موم کی طرح پگھلتا ہوں غزل کہتا ہوں

ہوش آتا ہے سنبھلتا ہوں غزل کہتا ہوں
جب تری سمت نکلتا ہوں غزل کہتا ہوں

شب کی تنہائی میں لو دیتا ہے احساس مرا
تیری یادوں سے بہلتا ہوں غزل کہتا ہوں

ایک اک شعر مہکتا ہے گلابوں کی طرح
سایۂ زلف میں چلتا ہوں غزل کہتا ہوں

شکوۂ غیر لبوں تک نہیں آتا ہے نشار
اپنی ہی آگ میں جلتا ہوں غزل کہتا ہوں

# غزل

رشید اعجاز (پونہ)

زہرہ پیکر کے لب رسیلے ہیں
سرخ ڈالی پہ پھول نیلے ہیں

چبھ رہی ہے بدن میں تنہائی
روز و شب کس قدر نکیلے ہیں

زندگی پی رہے ہیں، پینی ہے
گھونٹ میٹھے ہیں کچھ کسیلے ہیں

آنکھ بھیگے تو آبگینہ ہو
ورنہ رونے کو لاکھ حیلے ہیں

روز جوہی کے پھول چنتا ہے
خوب اعجاز کے وسیلے ہیں

# غزل

یوسف راہی (بنگلہ دیش)

علم کے گہرے سمندر میں اترنا ہے مجھے
فکر میں قوس قزح کا رنگ بھرنا ہے مجھے

وقت کے اس قافلے سے مجھکو رہنے دو الگ
ڈھیرے ڈھیرے غم کے صحرا سے گزرنا ہے مجھے

فہم و دانش پر بھی اب تو چھا چکی ہے تیرگی
فکر نو کا بن کے سورج اب ابھرنا ہے مجھے

میں تو راہی زیست کے صحرا میں ہوں محو سفر
موت جب دیگی صدا تو پھر ٹھہرنا ہے مجھے

صابر فخرالدین (یادگیر)

## غزل

صرف دو سطر لکھئے
آپ خط، مگر لکھئے
میں ہوں منتظر لکھئے
لکھئے بے خطر لکھئے
آپ شوق سے ہم کو
شاخ بے ثمر لکھئے
ہم خفا نہیں ہوں گے
چاہے جس قدر لکھئے
اور جو بھی لکھنا ہو
حرف معتبر لکھئے
ہو سکے تو اے صابر
زیر اور زبر لکھئے

---

سحر سعیدی (اورنگ آباد)

## غزل

اہلِ انصاف اگر میری گواہی لیتے
اس کو سُولی پہ چڑھانے سے بچا ہی لیتے

ہم کو حالات سنبھلنے نہیں دیتے ورنہ
اک گھروندہ سہی مٹی کا بنا ہی لیتے

آگ نفرت کی محبت سے بجھا دی ہم نے
ورنہ یہ لوگ تو بستی کو جلا ہی لیتے

گھر کی دیوار اٹھاتا نہ میں بروقت اگر
لوگ رستہ مرے آنگن کو بنا ہی لیتے

دوست ہی دوست ہیں کوئی نہیں تنقید نگار
ورنہ اک تازہ غزل ہم بھی سنا ہی لیتے

اے غمِ عشق بُرا ہو تیرا، ہم تیرے بغیر
کچھ نہ کرتے تو بزرگوں کی دعا ہی لیتے

شوق ہم کو ہی نہیں دشت نوردی کا سحر
ورنہ وحشت میں کہیں خاک اُڑا ہی لیتے

---

نوراللہ پوری (بھوپال)

## غزل

وقت نے جب بنجر دھرتی پر سورج نئے اگائے
سبزہ سبزہ آنگن آنگن جاگے کتنے سائے

دن تو اپنا ہنستے ہنستے میخانے میں گزرا
رات ہوئی تو پلکوں نے خود کتنے دیئے جلائے

جب بھی ہم نے ذہنوں میں اک شیش محل چمکایا
اس بستی کے سارے باسی پتھر بن کر آئے

کتنے پیڑ لگائے ہم نے سائے کی چاہت میں
سر پر جس دن سورج جاگا تن کو ڈس گئے سائے

شہر کے ہر اک چوراہے پر اک محشر برپا ہے
گاؤں کی سونی پگڈنڈی بس بانہیں پھیلائے

جس کا سارا جیون بیتا جلتے انگاروں پر
برفیلی چٹان پہ اس کو نیند کہاں سے آئے

نیند محبت نے لُوٹی ہے نورؔ سکوں قسمت نے
پتھریلی ہو راہ گزر تو کوئی نہ ساتھ نبھائے

---

انجان علیم (جمشید پور)

## غزل

بے آب سمندر کی کبھی پیاس بجھی ہے
"بس تشنہ لبی تشنہ لبی ہے"

سورج کی کرن چل نہ ابھی فرش چمن پر
کلیوں کے بدن پر ابھی شبنم کی نمی ہے

جس دم سے مقید ہے زمیں چاند ستارے
پرواز ہمیں آج اسی دم سے ملی ہے

ہر پیکر احساس کا سورج رہا روشن
جب شام کے نرغے میں کوئی بھی گھری ہے

انجان ترے نام سے جیتا ہے کوئی اور
یہ بات فرازوں کی صداؤں نے سنی ہے

---

جمیل قریشی (اودے پور)

## غزل

کتنے ہی خورشید اس بستی کے بام و در میں ہیں
ہم غریب شہر یہ کس عرصۂ محشر میں ہیں

ریل کے جانے کی سیٹی یاد ہے اب تک مجھے
اس کی وہ آنسو جڑی آنکھیں ابھی منظر میں ہیں

زلزلہ نے کر دیئے مسمار بستی کے مکاں
آج کل مہمان ہم ویرانیوں کے گھر میں ہیں

رات کے بالوں میں تو کب کی سفیدی آ چکی
جاگتی آنکھیں مگر اب تک مرے بستر میں ہیں

وہ پرندہ بھی اچانک گھونسلے سے اڑ گیا
گھات کی ناکامیاں اب دور تک منظر میں ہیں

---

احمد رضی (پھپھراؤں)

## غزل

تجھ کو پانے کے لیے ہم خود کو یوں برتا کیے
لوٹ کر جب بچپنے کی سمت ہم دیکھا کیے

دیکھتے کیا ہیں کہ ہے اک پتھروں کا ڈھیر سا
جلتی آنکھیں، دانت غائب، ہاتھ پاؤں ہر طرف

جسم کی شاخوں سے لاوا سا ٹپکتا ہی رہا
توڑ کر اپنے بدن کو رات بھر بیٹا کیے

نوچ کر شاخوں سے پتے دھوپ پھیلا کیے
آس کی اندھی گپھا میں جب کبھی اترا کیے

پھیلتے سائے کو گھر میں دیکھ کر سہما کیے
اور ہم بیٹھے ہوئے اس آگ میں بھیگا کیے

پتھروں کے ڈھیر سے اگنے لگے جب دست و پا
ہم صدا بن کے فضاؤں میں رضی بکھرا کیے

بوثی (احمد آباد)

## غزل

(فخر گجرات جناب فخر احمد آبادی کی یاد میں)

وہ دیدہ ور جو شیدائے شاہِ ذوق پیہم تھا
نکات و رمز و اسرارِ حریم فن کا محرم تھا
...ن شوق جس کا ماورائے سوزشِ غم تھا
...ِ دارِ زبان شوق زخمِ دل کا مرہم تھا
جمالِ فکر سے جسکی تھی اقلیم سخن تاباں
گہر افشاں بہر سو جس کے فکر و فن کا پرچم تھا
...ہ قصرِ ذوق گویائی وہ ایوانِ سخن سنجی
...ر در کج کلاہی سخن دانی جہاں خم تھا
وہ فخر خطۂ گجرات وہ صد نازشِ اردو
کسی اہلِ زباں سے مرتبہ جس کا نہ کچھ کم تھا
جبھی تو آج اے مختار یہ کہنا ہی پڑتا ہے
سخن میں وجہ صد نازش جناب فخر کا دم تھا

●●

زحمت سورتی (سورت)

## غزل

وہ ہاتھ جس کا نہ ہو معیار رجسٹرڈ
ہلکے اُسے کرواتے ہیں سو بار رجسٹرڈ
اس دورِ نیپلنگ کے ہیں قانون نرالے
ہو جاتے ہیں بے دھار کے ہتھیار رجسٹرڈ
کرتے ہیں جو چلتے ہوئے جلوؤں کو پریشاں
کھاتے ہیں وہ جوتے سرِ بازار رجسٹرڈ
اللہ تری شانِ عنایت کے میں قربان
کوتے بھی کرانے لگے گلزار رجسٹرڈ
قاضی نے رجسٹرڈ مجھے اک بار کیا تھا
کرنے لگی بیگم مجھے ہر بار رجسٹرڈ
سنتے ہیں گھسیٹے نے بھی مضمون لکھا ہے
نتھو نے کیا ہے کوئی اخبار رجسٹرڈ
سُن سُن کے چُراتی ہے ادب چور ہے دنیا
کروالئے زحمت نے بھی اشعار رجسٹرڈ

●●

نذیر احمد نظیر نیازی (احمد آباد)

## غزل گلکا

جہان علم کی فصل بہار ہے گلکا — مسرتوں کا حسیں آبشار ہے گلکا
وفا شناس محبت شعار ہے گلکا — نظر کا چین تو دل کا قرار ہے گلکا
جلا ملی ہے جہاں پر جمال اردو کو — تو وہ ادارۂ صد افتخار ہے گلکا
برائے اردو ترقی کا ایک زینہ ہے — سماج و قوم کا خدمت گزار ہے گلکا
جہاں پہ کھل گئیں اردو نوازیاں تیری — زبان اردو کا مدحت نگار ہے گلکا
نئے شگوفے نئے گل ہیں جسکے دامن میں — وہ گلزار ہے و لالہ زار ہے گلکا
لئے ہے صدق کے دامن میں علم و فضل کے پھول — عدو کی آنکھ میں پھر بھی تو خار ہے گلکا
مشن ہے تیرا اخوت فلاح و سچائی — اساس تیری بڑی پائیدار ہے گلکا
نظر ہماری نظر نے تو بس یہی دیکھا
فروغِ علم کا اک شاہکار ہے گلکا

منوہر لال ہادی (نئی دہلی)

# غزل

مت پوچھ، میاں، کس نے ڈبوئے ہیں سفینے
طوفاں نے کہ مانجھی کی نگوں سار خودی نے

آئے ہیں اسی بات سے جینے کے قرینے
مرجھا کے بتائی تھی جو کل شام کلی نے

اب دیکھئے کب ٹوٹیں یہ دشوار مہینے
اک راہ دکھائی تو ہے شوریدہ سری نے

گلزار تیرِ وحدت کے گلابوں سے جو سینے
بنجر کئے، ویران کئے کج نگہی نے

فطرت نے بکھیرے نگوں میں جو دفینے
با اذنِ بشر، ختم کئے ایک صدی نے

بڑھتے رہے جس ڈھنگ سے دولت کے خزینے
اس ڈھنگ کو اب عام کیا تیرہ شبی نے

ہادی کبھی مانگے جو مقدر سے نگینے
پھٹکار دیا مجھ کو ریاضت کی کمی نے

*

اقبال ملک تنہا (سورت)

## غزل

غم بھی بخشا گیا ہے خوشی کی طرح
موت ہم کو ملی زندگی کی طرح

پھر اندھیروں میں تم کو پکارا کئے
چار دن تم ملے چاندنی کی طرح

تم مجھے دیکھ کر بس سنورتے رہو
میں رہوں سامنے آرسی کی طرح

تم ہوا بن کے گزرو مرے پاس سے
میں بکھر جاؤں گا پنکھڑی کی طرح

شمعیں نفرت کی تنہا بجھا دیں بھی
آؤ مل کر رہیں آدمی کی طرح

* * *

نیاز اعظمی (علی گڑھ)

## غزل

جب سبھی اہلِ نظر، عکسِ نظر کھو جائیں گے
حادثوں کی دھند میں دیوار و در کھو جائیں گے

تتلیوں کا رنگ پینے جب خزاں آ جائے گی
دیکھتے ہی دیکھتے شاخ و ثمر کھو جائیں گے

رقعۂ نفرت پہ جب اک نام لکھا جائے گا
تب ہر اک تحریر کے زیر و زبر کھو جائیں گے

اونچی اونچی بلڈنگوں کے سائے بڑھتے جائیں گے
رفتہ رفتہ شہر کے سارے کھنڈر کھو جائیں گے

زندگی کے بحر کی لہریں فنا ہو جائیں گی
وقت کی باہوں میں کتنے ہی بھنور کھو جائیں گے

کچھ نشانی چھوڑ دے راہِ وفا میں اے نیاز
ہم نہ جانے زیست کے کس موڑ پر کھو جائیں گے

* *

خواجہ احمد عباس (بمبئی)

# "میری زندگی کا پہلا موڑ"

میری زندگی کا پہلا موڑ سچ مچ سڑک کا ایک موڑ ہی تھا۔
جلیانوالہ باغ والے قتلِ عام سے اگلے برس کی بات ہے' شاید میری عمر اس وقت پانچ برس کی ہوگی مگر اس واقعہ کا نقش اب تک میرے دماغ میں موجود ہے۔ میں اب بھی اس منظر کو اپنے تخیل میں دیکھ سکتا ہوں۔

ہمارے قصبہ میں چھ سات اسکول تھے۔ دو ہائی اسکول، باقی پرائمری اسکول۔ ہر اسکول میں سو دو سو لڑکے پڑھتے تھے۔ یہ سب ہزار بارہ سو لڑکے۔ پانچ برس سے سولہ برس کی عمر کے۔ اس وقت سڑک کے دونوں طرف کھڑے تھے۔ اس سڑک کو ہم "سڑک اعظم" کہتے تھے۔ اَن پڑھ لوگ "جرنیلی سڑک" کہتے تھے۔ جو تھوڑی بہت انگریزی جانتے تھے وہ "گرینڈ ٹرنک روڈ" کہتے تھے۔ سنا تھا کہ اس سڑک کو شیر شاہ سوری نے بنوایا تھا۔ یہ بھی سنا تھا کہ یہ سڑک پشاور سے لیکر کلکتہ تک جاتی ہے۔

ہزار بارہ سو لڑکے سڑک کے کنارے دونوں طرف کھڑے تھے کھڑے تھے نہیں کھڑے کئے گئے تھے۔ لاہور سے گورنر کا حکم انگریز ڈپٹی کمشنر کو آیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے اپنے ضلع کے سب تحصیل داروں کو حکم دیا تھا۔ پانی پت کے تحصیل دار نے تھانے دار کو حکم دیا تھا۔ تھانے دار نے سب اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں کو بلا کر انکو حکم دیا تھا کہ اگلے دن سب اسکولوں کے لڑکے صبح چھ بجے شہر کے باہر جرنیلی سڑک کے دونوں طرف باقاعدہ لائنیں بنا کر کھڑے ہو جائیں۔

اس وقت دن کے بارہ بجے تھے، گرمی کے دن تھے۔ چھ گھنٹے سے ہم کھڑے تھے۔ ہماری ٹانگیں تھک گئی تھیں۔ بس کبھی ایک ٹانگ پر کھڑا ہوتا تھا، کبھی دوسری پر۔ کبھی شمال کی طرف نظر کرتا تھا۔ جدھر سے سنا تھا انگریزی گھوڑ سوار فوج آنے والی ہے۔ مگر سڑک تھوڑی دور آگے جا کر مڑ گئی تھی۔ ہماری نظر موڑ کے آگے نہ جا سکتی تھی۔ مگر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہر لڑکا ایک نظر ادھر ڈال لیتا تھا، جدھر سے فوجی رسالہ آنے والا تھا۔ اس نظر میں ایک انجانا خوف بھی تھا۔ اور لڑکپن کا تجسس بھی تھا اور موڑ کے ادھر کیا ہے۔ اس کی ایک عجیب کشش بھی تھی۔ اس سڑک کے موڑ کی اہمیت کا احساس ہمیں بہت بعد میں ہوا لیکن ہم میں سے کتنوں کے لئے وہ زندگی کا پہلا موڑ تھا۔

آخر کار جس گھڑی کا انتظار تھا وہ آ ہی گئی۔ پہلے تو نظر کچھ نہیں آیا صرف قریب آتی ہوئی ایک آواز سنائی دی جیسے دور کہیں بادل گرج رہے ہوں۔ پھر آواز صاف ہوتی گئی۔ ہزاروں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کے ساتھ لوہے کی رکابوں، بوٹوں، زنجیروں، بندوقوں اور نیزوں کے آپس کے ٹکرانے کی آواز بھی تھی۔ پھر آواز اور قریب آتی گئی۔ اب ہم کسی قدر سہمے ہوئے اس موڑ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پہلے دھول اڑی پھر اسی دھول کے بادل میں سے ایک انگریز افسر گھوڑے پر سوار نظر آیا۔ اسکے پیچھے پورا رسالہ تھا۔ پہلے انگریز افسر تھے۔ پھر انگریز سپاہی تھے۔ ہر ایک خاکی وردی پہنے ہوئے پیٹیوں میں پستول لگائے ہوئے، گھوڑے کی زین پر الٹی رائفل رکھے ہوئے۔ ان کے پیچھے توپوں کی گاڑیاں تھیں جن کو خچر کھینچ رہے تھے۔ پھر ہندوستانی فوج۔ یہ بھی گھوڑ سوار تھے۔ کلف لگے خاکی صافے، اونچے ترّے، پنجابی، بلوچ، سکھ، جاٹ پھر انگریز سپاہی۔ جیسے ہندوستانی سپاہیو

کو آگے پیچھے سے گھیرے ہوں۔

یہ برٹش سامراج کی فوجی طاقت کا مظاہرہ تھا۔ توپیں، بندوقیں، رائفلیں، مشین گنیں، تلواریں، سنگینیں، پستول، ریوالور لال منہ والے انگریز افسر اور سپاہی، کالے اور سانولے ہندوستانی۔ فوجی۔ اس پریڈ کا یہی مقصد تھا کہ بچوں کے دل میں سامراجی فوج کی دہشت بٹھا دی جائے۔

اور واقعی پہلے تو ایسا ہی ہوا۔ لال لال منھ والے انگریزوں اور بڑی بڑی توپوں کو دیکھ کر بچے سب سہم گئے۔ چپ چاپ پھٹی پھٹی نظروں سے ان کو دیکھتے رہے۔ ایک لڑکے کا تو دہشت کے مارے پیشاب نکل گیا۔ رسالہ گزرتا رہا۔ پہلے ہندوستانی سپاہیوں کے بعد دوسرے انگریز افسر اور "ٹامی" آئے تو انکے لال لال منھ (جو دھوپ میں اور بھی چمک رہے تھے) دیکھکر ایک لڑکے نے دوسرے کے کان میں کہا، "لال منھ والے بندر"۔ دوسرے نے تیسرے کے کان میں کہا، یہاں تک کہ گھس پسا ہٹ ایک لڑکے سے دوسرے تک ہوتی ہوئی لائن کے آخر تک پہنچ گئی۔ اب لڑکوں کی دہشت میں کچھ کمی ہوگئی تھی۔ خوف کی جگہ ایک حقارت آمیز تمسخر نے لے لی تھی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ انگریز گھوڑ سوار "ٹامی"، ایک یونیفارم پہنے ہوئے آرہے تھے۔ بالکل عورتوں جیسے گھاگرے، ننگی پنڈلیاں۔ ان کو دیکھ کر لڑکے مسکرا دیئے۔ کچھ ہنس بھی دیئے۔ ماسٹروں نے گھورا۔ پھر ڈانٹا بھی۔ مگر لڑکوں کو اپنی ہنسی روکنا مشکل ہوگیا۔ ہریانے کی عوامی زبان میں ایک نے دوسرے کے کان میں کہا۔ "یہ تو ننگائیاں (عورتیں)، لگتے ہیں!"

تین گھنٹے بعد جب پریڈ ختم ہوئی اور فوجی رسالے کی ٹاپوں سے اڑائی ہوئی صرف دھول رہ گئی تو تھکے ہارے، بھوکے پیاسے لڑکوں نے گھر کا رُخ کیا۔ بھگدڑ سی مچ گئی مگر سامراجی پلان ناکام ہوگیا تھا۔ اس فوجی طاقت کے مظاہرے سے وہ ہندوستانی بچوں کے دل میں دہشت نہ بٹھا سکے تھے، صرف نفرت اور حقارت کا جذبہ پیدا کر سکے تھے اور گھر لوٹتے ہوئے چند من چلے لڑکوں نے اسی زمانے کا ایک تمسخر آمیز عوامی زبان کا نعرہ لگایا جسے سب ہی نے چلّا کر دہرایا۔

"بول گئی مائی لارڈ، کنگرڈوں کوں"

"بول گئی مائی لارڈ، کنگرڈوں کوں"

اور اسکے بعد لڑکوں کا ایک اور کورس!

"اے بی سی ڈی کہاں گئی تھی"

"مر گیا انگریز، میں رونے گئی تھی"

ایسی ہی ایک پریڈ پنجاب کے ایک اور شہر میں ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہندوستانی بچے کے دل میں انگریزی سامراج کے لئے ایسی نفرت بیٹھ گئی کہ بڑا ہوکر وہ دہشت پسند انقلابی بن گیا۔ اس کا نام تھا بھگت سنگھ جس نے سب سے پہلے "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگایا تھا۔ ہزاروں اور بچوں نے بڑے ہوکر کسی انگریز پر پستول تو نہیں چلایا مگر ان کے دلوں میں بھی انقلابی سیاسی خیالات پلتے رہے، پکتے رہے۔ ان ہی میں سے ایک میں بھی تھا اور وہ موڑ جس کے پیچھے سے انگریزی فوج نمودار ہوئی تھی وہ میری زندگی کا پہلا موڑ تھا جس نے میرے شعور میں انقلاب پیدا کردیا۔

## اللہ کے نام ہبہ

حضرت شیخ یحیٰ بن عبداللہ رضؓ کا لقب جلا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی روحانی باتوں سے لوگوں کے دلوں کو جلا، اور روشنی دیتے تھے۔ اُن کا بیان ہے کہ ابتدائے حال میں میں نے اپنے والدین سے کہا کہ آپ لوگ مجھے اللہ کو ہبہ کردیں۔ انھوں نے فوراً کہا ہم تم کو اللہ تعالیٰ کو ہبہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد میں ایک زمانہ تک وطن سے غائب رہا۔ جب طویل مدت کے بعد واپس آیا تو رات کا وقت تھا۔ میں نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا والدین نے پوچھا۔ کون؟ میں نے بتایا کہ میں آپ لوگوں کا لڑکا ہوں۔ اس پر انھوں نے کہا۔

"ہمارے ایک لڑکا تھا جسے ہم نے اللہ تعالیٰ کو ہبہ کردیا ہے اور ہم عرب لوگ ہدیہ واپس نہیں لیتے۔"

اس زمانے کے اسکول میں پڑھنے والے بچوں کی دماغی پہنچ صرف سرکاری نوکری تک تھی۔ کوئی تھانے دار ہونے کے خواب دیکھتا تھا تو کوئی تحصیلدار۔ بہت اڑان کی تو کلکٹر کمشنر ہونے کی تمنا کرلی۔ ورنہ آخر میں سرکاری دفتر کی کلرکی تو سب کو کرنی تھی، لیکن اس پریڈ کو دیکھنے کے بعد میرے دل میں انگریزوں کی نوکری کے لئے ایک نفرت سی بیٹھ گئی۔ "کچھ بھی کروں گا، گورنمنٹ سروس نہیں کرونگا"۔ میری طرح سیکڑوں نے اپنے دل میں طے کرلیا۔ جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا، یہ خیال پکا ہوتا گیا۔

پہلے میں ڈاکٹر بننا چاہتا تھا کیونکہ قومی تحریک کے کتنے ہی لیڈر ڈاکٹر تھے۔ جیسے ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر بی سی رائے وغیرہ۔ لیکن جب زولوجی کلاس میں مینڈک کی چیر پھاڑ کا وقت آیا تو میں وہاں سے بھاگا۔ ڈاکٹری کا خیال چھوڑ کر انجینرنگ کا سوچا۔ چند روز Mathematics کلاس میں گزارے۔ لیکن Differential calculus اور Trignometry سے ڈر کر وہاں سے بھی بھاگا اور آرٹس کا کورس لے لیا۔ ہسٹری اور اکنامکس۔ یہی مضمون تھے جو اس وقت کے سیاسی رجحانات کی ترجمانی کرتے تھے۔ مگر ہمارا زیادہ وقت انقلابی لٹریچر پڑھنے میں گزرتا تھا۔ کلاس میں بھی اکنامکس کی کتاب کے اندر آئرش انقلاب یا انقلاب روس کی تاریخ رکھ کر پڑھتے تھے۔ پالٹکس میں دلچسپی کے باعث ہی یونین کے ڈبیٹس میں حصہ لینا شروع کیا۔ پھر یونیورسٹی میگزین میں لکھنا شروع کیا۔ یونیورسٹی ہی سے اپنا ہفتہ وار پرچہ نکالا Aligarh Opinion۔ پھر دہلی اور بمبئی کے قوم پرست اخباروں میں لکھنا شروع کیا۔ پھر افسانے لکھے۔ پھر کتابیں ...... حشر کیا ہوا آپکو معلوم ہی ہے۔

مگر میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر زندگی کے اس پہلے موڑ پر وہ انگریزی فوج کا ہیبت ناک رسالہ نہ آتا تو آج خواجہ احمد عباس کیا ہوتا؟ کسی دفتر کا ہیڈ کلرک؟ کوئی چھوٹا موٹا مجسٹریٹ؟ یا کسی گورنمنٹ ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر؟ مگر اس موڑ پر تو اس انگریزی سامراج کی کسی نہ کسی نشانی کو نمودار ہونا ہی تھا۔ فوج نہ ہوتی کچھ اور ہوتا۔ اس لئے کہ وہ صرف میری زندگی کا پہلا ہی موڑ نہیں تھا۔ وہ تاریخ کا موڑ تھا۔ اور تاریخ کے ہر موڑ پر لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیاں بدل جاتی ہیں۔

⸻ ※ ⸻

## اقلیت اکثریت

تہذیب کا ارتقا طباع افراد کی اقلیت کا مرہون منت ہے یہ لوگ پہلے راستہ ڈھونڈتے ہیں یا تراشتے ہیں۔ اور پھر اکثریت ان کی پیروی میں اس راہ پر چل سکتی ہے۔ تلاش راہ کے دوران طباع افراد کو تنہا یا ان پر مشتمل اقلیت کو رخصت اور مراجعت کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ سینٹ پال سینٹ گریگری، مہاتما بدھ، میکاولی، دانتے اور کتنے ہی ایسے طباع افراد پر وہی بات صادق آئی جو افلاطون نے کسی غار میں رہنے والوں کے بارے میں کہی تھی۔ اگر غار میں رہنے والوں نے کبھی روشنی نہ دیکھی ہو اور ایک آدمی باہر نکل آئے تو پہلے اسے روشنی کی ماہیت سمجھنے میں کچھ وقت لگے گا اور پھر وہ واپس جاکر اس نور کا ذکر اپنے ساتھیوں سے کرے گا تو وہ سب اس پر ہنسیں گے۔ اور موقع ملے تو جان سے مار ڈالیں گے۔ طباع اقلیتوں پر بھی تجربے کی یہی دو کیفیتیں گزرتی ہیں کہ وہ عام روش ہٹ کر کچھ وقت نور کی دریافت میں صرف کرتی ہیں۔ پھر واپس آکر اکثریت کو ساتھ چلنے کی دعوت دیتی ہیں جہاں اکثریت نے طباع یا افراد یا اقلیت کی پیروی کا صحیح حق ادا کیا۔ وہاں تہذیب ترقی پذیر رہتی ہے۔

("آواز دوست" ــ مختار مسعود)

رام لعل (لکھنؤ)

# زرد پتوں کی بہار

## (ساتویں قسط)

گیارہ فروری ۱۹۸۰ء کی صبح سات بجے آغا سہیل نے جگایا۔ تینتیس سال کے بعد پہلی بار مجھے کسی نے لاہور میں جگایا تھا۔ پتہ نہیں کیوں میں ہر نئے دن کو ماضی کے ساتھ جوڑ کر یاد کرتا ہوں! جلدی سے آنکھیں کھول کر ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ جس بستر پر میں رات کو سویا تھا اسی پر بیٹھا اب چائے پی رہا تھا۔ میرے پاس ہی آغا سہیل بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اور اخبارات کے صفحے الٹ رہے تھے، پاکستان ٹائمز اور مشرق کے ۔۔ ان کا کمرہ کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ تو یہاں بھی میں رات کو کتابوں کی ہی خوشبو سے بسے ہوئے کمرے میں سویا ہوں آغا سہیل نے پوچھا ۔ نیند آئی

میں نے جواب دیا خوب!

بولے ۔ کل انور سجاد کا مقالہ کیسا لگا تھا؟

جواب دیا ۔ دلچسپ ۔ بہت ہی دلچسپ ۔ انتظار حسین اور انور سجاد دونوں اچھے جملے باز ہیں ۔ فرق صرف یہ ہے کہ انتظار صرف ادبی کالموں میں اس قسم کی زبان لکھتا ہے۔ جبکہ انور سجاد اپنی تنقید کو اس سے سجانا پسند کرتا ہے۔ مثلاً کل جب اس نے کہا کہ اپنے یہ نوٹ ۔ بستی ۔ پڑھ کر اصل پڑھ لکھے ہیں تاکہ یہ بے ربط نوٹس کسی سکہ بند نقاد کے ہاتھ لگ جائیں تو اُسے ایک اچھا مضمون لکھنے کا موقع مل جائے ۔ تو مجھے بہت ہنسی آئی "

لیکن اس وقت آپ ہنس تو نہیں رہے تھے ۔

ہاں لیکن میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔

"آپ بھی انور سجاد کی طرح نقادوں سے خفا معلوم ہوتے ہیں"

کیا ہمیں اس کا حق نہیں ہے کہ اگر وہ الٹی سیدھی تحریریں لکھیں تو ہم بھی کچھ کہہ سکیں ۔ وہ بھی تو ہمارے کمزور افسانوں پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں ۔"

اسی وقت سید قاسم محمود کا فون آگیا۔ میں نے ان سے کہا فوراً آجاؤ۔ آغا سہیل کے بیٹے محسن آغا نے آکر بتایا کہ مجھے پولیس آفس بھی جانا ہوگا۔ اپنی آمد کی رپورٹ درج کرانے۔ اس کام کیلئے اس نے اپنے دوست اسامہ عباسی کو بلا رکھا تھا۔ وہ اُسی وقت کار لیکر آ بھی گیا۔ طے یہی پایا کہ باقی ہر کام سے پہلے پولیس سے نپٹ لیا جائے ورنہ دھڑکا لگا رہے گا۔ لاہور میں غیر قانونی طور پر موجود ہونے کا۔ جلدی جلدی شیو بنا کر اور رعنا بھابی کے ہاتھوں کا بنا ہوا لکھنوی ذائقہ کا ناشتہ کرکے محسن اور عباسی کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے دفتر میں پہنچ گیا۔ اس طرح راستے میں کئی پرانی سڑکیں باغات اور عمارتیں بھی دیکھ لیں ۔ مال روڈ ۔ جی پی او ۔ مسجد شہداء ۔ یہ نئی تھی جو ۱۹۷۱ء کی جنگ میں شہید ہونے والے فوجیوں کی یاد میں مال روڈ پر بنائی گئی تھی ۔ اسے دیکھ کر مجھے ہزاروں فوجی یاد آگئے جنہوں نے سرحد کے دونوں اور اپنی جانیں قربان کردی تھیں ۔ آگے پرانی انارکلی، گول باغ تھا۔ جس کا پہلے نام ناصر باغ رکھا گیا تھا۔ جب مصر کے جمال عبدالناصر سے تعلقات بگڑ گئے، تو اس کا نام بدل کر الفیصل باغ رکھ دیا گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے کی بھنگیوں کی تش کی تاریخی توپ جوں کا توں ایک چبوترے پر رکھی ہوئی تھی۔ لیکن نئی نسل کے بچے کو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ عجائب گھر کے پاس سر گنگا رام اسپتال بھی اپنے اصلی نام کے ساتھ موجود تھا۔ اگرچہ اسکی قد آور مورتی وہاں موجود نہیں تھی جس کے بارے میں منٹو نے سیاہ حاشئے میں ایک لطیفہ بھی بیان کیا تھا کہ اس بت کو توڑنے کی کوشش میں اونچائی سے گر کر زخمی ہونے والا

شخص علاج کے لئے اِسی سر گنگا رام اسپتال میں لے جایا گیا تھا۔
شاید اس واقعے کے بعد ہی پاکستان کا ضمیر اس اسپتال کا نام
بدلنے کے لئے تیار نہیں ہوا تھا۔

پولیس میں آمد کی
رپورٹ لکھوا کر میں نے دونوں
لڑکوں سے کہا کہ وہ واپسی
کے لئے ذرا قلعہ گوجر سنگھ کا
راستہ اختیار کر لیں تاکہ میں
اس مکان کی ایک جھلک دیکھ
لوں۔ جہاں میں آخری بار رہا
تھا۔ جہاں میں قائد اعظم۔
محمد علی جناح کی ایک بہت
بڑی تصویر دیوار۔ لٹکتی ہوئی
چھوڑ آیا تھا۔ یہاں میرا چھوٹا سا
ذخیرہ اردو کے رسالوں ساقی
ادبی دنیا۔ ادب لطیف۔ نیرنگ
خیال۔ شاہکار۔ خیام۔ ہمایوں
کے علاوہ نئے زاویئے۔ علم
خیال، بھیا انور دے کے خطوط۔ منٹو کے افسانے ضدی، چٹکیاں اور کئی
اچھی کتابیں چھوڑ آیا تھا۔ اسی مکان کے نیم اندھیرے کمرے میں میں
نے اپنی بیوی کے ساتھ ہنی مون منایا تھا۔ اور ہماری پہلی بیٹی شیل
نے اسی مکان کے اندر بولنا اور گھٹنوں کے بل چلنا سیکھا تھا۔ اسی مکان
کے اندر میں نے ایک روز اچانک فیصلہ کر لیا تھا کہ میں پاکستان کا شہری
بنوں گا۔ لیکن دن بدن بڑھتے ہوئے فسادات کی وجہ سے اپنی بیوی اور
بچوں کو نواں شہر دوابہ جا کر چھوڑ آنے کے لئے ۷ اگست کو اچانک چل دیا
تھا۔ اور پھر واپس نہ آ سکا تھا۔ جب کہ میں نے اب تک واپسی کا
ریلوے پاس اپنے پاس سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔

## واپسی کا ٹکٹ

شادی کے چند دنوں بعد میاں
بیوی میں جھگڑا ہو گیا۔ بیوی غصہ سے
بولی۔
" میں اپنی ماں کے یہاں جا رہی
ہوں۔ ہمیشہ کے لئے۔ شوہر نے خاموشی
سے پرس کھولا اور کچھ روپے بیوی
کو دیتے ہوئے بولا۔ یہ لو کرایہ"
نے جھپٹ کر روپے لے لیا
اور ہوئے بولی " یہ تو کم ہیں
اتنے میں واپسی کا ٹکٹ کہاں سے
آئے گا "؟

## پرانا مکان

لڑکوں نے میری خواہش کے مطابق گاڑی نیلا گنبد سے نکال
کر میکلوڈ روڈ پر ڈال دی۔ دیواروں پر جا بجا کالے پینٹ سے
نعرے لکھے ہوئے نظر آئے " افغانستان افغانستان ---
روس کا نیا قبرستان " میں ایسے وقت میں پاکستان پہنچا تھا جب ہر
شخص افغانستان کے مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔ افغانستان میں روس
کی فوجی مداخلت نے ایران کے روزمرہ کے واقعات پر پردہ سا
ڈال دیا تھا۔ لوگ ہیجانی کیفیت کی وجہ سے یہ نہیں سوچ پاتے
تھے کہ امریکا افغانستان میں اپنے مطلب کی سرکار بنوا کر بلوچستان
کے راستے سے ایران پر کتنا بڑا دباؤ ڈال سکتا ہے۔
میکلوڈ روڈ پر سے جاتے ہوئے مجھے ریجنٹ سینما کی عمارت
نہیں دکھائی دی، جہاں سہراب مودی کی تاریخی فلم 'پکار' جب
ریلیز ہوئی تھی تو وہاں پلائی ووڈ سے جہانگیر کا پورا محل بنا دیا گیا تھا
اس عمارت کو گرا کر وہاں نیا سینما گھر تعمیر کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح وہاں
پلیس سینما کی عمارت بھی موجود نہیں تھی۔ جہاں جیلر، آدمی، زمین
دار اور چترلیکھا جیسی فلمیں ریلیز ہوئی تھیں۔ کرشن چندر کی فلم،
سرائے کے باہر بھی اسی سینما میں دکھائی گئی تھی۔
میکلوڈ روڈ کے چوراہے سے عبدالکریم روڈ کی طرف گھومتے
ہی مجھے ایسا لگا جیسے یہ سڑک کچھ سکڑ سی گئی ہے۔
آس پاس کے دونوں طرف کے مکان بھی جیسے ایک دوسرے
کے قریب آ گئے تھے۔ لوگوں کی بھیڑ بھاڑ پہلے جیسی تھی۔ لیکن مجھے
وہ دکان نہیں ملی جہاں سے میں شیونگ کریم۔ بلیڈ، صابن اور کبھی
کبھی نئے ڈیزائن کی ٹائی بھی خرید لیا کرتا تھا۔ وہاں اب خراد کی
دو بڑی بڑی مشینیں چل رہی تھیں۔ اور تیل کے دھبوں سے
داغ دار کپڑے پہنے ہوئے کچھ مستری اور چھوکرے کام میں مصروف
تھے۔ اور جس دکان سے پہلی بار " ادب لطیف " خرید کر میں احمد
ندیم قاسمی کے نام سے آشنا ہوا تھا۔ اور وہاں سے میں اکثر ادبی
رسالے خریدنے لگا تھا۔ وہ بھی نہیں ملی۔ سائن بورڈ بدل چکا تھا

اور اس کے ٹھیک سامنے سردار حکم سنگھ کے مرحوم بھائی کے مکان
کے بیرونی کمرے پر اب ڈاکٹر عبدالرشید کا بورڈ آویزاں تھا۔ کبھی
یہی کمرہ میرے قبضہ میں ہوا کرتا تھا۔ جس کا میں دس روپئے مہینہ ادا
کیا کرتا تھا اس کے ساتھ اندر جانے والی ڈیوڑھی کا راستہ کسی دھنسی
ہوئی قبر کی طرح اندھیرا اور
ڈراؤنا لگا۔ میرا دل اچانک
دھک سا رہ گیا۔ کار وہیں۔
رکوائی گئی۔ لیکن میری ہمت نہ
پڑی کہ باہر آکر اس کے اندر جانے
کی اجازت مانگوں۔ لڑکوں
نے پوچھا بھی ۔ چچا اندر نہیں
چلیں گے۔ ؟ ۔ لیکن میں نے
کہا۔ نہیں گاڑی آگے بڑھاؤ۔
میں پھر کسی وقت آؤنگا۔ اکیلے۔
لڑکے کچھ نہ سمجھ سکے۔
گاڑی آگے بڑھ گئی۔ اور پھر
امرت پارک اور ایبٹ روڈ اور
شملہ پہاڑی کے پاس سے ہوکر
ایف سی کالج کو لوٹ گئی۔

## خچر کی لات

نیگرو ملازم ایک دن دیر سے آیا
تو مالک نے پوچھا۔
• سام تمہیں آنے میں ایک گھنٹہ
کی دیر ہو گئی۔
جی۔ سر۔ راستے میں ایک خچر
نے مجھے لات ماردی تھی "
مگر اتنی سی بات پر تمہیں ایک
گھنٹہ کی دیر کیوں ہو گئی ؟
• سر۔ بات دراصل یہ ہوئی کہ
خچر نے لات اِس رخ پر نہیں ماری
تھی بلکہ دوسرے رخ پر ماری تھی۔

## مجھے کیا ہو گیا۔

میں نہیں بتا سکتا اس وقت مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں نے
اپنے اس مکان کے اندر جانے کی خواہش کیوں پوری نہیں کی جو
آزادی کے بعد سے میری یادوں کا حصہ بنا رہا ہے! اسے دیکھ
کر مجھے یک بیک دھنسی ہوئی قبر کا دھیان کیوں آیا تھا۔ شاید ماضی
میرے لئے ایک قبرستان ہی بن چکا ہے اسی لیے میری یادوں کے
مرکز اب قبروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور میں کسی دھنسی ہوئی
قبر کو دیکھتے ہی دل گرفتہ ہو جاتا ہوں۔

قیام گاہ پہ پہنچا تو سید قاسم محمود آ چکے تھے۔ ایک دوسرے
سے خوب گلے ملے۔ بھینچ بھینچ کر ملے۔ معلوم ہوا ڈاکٹر وزیر آغا اور
انتظار حسین کے فون آئے تھے۔ وزیر آغا صاحب سرگودھا سے
لاہور پہنچ گئے ہیں۔ اور دو بجے تک مجھ سے ملنے آجائیں گے۔ انتظار
حسین نے تین بجے آنے کا پیغام دیا تھا۔ ہم لوگ کچھ دیر کے لئے۔
گلبرگ میں چھوٹی موٹی شاپنگ کے لئے نکل گئے۔ میں لکھنؤ اور امرتسر
کے درمیان اپنی بیناؤں اور جانگیوں کا پیکٹ گرا آیا تھا۔ ایک
دوکان پر جا کر یہ ضروری چیزیں خریدیں اور دو واحد دو کے رسالے
کرکٹ سے متعلق بھی خرید ے۔ اخبار وطن کے۔ جن میں بھارت۔
پاک کے حالیہ کرکٹ ٹسٹ میچوں پر مضامین چھاپے گئے تھے۔
ایک لڑکے عمران رزاقی کی نظم کے یہ شعر پاکستان کی نئی نسل کے
ترجمان لگے۔

دل موہ لو چین کے لئے جائیں گے اہل ہندوستان سے
آئے ہیں مہمان تمہارے دیکھو پاکستان سے
مانا کہ تم کھیل چکے ہو آندھی اور طوفان سے
لیکن بچ کر رہنا تم میرے عمران سے

جب تک محسن میٹ مارکیٹ سے گوشت خریدتے رہے۔
سید قاسم محمود اور میں سگریٹ تلاش کرتے پھرے۔ مجھے ابھی تک
معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ پاکستان کی کون سی سگریٹ میرے گلے کیلئے
ٹھیک ہوگی۔ سید قاسم محمود کو میں چھٹی دہائی سے جانتا تھا۔
ان کی افسانہ نگاری کی وساطت سے۔ جب ان کا ایک شاہکار
افسانہ "قاسم کی مہندی" ادب لطیف میں شائع ہوا تھا۔ اسکے
بعد تو وہ ادبی منظر سے بطور افسانہ نگار تقریب قریب غائب ہی ہو
گیا تھا۔ لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ اشاعتی میدان میں بہت کچھ کر رہے
ہیں۔ کئی کتابیں چھاپ چکے ہیں۔ اردو میں مذہبی، تاریخی اور سائنسی
انسائیکلوپیڈیا اور ناول اور کئی دوسری طرح کی سیریز۔ آج وہ
میرے لئے منٹو نمبر، کرشن چندر نمبر اور عصمت چغتائی نمبر لے کر آئے تھے۔
اپنے مکتبہ شاہکار کے ۔ انہوں نے ٹھیک ہی کہا۔ اگر میں نے افسانہ
نگاری چھوڑ نہ دی ہوتی تو یہ سب کام کوئی دوسرا ہرگز نہ کرتا۔ کیونکہ
یہ سب میرے ہی تخلیقی ذہن کی اپج تھی۔ لیکن قاسم اس بات کیلئے

بھی تیار نظر آیا کہ وہ اب پھر سے افسانے لکھا کرے گا۔ اس کے اندر کا
افسانہ نگار آج زندہ ہو گیا ہے

## نئی نسل

سید قاسم محمود کے جانے کے بعد ایف سی کالج کے کچھ لڑکے آ گئے۔ خرم اقبال، اقتدار، حیدر شہزاد اقبال، محمد اکبر، ملک مجید وغیرہ۔ وہ سب محسن کے دوست تھے۔ مجھ سے ملنا چاہتے تھے ملے تو دیر تک۔ ہندوستان، ہندوستانی فلموں۔ کرکٹ کے میچوں اور ہند و پاک دوستی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ فروری کی گنگنی دھوپ میں نہائے ہوئے لان پر آغا سہیل وقفے وقفے سے کالج میں پیریڈ لیکر آتے تھے۔ لیکن یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کالج میں پڑھانے چل دیتے یا گھر کے اندر ہی ٹہل کر لوٹ آتے تھے۔

لڑکے ہندوستانی فلموں کے بڑے مداح تھے۔ ہندوستانی کرکٹ کھلاڑیوں کے بارے میں بھی انکی معلومات حیرت انگیز حد تک صحیح تھیں۔ لیکن وہ ہندوستانی امپائرنگ سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا یہ ہندوستان کی شاندار بیٹنگ اور بالنگ کی صلاحیتوں پر داغ تھا۔ وہ سب آزادی کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ ہندوستان کے بارے میں ان کے ذہنوں میں بہت سی غلط فہمیاں موجود تھیں۔ جو اب فلموں اور ہندوستان سے آنے والے لوگوں کی وجہ سے دور ہو رہی تھیں۔ مجھے اپنی ہی طرح پنجابی اور اردو بولتا ہوا اور پاکستانی کرکٹ کھلاڑیوں کی تعریف کرتا ہوا دیکھ کر وہ بہت خوش نظر آئے۔ وہ چاہتے تھے وہ خود ہندوستان جا کر وہاں کے شہروں کو دیکھیں اور نئی نسل کے لوگوں سے یونی ورسٹیوں اور لائبریریوں اور کافی ہاؤسوں اور سنیما ہالوں اور کھیل کے میدانوں میں ملیں۔ اس کے لئے میں نے انھیں خوش آمدید کہا اور مشورہ دیا کہ وہ چھوٹے چھوٹے گروہ بنا کر آئیں۔ اور دونوں ملکوں کی حکومتوں کا دروازہ بھی کھٹکھٹائیں

ڈھائی بجے کے قریب ڈاکٹر وزیر آغا آ گئے۔ ان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اگرچہ قلمی رشتے سے بیس برس سے شناسائی تھی۔ جب سے وہ "ادبی دنیا" کے پانچویں دور میں مولانا صلاح الدین مرحوم کے ساتھ بطور مدیر شریک ہو گئے تھے۔ ادبی دنیا تو بند ہو گیا تھا۔ لیکن اب وہ اپنا ذاتی رسالہ "اوراق" نکالتے ہیں۔ میں انکی مدیرانہ صلاحیتوں کے علاوہ انکی شاعری، انشائیہ نگاری اور تنقید نگاری کا بھی قائل ہوں۔ انکی تحریروں کے آئینے میں جو ایک شریف انسان، متین، ذہین اور پروقار شخصیت کی جھلک ملتی تھی۔ وہ اب بہ نفس نفیس گاڑی میں سے نکل کر میری طرف بڑھ رہے تھے۔ تقریباً چھ فٹ لمبا قد، پتلا جسم، سر پر نائٹ کیپ ہونٹ بوٹ میں، ایک ہاتھ میں چمڑے کا بریف بیگ اور دوسرا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھا ہوا۔ ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ جو وہ انشائیوں سے پیدا کرنے کے لئے متمنی رہتے ہیں۔

ہم ایک دوسرے کے ساتھ بے اختیار بغل گیر ہو گئے۔ اور وہیں دھوپ میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ گزشتہ بیس برسوں پر پھیلی ہوئی باتیں۔ ادب اور ادبی شخصیات سے متعلق جس طرح کوئی ایک طویل مدت کے بعد ملنے پر اپنے خاندان اور مکان اور عزیزوں کے بارے میں دریافت کرتا ہے۔ کون اب کتنا بڑا ہو گیا ہے، کون کون سی کلاس میں پڑھتا ہے، انکی شرارتیں اور تعلیمی معیار اور شوق اور اسی قسم کی ہزاروں باتیں۔ ہماری باتیں ہندوستان اور پاکستان کی نئی ادبی نسل کے متعلق تھیں۔

تھوڑی دیر بعد انتظار حسین بھی آ گئے۔ ہم لوگ دھوپ کو ڈھلتا دیکھ کر اندر جا بیٹھے آغا سہیل چائے کے انتظار میں لگ گئے اب ہمارے درمیان جدید افسانے پر باتیں ہونے لگیں۔ جدیدیت کی پہچان یہ ٹھہری کہ کون فارم کے نئے تجربوں کے علاوہ سادہ پیرایۂ بیان میں بھی جدیت کا احساس دلا سکتا ہے۔ انتظار حسین جس قدر شوخ اور شرارتی اپنے کالموں میں جملے بازی کی وجہ سے نظر آتا ہے، ویسا وہ حقیقی زندگی میں ہرگز نہیں ہے۔ اپنی افسانہ نگاری میں بھی نہیں۔ اسکی افسانہ نگاری اور شخصیت ایک سی گمبھیر اور پرکشش ہیں۔ لیکن حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس کی آواز اس کی آواز سے بہت مختلف یعنی کمزور ہے، جو افسانے کی دنیا میں گونج رہی ہے۔ جیسے وہ دو الگ الگ شخصیتیں ہوں۔ باتوں باتوں میں ستا

بچ گئے۔ اور ہم سب ڈاکٹر وزیر آغا کی کار میں لاہور کی سیر کرنے کے لئے نکل پڑے۔ انتظار حسین دراصل میرا انٹرویو لینے کے لئے آئے تھے ہ مشرق کے لئے۔ لیکن اُسے اگلے روز پر ملتوی کر دیا گیا۔ انٹرویو کے لئے دو آدمیوں کو تنہا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ لاہور پہنچ کر تنہائی ہی میسر نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن میں خوش تھا کہ ہر وقت دوستوں اور جاننے والوں کے ہجوم میں گھرا رہتا تھا میں خود در اصل ہر شخص سے ملنے کا متمنی تھا۔ میں تنہائی پسند ضرور ہوں لیکن ہمیشہ تنہائی میں رہ بھی نہیں پاتا۔ تنہائی جس حد تک سوچنے کی خوراک دے سکتی ہے اُسے ہضم کر لیتا ہوں۔ اس کے بعد پھر لوگوں سے ملنے کے لئے بے قرار ہو اٹھتا ہوں۔ لوگ صرف بولتے ہی نہیں اپنے چہروں کے پیچھے چھپے ہوئے۔ روپ بھی ظاہر کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی بہت ہی سنجیدہ آدمی کے اندر سے اچانک بہت ہی ہنسوڑ اور بے تکلف انسان باہر آ جاتا ہے۔

لاہور میں مجھے ابھی تک ڈاکٹر وزیر آغا ہی بے حد سنجیدہ معلوم ہو رہے تھے جب کہ پنجابی مزاج بے تکلفی اور خوش کلامی سے ہی عبارت ہے۔ میں تو پنجابی عوام کو کھلی کتاب کا نام دیتا ہوں۔ جو اپنے آپ کھلتی چلی جاتی ہے۔ ایک ایک ورق بنا چھوئے سامنے آتا چلا جاتا ہے۔

(باقی آئندہ)

## نامناسب ہے خون کھولانا

جوش ملیح آبادی اور مولانا ابوالکلام آزاد میں خاصی بے تکلفی تھی اور جوش صاحب چاہتے مولانا کے دفتر میں پہنچ کر ان سے ملاقات کر لیتے ایک بار جوش صاحب گرمیوں کے موسم مولانا آزاد سے ملنے ان کے دفتر پہونچے مولانا ہندوستان کے وزیر تعلیم تھے۔ اور بہت مصروف تھے مولانا کے سکریٹری احمد خان نے جوش صاحب سے کہا کہ چند لمحے انتظار فرمایئے۔ مولانا سے ابھی آپ کی ملاقات ہوتی ہے۔ لیکن جب دیر ہو گئی اور گرمی کے باعث جوش پریشان ہو گئے۔ تو انھوں نے ایک چٹ پر یہ شعر لکھ کر مولانا کو اندر بھجوا دیا۔

نامناسب ہے خون کھولانا
پھر کسی وقت مولانا

مولانا نے یہ شعر پڑھا اور کمرے سے باہر آکر جوش صاحب اپنے ساتھ اندر لے گئے

## کیا میں اب نہا سکتا ہوں

اسرار الحق مجاز سر تا پا شاعر تھے اور شاعری کے تمام لوازمات کی پابندیوں کے قائل جن میں دانت نہ مانجھنا اور مدتوں غسل نہ کرنا بطور خاص شامل تھا۔ ایک بار وہ کسی ڈاکٹر کے کلینک میں گئے اور کہنے لگے "ڈاکٹر صاحب آپ نے مجھے پہچانا؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا "مجاز صاحب آپ کو کون نہیں پہچانتا۔ پچھلے برس آپ کو نمونیہ ہوا تھا اور میں نے ہی آپ کا علاج کیا تھا۔ فرمایئے اب طبیعت کیسی ہے۔"

مجاز نے ہنس کر کہا۔ "آپ نے مجھے نہانے کے لئے منع کیا تھا میں یہ پوچھنے آیا ہوں کہ کیا اب میں نہا سکتا ہوں"

## امتیازی شان

ایک مرتبہ رسول اللہؐ کو ایک دعوت میں بلایا گیا۔ جب آپ صاحب خانہ کے یہاں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ مکان رنگ برنگ سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ آپؐ نے دروازہ پر کھڑے ہو کر چند رنگوں کے نام لئے جن سے مکان آراستہ کیا گیا تھا۔ پھر فرمایا اگر ایک ہی رنگ ہوتا تو بھی کام چل سکتا تھا۔ یہ فرما کر آپؐ واپس چلے گئے اور اندر داخل نہیں ہوئے۔

## مشورہ

ابوالاثر حفیظ جالندھری حیدرآباد دکن کی کسی محفل میں بہت دیر سے شاہنامہ اسلام سنا رہے تھے جب تھک گئے تو حاضرین محفل کو بتایا۔ حضرات میں کوئی دو گھنٹے سے مسلسل سنا رہا ہوں۔ اب کچھ دیر سستانا چاہتا ہوں۔ اس وقفہ میں آپ درود شریف پڑھئے اور میں ایک سگریٹ پی لوں

فیض احمد فیض (پاکستان)

# "کچھ اردو شاعری کے بارے میں"

ہمارے ہاں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اور انگریزوں کے آنے پر شاعری کی تحقیق شروع ہوئی۔ مولانا حالی کے مسدس سے یہ شعر بہ طور سند پیش کر کے ہماری شاعری کو ایک بیکار چیز قرار دیا جانے لگا۔ ایسے لوگوں کا خیال تھا کہ شاعری بیکاروں اور بیکاری کا شغل ہے ؎

جو کر جائیں ہجرت یہ شاعر ہمارے
کہیں مل کے خس کم جہاں پاک سارے

مولانا حالی یہ شعر لکھتے ہوئے بھول گئے کہ ان کے استاد بہت بڑے شاعر ہیں۔ یہ بھی یاد نہ رہا کہ مولانا خود بھی شاعر ہیں۔ حالی نے جس زمانے میں یہ شعر کہا وہ انحطاط کا زمانہ تھا۔ شاعری ہمیشہ حالات کے تقاضوں کے مطابق پیدا ہوتی ہے اسی دور میں میر، غالب سودا، درد، نظیر اور دوسرے سنجیدہ شعراء بھی پیدا ہوئے مگر مولانا اور ان کے ہم خیال لوگوں نے ان بڑے شاعروں کو تو نظر انداز کر دیا اور دوسرے اور تیسرے درجے کے اُن تُک بند شاعروں کو یاد رکھا جن کی شاعری کا مضمون تعیش پسندی اور لذتیت تھا یا وہ ان مضامین کی ترجمانی کرتے تھے۔ ان ہی شاعروں کو نمائندہ ٹھہرایا اور ان کی کنگھی چوٹی قسم کی خرافات کو شاعری قرار دے دیا دوسری عجیب بات یہ ہے کہ ان حضرات نے یہ بھی فرض کر لیا کہ سارا انحطاط ان ہی شاعروں کی وجہ سے آیا ہے۔ حالانکہ ایسے شعراء تو انحطاط کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اس زمانے سے آج تک شاعری کو غیر سنجیدہ شغل اور ایک بیکار قسم کی چیز کہا جا رہا ہے۔

دور حاضر کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبال ہیں۔ مگر اقبال کے بہت سے مداح انہیں شاعر کہنا ایک معیوب بات سمجھتے ہیں اور انہیں مفکر، فلسفی اور مبلغ کہتے ہیں ان ہی لوگوں کا دعویٰ ہے کہ علامہ کی عظمت ان کی شاعری میں نہیں، پیام میں ہے۔ ان بزرگواروں نے دوسرا مغالطہ یہ پیدا کیا اور برابر اس کا پرچار کرتے رہتے ہیں کہ فکر اور شعر دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ پھر جب علامہ نے کہا ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

تو یہی اصحاب اس شعر کا یہ مفہوم پیش کرنے لگے کہ طاؤس و رباب دراصل موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ کے مترادف ہیں اور جس قوم میں موسیقی یا طاؤس و رباب کا چرچا ہو گا بس اس قوم کا خاتمہ یقینی جانو۔

حقیقت اسکے بالکل برعکس ہے۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو شمشیر و سناں کا زمانہ کسی قوم کے عروج کا زمانہ نہیں تھا عروج تو شمشیر و سناں کے عہد کے بعد شروع ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ بھی یہی بتاتا ہے۔ بغداد میں عباسیوں کی سلطنت، اسپین میں امویوں کی سلطنت اور اس برصغیر میں مغلیہ سلطنت کی تاریخ اس نظریئے کی تائید کرتی ہے۔ بابر اور ہمایوں کا دور حکومت شمشیر و سناں کا زمانہ تھا۔ اکبر اور شاہجہاں کا عہد شعر و ادب موسیقی اور دوسرے فنون کے عروج کا عہد تھا اسی طرح ہارون الرشید، مامون الرشید اور خلیفہ عبدالرحمٰن کا زمانہ بھی ادب اور فنون کی ترقی کا زمانہ تھا۔

ہماری تاریخ میں بابر، ہمایوں، طارق بن زیاد اور خالد بن ولید بلاشبہ بڑے نام ہیں۔ بہت بڑے نام — ان سب

نے عظیم کارنامے انجام دیتے ہیں لیکن ان کا زمانہ اسلامی تہذیب کے عروج کا زمانہ نہیں تھا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ تمدنی اور تہذیبی ترقی کے لئے امن وسکون اور معاشرے کا ٹھہراؤ لازمی شرط ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب تہذیبیں انحطاط پذیر ہوتی ہیں اور معاشرے میں سنجیدہ غور وفکر کے بجائے فرار اور لذتیت کے رجحانات پیدا ہوتے ہیں تو اس سے شعر وادب اور فن وہنر سب ہی متاثر ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ طاؤس ورباب سے علامہ نے موسیقی اور فن وہنر کا استعارہ نہیں کیا تھا بلکہ انحطاط پذیر رجحانات مراد لئے تھے۔ طاؤس ورباب کو علامہ نے علامت کے طور پر استعمال کیا ہے ہمارے ہاں ایک ایسا طبقۂ فکر موجود ہے جو خالص سیاسی مقصد کے لئے فن وہنر اور شعر وادب کو اس لئے ملعون گردانتا ہے کہ ان ہی ذرائع سے لوگوں کے ذہن جلا پاتے ہیں اور وہ سنجیدہ غور وفکر کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اس طبقۂ فکر کا مطمع نظر یہ ہے کہ ان کی بالادستی اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے کہ لوگوں کو ہمیشہ اندھیرے اور جہالت میں رکھا جائے اور ان کے ذہن میں روشنی کی کوئی شعاع پھوٹنے نہ پائے۔

مولانا حالیؔ کے زمانے میں ایک عنصر یہ بھی تھا کہ انگریز ہندی مسلمانوں کو ان کے علمی، ادبی اور ثقافتی ورثے سے بدظن کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے منظم طور سے یہ تبلیغ کی کہ تمہارے شعر وادب میں خرافات کے علاوہ کچھ نہیں رکھا ہے۔ اگر تمہیں علم سیکھنا ہے تو ہماری پیروی کرو اور ہمارے ادبی نظریات اور اقدار کو اپناؤ۔ اس میں اس حد تک صداقت بھی تھی کہ مسلمانوں نے عباسیوں کے بعد شعر وادب اور فنون میں تو بڑا کمال حاصل کیا۔ مگر سائنسی علوم سے منہ پھیر لیا۔ مشرق میں سائنسی علوم کا جو نکتہ زوال تھا وہیں سے یورپ میں علوم وسائنس کے احیاء کا دور شروع ہوا۔ یہی دور برصغیر میں سلطنت مغلیہ کے آغاز کا دور ہے۔ مغلوں کی بھی سب سے بڑی کوتاہی یہی تھی کہ انھوں نے اس جانب کوئی توجہ نہیں کی، حالانکہ اگر تہذیبی اور معاشرتی اعتبار سے دیکھا جائے تو مغلیہ دور مغرب سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ جب حکومت کو زوال ہوا تو اس کی کوتاہی کی ذمہ داری شاعروں اور فن کاروں پر ڈال دی گئی۔ شعر وادب کے خلاف تعصب کچھ تو انگریزوں کا پیدا کردہ تھا اور کچھ اس وجہ سے تھا کہ بعض نو عمر لوگ انگریزوں کے ان ہتھکنڈوں سے متاثر ہوگئے۔

شاعر اور ادیب اجتماعی حالات سے متاثر بھی ہوتا ہے اور متاثر بھی کرتا ہے۔ بڑے شاعر صحیح تجزیہ کر کے معاشرے کی رہنمائی کرتے ہیں۔ چھوٹے شاعر یا ادیب یا فنکار اس انحطاط کی لپیٹ میں آ کر اسے اور ہوا دیتے ہیں۔ چونکہ بڑے شاعر خال خال پیدا ہوتے ہیں اور گھٹیا شاعروں کے غول کے غول پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے کم سمجھ لوگ اچھی شاعری کو شعر کا نمونہ ٹھہرانے کے بجائے اس گھٹیا شاعر سے شاعری کا اندازہ لگاتے

## عقلمندی

چینیوں نے کہا کہ تعمیرات میں نقش ونگاری کے ہم ماہر ہیں۔ رومیوں نے کہا ہم زیادہ شان وشوکت والا نقش ونگار بناتے ہیں۔ بادشاہ وقت نے کہا اچھا ہم تم دونوں کا امتحان لیتے ہیں۔ اہل چین نے بادشاہ سے کہا کہ ہم کو ایک گھر نقش ونگار بنانے کے لئے دے دیا جائے۔ اور اسکو پردہ سے مخفی کر دیا جائے۔ تاکہ اہل روم ہماری نقل نہ کر سکیں۔ ان شرائط پر انھوں نے پردے کے اندر نقاشی کا بہترین و بے نظیر کام دکھایا۔

اہل روم نے کہا ہم ٹھیک اسی منقش گھر کے سامنے جو اہل چین بنا رہے ہیں دوسرا گھر نقش ونگار والا بناتے ہیں تاکہ آپ اس تقابل سے فیصلہ کر سکیں کہ کون بہتر ہے اہل روم نے بھی پردے کے اندر مخفی کام شروع کیا مگر انھوں نے کوئی نقش نہ بنایا بس خوب صیقل وصفائی کرتے رہے یہاں تک کہ پورا گھر مثل آئینہ چمکنے لگا۔ بوقت امتحان اور مقابلہ جب درمیان سے پردہ ہٹایا گیا تو اہل چین کے تمام نقش ونگار کا عکس رومیوں کے بنائے ہوئے گھر پر اس طرح پڑا کہ وہ زیادہ خوبصورت معلوم ہوا

جگن ناتھ آزاد (جموں)

# اقبال اور جدید فکرِ مغرب (بیکن لاک اور کانٹ)

یہ یورپی فکر کی ابتدا بیکن سے ہوتی ہے جس نے استقرائی منطق کی صورت میں جادۂ فلسفہ پہ پہلی شمع جلائی یہاں **جلا** اس نکتے کو زیرِ بحث لانے سے منطق کا استنباطی پہلو استقرائی پہلو کا تضاد نہیں ہے، بات اصل مقصد سے پرے نکل جائے گی۔ سردست فکر و نظر کے اس قافلے کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جس کے نقوش راہ اقبال کے سامنے موجود تھے بیکن کے بعد آنے والوں مثلاً ڈیکارٹ، اسپینوزا لیبنز اور اکثر دوسروں نے اسی منطق ہی کو سب کچھ سمجھا۔ اِن تمام فلسفیوں کے نظریات سے اقبال جس حد تک متاثر ہوئے وہ آئینے کی طرح روشن ہے اور کلامِ اقبال کے ہر دور میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ "پیامِ مشرق" میں جو "دیوان شاعر المانوی گوئٹے" کے جواب میں لکھا گیا "نقشِ فرنگ" کے عنوان سے پورا ایک باب موجود ہے۔ اس کی پہلی نظم "پیام" میں اقبال کہتے ہیں:

ازمن اے بادِ صبا گوئے بہ دانائے فرنگ
عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق را ایں بہ جگر می زند آں رام کند
عقل از عقلِ فسوں پیشہ جگر دار تر است

عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری
عجب این است کہ بیمار تو بیمار تر است

وہ جو اقبال نے ۱۹۲۸ء[1] میں لکھا تھا کہ ہمارے سامنے واحد راستہ یہی ہے کہ ہم علوم جدیدہ کی جانب ایک مودبانہ اور آزادانہ رویہ اختیار کریں اس کی ایک روشن مثال یہ نظم ہے۔ منطق ہو یا دلیل، محبت ہو یا علت ان کا ذکر ان الفاظ میں کرنے کے بعد

حکمت و فلسفہ کاریست کہ پایانش نیست
سیلی عشق و محبت بہ دبستانش نیست

اقبال عقل کے ان کمالات کا ذکر بھی ضروری سمجھتے ہیں جن کی بدولت یورپ کا چہرہ دمک رہا ہے ع

"کیمیا سازیِ او ریگ رواں راز کرد"

صرف ایک خوبصورت مصرعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس انداز فکر کا ایک فنکارانہ بیان ہے کہ "کہیں ہم یورپی تہذیب کی گہرائی تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام نہ رہ جائیں۔" عقل کی اس کیمیا سازی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ

"بردلِ سوختہ اکسیر محبت کم زد"

اور اقبال نے اسی دوسرے پہلو سے انسان کے دل و دماغ کو بچانے کی کوشش کی ہے۔

بیکن کے بعد ڈیکارٹ، اسپینوزا، لیبنز اور اکثر دوسرے فلسفی اپنے نہاں خانۂ افکار میں براہین کی شمعیں جلاتے رہے۔ زندگی کے تجربے، قلبی واردات اور وجدان کے لئے ان نگار خانوں میں کوئی جگہ نہ تھی۔ ان کی آواز بڑی حد تک افلاطون کی صدائے بازگشت تھی اقبال نے جن کی حیثیت ہمارے ادب میں عشق و وجدان کے پیغمبر کی ہے اپنے کلام میں براہین کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کیا لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے انسان کی منتہائے مقصود بھی قرار نہیں دیا۔ یوں تو عقل کی محدود پرواز کا ذکر کلامِ اقبال میں قدم قدم پہ آیا ہے مثلاً:

[1] یہ کتاب Reconstruction of Religious Thought in Islam ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی لیکن جن لیکچروں پر یہ کتاب مشتمل ہے وہ علامہ نے ۱۹۲۸ء میں مدراس میں دیئے تھے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم
دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

لیکن "گلشن راز جدید" میں ہمیں بیکن کا خاص طور سے ذکر نظر آتا ہے جہاں اقبال نے عقل کے کارناموں کے ساتھ عقل کی مجبوریوں پر بھی روشنی ڈالی ہے

زمانے با ارسطو آشنا باش — دمے با سازِ بیکن ہم نوا باش
ولیکن از مقامِ شاں گذر کن — مشو گم اندریں منزل سفر کن
بہ آں عقلے کہ داند بیش و کم را — شناسد اندرونِ کان و یم را
جہان چند و چوں زیرِ نگیں کن — بہ گردوں ماہ و پرویں را کمیں کن
ولیکن حکمتِ دیگر بیاموز — رہاں خود را ازیں مکرِ شب و روز

یہی وہ حکمت دیگر ہے جس میں "تجلیات کلیم" بھی پنہاں ہیں اور "مشاہداتِ حکیم" بھی ورنہ خرد کے حدود اقبال کے نزدیک وہی ہیں جو اس رباعی میں[1] بیان کئے گئے ہیں

خرد سے راہرو روشن بصر ہے — خرد کیا ہے چراغ رہ گزر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا — چراغ رہ گزر کو کیا خبر ہے

یورپ میں دلائل و براہین کے اس دور کے بعد لاک کا زمانہ آیا۔ لاک نے مادے کو منبعِ کل قرار دیا ہے۔ اقبال کے نزدیک لاک کا نظریہ ایک لالۂ تہی جام ہے۔ برکلے نے مادے کو نفس ہی کی ایک دوسری صورت کہا۔ اس کے نزدیک کائنات کی حقیقت یہی جوہر ہے۔ مادہ بھی اُسی کی ایک شکل ہے۔ ہیوم نے نفس کی اہمیت سے قطعی انکار کیا اور اس نظریے کے ساتھ یورپی فلسفہ ایک ایسے مقام پر آگیا جس کے سامنے مسدود راستوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

کانٹ[2] کے فکر و نظر نے اس جمود کی گرہ کشائی کی۔ کانٹ عصر حاضر کا پہلا بڑا فلسفی ہے جس کے قد و قامت پر سقراط، افلاطون اور ارسطو کے قد و قامت کا گمان ہوتا ہے۔ اس نے لاک اور فلسفے کے انگریزی اسکول کے اس نظریے کا انتقادی تجزیہ کیا اور اس کی تغلیط کی کہ قوتِ مدرکہ ہی تمام علوم کی بنیاد ہے ہیوم اس خیال میں تھا کہ اس نے روح کے وجود سے انکار کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہے اور اس نظریے کی بنیادیں پختہ کر دی ہیں کہ ہمارے حواس ہی تمام علوم کی بنیاد ہیں۔ کانٹ نے

**علم**

ایک دانا نے برائے امتحان کسی سے کہا کہ ہندوستان میں ایک درخت ایسا ہے جو اس کا میوہ کھا لیتا ہے کبھی نہیں مرتا۔ اس خبر کو جب بادشاہ نے سنا تو وہ اس درخت کا عاشق و دیوانہ ہوگیا اور فوراً ایک قاصد اس درخت کی تلاش کے لئے ہندوستان بھیجا۔ یہ قاصد سالہاسال ہندوستان کے اطراف و جوانب میں سرگرداں پھرتا رہا مگر کہیں ایسا درخت نہ ملا۔ جس سے بھی دریافت کیا لوگ اس کو جواب دیتے کہ ایسے درخت کو صرف پاگل اور دیوانے تلاش کرتے ہیں۔ جب وہ قاصد غریب الوطنی اور سیاحت کی مشقتوں سے عاجز اور درماندہ ہوا تو نامراد اور مایوس ہوکر واپسی کا عزم کیا۔ بوقت واپسی راستے میں اسے ایک قطب شیخ ملے۔ یہ شخص شیخ کے پاس باچشم تر حاضر ہوا اور از اول تا آخر ماجرا بیان کیا۔ قاصد کی گفتگو سن کر شیخ ہنسا اور اس نے کہا اے سلیم یہ درخت صرف علم کی نعمت ہے علم سے انسان دائمی زندگی پاتا ہے اور بے علم آدمی مردہ ہوتا ہے۔

---

[1] بعض حضرات اس صنف سخن کو رباعی نہیں مانتے۔ اسے قطعہ کہتے ہیں لیکن اکثر اساتذہ کی تقلید میں جو اسے بحر ہزج ہی کے ایک اصناف کی وجہ سے رباعی کہتے ہیں میں بھی اسے رباعی ہی مانتا ہوں۔ (حاشیہ ۲ اگلے صفحہ پر)

اسے خشت اول کی کجی قرار دیا اور کہا کہ یہ ضروری نہیں کہ مطلق اور قائم بالذات حقیقت کا عرفان ہمیں سائنسی (علمی) تجربے یا حواس کی مدد سے حاصل ہو۔ حقیقت ہر حال میں حقیقت رہے گی خواہ ہمارا ادراک وہاں تک پہنچ سکے یا نہ پہنچ سکے۔ کانٹ کے نزدیک انسان کا نفس کوئی کوری مومی تختی نہیں ہے جس پر انسان کا حواس یا سائنسی (علمی) تجربہ جو چاہے لکھتا چلا جائے نہ ہی یہ ذہنی کیفیات کے ایک سلسلے کا منتزع یا مجرد نام ہے بلکہ شخصیت کا ایک فعال حصہ ہے جو احساس کو افکار میں تبدیل کرتا ہے، ان میں ایک ربط پیدا کرتا ہے اور مختلف تجربوں کو ایک مسلسل خیال کی صورت دیتا ہے۔ انسان کانٹ کے نزدیک کسی مقصد کا ذریعہ بن کر دنیا میں نہیں آیا بلکہ خود مقصودِ کل ہے اور اسی لئے اشرف المخلوق بن کر رہے۔

اقبال نے شروع میں کانٹ کے اس نظریے کو جس طرح قبول کیا اس کی نمایاں تصویر "پیام مشرق" میں موجود ہے ذات کا نظریہ بیان کرتے وقت جہاں اقبال نے یہ کہا تھا

ساغرش را سحر از بادۂ خورشید افروخت
ورنہ در محفلِ گل لالہ تہی جام آمد[1]

وہاں اسی دور میں کانٹ کے نظریے کو اِن الفاظ میں بیان کیا

فطرتش ذوقِ مئے آئینہ فامے آورد
از شبستانِ ازل کوکب جامے آورد[2]

کانٹ کی تصنیف "تنقید عقل محض" کا ذکر کرتے ہوئے اقبال "اسلام میں افکار الٰہیہ کی تشکیل جدید" میں لکھتے ہیں:

"اُس کی تصنیف "تنقید عقلِ محض" نے پرواز دلیل کی محدودیت کو بخوبی واضح کیا ہے اور استدلال پسندوں کے سارے کام کو ملیامیٹ کر دیا ہے۔ اسے (کانٹ کو) صحیح طور پر خدا کی طرف سے ملک کو بہترین تحفہ کہا گیا ہے۔"

کانٹ کے اس نظریے کے ساتھ کہ خودی کی بنیاد یقین ہے نہ کہ برہان اور علوم باطنی کی کنجی باطنی تجربہ ہے نہ کہ علمی تجربہ اقبال کلی طور پر متفق ہیں لیکن اِس حقیقت کو بھی ہمیں فراموش نہ کرنا چاہئے کہ رومی کانٹ کی پیدائش سے سیکڑوں سال پہلے کہہ چکے تھے۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

یہاں کانٹ اور اقبال کا تقابلی مطالعہ مقصود نہیں لیکن یہ کہنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اقبال کانٹ کے ساتھ بہت دور تک نہیں چلتے۔ کانٹ کی نظر میں انسان کی خود مختاری اور حیاتِ ابدی نظامِ کائنات کے انصاف کی دلیلیں ہیں لیکن اقبال کے نزدیک

## نیا ریکارڈ

گراموفون پر ایک نیا ریکارڈ لگاتے ہی لڑکی فرطِ انبساط سے جھوم اٹھی "کتنا شاندار ہے پاپا۔ ہے نہ؟" اس نے پاس بیٹھے اپنے باپ سے پوچھا "کبھی آپ نے ایسی چیز سنی تھی؟"
"نہیں بالکل اسی جیسی تو نہیں"۔ باپ نے جواب دیا۔ "مگر ہاں اس سے بہت ملتی جلتی آواز ضرور سنی تھی — ایک بار جب خالی ڈبوں سے بھری ٹرک سنور سے لدی ٹرک سے ٹکرا گئی تھی۔"

---

[2] (گذشتہ صفحہ کا) امینوئل کانٹ، جرمن فلسفی (۱۷۲۴ — ۱۸۰۴)
ڈاکٹر سید عابد حسین نے کانٹ کی معرکہ آرا تصنیف Critique of pure Reason کا ترجمہ اردو میں "تنقید عقلِ محض" کے نام سے کیا ہے۔

[1] ساغر یا جام کنایہ ہے ذہن انسانی (mind) سے۔ سحر کنایہ ہے حواسِ خمسہ سے۔ بادۂ خورشید کنایہ ہے اُن مشاہدات یا تجارب کا جو بذریعہ حواسِ خمسہ حاصل ہوتے ہیں۔ محفلِ گل کنایہ ہے کائنات سے۔ لالہ کنایہ ہے انسان سے۔ تہی جام کنایہ ہے اس نظریے سے کہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو اس کا ذہن لوح سادہ کی طرح سے صاف ہوتا ہے (یوسف سلیم چشتی)

[2] ذوق، مئے آئینہ فام کنایہ ہے جذبۂ تحقیق حق یا جذبۂ خدا پرستی سے۔ کوکب جام کنایہ ہے ضمیر کی آواز یا حاسۂ اخلاق سے (یوسف سلیم چشتی)

## بڑا آرٹسٹ

آرٹسٹ نے اپنے مکان مالک سے کہا "کچھ سالوں بعد لوگ اس مکان کو دیکھیں گے اور کہیں گے کہ کسی زمانے میں جان آرٹسٹ یہاں رہتا تھا۔"

مکان مالک نے بُرا سا منہ بنایا بولا۔ "اگر شام تک کرایہ نہ ملا تو لوگ کل صبح ہی ایسا کہنے لگیں گے۔"

یہ دونوں انسان کی اپنی جہد کے انعامات ہیں۔ کانٹ فرد کو ذات او خود قرار دیتا ہے۔ اقبال فرد کی جہد میں تپی ہوئی شخصیت کو۔ اقبال کے یہاں شخصیت کا تصور اس کے اہم ترین تصورات میں سے ہے۔ اصل میں اقبال کا سارا فلسفہ خودی شخصیت کے ارتقاء کے گرد گھومتا ہے۔

شاخِ نہال سدرہ خار و خس چمن مشو
منکرِ او اگر شدی منکرِ خویشتن مشو

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ۔۔۔ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

زہرہ و ماہ و مشتری از تو رقیب یک دگر
از پئے یک نگاہ تو کشمکش تجلیات!

کافر بیدار دل پیش صنم ۔۔۔ بہ ز دیں دارے کہ خفت اندر حرم

تو فروزندہ تر از مہر منیر آمدہ ای
آں چناں زی کہ بہ ہر ذرہ رسانی پرتو

تو کیستی ز کجائی کہ آسمانِ کبود ۔۔۔ ہزار چشم بہ راہِ تو از ستارہ کشود

اور ویسے بھی کانٹ کے نظریات کو اقبال نے جوں کا توں قبول نہیں کیا۔ کانٹ ایک ماہر مابعد الطبیعات تھا۔ اقبال کے یہاں مابعد الطبیعاتی افکار اس کے جہد و عمل کی تعلیم میں ایک ذہنی پس منظر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں بنیادی اہمیت جہد و عمل کی ہے شعر اقبال کا طرۂ امتیاز نظریاتی فلسفہ نہیں بلکہ عملی فلسفہ ہے۔ مثال کے طور پر خودی ہی کو لیجئے۔ اقبال سے قبل خودی محض ایک فلسفیانہ تصور تھا۔ اقبال نے اس میں عمل کا مفہوم شامل کیا اور ۱۹۱۳ء میں اپنی پہلی تصنیف "اسرار خودی" اسی موضوع پر پیش کی

اقبال پر کانٹ کے اثر کا ذکر ختم کرنے سے پہلے اقبال کا یہ شعر پیش کرنا چاہتا ہوں

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمن است
کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بودہ است

یہ کہنا تو دشوار ہے کہ یہ شعر کانٹ ہی کے افکار کا پرتو ہے لیکن کانٹ نے اپنی کتاب "آسمانوں کے مسائل" میں یہ کہا ہے کہ تمام ستارے یا تو آباد رہ چکے ہیں یا ایک نہ ایک دن آباد ہو جائیں گے۔

(یہ مقالہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی کتاب "اقبال اور مغربی مفکرین" کا ایک باب ہے جو ترمیم اور اضافے کے ساتھ عنقریب مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔)

سید عبدالباری (سلطان پور)

# نیا افسانہ — منظر و پس منظر

لوگوں کا خیال ہے کہ جدید افسانہ نے جدید دور کے انسان کے المیہ کو دیگر اصناف ادب کے مقابلہ میں زیادہ کامیابی کیساتھ پیش کیا ہے اور وہ اپنے تمام ترفنی و تکنیکی انحرافات کے باوجود افسانہ قرار دئے جانے کا مستحق ہے بلکہ ماضی کے مقابلہ میں زیادہ بہتر زیادہ کامیاب اور موجودہ حالات کے مناظر میں زیادہ کارآمد اور تاثیر انگیز ہے۔ اس نے انسان کے داخل کی پیچیدہ گتھیوں کو پیش کرنے اور اس کے نفسیاتی معرکوں کو صفحہ قرطاس تک منتقل کرنے میں زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دیگر اصناف ادب کے مقابلہ میں زیادہ پڑھا اور لکھا جارہا ہے اس کے برعکس کچھ لوگوں کی یہ رائے ہے کہ افسانہ شاعری کے مقابلہ میں اس عہد کے آشوب اور کرب کو زیادہ دیانت داری اور زیادہ شدت و وضاحت کیساتھ نہیں پیش کرسکا ہے اس لئے کہ اس میں بیانیہ (Narration) کی نزاکتیں اور ماجرا کو پیش کرنے کی دقتیں، فنکار کو خود سے ہم کلام ہونے، اپنی روح سے سرگوشیاں کرنے اور اپنے اعلیٰ تخیلی تجربات کو بے لیت و لعل پیش کرنے سے محروم کردیتی ہیں۔ کچھ لوگ تو جدید افسانہ کو سرے سے افسانہ قرار دینے پر آمادہ نہیں اور اسکی فنی دست درازیوں پر چیں بجبیں ہیں ان کے خیال میں نیا افسانہ قاری کی عدم شمولیت کی بنا پر ہوا میں چلائے جانے والے تیروں کی مانند ہے۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک لکھے گئے جدید افسانوں کے طومار میں بقول قمر احسن کوئی افسانہ ایسا نہیں جو یاد رکھنے کے لائق اور قابل قدر ہو۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اس عہد میں افسانوی تجربات کیلئے کوئی اصول وضبط و نظم یا قانون نہیں تھا۔ بلکہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ اپنے اہضوات کو نام تجربہ منوانے پر تلا ہوا تھا۔ اس عہد کے افسانوں کے اندر مطالعہ کی کشش (Readability) کا فقدان تھا۔ وہ اپنے قاری کے ذوق اور اسکی فہم کے لئے اجنبی بن گیا۔ بلکہ ان کے خیال کے مطابق تو اس نراجی دور میں بہت سے ادیب زبان اور اس کے قواعد و لزوم سے بھی نابلد تھے جسکی وجہ سے ان کی اکثر تخلیقات فضول و بے معنی تھیں۔

جدید افسانہ کے بارے میں ان متضاد تاثرات کی روشنی میں جب ہم اس پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ان خیالات میں کسی نہ کسی پہلو سے صداقت کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ جدید افسانہ نے پلاٹ و کردار محل وقوع، انسانی فطرت کی معنی خیز نقش گری اور حقیقت نگاری، کے تقاضوں کو فراموش کرکے بلکہ بسا اوقات ان کے بارے میں معاندانہ روش اختیار کرکے اپنے لئے سنگین مسائل پیدا کرلئے۔ دراصل انھوں نے دانستہ یا نادانستہ اسی پہلو پر غور کرنے سے گریز کیا کہ کسی ماجرا یا صورت حال کی ایجاد اور کچھ کرداروں کو منظر عام پر لائے بغیر کسی نقطۂ نظر یا (Theme) کو اگر بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سعی کو کیا افسانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ افسانہ کی تشکیل جن بنیادی عناصر سے ہوتی ہے اگر وہ یک قلم موقوف کردیئے جائیں تو کیا ضروری ہے کہ ہم اپنی کاوش کو افسانہ ہی کا نام دیں۔ اسکو انشائیہ تاثراتی خاکہ ادب پارہ یا فلمی فیچر کہہ کر بھی دنیائے ادب سے اپنا لوہا منوا سکتے ہیں۔ آخر یورپ میں لوگوں نے اینٹی اسٹوری کے عنوان سے اپنی آزاد خرامی کے لئے جواز پیدا کیا۔ ایک خلاق تخیل کی تگ و تاز اور رفعت پرواز کے لئے اس کائنات میں بڑی وسعت موجود ہے کیا ضروری ہے کہ ہم اپنی محشر خرامی کو خرام ناز اور صحرانوردی کو گلگشت چمن قرار دیں۔ نثر میں شاعری اور شاعری میں نثاری لوگ آج بھی و فور شوق سے کررہے ہیں۔ مگر افسانے میں شاعری کرنے سے کئی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ افسانے کا آرٹ شاعری کے برعکس وضاحت اور تفصیل کا آرٹ ہے۔ اس میں نہ تو فلسفیانہ سنجیدگی سے بات بنتی ہے، نہ مجذوبانہ رمزیت اور شاعرانہ ایہام

اور پرواز تخیل سے کام چلتا ہے۔ افسانے کے بجائے ناول میں قسمت آزمائی کی جائے تو اس طرح کے رنگارنگ ذوق کی تسکین کے اچھے خاصے مواقع ہوتے ہیں اس لئے کہ اسکا کینوس کافی کشادہ ہوتا ہے۔ افسانے کی تنگ دامانی اسطرح کی مستانہ روی کی متحمل نہیں ہو پاتی۔ پھر جدید افسانہ نگاروں کو اس نزاکت کا احساس نہ تھا ورنہ وہ اپنی دست درازیوں کے لیے اسی صنف کا انتخاب نہ کرتے اور اپنی پرواز تخیل کیلئے کسی اور میدان کا رُخ کرتے لیکن میکدۂ ادب کے ذوق نیم رس رکھنے والے یہ نو گرفتار وارث علوی کے الفاظ میں فقط اپنی خفت مٹانے اور شاعر وفلسفی کے بیچ میں بحیثیت فنکار اپنا مقام بنانے کیلئے دنیائے ادب میں داخل ہوگئے اور اپنی کاوشوں کو علامات اساطیر اور تجریدیت کا مغلوبہ بنا کر اپنے علامتی نظم یا تجریدی تصویر کا ہم پایہ سمجھنے اور خوش ہونے لگے۔

اس میں شک نہیں کہ ادب و فن کی دنیا میں کسی ایک صنف ادب میں قدیم سانچوں سے چمٹنا اور نئے تجربات سے منہ موڑنا ایک باشعور فنکار کیلئے تباہی کی علامت ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا شرر نے جس انداز سے ناول نگاری کی اگر ہم آج بھی اسی کو اختیار کریں تو وہ اسطرح بے ہنگم محسوس ہوگا جیسے اس عہد میں کوئی واجد علی شاہ کے عہد کا لباس زیب تن کرکے منظر عام پر آجائے۔ شاہ حاتم، آبرو یا استاد نصیر کے لہجے یا عالم میں اگر کوئی غزل سرا ہو تو آج بے سرا سمجھا جائے گا اسی طرح افسانہ بھی آج وہ نہیں رہ سکتا جو پریم چند کے عہد میں تھا۔ اس لئے کہ گذشتہ پچاس سال میں دنیا کیا سے کیا ہوگئی ہے اور انسانی زندگی کی پیچیدگیاں اور اس کے مسائل کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ کوئی بھی ہیئت اور اسکی تکنیک اگر وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں تو ایک شاخ بے ثمر بن کر اپنی اہمیت وافادیت کھو دیتی ہے۔ تراش وخراش اور حذف واضافہ فطرت کے اندر بھی جاری ہے اور انسانی تمدن اور اس کے فنون لطیفہ میں بھی یہ عمل ہر دور میں کارفرما رہا ہے۔ مگر حذف واضافہ ایسا نہ ہو کہ شیروانی کو بنیان یا پاجامہ کو جانگھیا میں تبدیل کردے۔

جدیدیت کے علمبرداروں اور جدید تر جدیدیت کے دعویداروں نے ترقی پسند افسانہ نگاروں کے تجربات سے انحراف کو اپنے لئے لازمی قرار دیکر دراصل ایک نہایت خاردار وادی میں قدم رکھ دیا، لیکن آبلہ پائی، عرق ریزی اور خون فشانی کے دکھ جھیلنے کی وہ صلاحیت انہیں ناپید تھی جو گذشتہ نسل کا خاکہ تھی۔ افسانہ نگاری یا فکشن کے بنیادی ڈھانچے کی شکست وریخت سے انھوں نے ایسی بے ہنگم تخلیقات کو زیب قرطاس بنایا جنھیں سمجھنے سمجھانے کے لیئے ان کو مستقل طور پر جدید نقادوں کی ایک ٹولی کی بھی ضرورت پیش آئی جو انکی تخلیقات کی پالکی اٹھائے ہٹو بچو کی صدائیں بلند کرتے ہوئے ان کے آگے پیچھے نظر آتے ہیں۔

بیسویں صدی کی چھٹی ساتویں اور آٹھویں دہائی میں دنیائے ادب میں ایسی آندھیاں چلیں کہ اسلوب وتکنیک اور آرٹ وفن کی طنابیں ٹوٹنے لگیں۔ ہمارے افسانہ نگار عصری حسیت تاریخی اور شہری تمدن کی ستم رانیوں سے مجروح ومتاثر ہوکر جب کہانی بیان کرنے چلے تو انسانی زندگی کے کسی ایک واقع پر اپنی نگاہ مرتکز کرنے اور اسکی ابتدا وانتہا کو سمیٹنے کو اپنے قلم کے لئے باعث ننگ سمجھنے لگے۔ انشائیہ ادب لطیف اور نثری شاعری کا وہ ریلا آیا کہ افسانہ نگار بھی اس میں بہنے لگے۔ ماضی کے تجربات غیر ضروری قرار پائے، روایت سامانِ وحشت بن گئی۔ لیکن یہ بھی ستم ظریفی ہے کہ ان فنکاروں نے ماضی کے تجربات سے اس وحشت ونفرت کے باوجود اپنا افسانوی مواد ماضی کی اساطیر سے اخذ کرنے میں بڑی فراخدلی کا ثبوت دیا۔

انکسار ایک اچھے فنکار کی شخصیت کا لازمی عنصر ہے جو اسکی انانیت کے سرکش رہوار کے لئے لگام کا کام کرتا ہے اور شخصیت کے اندر توازن برقرار رکھتا ہے۔ اسکی مدد سے انسان اپنے سے چھوٹوں کو حقیر سمجھنے اور اپنے سے بڑوں کی خوشامد کے مرض اور Snobbery کی علت سے محفوظ رہتا ہے۔ ہماری جدید نسلوں کا تخیل اس لنگر سے محروم ہے، اور جدید افسانوں کا خالق بھی اس محرومی سے کسی سے پیچھے نہیں۔ اسے وہ اپنی محرومی نہیں بلکہ دور جدید کا فیضان تصور کرتا ہے کہ اسکی بدولت ان کو اپنے باپ کی مردہ لاش ڈھونے سے نجات حاصل ہوگئی۔ ان کے خیال میں زمانہ ہر آن متغیر ہے اور ان تغیرات کے ساتھ انسان کے داخل کی کائنات بھی گوناگوں انقلابات سے دوچار ہے۔ ایسی صورت حال میں ایک فرد کے لئے یہ زیبا نہیں کہ وہ روشنی

وحرارت کے لئے ماضی کی روایات کی راکھ کریدتا رہے۔ انکسار سے محرومی نے ہمارے جدید فنکار کا رشتہ ماضی سے توڑ دیا۔ شکست و ریخت کو اس نے اپنا شعار بنا لیا اور اپنے تجربات کے لئے کسی ضابطہ کا پابند نہیں رہا۔ اس نے ماضی پر حقارت کے ساتھ نگاہ ڈالی اور اپنے تہذیبی و فکری ورثہ کو دریا برد کر دینے کے لائق قرار دیا۔ اس نفسیات نے اس سے وہ حیرت انگیز اور عجوبۂ روزگار کارنامے انجام دلائے جنہیں صفحۂ قرطاس پر دیکھئے تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی طلسمات کی سیر کر رہے ہیں جہاں ہر شئے ناقابلِ فہم ہے اور جہاں ہر ذی روح مبتلائے وحشت ہے۔

اسلوب و ہیئت پہ تیشہ زنی کے ساتھ نظریہ کو بھی جدید افسانہ نگاروں نے ترقی پسندوں کی ضد میں ایک شجرِ ممنوعہ سمجھ لیا یہ بات برایا شگون بگاڑنے کے شوق میں خود اپنی ناک کاٹنے کے مصداق تھی اس لئے کہ نظریہ کی گرمی کے بغیر انسانی مشاہدات کی حیثیت خس و خاشاک کے بکھرے ہوئے ڈھیر کی مانند ہے جس میں کوئی نظم، کوئی ترتیب اور کوئی مرکزیت نہیں۔ عقیدہ انسان کی فطرتِ معصوم کی شیرازہ بندی کرتا ہے اور اسے استحکام عطا کرتا ہے۔ مگر خانہ براندازان مغرب کے طفیل اسے ایک کابوسی قرار دیا گیا جو لوگوں کو بے وجہ خوف و دہشت کی نفسیات میں مبتلا کر دیتا ہے۔ انسان کے داخل کو منور کرنے کے لئے عقیدہ سے بہتر کوئی قندیل نہیں اور داخل کی تاریکی نے موجودہ انسان کو ان پستیوں تک پہنچا دیا ہے جن کا رونا ہم سب رو رہے ہیں۔ داخل کے کھوکھلے پن، بے حسی، ٹھنڈک اور یبوست پر جدید فنکار بھی ماتم کناں ہیں۔ مقصدیت اور افادیت کو ہم معنی قرار دینا در اصل مقصدیت کو رسوا کرنے کی ایک شعوری کوشش ہے۔ افادیت کا تصور خالص تاجرانہ ہے اور مادہ پرستوں کے ذہن کی ایجاد ہے۔ مقصدیت کبھی اس کی غلام نہیں ہو سکتی۔ افادیت پرستی کا مرض یورپ کے مادہ پرستانہ تمدن سے شروع ہوا لیکن اس نے خطرناک نوعیت اس وقت اختیار کر لی جب معاشی مساوات کے علمبرداروں نے اخلاقی اقدار کو اضافی قرار دیا اور وسائل کے حسن و قبح سے بے نیاز ہو کر فرد کی مادی بہبود پر نگاہیں جمالیں۔ جدید فنکاروں نے افادیت پرستی کے ساتھ مقصدیت کو قابلِ گردن زدنی قرار دے کر انصاف نوازی اور حقیقت پسندی کا ثبوت نہیں دیا۔

جدید اہلِ قلم غیر مشروط اور غیر پابند زندگی گزارنے کے آرزو مند ہیں۔ ان کے خیال میں کسی طرح کی پابندی یا شرط انسانی ذہن کے لئے سمِ قاتل ثابت ہوتی ہے۔ مشروط پابندی کی وہ شکلیں جو اشتراکی نظام نے اہلِ قلم پر عائد کی ہیں یقیناً انسان کو ایک بے روح پیکر بنا دیتی ہیں۔ فنکار کو سیاسی مقاصد یا چند سماجی اغراض کیلئے استعمال کرنا یقیناً ایک ناپسندیدہ بات ہے لیکن فنکار کے اندر تخلیقی درد اور خلوص کے بغیر کیسے کوئی اچھی تخلیق عالمِ ظہور میں آسکتی ہے اور یہ تخلیقی درد فرد و معاشرہ کے بارے میں فنکار کی لاتعلقی سے کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ ایک نارمل انسان نظریاتی شعور یا فکری بالیدگی کے بغیر ایک نارمل تخلیقی عمل سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ یہ عالمِ آب و گل اور یہ بزمِ کائنات ہم کو خود بخود نظریاتی سانچے میں ڈھال دیتی ہے حسن و قبح کا تصادم اور خیر و شر کی کشمکش ہمیں ایک نقطۂ نظر کے قریب آپ سے آپ پہنچا دیتی ہے۔ اس نارمل طریق سے ہٹنے کے بعد دوسرا راستہ ہذیان گوئی کا رہ جاتا ہے جیسا کہ غالب کا خیال ہے ؎

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

بصیرت و دانائی کی ہر انجمن کسی نہ کسی نظریہ کے چراغوں سے منور ہے۔ یہ کائنات اس روشنی کے بغیر معمہ بن جائے اور انسان کو اپنے سفر کا آغاز پھر وہیں سے کرنا پڑے جہاں آغازِ تمدن کے وقت تھا۔ نظریہ فنکار کو ترتیب کا سلیقہ عطا کرتا ہے اور زندگی کے حقائق کی معنی خیز اور با مقصد ترتیب ہی ایک اچھی تخلیق کی ضامن ہوتی ہے۔ اگر ترتیب کی کوئی غایت نہ ہو اور مشاہدات یوں ہی بکھیر دیئے جائیں جیسے کیلیوڈسکوپ میں رنگین شیشوں کے ٹکڑے بکھرے ہوتے ہیں تو پھر کسی تخلیق میں کسی باشعور انسان کے لئے دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہو سکتا۔

یہ سچ ہے کہ یہ دور نظریاتی کشاکش کا دور ہے اور نظریات سیاسی حرص و آز کی تکمیل اور ہوسِ اقتدار کی آسودگی کا حربہ

بنا لئے گئے ہیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اس دور کے آشوب و آلام میں نظریات کی تہہ بالی کو خاصا دخل ہے۔ انسانی وجود کو زہر آلود نظریات نے داغ داغ بنا دیا ہے۔ اسکی خلوتوں کا سکون اور اس کے داخل کا اجالا چھین لیا ہے لیکن اس کائنات میں زہر کے ساتھ امرت بھی موجود ہے نظریہ کی پرکھ اور اس کا حقیقی ادراک ہو تو یہ زخموں کا مرہم بن جاتا ہے۔ اگر انسان کے ضمیر کی آواز اور اس کے خلوص کی حرارت باقی ہے تو پھر اچھے برے کی تمیز مشکل نہیں۔ حسن و خیر کو شر و بدی سے آسانی سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہماری موجودہ نسلیں سہل انگاری اور پست ہمتی کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتی ہیں۔ چنانچہ نظریات سے کنارہ کشی ( Non alignment ) کو وجہ عافیت قرار دیا جا رہا ہے۔ نظریاتی وابستگی کو نشانۂ ملامت بنانے والے ہماری گذشتہ ۲ دہائیوں میں کثیر تعداد میں مختلف آلات حرب و ضرب سے مسلح ہو کر سامنے آئے اور اقدار و روایات کی قدیم عمارتوں کو منہدم کرنے لگے۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ ان کے پاس کوئی نقشۂ تعمیر نہ تھا اور اس بھیڑ میں جو آرٹ و فن کے لئے نظریہ کو مضر قرار دیتی تھی اور الفاظ کے شعبدوں سے دل بہلاتی تھی، اشتراکی و غیر اشتراکی سبھی شریک تھے۔ ان کے پاس غلط نظریات پر لعنت و ملامت کے لئے تیز و تند الفاظ تو تھے لیکن اچھے برے کی کوئی پرکھ نہ تھی۔

غرض نظریہ سے محرومی نے اسی عہد کے افسانوں کو مجموعہ اضداد بنا دیا۔ افسانہ فقط واقعات کو بیان کرنے کرداروں کا سراپا کھینچ دینے اور جزئیات نگاری کرنے کا نام نہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ واقعہ کردار اور فضا تینوں باہم مل کر ایک گہرا تاثر دماغ پر مترتب کریں۔ یہ تاثر ہمیں صرف حیرت میں نہ ڈال دے بلکہ ہمارے ذہن کی گتھیوں کو بھی سلجھائے اور ہماری روح کی کثافت کو دور کرے۔ افسانے میں جو واقعہ بیان کیا جا رہا ہے اس کے خام مواد کا انتخاب افسانہ نگار کے لئے سخت آزمائش کا مرحلہ ہوتا ہے۔ آج کے اعصاب شکن دور میں ایک فنکار سے یہ توقع کرنا کہ وہ بہت زیادہ نارمل انسانی ردعمل کی تصویر کشی کرے مناسب نہیں۔ کوئی بھی حساس فنکار اس عہد کے تصادم و بحران سے الگ نہیں رہ سکتا اور اگر الگ ہٹا ہے تو اس کی تخلیق اس عہد کے انسان کی سچی تصویر کشی نہ کر سکے گی انسانی جذبات کی گہرائیوں میں اترنا اور احساسات کی ہر لرزش پر نگاہ رکھنا افسانہ نگار کی اولین ذمہ داری ہے۔ فقط چونکا دینے والی باتیں اور قاری کو حیران و ششدر بنا دینے والی سیچویشن پیدا کر دینا افسانہ کی معراج نہیں۔ ایک بالغ النظر فنکار ہمارے جذبات کی گہرائیوں میں اترتا ہے اور ہمارے تجربات و مشاہدات کی معنی خیز توضیح کرتا ہے۔ پلاٹ اگر چست و گٹھیلا نہیں اور واقعات کو اسباب و علل کے رشتے سے مربوط کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے تو افسانہ بے کیف ہو جاتا ہے لیکن یہاں چستی سے مراد یہ نہیں کہ افسانہ میں کردار نگاری اور واقعہ نگاری کی راہیں مسدود کر دی جائیں۔ پلاٹ میں اتنی لچک بھی ضروری ہے کہ ان تفصیلات کی گنجائش باقی رہے جن سے ہم کرداروں کے چہرے پہچان سکیں اور ہماری تمدنی بصیرت میں اضافہ ہو سکے۔ موجودہ دور کی زندگی میں خواہ وہ شہروں کی ہو یا دیہاتوں کی اسقدر رنگا رنگی پیچیدگی اور الجھاؤ آگیا ہے کہ افسانہ نگار کا کام اتنا آسان نہیں رہا جتنا کہ اس صدی کے آغاز میں تھا۔ آج کے انسان کو ہر آن صدہا نفسیاتی، معاشرتی اور اخلاقی معرکوں کا سامنا ہے۔ آج کے انسان کے پاس تفریح کے لئے بھی وقت نہیں رہا۔ جب جسم سرتاپا آبلہ ہی آبلہ ہو تو آخر حنا بندی کس چیز کی ہوگی ایسے انسان کو آئینہ دکھانا بڑا سنگین اور بڑا نازک کام ہے۔ بہت سے جدید افسانہ نگار پلاٹ کے فطری ارتقاء کو نظر انداز کر کے اپنے افسانوں میں نکتہ آفرینی کا جوہر دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ افسانہ کو کسی واردات یا واقعہ سے شروع ہو کر فطری انداز سے تناور درخت بننا چاہئے۔ افسانہ کی عمارت اگر مصنوعی انداز سے کسی ایک تصور یا ایک خیال پر اٹھا دی جاتے تو وہ پائیدار نہ ہوگی۔ ایسے افسانہ نگاروں کی کاوشیں وارث علوی کے الفاظ میں یوں محسوس ہوتی ہیں جیسے ایک پورا درخت بیج پر نصب کر دیا گیا ہو۔ افسانہ کے لئے کسی واقعہ یا واردات کے انتخاب میں افسانہ نگاری کی فکری بالیدگی، تہذیبی شعور اور حیات و کائنات کے بارے میں نقطۂ نظر اہم رول ادا کرتا ہے۔ سطحی ذہن و دماغ کے لوگ ایسے ایسے لطیفوں کو افسانہ بنانے کی کوشش کرتے

ہیں کہ قاری کا تحمل جواب دیدیتا ہے۔ الفاظ کی فضول ترجیح کسی خفیف مہمل اور پیچ پوچ واقعہ کو معنی خیز نہیں بنا سکتی۔ ایسے افسانے جن میں کینوس تو بہت بڑا ہے مگر تصویر ندارد ہے نہایت مصنوعی محسوس ہوتے ہیں کیونکہ قاری محسوس کرتا ہے کہ ایک معمولی بات کہنے کے لئے غیر ضروری واقعات اور تفصیلات کا خواہ مخواہ طومار باندھ دیا گیا ہے۔

ایک اچھا افسانہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ اس کا معاشرتی شعور پختہ اور ماحول کا مطالعہ وسیع ہو۔ وہ جس طبقہ کے احوال پر روشنی ڈالے اس سے اچھی طرح واقف ہو۔ معاشرہ میں مقبول و معروف اقدارِ حیات اور تہذیبی آداب سے بھی واقف ہو۔ کسی ایک طبقہ یا گروہ کی تنقیص کو اپنا مستقل شعار نہ بنائے۔ اسے بحیثیت مجموعی انسان میں دلچسپی ہو۔ انسان کے رنج و الم خوشی و غم کے لازوال تسلسل اور اس کے اندر برپا خیر و شر کی دائمی کشمکش پر اس کی نگاہ ہو۔ وہ انسان پر مختلف لیبل لگا کر اور ان کو مختلف طبقات اور گروہوں میں تقسیم کر کے اپنے مطالعہ کا موضوع نہ بنائے بلکہ اس کو ایک ناقابل تقسیم اکائی تصور کرے۔ ہمارے جدید افسانہ نگاروں میں یہ خوش آئند بات سامنے آتی ہے کہ ان کے اندر انسان سے دلچسپی تمام دیگر دلچسپیوں سے شدید اور توانا ہے۔ وہ انسان کے درد کو ذاتی درد بنانے کی طرف مائل ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس درد کا مداوا ڈھونڈنے سے ان کو دلچسپی نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ درد کا بانٹ لینا ہی درد کا مداوا ہو سکتا ہے مگر اس کے لئے بھی رشک و حسد اور ہر طرح کے تعصبات سے بالاتر ہونے اور انسانی مساوات و اخوت کے کچھ عالمگیر اصولوں کی روشنی میں ہمیں اپنے نفس کا تزکیہ کرنا ہوگا تبھی ہم ہر انسان کو سینے سے لگانے کے لئے جس گداز قلب اور جس بے کراں عشق کی ضرورت ہے اپنے اندر پیدا کر سکیں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارا جدید فنکار اپنے جذبات کے تزکیہ کے لئے تیار نہیں۔ وہ اپنے ذہن کی خلوتوں میں کسی اور کو جگہ دینے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے دل کے نہاں خانے سرد ہیں چنانچہ وہ اس گداز سے محروم ہے جو اس کی تخلیقات کو ان رفعتوں سے ہمکنار کرے جو ادب کی تاریخ میں یادگار فن پاروں کو حاصل رہی ہیں۔

ایک اچھے افسانہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اسمیں کوئی مرکزی خیال، کوئی مدعا اور کوئی خیال ( Motto ) ابھر کر سامنے آئے۔ تاکہ قاری بھرپور تاثر لیکر افسانہ کے اختتام تک پہونچے۔ فنکار کا ذہن اگر فقط کیمرہ کی مانند ہے جو تصویریں اتارتا چلا جارہا ہے تو اس کی تخلیق بھی کاغذ کا پھول بن کر رہ جائے گی جس میں خوشبو اور اہتزاز کی کیفیت نہ ہوگی، ایک افسانہ میں اگر خیال کی مختلف لہریں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہیں اور کوئی مرکزی تاثر قائم نہ ہو تو ہمارے خیال میں یہ افسانہ کی ناکامی ہے۔ ایڈگر ایلن پو نے سچ لکھا ہے کہ ایک مشاق فنکار جب پورے سوچ بچار کے بعد ایک ایسے بے نظیر لفظ واحد تاثر کا تصور کر لیتا ہے جسے وہ افسانہ میں ڈھالنا چاہتا ہے تو پھر وہ ایسی کہانیاں ایجاد کرتا ہے۔ ایسے واقعات کو سلسلے میں پروتا ہے جو اس تاثر کی پیش کش میں بہترین طور پر معاون ہو سکتے ہیں۔ پوری تحریر میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں لکھا جاتا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کا جزو نہ بن سکے۔" غرض افسانے میں بیانات کو بے داغ طور پر پیش کرنے اور اسکو ہر طرح کی دخل در معقولات سے محفوظ رکھنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ جدید افسانوں میں یہ کمی شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے کہ وہ کسی مرکزی نقطۂ خیال پر مرتکز ہونے کے بجائے ایک الجھی ہوئی ڈور کی مانند ہوتے ہیں جسکا کوئی سرا نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جدید افسانہ اس صدی کی آٹھویں دہائی میں آکر معنویت و توازن کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب زندگی کے بارے میں ایک تصور اور ایک نقطۂ نظر کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ ہمارے نئے افسانہ نگاروں میں اب علمی انکسار کی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ اب وہ نظریاتی وابستگی سے زیادہ متوحش نہیں بلکہ نظر کی زندگی میں کسی نہ کسی سطح پر ضرورت محسوس کرنے لگے ہیں۔ عتیق احمد صاحب "معیار" دہلی میں "آٹھویں دہائی کے اردو افسانے کا کردار" کے عنوان کے تحت رقمطراز ہیں "یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہمارا علم اشیاء کے چند پہلوؤں تک ہی محدود ہوتا ہے اور ہم کبھی مکمل شے کے عرفان اور تفہیم کے دعویدار نہیں ہو سکتے یہاں اور اکر کی سطحوں کا امتیاز اور اشیاء کا حقیقت کے داخلی

تنوع اور تضاد کا پہلو واضح ہے۔ نئے افسانہ نگاروں کے یہاں مسائل کی تفہیم کی نوعیت بھی اسی لئے مختلف ہے اور آگہی کی شکلوں میں بھی تضاد ہے۔ سماجی فرد کی انا کو مختلف نہجوں پر جن چیلنجوں کا سامنا ہے اور جن اذیت ناک آہنگیوں کے مابین انکی بصیرت صدموں سے دوچار ہے اس نسل نے اپنے فن میں اسی کو موضوع بنایا ہے۔ نظریاتی وابستگی نہیں زندگی کا ایک خاص تصور، ایک خاص فہم اور ایک خاص نقطۂ نظر اس کی پہچان میں ضرور شامل ہے" حقیقت سے وابستگی سید محمد اشرف، سلام بن رزاق، رضوان احمد، حسین الحق، ساجد رشید، حمید سہروردی، سجاد عزیز عشرت ظہیر اور مہدی ٹونکی کے افسانوں میں ملتی ہے۔ اس سے قبل چھٹی وساتویں دہائی میں اردو افسانہ زبردست انتشار کی زد میں تھا اور طرح طرح کے تجربات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ بقول عتیق احمد ان دنوں زبان کی منطق اور واقعات کے پابند سلسلے کے بجائے ذہن زندگی اور تاثرات کی کیفیت پر زیادہ توجہ دی گئی۔ بیان (Narration) سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور خالص تجریدی فضاؤں میں گھری ہوئی افسانوی اقلیم کا مشاہدہ کرایا گیا۔ جس میں زندہ اور محسوس کرداروں کا کہیں دور دور پتہ نہیں۔ اس دور کے افسانوں میں عجیب مجہول ومدقوق چہرے سامنے آتے ہیں جنہیں اپنی ذات کا تو شدید احساس ہے لیکن وہ احساس زیاں سے دبے ہوتے اور نا طاقتی کے احساس سے لبریز ہیں۔ وہ ماحول سے علیحدہ رہنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ انھیں اپنے شکوک، اپنے اندیشوں اور اپنے خوف واضطرابات سے فرصت نہیں کہ کسی اور طرف سر اٹھا کر دیکھ سکیں چنانچہ سلام بن رزاق حسین الحق، مجید انور، مشتاق صدیقی وغیرہ کے افسانے اسکا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ یہ قطعیت سے گریزاں اور اخلاقی مقاصد سے متوحش نظر آتے ہیں۔ مشینی زندگی کی حشر سامانیوں کو غایت درجہ وحشت و بے ربطی کے ساتھ بیان کرنا ان کا شعار ہے۔ رشتوں کی پامالی اور اخلاقی قدروں کی ٹوٹ پھوٹ گذشتہ نسل سے بُعد کا شدید احساس، بے یقینی وبے اطمینانی کی کیفیات چھٹی وساتویں دہائی کے جدید افسانوں کے نمایاں اوصاف ہیں۔ اس دور کا فنکار انسان کی انفرادی واجتماعی انا کو ہر طرف مجروح ہوتا ہوا دیکھ رہا ہے اور یہی وجہ ہے وہ معاشرہ اور اسکے ضابطوں سے بیزار ہے۔ اُسے اس سے بحث نہیں کہ آخر وہ ماحول کیونکر وجود میں آسکتا ہے جس میں ہر شخص کی انا پوری طرح محفوظ و مامون رہے اور وہ اس پر بھی غور نہیں کرتے کہ ایک صحتمند انسان کی انا اور ایک مدقوق ومجہول انسان کی انا میں کیا فرق ہے۔ اپنی اس پریشان خیالی کے اظہار کے لئے اسی دور کے افسانہ نگاروں نے اردو افسانہ کے سکہ بند اسلوب وہیئت سے ہٹ کر تجریدی واستعاراتی تکنیک کے دامن میں پناہ لی۔ ان کے خیال میں قدیم تکنیک سرے سے افسانے کے لئے موزوں ہی نہیں بلکہ اس کی وجہ سے افسانہ کو شدید نقصانات پہنچے۔ چنانچہ قمر احسن لکھتے ہیں " اردو افسانہ کو سب سے زیادہ نقصان پریم چندجی نے پہنچایا۔ یہ تو خدا بھلا کرے منٹو کا۔ انہوں نے اس کیچڑ میں پھول کھلانے کی کوشش کی ورنہ منشی جی نے اردو افسانے کی تمام روایت کو اپنی آئیڈیالوجی اور سماجی روشن خیالی کی نذر کر دیا تھا" انھیں شکوہ ہے کہ منشی جی نے کہانی کو اپنی فطری معصومیت شعریت اور سادگی سے الگ کر کے نیک وبد کی آویزش کے جھگڑے میں پھنسا دیا۔ منٹو نفسیات کے جھگڑے میں پڑ گئے۔ اس کے بعد لوگ جیمس جوائس، ایڈ گرالین پو اور ورجینا وولف کو پڑھ کر اس کی نقالی کرتے رہے۔ ان کے خیال میں ترقی پسند افسانہ نگاروں نے آئیڈیالوجی کے چکر میں اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر دیا۔ ان کا خیال ہے کہ افسانہ ہو یا شاعری اس کا مقصد صرف مسرت، انبساط اور حیرت انگیز بہجت یا پُر اسرار کرب اور صدمہ سے قاری کو گذارنا ہے اور اپنے غیر محسوس وناقابل گرفت تجربہ میں قاری کو شریک کرنا ہے۔ شعر وافسانہ کے مقصد کو محدود کرنے کا یہ میلان جدید نقادوں اور فنکاروں میں عام طور سے پایا جاتا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسرت وبہجت کیا کوئی مجرد شے ہے جو فرد کے اخلاقی ومعاشرتی وجود کو نظر انداز کر کے اس کے لئے مہیا کی جاسکتی ہے۔ فرد کے فکری وذہنی وجود کو بالائے طاق رکھ کر صرف نشہ آور اشیا رقص وسرود کی بوچھار اور زندگی سے فرار حاصل کرنے والے دیگر اسباب عیش وعشرت کی

اس کے لئے کیف و انبساط کے ضامن بن سکتے ہیں۔ اگر نرد کے ذہنی فکری دھوکو فراموش نہیں کیا جائے گا تو لازماً اس سے تعلق رکھنے والے نزاعی مسائل کا سامنا کرنا ہوگا اور ان مسائل کی طرف ہم توجہ کریں گے تو لازماً آئیڈیالوجی اقدار اور نظریہ کی گفتگو آہی جائے گی۔ خواہ ہم ان سے دامن چھڑانے کے لئے ان مسائل کو صلواتیں سنائیں خواہ منشی پریم چند ترقی پسند اور تعمیر پسند اہلِ قلم کی طرح ان گتھیوں کو اپنی تخلیقات میں سلجھانے کی کوشش کریں۔ نظریاتی شعور کے بغیر کسی فنکار کی شخصیت میں وہ گداز پیدا ہی نہیں ہو سکتا جس سے اس کے تجربات و مشاہدات پگھل کر اس کی شخصیت کا جزو بن سکیں اور جب اظہار کی منزل میں آئیں تو خود اسکے دل کی آواز بن چکے ہیں۔ نہایت تجربات او مشاہدات کی شیرازہ بندی کے فنکار کے نظریاتی شعور کی محتاج ہے۔ اس کے بغیر اس کی ہر کوشش ابلاغ معنی اور ترتیب سے خالی ہو گی اور وہ اسی طرح اکھڑی اکھڑی باتیں کرے گا جیسا کہ بہت سے جدید فنکار شعر و افسانہ کی دنیا میں کرتے رہتے ہیں

۱۹۶۱ء کے بعد اردو افسانہ میں جو بے حساب تبدیلیاں رونما ہوئیں اس کے لئے کچھ لوگوں نے یہ تاویل کی ہے کہ اس زمانہ میں ہمارے علوم و تجربات کا نظر بے حد وسیع ہو گیا۔ زندگی، اس کے حقائق، اس کے تجربے، اس کی ولداری اسکی برکتیں اور اس کے المیے ہم پر پھٹ پڑے۔ حالانکہ یہ اس دور کے فنکاروں کی خوش فہمی ہے۔ انسان کے علم و تجربہ کو اس دور میں زبردست ناکامیوں اور نامرادیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے فکر و خیال کی دنیا تنگ سے تنگ تر ہوتی گئی۔ اس کو طرح طرح تعصبات اور تشنجات نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ مادیت کے شعبدوں سے اس کی آنکھوں کو چکا چوند بنا کر اس کے دامن میں اقدار و روایات کا جو سرمایہ تھا اس سے اس کو محروم بنا دیا گیا۔ یہ ہماری سب سے بڑی بدقسمتی تھی کہ ہم اپنے دور کو عقل و شعور کی معراج کا دور سمجھتے رہے اور ایسے افعال کے مرتکب ہوتے رہے جو قرونِ مظلمہ کے ذرند صفت انسانوں کا شعار تھا۔ علم و شعور کے اس پندار نے عہد جدید کے فنکاروں کو بہت سی خود فریبیوں میں مبتلا کیا۔ اظہار کے نئے اسالیب کی ایجاد کا شوق پیدا ہوا۔ اور قرۃ العین حسن کے الفاظ میں "ہم میں سے ہر شخص نے یہ فرض کر لیا کہ نئے دور کے نئے مسائل کا انکشاف صرف اسی پر ہوا لہذا جو انداز اظہار اس نے اختیار کر رہا ہوں وہی صحیح ہے جس کے نتیجے میں ہر شخص کی ذات پر میں ایک اسکول قائم ہو گیا اور آخر میں اردو افسانہ کی وہ شکل سامنے آئی جسے نہ تو غیر معتبر قاری ہضم کر سکا اور معتبر قاری قبول کر سکا" زندگی سے اس دور کے افسانہ نگاروں کے رشتے ٹوٹ گئے اور اظہار کے مروج پیمانوں کو اس نے یکسر نظر انداز کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں اس پر ہذیان گوئی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ افسانہ کی مقبولیت (Readability) ختم ہونے لگی۔ قاری اپنے عہد کے افسانہ نگاروں کے احساسات میں شریک نہ ہو سکا۔ اسلئے کہ خود افسانہ نگار نے اس کے احساسات کو یک لخت نظر انداز کر دیا۔ چنانچہ جدید افسانوں کی کھیپ کی کھیپ حشرات الارض کی طرح سامنے آگئی لیکن اردو افسانہ کی دنیا میں عام قاری کے نزدیک مقبولیت انھیں کو حاصل رہی جو پریم چند اور ترقی پسندوں کی روایت کے مطابق اپنے واضح خیالات کو عوام کے احساسات کا جزو بنا کر ابلاغ و اظہار کے معروف اسالیب کی پیروی کرتے ہوتے پیش کرتے رہے۔ میرا خیال ہے کہ چھٹی اور ساتویں دہائی میں بھی کرشن چندر، قرۃ العین اور بیدی کو لوگ ٹین راا اور سریندر پرکاش کے مقابلے میں زیادہ پڑھتے پڑھاتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عوام معمہ حل کرنے اور رموز و علائم کا بھید معلوم کرنے کے لئے افسانے نہیں پڑھتے بلکہ وہ اپنے خوابوں کی تعبیر ان میں ڈھونڈتے ہیں جدید معاقی افسانے بے سر پیر کے اور فکر و خیال کے اعتبار سے کھوکھلے تھے۔ چنانچہ جدید ادب اپنا کوئی قاری نہیں پیدا کر سکا۔ یہ لوگ کہتے رہے کہ ہم ابھی اول ادب کے دیگر فارموں میں تجربے کر رہے ہیں مگر ان تجربوں کو جب تک وہ کوئی خاص صورت و شکل حاصل کر لیں قاری کے سامنے لانے کی کیا ضرورت تھی۔ انکو کسی قاری کی ضرورت بھی نہ تھی۔ یہ خود ہی چھپاتے اور خود ہی پڑھتے پڑھاتے رہے۔ چنانچہ گزشتہ دو دہائیوں میں ان بوالعجبیوں نے اردو ادب کی مقبولیت کے دائرہ کو بڑھانے کے بجائے اسے اور محدود بنا دیا۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی ادبی تخلیق فکر و فن دونوں پہلوؤں سے بے سر پیر کی ہو اور سہوات کو تجربہ کے نام پر ادب قرار دیا جائے تو اس کی مقبولیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اسے بعض لوگ نراجی دور قرار دیتے

ہیں جس میں اردو زبان و ادب کو ناقابل تلافی نقصانات ہوئے۔

۱۹۶۰ء کے بعد ہمارے جدید افسانہ نگاروں نے اپنے قدم سنبھالنے کی کوشش کی اور کم از کم افسانہ کے بنیادی خدوخال اور اس کی حیثیت کی طرف واپس آنے لگے۔ وہ محسوس کرنے لگے کہ افسانے کے لئے کہانی پن ناگزیر ہے اور کسی واقعہ یا حادثہ کو عمومیت کے تناظر میں پیش کئے بغیر چارہ نہیں۔ اسکو فقط محدود معنی یا تناظر میں ممثل (Allegorised) کر دینے سے کام چلنے والا نہیں۔ اس کو فقط مجرد احساس یا واقعہ کو ہم کسی سماجی تناظر کا پیراہن عطا کئے بغیر دوسروں تک منتقل نہیں کر سکتے۔ آخر کچھ تو ہے جس کو آپ افسانہ یا افسانویت کی خاطر برقرار رکھیں گے۔ علامت و استعارہ کے کمالات دکھانے کے لئے شاعری کا میدان کافی وسیع ہے۔ افسانہ میں اس کی گنجائش کم ہے۔ واقعہ و ماجرا سے دامن کش ہو کر افسانہ کی شناوری کرنا ایسا ہی ہے جیسے ریت میں کشتی چلانا۔ پھر اس صحرا میں سراب کے علاوہ اور کچھ نہیں رہ جاتا۔ صد حیف ہماری نئی نسلوں کو اپنی روح کے کھوکھلے پن کا اس قدر شدید احساس ہے کہ وہ ادب کی اصناف کو بھی کھوکھلا بنا دینا چاہتے ہیں۔ کھوکھلے پن کی بقا اور اس کے قدم قدم پر اظہار سے ان کو بے پناہ دلچسپی ہے۔ اس معاملہ میں کن کن توہمات نے قدموں میں زنجیریں ڈال رکھی ہیں۔ نسلی خلیج (Generation Gap)، پابند و مشروط زندگی کا خوف، معاشرتی ذمہ داریوں سے دہشت، نظریہ کی چھان بین کی دردسری سے دور رہنے اور نظام اقدار کو کابوس سمجھنے کا رجحان کس کس طرح سدِ راہ بن رہا ہے۔

اطہر نیازی کا خیال درست ہے کہ "ہم نے ڈائیلاگ، مونولاگ سے کہانی بنی اور ہم نے آزاد تلازم کے ذریعہ لاشعور کی کہانی لکھی لیکن کوئی کہانی ایسی نہیں لکھی جس کے بارے میں اردو ادب یہ کہہ سکے کہ کہانی کی یہ تکنیک دنیا نے اردو ادب کو ہی نے دی ہے۔" اس اعتراف کے باوجود انکو یہ توقع ہے کہ اگلے دس سالوں میں اردو میں ایسی کہانیاں لکھی جائیں گی جو ورلڈ لٹریچر کو نئی جہت سے روشناس کرائیں گی اس لئے کہ ہم دکھ اور تضاد سے جنگ کر رہے ہیں۔ اسلئے مغرب کے مقابلے میں ہم زیادہ اسکی اہلیت رکھتے ہیں کہ اچھی تخلیق پیش کر سکیں۔"

لیکن مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا ہے کہ مغرب ہی کی طرح ہم صداقت کی تلاش، تضادات سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سعی اور انسان کے حقیقی دکھوں کے مداوا کے معاملہ میں مخلص نہیں محض مغرب کے نفاق کی نقالی اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں خواہ وہ اشتراکیت کا نفاق ہو یا سرمایہ داری کا۔

جدید فنکار اپنے ذہنی خلا کو پُر کرنے کے لئے اساطیر اور دیومالا کے تہ خانے میں بھی بار بار اترتا ہے اور جو کچھ ہاتھ لگ جاتا ہے اُسے باہر لا کر اس طرح پیش کرتا ہے جیسے اُسے کائنات کے کسی سربستہ راز کا پتہ لگ گیا ہو۔ اساطیر کی مدد سے موجودہ زندگی کے مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے اور تخلیق کے سربستہ رازوں کا پتہ چلانا چاہتا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ اس سے ان کے افسانوں میں تجسس و تحیر کی حرارت نظر آتی ہے اور عوام کے رومانی احساس کی تسکین کا ذریعہ پیدا ہوتا ہے اور افسانے سے عوام کے رشتے کی دوبارہ استواری کی امید پیدا ہوتی ہے۔ اساطیر کی طرف میلان سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ کائنات کی بے معنویت اور روح کے کھوکھلے پن کی باتیں اب اتنی گھِس پِٹ چکی ہیں کہ جدید فنکار ان سے چھٹکارا چاہتا ہے اور دور دراز ماضی کے تہہ خانوں میں جا کر پناہ لینا چاہتا ہے۔ یہاں یہ نفسیات بھی کام کر رہی ہے جو انگریزی ادب کے بعض رومانی شعراء کے یہاں کارفرما تھی یعنی سوفسطائی تمدن اور میکانکی تہذیب کے کرب سے نجات حاصل کرنا اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہم اپنے دلکش اور پُر اسرار ماضی کی طرف لوٹ آئیں۔ اس طرح جدید تمدن کی مضحکہ خیزی کو اچھی طرح نمایاں کیا جا سکتا ہے اور موجودہ دور کے انسان کے المیہ کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ دیومالا کے گلیاروں میں بھی اخلاقی قدروں کی شمعیں جھلملاتی نظر آتی ہیں اور وہاں بھی زندگی کے نظم و ترتیب کی طلب و تڑپ محسوس ہوتی ہے جس سے ہمارا جدید فنکار سخت متنفر ہے۔ اس وقت جوگیندر پال، انور عظیم، غلام حیدری، مظہر امین، انور سجاد، اقبال مجید، کمار پاشی، احمد ہمیش اور حمید سہروردی نیز اسطور سازی اور قدیم اساطیر کی بازیافت کے شغل میں منہمک ہیں بالخصوص اس صدی کے آٹھویں دہائی کے افسانوں میں تو اسی فنکی کی بہتات ہے۔ جدید تر کی قدیم تر سے یہ قربت ہمارے ادبی مطالعہ کا ایک دلچسپ موضوع ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ یہ شغل کب تک ہمارے افسانہ نگاروں کا ساتھ دیتا ہے

جدید افسانہ نگاروں کے افسانوی کردار بالعموم مخصوصاً ایسے انسان ہیں
جو زندگی کے حقائق سے شکست کھا کر موت و زندگی کے درمیان معلق ہیں اور
ایک بے حسی و از خود رفتگی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ مثلاً حمید سہروردی کا افسانہ
"نہیں کا سلسلہ ہاں سے" ایک بابا کے کردار پر مرکوز ہے جس نے لوگوں
سے بات چیت بند کر دی ہے۔ مصلی پر بیٹھے ہوئے تسبیح کے دانوں پر ہاتھ
پھیر رہا ہے اور گردن اٹھا کر رونا شروع کر دیتا ہے۔ اسکے اندر کی مایوسی
خود اس کے الفاظ میں اسکو کہیں دور لے جانا چاہتی ہے لیکن کہاں یہ
خود اسے معلوم نہیں۔ وہ جواب کی تلاش میں ہے۔ کوئی بات یا خیال واضح
نہیں۔ ایک موہوم سا خیال اسکی آنکھوں اور اس کے ذہن پر پوری طرح
مسلط ہے۔ اس کی بہو ایک خواب کا ذکر کرتی ہے "وہ کہتا ہے میں سب کچھ
سن رہا ہوں لیکن الفاظ میرا ساتھ نہیں دیتے۔" اس طرح کے ایک بابا کو
میں نے بچشم خود اپنے شہر میں کچھ عرصہ قبل دیکھا تھا جو زندگی کے
آخری ایام میں مکمل تنہائی چاہتے تھے۔ اور انسان کی صورت سے متوحش
ہوتے تھے۔ باہر کھلے سورج میں آنے اور انسانوں سے ملنے پر راضی
نہ ہوتے۔ ضعیفی و لاغری نے انکو معذور محض بنا دیا تھا۔ لیکن اس ایک
کردار کے علاوہ اور کہیں اس کا ثانی نہ ملا۔ اس کردار کے انتخاب میں
افسانہ نگار کا یہ ذوق صاف نظر آتا ہے کہ وہ غیر متوازن اور غیر نارمل
کرداروں کی تلاش کا شائق ہے۔ یہ مذاق جدید افسانہ نگاروں
کے یہاں عمومیت رکھتا ہے لیکن اس عہد میں کچھ ایسے بھی افسانے
لکھے گئے جو نارمل انسانوں کے درد کو کامیابی کے ساتھ پیش کرتے
ہیں۔ سریندر پرکاش اپنے افسانہ "بازگوئی" میں امرجنسی کے دور
کی چیرہ دستیوں کو نہایت تاثر انگیز علامتوں کی مدد سے بیان کرتے
ہیں۔ انسان کے ذہن و ضمیر اس عہد میں جو دست درازیاں کی گئیں وہ
بڑی خوبی سے افسانے کا موضوع بن گئی ہیں۔ بقول ڈاکٹر شمیم حنفی افسانہ
نگار نے ایک مستقل انسانی المیہ کے نشانات ڈھونڈ نکالے ہیں جو ہر
دور میں مشترک رہا ہے۔ اس میں داستان اور اساطیری اسلوب
کی جھلک بھی ہے اور کہانی پن بھی، کردار نگاری بھی ہے اور افسانہ
طرازی کے جملہ لوازم بھی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ظلم و جبر، فحاشی
اور آبرو باختگی کے المناک انجام اور اس سلسلے میں حیرت انگیز
قربانیاں پیش کرنے والوں کے کردار کی عظمت ہمارے سامنے نکھر کر آتی
ہے۔

مین را نے اپنی کہانیوں میں مرکزی نقطہ عام آدمیوں کو بنایا
ہے۔ جو بے نام بے نمود ہیبت زدہ اور ایک لامحدود خلا سے بھرا ہوا
ہے۔ مین را اپنے کرداروں کے ذریعہ ہماری یقینیات کی چٹانوں پر
ضرب لگاتا ہے اور لوگوں کو خوفزدہ کرتا ہے۔ یہ کردار اپنے داخلی
سناٹے اور تنہائی کے احساس سے ہم کو متوحش کرنا چاہتے ہیں۔ بقول
شمیم حنفی رفاقت کے اس مہک سے محروم ہیں جس کا سراغ ہمارے
ناولوں کے کرداروں میں ملتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح کا
کردار قاری سے ایک نجی رشتہ قائم کر سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں
کہ جس طرح کی ذہنی پیچیدگیوں میں مین را کے کردار مبتلا ہیں وہ اپنی تخیل
کہ دیگر قوی ذہنوں پر اپنا سکہ جما سکتے ہیں مگر ایسے پر اسرار اور پیچیدہ
افسانہ کے فن کو شخصی فن بنا دیں گے جس کے حوالے اجتماعی نہیں شخصی ہو
کر رہ جائیں گے اور جن کو معاشرہ کے خال خال افراد ہی سمجھ سکیں گے۔
مین را کو کردار نگاری، مختلف کیفیات کی تصویر کشی، مختلف احساسات
کی نقش گری پر زبردست قدرت ہے مگر اس کی پیچیدہ و استعاراتی
تحریر اور طویل مباحث اس کے افسانے کو چیستاں بنا دیتے ہیں۔
آپ خود غور کریں اسطرح کے جملے ہمارے اور آپ کے کس کام کے
"حقیقتیں اور خواب، روشنی اور اندھیرا، ماضی و حال سب پگھل
گئے پھر پگھلا ہوا مواد........" لیکن مین را جب "آخری کمپوزیشن"
پر ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے تو اس کے افسانے کی اجتماعی
معنویت ابھر آتی ہے اور وہ ہم سب لوگوں کے لئے یکساں طور پر دلکش
ہو جاتا ہے لیکن جب وہ نقطوں کا رزمیہ لکھنے لگتے ہیں تو غلام ثقلین
کے الفاظ میں یہ کیفیت ہوتی ہے "انور سجاد، بلراج مین را،
سریندر پرکاش، شمس نعمانی اور دوسرے بہت سے افسانہ نگاروں
کے افسانے پڑھ کر مجھے کسی ڈائجسٹ کی خواہش شدت کے ساتھ
محسوس ہوتی ہے تاکہ جو کچھ پڑھا ہے وہ ہضم ہو سکے ورنہ ڈرتا ہوں
کہ کہیں ادبی معدہ انتشار کا شکار نہ ہو جائے۔" (تجریدی افسانے)
لیکن جدید افسانہ نگاروں کا اعتدال پسند گروہ جو انتظار حسین

غیاث احمد گدی، عبداللہ حسین وغیرہ پر مشتمل ہے بقول ڈاکٹر احمد سجاد "اپنے گہرے علم وفن وتیکنکی مہارت سے مختلف قوموں، تہذیبوں، تاریخ مذاہب، اساطیر اور لوک کہانیوں اور داستانوں سے اپنے علائم اخذ کرتا ہے۔ انہیں اپنے احساسات وجذبات کی بھٹی میں تپاکر جب کہانوی انداز میں پیش کرتا ہے تو علامتوں کے ظاہری ابہام کے باوجود قاری ایسے افسانوں کو بڑھ کر الجھتا نہیں بلکہ جدت تہہ داری، معنویت اور فنی عظمت سے لطف اندوز ہوتا ہے"۔

آخر میں ہم یہ ضرور عرض کریں گے کہ جدید افسانہ بہرحال اس منزل کی طرف بڑھ رہا ہے جہاں وہ اس دور کے فرد وسماج کے تصادم وتضادات کو اس عہد کے انسان کی پیچیدہ شخصیت کو، اس کے عہد کے سنگین مسائل کو پیش کرنے کے لئے واحد موزوں ترین صنف ادب کی حیثیت سے سامنے آئے گا۔ اسمیں خیال وفکر کی صداقت، عصری حسیت، درد آدمیت کی جھلک پیدا ہورہی ہے۔ اس میں آپ بیتی کو جگ بیتی اور جگ بیتی کو آپ بیتی بنانے کا انداز نمایاں ہورہا ہے۔ آج کے بکھرے ہوئے انسانوں کے لمحاتی تجربوں کو نئی معنویت عطا کرنے اور کھوئے ہوئے رشتوں کو پھر سے دریافت کرنے کی طرف میلان پیدا ہو رہا ہے۔ یہ فنکار کی انفرادیت اور اس کے سماجی رشتوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ اب اُسے پھر ان صداقتوں کی تلاش ہے جنھیں انسانیت کے روشن ضمیر پیامبروں نے ماضی میں فرد ومعاشرہ کے فوز وفلاح کے لئے اور انسانی روح کی تسکین وتالیف کے لئے منکشف کیا تھا۔ آج انسان مشرق ومغرب اور قدیم وجدید کے جھگڑوں سے بالاتر ہوکر اور رجعت پسندی ونظریہ پرستی کے احمقانہ، بوسیدہ اور منافقانہ نعروں سے بے نیاز ہوکر اپنے مسائل کے حل کے لئے ابدی صداقتوں کی تلاش میں مصروف ہے۔ اپنی اس تلاش میں وہ جس قدر کامیاب ہوگا اسی حد تک اس کے ادب وفن کی دنیا تابناک ہوگی اور اس کی تخلیقات کی معنویت اور تاثر انگیزی میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ افسانہ جلد ہی قدیم وجدید کی آمیزش سے اپنے لئے ایک ایسا پیراہن تیار کر لے گا جو ابلاغ کا ایک مقبول ودلکش وسیلہ ثابت ہو اور اس عہد کے انسان کی پیچیدہ شخصیت کو پوری طرح واشگاف کر سکے۔ ساتھ ہی ہمارے تجربات ومشاہدات کو ہمارے لئے معنی خیز بناکر ہمارے ذہن کی گتھیوں کو سلجھا سکے اور ہمارے دکھ درد کو کم کرسکے ساتھ ہی ہمارے جذبات کا تزکیہ کرسکے۔

---

## داڑھی کیلئے: اجازت نامہ

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ حکومت کا کوئی ملازم اگر داڑھی رکھنا چاہے تو اسکی پیشگی اجازت لینے کے لئے باقاعدہ درخواست دینی پڑے کہ "عالیجاہ چونکہ فدوی کا داڑھی رکھنے کا ارادہ ہے اس لئے اجازت مرحمت فرمائی جائے"۔ گویا داڑھی نہ ہوئی اسلحہ ہوگیا جس کے لئے لائسنس ضروری ہے۔ مگر صاحبو شاہ ایران کے وقت میں یہ قانون بھی رائج تھا۔ وہاں حکومت وقت کے ملازمین کو اجازت حاصل کئے بغیر داڑھی رکھنے کی ممانعت تھی۔

("دیکھا ایران" ـــ افضل علوی)

## دعا کی درخواست

اڈیٹر گلبن ثریا ہاشمی کے برادر نسبتی جناب سید سعید احمد صاحب کراچی میں سخت علیل ہیں۔ قارئین گلبن سے درخواست ہے وہ موصوف کی صحت کے لئے اللہ رب العزت سے دعا فرمائیں۔

(ادارہ)

رحمت امروہوی (احمد آباد)

(یادِ رفتگاں)

# محمد نظیر نصیری

پورا نام محمد نظیر۔ نصیری تخلص چشتیہ سلسلے کے بادا نصیر الدین
صاحب کے مرید غالباً اسی وجہ سے نصیری تخلص اختیار کیا۔
شاعری میں شرفِ تلمذ کس سے حاصل تھا اس کا پتہ نہیں چل سکا
دلی ضلع فیض آباد قصبہ گوشائیں گنج ۱۹۴۷ء سے بہت قبل احمد آباد
میں سکونت اختیار کی تمام عمر مل میں کام کیا بیت المال احمد آباد
کے جنرل سکریٹری مسلم لیگ اور انجمن ترقی اردو احمد آباد
اور دیگر ادبی اداروں سے منسلک رہے

سر پر کالی مخمل کی ٹوپی سفید کوٹ سفید پاجامہ ہاتھ میں
چھڑی پان کے بہت شوقین گرمی ہو یا برسات انہی وضع قطع
کے ساتھ ہمیشہ بسر کی کبھی کبھی کاندھے پر رومال بھی ڈال لیا کرتے
تھے اردو فارسی عربی زبانوں پر عبور شعر اردو اور فارسی دونوں
زبانوں میں کہتے تھے مشاعروں میں اکثر تحت اللفظ میں پڑھتے فن
عروض پر دسترس اساتذۂ فارسی کے سیکڑوں اشعار ازبر تقریر
کے مرد میدان سیاسی مذہبی ادبی غرض کوئی اجتماع ہو بیتکان
بولتے تھے اور بات بات میں لطائف ہر مکتبِ خیال کے لوگ
نصیری صاحب کو بلاتے تھے اور لطف اندوز ہوتے تھے بوڑھا
یا بوڑھے بچوں میں بچے اور جوانوں کی محفل میں جوان یہ تھے
نصیری صاحب ہمیشہ ہنستے اور خوش مزاج رہنا ان کا معمول
تھا میں نے مشکل سے مشکل حالات میں بھی نصیری صاحب
کو کبیدہ خاطر نہیں دیکھا عمر طویل پائی میں نے انکو کبھی سائکل
رکشا پر سفر کرتے نہیں دیکھا۔ ہر جگہ پیدل ہی جاتے تھے بہت
دوری پر بس میں سفر کرتے تھے۔ زندہ دل اتنے کہ مشاعروں
نامانان مشاعروں میں نصیری صاحب کی موجودگی مشاعرے
کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی نوجوان شعرا کو بہت کھل کر
داد دیتے تھے بڑی فراخ دلی کے ساتھ انکی حوصلہ افزائی کرتے
تھے۔ علمِ طب کا بھی شوق تھا اس سلسلے میں کافی مطالعہ کیا اور
سند بھی حاصل کی لیکن باقاعدہ مطب نہیں کیا علمِ رمل میں
بھی دخل تھا ہمیشہ پیتل کا بنا ہوا ایک پانسہ اپنی جیب میں رکھتے
تھے اپنے حالات جاننے کے خواہش مند رہ پانسہ پھینکتے تھے اور
نصیری صاحب پانسہ پر بنی ہوئی اشکال سے زائچہ تیار کر کے۔
حال بتاتے جس سے حال پوچھنے والا شخص مطمئن ہو جاتا تھا
اور بطور چراغی کچھ نذرانہ بھی پیش کرتا تھا۔

ایک روز میں نے ازراہِ مذاق پوچھ لیا کہئے نصیری صاحب
آپ کے رمل کا کیا حال ہے آجکل کہنے لگے رحمت صاحب اللہ
کا شکر ہے بیس لاکھ کی بستی والے احمد آباد میں دو چار بیوقوف
روز آہی جاتے ہیں اور چراغی دے جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ کسی تقریب کے موقع پر نصیری صاحب نے
اپنے احباب کو ایک پارٹی دی غالباً یہ ۱۹۴۷ء سے قبل کی بات
ہے راقم الحروف بھی اس پارٹی میں شریک تھا یہ پارٹی دیکھنے
سے زیادہ تعلق رکھتی تھی دلی چکلہ کے ایک بہت بڑے مکان
میں اس پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا اس وقت ریفریجریٹر یا
فریج عام نہیں تھے موسم کے جتنے بھی پھل تھے برف کے کارخانے
میں بھیج کر برف کی سلوں میں پیوست کرا دیے گئے
تھے سلیں کافی بڑی سائز میں بنائی گئی تھیں آم تربوز۔
خربوزہ چیکو سیب سنترے کیلے، تمام برف کی سلوں کو
صاف اور شفاف دھو کر مکان کے چاروں طرف میزوں

پھلکوا اکر دیا گیا کچھ برف کی سلیں زمین پر بھی رکھی تھیں۔ ایک مزدور برف توڑنے پر معمور کیا گیا۔ برف کی سلوں میں منجمد پھل نکالے گئے اور انھیں دھوکر تشتریوں میں سجا کر میزوں پر لگا دیا گیا۔ مہمانوں سے کہا گیا کہ وہ خود ہی پھل تراشیں اور شوق فرمائیں۔ مہمانوں نے پھل کاٹے تو ضرور مگر کھانے کی ہمت کسی میں نہ ہوئی۔ پھل برف میں تبدیل ہو چکے تھے اور انھیں کھانا ناممکن ہو گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں سب لوگ ہاتھ چھوڑ کر بیٹھ گئے لیکن پارٹی کا منظر بہت اچھوتا اور سہانا تھا آخر میں خشک میووں پر پارٹی کا اختتام ہوا جو لوگ اس پارٹی میں شریک تھے انکے لئے یہ پارٹی ایک یادگار ثابت ہوئی

فخر گجرات، کلیم احمد آبادی، حزیں قریشی، عادل دہلوی، وحید بنارسی، مرزا کوثر بیگ انجم فوقی بدایونی یہ تمام لوگ نصیری صاحب کے ہمعصر شعرا تھے اساتذہ میں چشمک ہوتی رہتی جس میں نصیری صاحب پیش پیش رہتے اسی زمانے میں احمد آباد میں ایک فی البدیہہ مشاعرہ منعقد ہوا جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ کچھ اساتذہ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جس میں فخر گجرات اور انجم فوقی بدایونی کے شاگرد بہت زیادہ تھے مشاعرے میں یہ لوگ اپنے شاگردوں کے جم غفیر کے ساتھ شریک ہوتے تھے جس کی وجہ سے مشاعرے بہت دیر تک چلتے تھے اور جب اساتذہ کے پڑھنے کا موقع آتا تھا تو سامعین کافی تعداد میں رخصت ہو چکے ہوتے تھے اس صورتِ حال سے تنگ آکر جناب بشیر احمد زخمی نے فی البدیہہ مشاعرے کی تجویز رکھی اور طے یہ پایا کہ تمام لوگ اپنے شاگردوں کو لیکر آئیں اور جو شاعر ایک شعر بھی کہہ دیگا اسی شاعر کو آئندہ مشاعروں میں دعوت دی جائیگی مشاعرہ ہوا جس میں نصیری صاحب بھی شریک تھے

## مشورہ

ایک دولت مند محترمہ نے اپنی سہیلی کو مشورہ دیا

"بل کی ادائیگی مسکراہٹ سے کرو"

"میں خوشی سے کرتی" ـــــ سہیلی نے بڑی مایوسی سے کہا۔

"مگر کلرک نقد روپئے مانگتا ہے!"

تبسم مبارکپوری کامل امروہوی غرض اُس عہد کے تمام شعرا اس میں شریک تھے اساتذہ کو فی البدیہہ مشاعرے سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا پھر بھی سبھی لوگوں نے اشعار کہے اسکے بعد بزم خیال احمد آباد کا قیام عمل میں آیا۔

۱۹۵۲ء میں احمد آباد بیت المال آفس میں ایک بہت بڑی چوری کا واقعہ ظہور پزیر ہوا اس وقت نصیری صاحب بیت المال کے صدر یا جنرل سکریٹری تھے بہت ہی گرفتاریاں عمل میں آئیں اسٹاف کے لوگ بھی گرفتار ہوئے قریب ایک سال مقدمہ چلا نصیری صاحب باعزت بری کردئے گئے لیکن اس ایک سال کے عرصے میں نصیری صاحبؒ کو میں نے کبھی مایوس اور دلبرداشتہ نہیں پایا اپنی اسی وضع قطع کے ساتھ خوش وخرم رہتے تھے اور احباب سے برابر ملتے تھے انہیں دنوں احمد آباد میں ایک طرحی مشاعرہ ہوا قافیہ ورد یف کچھ اسطرح تھے "وطن میرے لئے"، "چمن میرے لئے" اسی مشاعرے میں نصیری صاحب یا انکے کسی دوست نے غزل پڑھی جس کا ایک مصرع ذہن میں محفوظ ہے "کس قدر منحوس تھا بادن کا سن میرے لئے" اور یہ مصرع اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے نصیری صاحب بہت ہی خوبیوں کے مالک اور باغ وبہار آدمی تھے ایسے لوگوں کی یاد آج بھی آتی ہے اور دل کو ستاتی ہے نصیری صاحب کے دو اشعار پیش خدمت ہیں

ہے نصیری کا مکاں کیسے کہا اے غالب
"کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد"

مخاطب ہو کے اردو کہہ رہی ہے یہ مخالف سے
انھیں بتیس دانتوں میں رہونگی میں زباں ہو کر

## ڈارلنگ

ٹیلیفون پر ـــــ ڈارلنگ، کیا آپ بول رہے ہیں؟
ہاں ـــ میں ہی بول رہا ہوں مگر آپ کون ہیں؟
ادھر سے آواز آئی

ضیاء الاسلام (الہ آباد)

ڈرامہ (بچوں کیلئے)

# سدابہار درخت

پردہ اٹھتا ہے

(تو ایک بوڑھا آدمی ایک چھوٹے بچے کو ساتھ لیکر کھرپی سے زمین کھود کھود کر قسم قسم کے پھلوں کے پودے لگا رہا ہے۔ بچہ پودے اٹھا اٹھا کر بوڑھے آدمی کو دیتا جا رہا ہے۔ اتنے میں ایک شاندار اور پرہیبت شخص ادھر سے گھوڑے پر گزرتا ہے اور بوڑھے آدمی کو پیڑ لگاتے دیکھ کر رک جاتا ہے پھر اس کے پاس آکر پوچھتا ہے)

**سوار:-** اس عمر میں آپ کس کے لئے یہ پودے لگا رہے ہیں۔ بڑے میاں؟ آخر یہ پیڑ کب لگیں گے، کب بڑے ہوں گے کب پھل لائیں گے، اور ان پھلوں کو کھانے کیلئے کون بیٹھا رہے گا؟

**بوڑھا آدمی:-** اسی لئے تو جلدی کر رہا ہوں جناب! اگر کہیں مرنے سے پہلے یہ کام ادھورا نہ رہ جائے۔

**سوار:-** آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

**بوڑھا آدمی:-** میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں جناب کہ آج تک اپنی زندگی میں جتنے پھل میں نے کھائے ہیں ان میں سے کوئی بھی پھل میرے لگائے ہوئے درخت کا نہیں تھا سب میرے بزرگوں کے لگائے ہوئے پیڑوں کے تھے۔ وہ سارے خوش ذائقہ، رسیلے، خوشبودار اور میٹھے پھل جو میرے نصیب میں آئے سب میرے اجداد کی محنت کا ثمر تھے۔

(بوڑھے آدمی کا جملہ پورا نہیں ہو پاتا کہ کچھ شاہی سپاہی داخل ہوتے ہیں، سوار کو دیکھتے ہوئے سب سپاہی ادب سے سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بوڑھا آدمی سمجھ جاتا ہے کہ سوار کوئی اور نہیں شہنشاہِ وقت ہے۔)

**بوڑھا آدمی:-** (بادشاہ سے مخاطب ہو کر) عالی جاہ! میں اس کام کو جلد سے جلد پورا کر لینا چاہتا ہوں کہ کہیں (بچے کی طرف اشارہ کر کے) یہ بچے بھوکے نہ رہ جائیں۔ اور آنے والی نسلیں مجھ سے حساب نہ مانگیں۔ یا حشر میں میرا دامن نہ پکڑیں۔

**بادشاہ:-** (خوش ہو کر) سبحان اللہ۔

(بادشاہ کے منہ سے سبحان اللہ نکلتے ہی ایک شاہی سپاہی سنہری چم چم چمکتی ہوئی اشرفیوں کا ایک تھال لاکر بوڑھے کو پیش کرتا ہے)

**سپاہی:-** عالی جاہ کی جانب سے ایک ہزار اشرفیوں کا یہ تحفہ قبول فرمایئے۔

(بوڑھا آدمی ادب سے جھک کر اشرفیاں لیتا ہے اور بے تعلقی سے بچے کی طرف بڑھا دیتا ہے۔ بچہ اشرفیوں کو پودوں کے قریب رکھ دیتا ہے)

**بوڑھا آدمی:-** حضور کا اقبال رہتی دنیا تک قائم رہے۔ ملاحظہ فرمایا جہاں پناہ نے؟ لوگ پیڑ لگاتے ہیں، پھر وہ پیڑ بڑے ہوتے ہیں۔ تب جاکر کہیں برسوں بعد پھل دیتے ہیں لیکن خدا کا کرم دیکھئے کہ یہ پیڑ ابھی لگ بھی نہیں پائے اور پھل دینے لگے۔

**بادشاہ:-** (اور زیادہ خوش ہو کر) سبحان اللہ۔ سبحان اللہ

(اشرفیوں کا دوسرا تھال بوڑھے کو پیش کیا جاتا ہے۔ بوڑھا اشرفیوں کو دیکھ کر مسکراتا ہے اور ادب سے اشرفیاں لیکر دوبارہ

بچّے کی طرف بڑھا دیتا ہے)

**بوڑھا آدمی:-** (بادشاہ سلامت سے مخاطب ہو کر) یہی غور فرمایا بادشاہ سلامت نے؟ کہ دنیا کے سارے پیڑ سال میں صرف ایک بار یا زیادہ سے زیادہ دو بار پھل دیتے ہیں مگر اللہ کی مہربانی دیکھئے کہ ان پیڑوں نے گھڑی بھر میں ہی مجھے دو بار پھل دے دیئے۔

عالی جاہ! نیکی اور خدمتِ خلق ایک ایسا سدا بہار درخت ہے جو ہر گھڑی ہر لمحہ پھل دیتا رہتا ہے جس کی خوشبو اور مٹھاس گاؤں گاؤں، شہر شہر، جنگل جنگل پھیلتی رہتی ہے

**بادشاہ:-** (بے اختیار ہو کر) بے شک، سبحان اللہ کیا عمدہ بات کہی ہے۔ ہم خوش ہوئے یہ جان کر کہ ہماری حکومت میں ایسے بزرگ، صاحب نظر، عقلمند اور دور اندیش انسان موجود ہیں۔

(اشرفیوں کا تیسرا تھال بوڑھے کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جسے لیکر وہ پھر بچے کی طرف بڑھا دیتا ہے۔)

**بادشاہ:-** (سپاہیوں سے مخاطب ہو کر) فرمان قلمبند کیا جائے۔

**ایک سپاہی:-** ارشاد ہو جہاں پناہ (لکھنے لگتا ہے)

**بادشاہ:-** جب تک یہ بزرگ انسان زندہ رہے، اسے شاہی خزانے سے ہر سال ایک ہزار اشرفیاں دی جاتی رہیں اور اس کی ہر طرح کی آسائش و آرام کا خیال رکھا جائے (یہ کہہ کر بادشاہ آگے بڑھتا ہے اور سپاہیوں کو حکم دیتا ہے) منزل کی طرف فوراً کوچ کیا جائے۔

(بادشاہ گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو جاتا ہے۔ پیچھے پیچھے سپاہی بھی چلے جاتے ہیں۔ اور بوڑھا کمر اپنے کر پھر پیڑ لگانے میں معروف ہو جاتا ہے کہ)

پردہ گر جاتا ہے۔

★

(مرکزی خیال ایک عربی کہانی سے ماخوذ)

ماجد الباقری (پاکستان) (بچوں کے لئے)

# برسات

چاروں طرف چھائے ہیں بادل
گھر گھر کر آئے ہیں بادل

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلی ہے
کھلی ہوئی ہر دل کی کلی ہے

کوئل کو کو بول رہی ہے
کانوں میں رس گھول رہی ہے

کہیں پپیہے کی تان سہانی
کر دیتی ہے دلوں کو پانی

گرج رہے ہیں بادل دھم دھم
برس رہی ہیں بوندیں چھم چھم

بھورے کھیت ہوئے ہیں دھانی
لگتی ہے ہر چیز سہانی

مور امنگوں پر ہیں آئے
ناچ رہے ہیں پر پھیلائے

اک مستی سی چھائی ہوئی ہے
رت متوالی آئی ہوئی ہے

ماجد یہ موسم ہے سہانا
اچھا اچھا پیارا پیارا

٭

بدیع الزماں خاور (دہلی) (بچوں کے لئے)

# مگر خریدوں کیسے؟

سوچ رہا ہوں آج خریدوں
اک اچھی سی گیند
اک لٹو
اک اچھا سا باجا
تھوڑی برفی
تھوڑے لڈو
اور تھوڑا سا کھاجا
سوچ رہا ہوں
آج خریدوں
مگر خریدوں کیسے؟
امی نے تو
مجھے دئے ہیں
آج بھی دس ہی پیسے !!

٭

# عکس ریز

(تبصرہ کے لئے کتاب کی دو جلد ادارہ کو بھیجیں ورنہ تبصرہ شائع نہ ہوگا۔) — "ادارہ"

آنکھیں ترستیاں ہیں ــــــــ جگن ناتھ آزاد

صفحات ۲۷۲، سائز ڈیمائی، قیمت چھتیس روپے

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹، گولا مارکٹ، دریا گنج، دہلی ۲

---

علم، تجربہ اور بصیرت کا نام جگن ناتھ آزاد ہے۔ آزاد ماہر اقبال ہیں، استاد شاعر ہیں، غضب کے لکھاڑ ہیں اور بے حد پیاری شخصیت کے مالک ہیں۔ میں ان سے کئی بار کی ملاقات کے بعد یہ تاثر قائم کرنے میں حق بجانب ہوں۔ یعنی محبت اور اپنائیت کا دوسرا نام جگن ناتھ آزاد ہے۔ میں ان کی شخصیت پر اس لئے زور دے رہا ہوں کہ "آنکھیں ترستیاں ہیں" شخصیت نگاری کی ایسی ہی کتاب ہے جس میں ہندو پاک کے چالیس پینتالیس برس کی تاریخ ادب کے نقوش قلمبند ہیں۔ آزاد اس کتاب میں اپنے احساس اور اپنی فکر کو اپنے اسلاف، اپنے دوستوں اور ہم عصروں کے روبرو کرکے دیکھتے ہیں۔ اس مجموعۂ مضامین میں وجودگی سرشاری کے ساتھ کئی پرکیف فضا بیدار نظر آتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ دکھوں، حسرتوں اور ناآسودگیوں کے عکس بھی لرزتے محسوس ہوتے ہیں لیکن اس دکھ میں ناقدری اور ناشناسی کی روش کا مظاہر نہیں ہے بلکہ اس میں عہد رفتہ کے دامن سے یادوں اور باتوں کی تازگی اور نرمی کا مخملیں لمس ہے۔ تاجور نجیب آبادی، تلوک چند محروم، صلاح الدین احمد، ابوالکلام آزاد، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، مولوی عبدالحق سے کرشن چندر اور نریش کمار شاد تک شخصیت اور فن کے تجزیوں کا سلسلہ دراصل معاشرتی تبدیلیوں پر مرکوز ہے۔ فنکار کی روح اپنے عہد کے بنیادی تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ اسی اندرونی آواز کو جگن ناتھ آزاد نے اپنے قلم کی آزادمنشی سے بھرپور طور پر گرفت میں لیا ہے۔ آزاد زندگی کی گہرائیوں کو سمجھنے کا تجربہ رکھتے ہیں اور چونکہ خود محبت اور خوبصورتی کی قدر کی نشانی ہیں اس لئے تہذیبی رشتوں کو جوڑنے اور سمیٹنے میں زندگی کا ایسا دریا پار کرتے نظر آتے ہیں جس کی ایک ایک لہر میں رنج کے سیلاب پوشیدہ ہیں لیکن وہ اپنے وجدان کے موسم میں رقص کرنا نہیں بھولتے۔ اور یہی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ تاجور نجیب آبادی، صلاح الدین احمد، ابوالکلام آزاد، عبدالمجید سالک، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، مولوی عبدالحق، شیخ سر عبدالقادر، سروجنی نائیڈو، عبدالقادر سروری، مہندر ناتھ، سلیمان ادیب، عرش ملسیانی، محمد دین تاثیر، درگا پرساد دھر، بینے بھائی، کرشن چندر، جاں نثار اختر، نریش کمار شاد، حسرت موہانی، پریم ناتھ در، رشید احمد صدیقی اور تلوک چند محروم پر یہ سوانحی خاکے بقول سلیم اختر وہ آئینے ہیں جن میں آزاد نے اپنی فطرت کے بہترین عناصر کی امداد سے اپنے دوستوں اور بزرگوں کی یادوں کے محبت بھرے مرقعے سجائے ہیں۔ یوں دیکھیں تو یہ تمام مضامین مل کر 'موزیک' کی صورت

اختیار کر کے خود مگن ناتھ آزاد کی شخصیت کے رنگ دکھاتے ہیں۔ وہ شخصیت جس کا سارا حسن اور رنگینی، محبت، خلوص، جذبات، لگن اور عجز و انکسار سے جنم لیتا ہے۔

"حرف اول" آزاد نے اور "مقدمہ" ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے۔ کتاب خوبصورت چھپی ہے، کاغذ عمدہ ہے۔!

"مناظر عاشق ہرگانوی"

---

## فکر برہ ——— علیم صبا نویدی

صفحات ۱۱۲، سائز ڈیمائی، قیمت ۱۸ روپئے

پتہ :- ۲۹ رامیر النساء بیگم اسٹریٹ، ماونٹ روڈ، مدراس ۲

---

نرمی، لطافت اور نزاکت علیم صبا نویدی کی پہچان ہیں۔ ان کی غزلیں محروم آدمی کی نہیں، مغموم آدمی کی غزلیں ہیں۔ ان کے یہاں حرص نہیں ہے، ایک اطمینان دلانے والی قناعت پسندی ہے جس کے ڈانڈے خود مستی سے ملتے ہیں۔ "فکر برہ" کی غزلیں اثر و تاثیر، کیف و سرور اور انسانی قدروں سے بھرپور ہیں۔ زندگی اور کائنات کا تجسس اور تعلق کا اظہار جس وارفتگی و شگفتگی سے ملتا ہے، وہ صبا نویدی کی داخلی شعور و کیفیات کی آئینہ دار ہے۔ صبا نویدی کی رجائیت آمیز نغمگی، مترنم فضا میں رقص کی سی کیفیت، رومانی سماں، حسن زندگی جس رعنائی و توانائی کے ساتھ ان کے تغزل میں جلوہ گر ہے وہ خود صبا نویدی کے شاعرانہ تشخص اور ان کی فنکارانہ عظمت کی شناخت ہے۔ گرد و پیش کے تہذیبی، سیاسی و ثقافتی شعور کے ساتھ ساتھ حسن معنی، حسن بیان، حسن تاثیر اور لطف زبان کی رعنایات بھی ان کے یہاں کارفرما ہوتی ہیں۔ ؎

چھاؤں کے سرسبز بوٹوں پہ مرادوں کے حروف
ذہن لکھتا جا رہا تھا انگلیاں خاموش تھیں

---

ہم اپنے جسم کی وسعت میں پھیل پھیل گئے
اور آسمان بھی بڑھتا رہا ہماری طرف

مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ کس صدی کا نور
مری نظر سے ٹپکتا رہا اندھیرے میں

اُس گھر کو آسماں نے زمیں دوز کر دیا
جس گھر کو اپنے خانہ خرابوں کا خوف تھا

اسی کے ہاتھ میں ہیں شہرتوں کی ریکھائیں
جو موسموں کی طرح خصلتیں بدلتا ہے

اپھائی کو آگ لگی ہے
فرق نہیں ہے نیک و بد میں

تو ایک ہی مرکز پہ نہ رکھ اپنی نگاہیں
کتنوں کا یہاں سر دمقدر ہے ذرا دیکھ

اپنی دیواروں کے اندر ڈال کر لاکھوں شگاف
تیرگی بھی اب چلی ہے روشنی کی سمت ہی

ہیئت کی ندرت کے ساتھ خیال کی جدت اور جزئیات کی تصویرکشی میں فنکارانہ چابک دستی بھی صبا نویدی کی غزلوں کی خصوصیت ہے۔

"فکر برہ" میں چھوٹی بڑی ایک سو غزلیں شامل ہیں۔ مولانا راجی صدیقی نے "نئی فکر کا ضامن چہرہ" کے تحت علیم صبا نویدی کی شاعری اور شخصیت کا جائزہ لیا ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت اور سرورق گوارا ہے۔

"مناظر عاشق ہرگانوی"

---

## جذبات و نغمات (شعری مجموعہ) ——— تاج النساء تاج

صفحات ۷۸، قیمت ۱۵ روپئے

ناشر :- سیما پبلشرز اینڈ بکس پروموٹرس۔
74- وینکٹ گیری نگر حیدر آباد - 500045

مصنفہ کا پتہ :- 67/1 ایسٹ انجانیا ٹمپل اسٹریٹ، گاندھی بازار۔ بنگلور — 4

تاج النساء تاج کا ایک شعر ہے

خوش کریں گے نہ خوش رہیں گے لوگ
صرف تنقید فن کریں گے لوگ

اور اس وقت جب کہ میں اُن کے شعری مجموعہ "جذبات و نغمات" پر اپنے خیالات قلمبند کر رہا ہوں یہ سوچ رہا ہوں کہ موصوفہ کی شکایت کا ازالہ کس طرح کروں۔ اگر مصرعہ ثانی میں تنقید کی جگہ تنقیص لفظ استعمال ہوتا تو میں تاج سے سو فیصد متفق ہو جاتا۔ لیکن صحت مند تنقید کا مقصد نہ تو تخلیق کار کو خوش کرنا ہوتا ہے اور نہ ہی ناراض۔ تنقید کا مقصد تو تخلیق کی خوبیوں اور خرابیوں کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ خوبیاں اِس لئے کہ قارئین تخلیق کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ لگا سکیں اور خرابیاں اِس لئے کہ تخلیق کار اس کی روشنی میں بہتر ادب تخلیق کر سکے۔ اس لئے تنقید یا تبصرہ ادب کے صحت کے لئے بہت ضروری ہے۔

یہ تو تھا جملہ معترضہ اب آئیے "جذبات و نغمات" کی طرف تاج النساء تاج ایک شاعرہ ہی نہیں ناول نگار بھی ہیں۔ اُن کا ناول "بولتی ویرانیاں" پہلے ہی شائع ہو چکا ہے۔ "جذبات و نغمات" اُن کا شعری مجموعہ ہے جو بقول اُن کے خود " جذبات کی ایک ٹوٹی پھوٹی زبان میں نغمات کا روپ دینے کی ایک ادنیٰ کوشش ہے"۔ موصوفہ نے یہاں انکسار سے کام لیا ہے۔ ورنہ اُن کی غزلیں پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کی شاعری میں شگفتگی اور فکر کی تازگی ہے۔ زبان صاف ستھری ہے۔ الفاظ کی بندش خوبصورت اور خیال میں نزاکت پائی جاتی ہے۔ غزل (عورت سے بات چیت کرنا) مردوں کی اجارہ داری رہی ہے۔ مختلف وجوہات کی بنا پر عورت اپنے جذبات و احساسات اپنی زبان سے معرض اظہار میں نہیں لا سکتی تھی۔ لیکن اب غزل کی زبان میں عورت نے مرد سے بات چیت کرنے کی جو روش اختیار کی ہے وہ غزل کی دیرینہ روایت سے طمانیت بخش انحراف بھی ہے اور نسوانی خودی کا جرأت مندانہ اظہار بھی۔ لیکن اِس انحراف اور اظہار کے باوجود بھی عورت مردوں کے بُنے ہوئے جال سے ابھی پوری طرح آزاد نہیں ہو سکی ہے۔ اور جب وہ خود کو مرد تصور کر کے عورت سے بات کرتی ہے تو فطرت کے خلاف لگتا ہے۔ تاج کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

صبح کے چہرے پہ ہے شام بہار
زلف اُڑ کر اُن کے رُخ پر آ گئی

ہمارے دم سے محبت کا نام زندہ ہے
ہمارے ہاتھ سے آنچل چھڑا رہے ہو تم

یہ بھیگی بھیگی نگاہیں یہ خوشنما موسم
نظر سے اپنی مسلسل پلا رہے ہو تم

مگر اس روایت پرستی کے باوجود تاج کے یہاں عزم بھی ہے وہ عورت کی بے بسی پر بغاوت کیلئے آمادہ نظر آتی ہیں۔

اگر دنیا ہمیں مجبور و بے بس بنا ڈالے
تو دنیا کو ہمیں زیر و زبر کرنا بھی آتا ہے

اور اسی عزم نے تاج سے ایسے پائے کے شعر بھی کہلائے ہیں:

اے سعی ضبط غم تری عزت خدا کے ہاتھ
بکھری نہیں ہے زلف مگر آنکھ نم تو ہے

نشاط شوق کے باقی ہیں مرحلے شاید
گلے لپٹ کے بھی کیوں دل ہے بیقرار ابھی

نظروں نے خود ہی دل کا احوال کہہ دیا
بے وجہ آپ نے کیوں تکلیف گفتگو کی

اس مجموعہ میں ایک نعت، ۵۸ غزلیں اور آخر میں چند قطعات شامل ہیں۔ کتابت و طباعت خوبصورت اور کاغذ غنیمت ہے۔

"ظفر ہاشمی"

بہترین خواہشات کیساتھ
گجرات آٹو سینٹر
پٹرول پمپ اینڈ سرویسز
عثمان پورہ۔ آشرم روڈ۔ احمد آباد ۳۸۰۰۱۳
فون = 45845
مالکان
محمد امین خاں، محمد یسین خاں، محمد اعجاز خاں
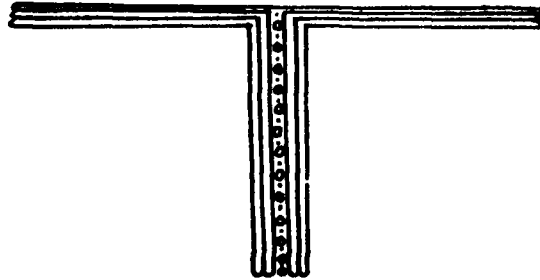
## ڈاکٹر عنوان چشتی (دہلی)

گلبن کا نومبر کا شمارہ ملا۔ ممنون ہوں کہ آپ مسلسل اس ادبی تحفہ کے ساتھ یاد فرماتے ہیں۔ گلبن ایک معیاری رسالہ ہے۔ امید ہے خوب سے خوب تر کا سفر جاری رہے گا۔ ★

## جمیل زبیری۔ (کراچی۔ پاکستان)

گلبن نظر نواز ہوا۔ یادآوری کا شکریہ۔ میں نے پرچہ پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ اچھا ہے۔ رام لعل کا سفرنامہ میں پڑھتا ہوں۔ وہ جب یہاں آئے تھے۔ اس وقت ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ بہت عمدہ سفرنامہ تحریر کیا ہے۔ ★

## شوکت مہدی (رحیم یارخانہ پاکستان)

گذشتہ سال سنا ہوا لگیا تھا۔ محترم جعفر شیرازی صاحب کے یہاں گلبن کے پرانے اور نیا شمارہ دیکھا۔ میں حیران ہوں کہ آپ کے یہاں رسائل کی قیمت نہایت کم ہے۔ اسکی کیا وجوہات ہیں؟ ★

## ڈاکٹر مجید آذر (بمبئی)

گلبن اکتوبر، نومبر کا شمارہ نظر سے گذرا۔ معلوم ہوا کہ اتنا معیاری انشار، اور ادب سے پُر جریدہ نکالنا آپ ہی کا حصہ ہے۔ ★

## ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید (مدراس)

گلبن پابندی سے ملتا ہے۔ آپ نے تو نت نئے عنوانات کیساتھ اسکو خاصہ بانکا اور طرحدار بنا دیا ہے۔ صاف ستھرے اور معیاری جرائد میں گلبن اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ یقین ہے اس کے وزن وتار میں اور اضافہ ہوتا رہے گا۔ ★

## مظہر امام (سری نگر)

گلبن باقاعدگی سے مل رہا ہے شکر گزار ہوں۔ آزاد غزل کی ترقی اور ترویج کے سلسلے میں گلبن کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائیگا۔ ★

## اسد رضوی (مظفرپور)

اکتوبر گلبن باصرانواز ہوا۔ اداریہ پڑھ کر "ترے وعدے پر جئے ہم....." فسانہ یاد آگیا۔ مگر آپ لوگوں کی جان توڑ کوشش ایک دن ضرور رنگ لائیں گی۔ خدا آپ لوگوں کو کامیاب کرے۔ فیض احمد فیض کی نظم قاصر عظیم اور یوگیند ربال صابر کی غزلیں پسند آئیں۔ ظفر عدیم صاحب کی غزل اکثر مطلع سے آنکھیں چراتی ہے۔ موصوف کا یہ شعر ؎

کسی کی یاد میرے ہاتھ تھامے رہتی ہے
شکستہ آئینہ جب تک سنوارتا ہے مجھے

صرف ان کیلئے نہیں اور بھی لوگ ہیں اس دہر میں ایسے کہ جن پہ یہ شعر صادق آتا ہے۔ بہرحال آپ ظفر عدیم صاحب کا مکمل تیار رسال

فرمائیں تاکہ ان سے میں رابطہ قائم کرکے انھیں بتاؤں کہ ؎

ایک تو ہی تو نہیں دہر میں تنہا بھائی
ساتھ میں بھی ہوں ترے عکس تمنا کیطرح

آزاد غزلوں کے اغراض و مقاصد سے مطلع فرمائیں۔ محمد عبدالقادر ادیب کا مضمون ' اردو کا مسئلہ ' واقعی ایک پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے۔ جو زبان خود زبان زد عام ہو اسکی مقبولیت کیلئے سمجھوتہ کیا۔ ★

## نازش پرتاپ گڈھی (پرتاپ گڈھ)

پہلے آپ کا خط ملا۔ پھر اگست ستمبر کا مشترکہ شمارہ، اسکے بعد اکتوبر کا شمارہ بھی مل گیا۔ آپکی اس مسلسل کرم فرمائی کیلئے شکر گذار ہوں زیر نظر شماروں میں مضامین نظم و نثر کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں خاصے شعور اور سلیقے کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ اپنی افادیت کے پیش نظر پوسٹ مارٹم کا باب گلبن کے ہر شمارہ کا لازمی جزو ہونا چاہیے نہ جانے کیوں اکتوبر کے شمارہ میں آپنے یہ اہم باب حذف کر دیا ہے اسکے علاوہ علمی، اور ادبی مضامین کی کمی بھی شدت کے ساتھ محسوس ہو رہی ہے۔

## ظفر ہاشمی۔ (جمشید پور)

آپ لوگوں نے نہ صرف گلبن کو زندہ رکھا ہے بلکہ اسکی سبح درج اسکے ... زیادہ وحد سے زیادہ وقار بخشا ہے۔ اسکی کتابت و طباعت اور زنا ست، اسکا کاغذ سب کچھ خیرہ کن ہے۔ یہ مختصر صفحات کا پرچہ کئی ضخیم پرچوں میں بھی اپنی اعلیٰ شناخت کا ضامن ہے یہ سب بے لوث خدمت کا ثمر ہے ——— تازہ شمارہ میں بالخصوص محمد

ابن الحسن کی ' حمد ' صفدر صدیق رضی کی غزل ' جمیل زبیری کی کہانی حکیم الدین شیرازی کا مضمون ' ڈاکٹر قمر رئیس کا مقالہ اور رام لعل کا سفرنامہ اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے اچھوتا ہے۔ ★

## شوکت علی شاہد (ٹمکور۔ کرناٹک)

اپنے ایک دوست عارف متین کے ہاتھ میں گلبن کا ایک شمارہ دیکھا۔ جریدہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس کے معیار نے بہت متاثر کیا۔ احمد آباد جیسے مقام سے اس قدر خوبصورت اور معیاری پرچہ نکالنے پر میری جانب سے دلی مبارکباد۔

## سردار ایاغ (بنگلور)

تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ۔ اس بار غزلوں کی صاف ستھری کتابت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ ترتیب و انتخاب بھی قابلِ ستائش ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی یہی صورت برقرار رہے گی۔ ★

## انجم نصیر آبادی (سورت)

اس میں شک نہیں کہ گلبن پہلے کی بہ نسبت اب بہت معیاری ہو گیا ہے۔ ★

## ش م۔ عارف ماہر آروی (پٹنہ)

• گلبن کا تازہ شمارہ نومبر ۸۲ء ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ گلبن قدیم و جدید کا سنگم ہے۔ حمد، اس کے بعد نعت پھر پوسٹ مارٹم وغیرہ خوب سے خوب تر کی طرف سفر ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ★

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

گجرات سے نکلنے والا واحد علمی ادبی اور ثقافتی

ماہنامہ

# گلبن

مارچ ۱۹۸۳ء

ایڈیٹر
ثریا ہاشمی

مینیجنگ ایڈیٹر
ظفر ہاشمی

ترتیب کار
مناظر عاشق ہرگانوی

نگران
سید محمد حکیم الدین شیرازی

منتظم اعلیٰ
سید احمد مختار غوثی

مشیر
سید علی احسن بخاری

بدل اشتراک

| | |
|---|---|
| لائف ممبری | ۲۵۰ روپے |
| زرتعاون سالانہ | ۲۵ روپے |
| زرسالانہ | ۲۰ روپے |
| غیر ممالک میں بحری ڈاک سے | ۳ پونڈ |
| غیر ممالک میں ہوائی ڈاک سے | ۵ پونڈ |
| عام شمارہ | ۱-۷۵ روپے |

پتہ: ۲۰/۱۴۹ گجرات ہاؤسنگ بورڈ کالونی شاہ عالم
احمد آباد ۳۸۰۰۲۸

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر ـــــــ ثریا ہاشمی

مطبع: نشاط پریس ٹانڈہ، فیض آباد، یوپی


## فہرست

**اداریہ**

# مبارکباد

محترم جناب رفیع الدین شیخ صاحب ایم ایس سی نے بحیثیت میئر احمد آباد تیسرے سال میں قدم رکھا ہے۔ موصوف کو میئر شپ کے معزز عہدہ کے لئے لگاتار تین سالوں سے منتخب کیا جا رہا ہے۔ جوان کی شخصیت کی عظمت، ہر دلعزیزی اور بے پناہ صلاحیت اور سوجھ بوجھ کی غماز ہے موصوف احمد آباد کارپوریشن کی تاریخ میں سب سے کم عمر میئر ہیں۔ ان کے اندر عوام کی خدمت کا بے پناہ جذبہ ہے اور اسی جذبے نے انھیں ہر وقت متحرک کر رکھا ہے۔ سیاسی، سماجی اور عوامی مسائل کی الجھنوں میں ہر وقت گھرا رہنے کے باوجود ان کے چہرے پر جو شگفتگی اور بصیرت نظر آتی ہے وہ خود اعتمادی اور اخلاص کی آخری منزل پر ہی آکر انسانوں کو حاصل ہوتی ہے ہم جناب رفیع الدین صاحب کو تیسری بار بننے پر اپنی دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ موصوف کو اپنی تمام تر عنایتوں سے نوازے اور ان کے اندر قوم و ملک کی خدمت کا مزید جذبہ اور صلاحیت پیدا کرے۔

ہم جناب رفیع الدین صاحب کی خدمت میں نذرانہ خلوص یوں بھی پیش کرتے ہیں کہ موصوف محترم جناب محمد مصطفیٰ صاحب آف اٹیلین بیکری کے برادرِ عزیز ہیں۔ جناب مصطفیٰ صاحب نے ساڑھے پانچ سال قبل گلبن کا اجراء کیا تھا اور تب سے آج تک وہ گلبن کو اپنی یادوں میں بسائے ہی نہیں ہیں بلکہ اسے اپنی گرانقدر رائے اور تعاون سے نوازتے بھی رہے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں کو اردو زبان سے جو محبت ہے اور اردو کی ترویج و اشاعت سے جو دلچسپی ہے اس پر ہم بجا طور پر فخر کرتے ہیں اور اسی نسبت سے ہم ایک عرضداشت محترم میئر صاحب کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

احمد آباد شہر میں اردو میڈیم کے تقریباً نوے اسکول ہیں مگر ہائی اسکول صرف ایک ہی ہے۔ یعنی الیف، ڈی ہائر سکنڈری اسکول ہم ان باہمت منتظمین خصوصاً جناب عبدالرحیم شیخ، جناب فیض محمد شیخ اور جناب عبدالرحیم ضیار کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور ان کے عزم کی داد دیتے ہیں کہ انھوں نے پچھلے دس سالوں سے پورے گجرات میں اردو میڈیم کا واحد ہائر سکنڈری اسکول چلا کر اپنی عظمت کا سکہ بٹھا دیا ہے لیکن یہ اسکول بھی محض لڑکیوں کو اردو میڈیم سے تعلیم دیتا ہے۔ لڑکوں کے لئے انتظام یہاں بھی نہیں۔

ایسی صورت میں احمد آباد کارپوریشن کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ چند اردو میڈیم ہائی اسکول کھولے اور نوے پرائمری اسکولوں سے نکلے ہوئے طالبعلم کو اردو میڈیم سے ہائی اسکول کرنے کی سہولت فراہم کرے ہمارا اندازہ ہے کہ ہر سال تقریباً دو ہزار طالبعلم صرف احمد آباد میں اردو میڈیم سے ساتویں درجہ پاس کرتے ہیں۔ چونکہ انھیں اردو میڈیم سے پڑھنے کیلئے مزید سہولت نہیں اسلئے وہ یا تو دوسرے میڈیم کے اسکول میں چلے جاتے ہیں جہاں انکی اٹھان دب جاتی ہے یا پڑھائی ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر ان بچوں کو اردو میڈیم سے ہائی اسکول کرنے کی سہولت فراہم کردی جاتی تو ہمیں یقین ہے کہ لڑکوں میں کم از کم ستر فیصد اور لڑکیوں میں کم از کم نوے فیصد اردو میڈیم کو ہی ترجیح دیں گے اور بہترین طالبعلم ثابت ہونگے۔

یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر احمد آباد کارپوریشن کو بہت پہلے دھیان دینا چاہیئے تھا اور اب جبکہ جناب رفیع الدین صاحب ایسا اردو داں اور اردو نواز شخص اس شہر کا میئر تیسری بار منتخب ہوا ہے ہم امید کرتے ہیں کہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے گا۔

مہدی پرتاپ گڈھی (پرتاپ گڈھ)

# نعت

گھٹا بن کے برسے، صبا بن کے آئے
وہ اک موسم جاں فزا بن کے آئے

تمنائے موسیٰؑ، نوید مسیحاؑ
خلیلؑ خدا کی دعا بن کے آئے

ضلالت کی راہوں میں بھٹکا جب انساں
تو کی رہبری، رہنما بن کے آئے

تھا وہ حبس دم گھٹ رہا تھا بشر کا
وہؐ دنیا میں تازہ ہوا بن کے آئے

تھی مجروح جب روح انسانیت کی
تب عالم میں حضرت دوا بن کے آئے

مریض آدمیت ہوئی جاں بلب جب
جہاں میں نوید شفا بن کے آئے

سفینہ جب آدم کا آیا بھنور میں
بہ اذنِ خدا، ناخدا بن کے آئے

سراپا محبت، سراپا مروت
غریبوں کے وہؐ ہم نوا بن کے آئے

جب الحاد کی تیرگی تھی مسلط،
وہؐ دنیا میں نور خدا بن کے آئے

تھا مٹی بشر اس کو سونا بنایا
محبت نسخۂ کیمیا بن کے آئے

چمن در چمن گل کھلے زیست نو کے
وہؐ دنیا میں دستِ صبا بن کے آئے

نظام جہاں از سر نو سنوارا
زمانے کے فرماں روا بن کے آئے

فقیری میں تھی شہنشاہی کی عظمت
زمانے کے حاجت روا بن کے آئے

تونگر بنا چاہتا ہو جو مہدی
درِ مصطفےٰ پر گدا بن کے آئے

زخمی بڑودوی (بڑودہ)

# نعت

نازشِ کون و مکاں دین کے سالار کی بات
آؤ سب مِل کے کریں احمد مختار کی بات

آ کے چوکھٹ پہ تری پا کے دلوں کے گوہر
فخر سے کرتی ہے دنیا تری سرکار کی بات

نور ہی نور بکھر جاتا ہے میرے گھر میں
چھیڑتا ہے جو مرا دل ترے دیدار کی بات

مجھ پہ ہو جاتا ہے وجدان کا عالم طاری
جب کوئی کرتا ہے اللہ کے دلدار کی بات

جی میں آتا ہے کہ منہ چوم لوں ترا زخمی
جب بھی کرتا ہے مرے سید ابرار کی بات

# تعارف

نام: نجم الحق

ادبی نام: صبا اکرام

پیدائش: ۲۸ر جون ۱۹۴۵ء

مقام پیدائش: ہزاری باغ (بہار)

تعلیم: بی اے، ڈی۔ آئی۔ ایل ایل

ڈپ۔ ان۔ پی ایم

پیشہ: ملازمت

(پرسنل آفیسر، آدم جی کاٹن ملز، کراچی)

کتابیں: سنگ میل (انتخاب)

سورج کی صلیب (شعری مجموعہ)

پتہ: ۲/۳ سینئر آفیسرز فلیٹس،

آدم جی کاٹن ملز، لانڈھی، کراچی ۲۲

—o—

مناظر عاشق ہرگانوی

## سوچ نگر کا شاعر۔ صبا اکرام

گوتم ہو تم
شہروں شہروں
گھوم کے پہنچے ہو منزل تک
پھر بھی
سونی منڈیروں کی کرچی
تم کو یاد بہت ہے
ان یادوں میں
بکھرے خواب کے منظر پنہاں
جنگ کا شور نگر بھی شامل
موتی، کنکر، پتھر، سایہ
مٹی، گھر اور سورج، آنگن
اور دیواریں
ایسے میں
بے انت مسافت
اور فنکاری
نظمیں غزلیں
سوچ کی زد میں
گوتم ہو تم

—o—

وزیر آغا (پاکستان)

# انتہائی حساس شاعر صبا اکرام

صبا اکرام کی غزلوں اور نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے کتنی ہی بار میری چشمِ تصور کے سامنے ایک ایسی بے پتوار ناؤ کی تصویر ابھری جو جہت اور سمت سے ناآشنا محض لہروں کے زیر و بم پر سفر کر رہی تھی اور جس کا سایہ شفاف پانی کے اندر بہت دور تک اترا ہوا نظر آ رہا تھا۔ یہ امیج صبا اکرام کی شاعری اور اس کی زندگی کی ہم آہنگی پر دال ہے، کیونکہ صبا کی زندگی میں بار بار اکھڑنے یعنی UPROOT ہونے کا المیہ ابھرتا رہا ہے، اور یہی المیہ اس کی شاعری میں جڑوں کے کٹنے کا منظر پیش کرتا ہے، بلکہ صبا اکرام کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے تو یہ بھی محسوس ہوا ہے، کہ اس کے ہاں بے پتواری ناؤ، ناؤ نہیں ہے بلکہ بیخ و بن سے اکھڑا ہوا ایک درخت ہے، جسے کسی چیختے ہوئے طوفان نے لہروں کے سپرد کر دیا ہے۔ اور اب سمت سے ناآشنا لہریں اسے ساتھ لئے پھرتی ہیں۔

اگر معاملہ جڑ سے اکھڑے ہوئے درخت کا ہے تو لازم ہے، کہ اس کہانی کے دو مرحلے ہوں گے، ایک وہ جب جڑیں سلامت تھیں، دوسرا وہ جب جڑوں نے زمین سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور وقت کے دھارے پر بہنے لگیں، صبا کی غزلوں اور نظموں میں یہ دونوں مراحل نہایت خوبصورتی سے بیان ہوئے ہیں۔

پہلے مرحلے کے سلسلے میں صبا اکرم کی شاعری میں بہت سے ایسے الفاظ ابھرے ہیں، جو دھرتی کے ساتھ اس کی وابستگی کو ظاہر کرتے ہیں، مثلاً پیپل، پتھر، مٹی، گھر، آئینہ اور تھیلی وغیرہ مگر لطف کی بات یہ ہے کہ یہ تمام اشیاء پہلے تو امیجز میں ڈھلی ہیں اور پھر ان کے علامتی مفاہیم پانی میں اترے ہوئے سایوں کی طرح نظر آنے لگے ہیں، میں نے ان اشیاء کو علامتی محض اس لئے نہیں کہا کہ جب ہم کسی شے کو علامت قرار دے دیتے ہیں تو ایک خاص معنی اس کے ساتھ منسلک کر دیتے ہیں مثلاً صلیب کے ساتھ قربانی وغیرہ۔ اس حد تک کہ شے میں شے یا امیج، نشان (SIGN) بھی تبدیل ہو کر اپنے امکانات سے محروم ہو جاتا ہے، اردو تنقید میں یہ رواج عام ہو گیا ہے کہ جب کسی شاعر کے ہاں علامتی رویے کی نشاندہی کر دی جاتی ہے تو پھر ہمارے نقاد اس کے کلام سے علامتیں برآمد کر کے دکھاتے ہیں، بعینہ جیسے آثارِ قدیمہ کے ماہرین سطحِ زمین کے نیچے سے ٹوٹے ہوئے برتن برآمد کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ کسی شاعر کے ہاں ابھرنے والے بعض الفاظ یا امیجز کو علامتی کہہ سکتے ہیں یعنی اس بات کا اظہار کر سکتے ہیں کہ ان الفاظ یا امیجز نے معانی کے در وا کر دیئے ہیں، اور اب قاری کا ذہن نئے نئے تلازمات کے ذریعے تیز مشابہتوں کے انتہائی باریک دھاگوں کو محسوس کر کے پوری کائنات کو جڑا ہوا دیکھ رہا ہے، تشبیہ دو چیزوں کی مماثلت کا احساس دلاتی ہے، استعارہ کسی ایک چیز کا

ذکر کرکے دوسری کو SUGGEST کرتا ہے مگر جب علامتی انداز
نظر پروان چڑھتا ہے، تو اشیاء کے مخفی رشتے اور روابط نظر آنے
لگتے ہیں، جو عام نظروں سے اوجھل تھے۔ ایک سائنسدان شے کو
اجزا میں تقسیم کرکے ان کا مطالعہ کرتا ہے، مگر فنکار ان رشتوں کو
دریافت کرتا ہے، جو اشیاء کو آپس میں مربوط اور منسلک کئے ہوئے
ہیں، ساری کائنات ایک تسبیح کی طرح ہے جس کے تمام تر دانے ایک
ہی دھاگے میں پروئے ہوئے ہیں۔ مگر ایک پیغمبر، صوفی یا فنکار ہی یہ
تسبیح پڑھنے پر قادر ہے، اور یوں صرف وہی صحیح معنوں میں کائنات
کی عظیم وحدت کو محسوس کرسکتا ہے۔ لہٰذا علامتی یا غیر علامتی شاعری
کی تقسیم بھی کچھ ایسی کارآمد نہیں، اچھی شاعری بنیادی طور پر علامتی
ہوتی ہے کہ امکانات کے ایک جہاں ہوشربا کا منظر پیش کرتی ہے
صبا اکرام کی شاعری اس اعتبار سے علامتی ہے کہ اس نے اشیاء
کو محسوسات کے ہالے میں لے کر انہیں اس قدر صیقل کر دیا ہے
کہ ان میں ارد گرد کی دنیا کے سائے اتر آئے ہیں، آئینہ اسی
لئے صبا اکرام کا ایک خاص امیج ہے کہ آئینہ اپنا ہاتھ بڑھا کر
اشیاء کو نہیں چھوتا بلکہ ارد گرد کی اشیاء کو اپنے وجود میں سمیٹ
لیتا ہے۔ انعکاس کا یہ عمل ہی ایک اچھے شاعر کی پہچان ہے۔ وہ
مردہ لفظ میں ایک نئی روح پھونک کر اسے رنگ بدلتی ایک چھوٹی
سی کائنات میں تبدیل کر دیتا ہے۔

پہلے مرحلے میں ابھرنے والے الفاظ اور امیجز ایک
منضبط، ٹھہری ہوئی اور دھرتی کے ساتھ جڑی ہوئی دنیا کا منظر
پیش کرتے ہیں، مگر دوسرے مرحلے میں صبا اکرام کی شاعری، سمندر
پتنگ، سورج، چڑیا اور ریت ایسے الفاظ بروئے کار لاتی ہے
اور یہ تمام الفاظ متحرک امیجز کو مرتب کرتے ہیں اور پھر ایک
ایسے بے پایاں مدوجزر کی نشان دہی کرنے لگتے ہیں جس کا کام
اشیاء کو جڑ سے اکھیڑ کر بہائے جانا ہے۔ مثلاً سمندر ایک
گُودتی ہوئی بے انت مسافت ہی کا تو نام ہے۔ اسی طرح ایک
مسلسل سفر سورج کا نوشتہ تقدیر ہے۔ پتنگ زمین کی کشش
ثقل کو عبور کرنے کا علامیہ ہے اور ٹوٹی پتنگ زمین سے

منقطع ہونے کا منظر پیش کرتی ہے۔ ریگ دراصل ریگ
رواں ہے کہ ہوا کا ہلکا سا جھونکا بھی اسے مسافر کا منصب
عطا کر دیتا ہے۔ یوں تو یہ تمام اشیاء شاعر کی اس احساسی
کیفیت ہی کو اجاگر کرتی ہیں جو دھرتی سے کٹ جانے کے تقاضا
نے اس پر طاری کر رکھی ہے۔ مگر اس سلسلے میں "چڑیا" کا امیج
بہت قوی ہے کہ بیک وقت اڑنے کے عمل کی طرف بھی ذہن
کو راغب کرتا ہے اور شاعر کے دل میں سوئے ہوئے
خوف کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص ایک چڑیا کی
طرح اپنے آشیانے سے جدا ہو کر طویل مسافتوں اور بے انت
فاصلوں کی زد میں آجائے تو اس کے ہاں ایک احساس یاس
جنم لیتا ہے یہی احساس اگر شاعری کی بنت میں شامل ہو تو اس
سے ایک عجیب سی کرب انگیز کیفیت پیدا ہوگی، صبا اکرام کی
شاعری میں اس کیفیت کا کوئی بلند بانگ اعلان تو نہیں ہوا مگر
اسے محسوس یقیناً کیا جاسکتا ہے۔

صبا اکرام کی شاعری ایک انتہائی حساس شاعر کی ان
متنوع واردات کو پیش کرتی ہے۔ جو زمانے کے روبرو آنے
پر اسے عطا ہوئیں اور ہر چند کہ ان کا ذائقہ کڑوا کسیلا تھا
تاہم وہ شاعر کے باطن کو مصفا اور اسکے کلام کو آئینہ صفت
بنانے میں مدد معاون ثابت ہوئیں۔ جب کسی شاعر کا دل
اور اسکا کلام دو آئینوں کی صورت میں نظر آئیں اور یہ آئینے
ایک دوسرے کے روبرو بھی ہوں تو پھر علامتی مفاہیم کا ایک
عکس در عکس سلسلہ وجود میں آئے گا۔
صبا اکرام کی شاعری میں یہی سلسلہ ابھرا ہے۔

صبا اکرام (پاکستان)

## آئینے کا آدمی

صبح کے زعفرانی لبوں پر
جو شفقت کی ہلکی سی مسکان تھی
ایک ٹھٹھری ہوئی رات کی دھند میں
کھو چکی ہے
مرے چھوٹے بھائی نے
مجھکو لکھا ہے
کہ آنگن میں جو نیم کا پیڑ تھا
اک طوفان میں گر چکا ہے
وہاں ٹھنڈی چھاؤں نہیں
دھوپ کا سلسلہ ہے
مگر کھوج میں نان و نفقہ کی
نکلا ہوا
ایک کمزور سا آدمی
اپنے خوابوں کی
بیساکھیوں پہ ٹنگا
زندگی بھر جو
سوکھے ہوئے ہونٹ کی پپڑیوں سے
کنویں تک کے
بے انت رستوں پہ چلتا رہا
آج بھی وہ مرے سامنے
آئینے میں کھڑا ہے

---

## غزل

اس کو دیکھوں تو کبھی میں بھی کہ وہ کیسی ہے
میرے پیچھے جو صبا گھر میں مرے رہتی ہے
جلتے سانسوں کے گھنے دشت میں جاری ہے سفر
جاں ابھی قہر کے خطروں سے کہاں چھوٹی ہے
اب کوئی خوابوں کا جھولا بھی لگائے تو کہاں
شب کے پیڑوں کی ہر ایک شاخ حسیں ٹوٹی ہے
اس کے آنگن میں کھڑے نیم کی چنچل چھایا
شام سے ہی مری دہلیز پہ آ بیٹھی ہے
گم ہوئی ہے صبا لوہے کے پلوں کے نیچے
گاؤں کی شوخ ندی شہر میں جب پہنچی ہے

---

بھٹکائے پھر رہی ہے ہوا اپنے سنگ سنگ
تجھ سے بچھڑ کے ہم تو ہوئے ہیں کٹی پتنگ
میں چپ کھڑا اندھیرے میں تکتا رہا اسے
تھا روشنی میں ڈوبا ہوا اس کا انگ انگ
چلتے رہیں اندھیروں میں ہم یونہی کب تلک
ہے انتظار ختم ہو اب زیست کی سرنگ
شبدوں کی لہر ہونٹوں کے ساحل کو چھو گئی
صحرا میں چپ کے گونجی صداؤں کی جل ترنگ
بچے کھڑے سڑک پہ صبا دیکھتے رہے
دو منزلے کی چھت پہ گری جا کے وہ پتنگ

فہمیدہ ریاض (دہلی)

## اک ٹکڑا آکاش

دیکھو رے، وہ تنا ہوا ہے
اپنے چھوٹے سے آنگن پر
اک ٹکڑا آکاش،
چاندنی نے گھٹتے گھٹتے دیکھا
دیواروں کی کوکھ میں پتا سنگ ہمارا
لال بھبھوکا رنگ ہمارا
دنیا بیرن، پیار کی دشمن
بند ہے دروازوں کے باہر
آنگن کی گودی میں آئیں نرم ہوائیں
ہمیں بلائیں
لوری گائیں بدن ہمارے
اب سو جائیں
اب کیا غم ہے، یہ کیا کم ہے
اک ٹکڑا آکاش!

---

کرشن موہن (دہلی)

دو نظمیں

## سوچ

ایک پاگل ہنستے ہنستے گالیاں دینے لگا
اور گریباں پھاڑ کر داد جنوں دینے لگا
یہ تماشا دیکھ کر
لوگ سب ہنسنے لگے
اور میں
پڑ گیا ہوں سوچ میں

## لعل بدخشاں

مساوات کا یہ زمانہ ایں ہے
کہ اب نسل اور رنگ کا امتیاز آدمی آدمی میں
ستودہ نہیں ہے۔
ہر اک نسل اعلےٰ ہے ہر رنگ رخشاں
فقط آدمیت ہے لعل بدخشاں

---

ظہیر غازی پوری (ڈومکا)

## پندار

معنویت کی بے انتہا وسعتیں
جب نگاہوں میں ہوں
تو زمیں دشت صحرا، سمندر سبھی
نقش موہوم سے لگتے ہیں
نیلے پانی میں تحلیل ہوتے ہوئے
پھر بھی
افکار کی کشت زرخیز میں
میں نے دیکھا ہے اکثر
کہ صرف ایک نقطہ بھی
پندار ہوتا ہے
افہام و تفہیم کا!

---

امداد آکاش (پاکستان)

## شب خون

رات روتی رہی
شبنمی آنکھ سے
چند موتی گرے
اور پاگل ہوا
سہمی سہمی دبے پاؤں چلتی ہوئی
چند خاموش اجڑے درختوں کی شاخیں ہلیں
چند پتے گرے
رات چپ ہو گئی
ایک آہٹ ہوئی
اور بیہم سکوت
بہکے بہکے سے قدموں کی آواز سے
ٹوٹ کر چاروں جانب بکھر سا گیا
سرسراہٹ ہوئی
دو بدن کسمسا کر الگ ہو گئے
ایک سائے نے مدھم سی آواز میں
دوسرے سے کہا
آرہا ہے کوئی !!

رشید اعجاز (پونا)

## مقدم

ہوائی سرائے کے در پر لکھا ہے .
تھکے رنگ، وامانده خوشبو کے پیکر،
اُبلتی ذہانت کے گم نام خاکے ،
اپاہج کا احساس بے صوت ـــــ
ـــــ گونگے تصوّر ، !
ہتھیلی کی کالی لکیروں کے سائے ،
کثیر العیال آرزو کے دھندلکے ،
معافی کی اندھی گپھاؤں کے خالق ،
کتابوں کے کیڑے نظریوں کے غازی
خیالی گھروندوں کے قلاش والی !!
نئے اور پرانے زمانے کے ٹکراؤ کا شور اوڑھے ہوئے تن بدن .
ـــــ برف اور آگ کی جفتیوں کے کفن .

سب !
نشانوں سے بہکے ہوئے تیر نیزے !!
بلا خوف آجائیں، آرام پائیں !
ہوائی سرائے کا در کھٹکھٹائیں ـــــ !!
ہوائی سرائے کے در پر لکھا ہے . . . . . .

ارشد رضا (بھاگلپور)

## رات کا قصہ

میز پر تمہاری تصویر
رکھی ہے
تمہارے سبھی خطوط
میں کئی بار پڑھ چکا ہوں
بس اک آخری سگریٹ بچا ہے .
اور رات بھی گذرنے والی ہے
چلو یوں ہی سہی
اب میرے زخموں سے لہو تو نہیں بہتا

انور سجاد

# پرتو

جب آسمان کی کوکھ تاریکیوں کو جنم دینے لگتی اور رات کے دوش پر تاریکیوں کا سیلاب امڈنے لگتا تو وہ چپکے سے مکان کی چھت پر چلی جاتی اور دور افق پر سیاہیوں میں گھلتی ہوئی سرخی کو دیر تک دیکھتی رہتی۔ اور پھر جب چاروں طرف اندھیرے لپکنے لگتے اور تاریکیاں اس کی روح کو محیط کر کے اس کے دل میں اترنے لگتیں تو وہ بہت ہی بے چین ہو کر اونچی اونچی منڈیروں والے گھر کے صحن میں کچھ اس طرح چکر کاٹنے لگتی جیسے کلّے کے ساتھ رسّی سے بندھی ہوئی بکری اپنی قید سے تنگ آ کر کلّے کے گرد گھومنا شروع کر دیتی ہے۔

صحن میں پھرتے پھرتے اس کے ذہن میں لاتعداد پریشان سے خیالات آتے جو اس کے ذہن کو مجروح کرنے کے بعد بالکل اسی طرح غائب ہو جاتے جیسے اس کے گھر کے سامنے سے گذرتے ہوئے اجنبی لوگ — پھر وہ یکایک ایک بھاری سی آواز سے چونک اٹھتی — "جمیلہ!"

اس کے تمام خواب ٹوٹ جاتے اور وہ اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو اپنے پریشان خیالات کے مانند کندھے پر گرے دوپٹے کی بکل میں سمیٹتی اور ہولے ہولے سیڑھیاں اترنے لگتی۔ اور پھر جب ابا کی دوسری آواز اس کے کانوں سے ٹکراتی "جمیلہ بیٹی! آؤ کھانا کھا لیں" تو اس کا دوپٹہ اس کے سینے کو بھی اپنے دامن میں چھپا لیتا اور وہ خاموشی سے اپنے ابا، امی اور چھوٹی بہن کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگتی۔

اس کو اسکول سے اٹھا کر جب اس کی ماں نے اس سے یہ کہنا شروع کیا کہ "جمیلہ! سر پہ دوپٹہ اوڑھا کر اب تو ماشاءاللہ جوان ہو گئی ہے" تو اس کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کو دوپٹے نے جکڑ لیا ہے۔ اس کے اور اس کی سہیلی کے درمیان صرف دو گھروں کا فاصلہ تھا لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد اس کے ابا کے کہنے پر اس کی سہیلی کے ہاں آنا جانا بھی ختم کرا دیا کیونکہ وہ مناسب نہیں سمجھتے تھے کہ ان کی جوان بیٹی بازار سے گذرے۔

کبھی کبھار اس کی سہیلی اس کے ہاں آتی اور وہ دونوں پچھلے کمرے میں بیٹھی گھنٹوں کھسر پھسر کیا کرتیں۔ اور جب آخر میں وہ بتاتی کہ اس کی خالہ کے لڑکے نے آج اسے فلاں تحفہ خرید کے دیا ہے اور کبھی انھوں نے گھر سے چھپے چوری ہوٹل میں چائے بھی پی تھی تو جمیلہ معاً اداس سی ہو جاتی اور اس کا دل سینے کے پنجرے میں بے بسی سے پھڑپھڑانے لگتا اور اس کے ہاتھ کی پشت پر جلتے ہوئے کوئلے سے پڑا ہوا نشان بڑی شدت سے دہک دہک کر پھیلنے لگتا اور اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے کر اس کے ذہن کو بھی راکھ کر دیتا اور وہ اس راکھ کو اپنے زخمی دل پر لگاتے ہوئے سوچتی...... جانے فضل اس وقت کہاں ہوگا؟ جانے کوئی اور فضل بھی کیوں اس کی زندگی میں نہیں آتا، جو اسے ناخنوں کی پالش اور سرخی لا کر دے — وہ کب آئے گا — فضل فضل — میری پیاری سہیلی — میری اچھی ہمراز — کاش فضل تمہارا بھائی نہ ہوتا — کاش اس کے بارے میں گفتگو کرنے کی چاہ نے تمہارے سامنے میرے ہونٹوں کو سی نہ دیا ہوتا — یہ سب میں کس سے کہوں۔ اس کے متعلق کس سے پوچھوں — مجھے ہونٹوں میں پڑا ہوا تالا توڑنے میں شرم آتی ہے جیسے میں تمہاری کوئی چیز چرا رہی ہوں ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ وہ ہنڈکھیلا اور گڈے گڑیا کے بیاہ ایسے کھیلوں میں ان کا ساتھ دیا کرتا تھا ایک مرتبہ جب اس کی [illegible]

وطائی ہوئی تھی تو اس شریر نے گڈے اور گڑیا دونوں کو جان سے مار ڈالا تھا اور پھر جب ہنڈ کلہیا کے کھیل میں چھینا جھپٹی کی نوبت آئی تھی تو اس نے چمٹے سے سلگتا ہوا کوئلہ پکڑ کے اس کے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیا تھا اور وہ چیختی ہوئی گھر بھاگ آئی تھی۔ اس نے ماں سے گیلا آٹا زخم پر لگواتے ہوئے کئی بار دروازے کی طرف دیکھا تھا کہ شاید وہ اس کی خبر لینے آئے۔ لیکن وہ بے پروا سا لڑکا نہیں آیا تھا اور اس نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لی تھی کہ شرمندگی نے اس کے پاؤں جکڑ لئے ہوں گے۔ اور جب دوسرے دن ان کے ہاں گئی تھی تو فضل نے واقعی بڑی شرمندگی سے اسکے ہاتھ میں چمٹا دے کر کہا تھا — "تم میرے ہاتھ پر کوئلہ رکھ دو۔"

اور جمیلہ نے بڑے فاتحانہ طریقے سے چمٹا پھینک کر اپنے دل میں کہا تھا۔ "نہیں فضل — مجھ میں اتنی ہمت کہاں۔"

اور پھر جب ایک مرتبہ وہ اپنے گڈے کو کہیں رکھ کر بھول گئی تھی تو فضل نے اس شرط پر گڈا بننا منظور کیا تھا کہ جمیلہ گڑیا بنے۔ اتنے بڑے جاندار گڈے اور بے جان ننھی سی گڑیا کا جوڑ — یہ سن کر بچپنے کے باوجود جانے کیوں اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا اور اس کے گال خون سے جلنے لگے تھے۔

اسے تو سب کچھ یاد تھا۔ سب کچھ۔ لیکن فضل — فضل تمہیں تو کچھ بھی یاد نہیں۔ اگر ہوتا تو آج میرے ہاتھ کا زخم میرے دل پر نہ اتر آتا۔ اگر یہ تمام یادیں تمہیں عزیز ہوتیں تو تم مجھ سے بچھڑ کے کبھی نہ اپنے چاچا چاچی کے ہاں رہنے کے لئے جاتے۔ یہاں بھی تو اسکول تھے۔ نئے شہر اور اپنے ابا، امی سے دور رہنے کے شوق میں تم مجھے بھی بھول گئے۔ اور اگر تمہارے چاچا کو میری حالت کا پتہ ہوتا تو وہ تمہارے ابا سے ضد کر کے تمہیں کبھی نہ لے جاتے — تمہارے ابا تمہاری شرارتوں سے تنگ تھے اسی لئے تو انھوں نے چاچا چاچی کی بات مانی تھی۔

فضل کے جانے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ گھر کی چار دیواری میں قید ہو گئی تھی۔

کبھی کبھی وہ اپنی سہیلی سے فضل کے بارے میں پوچھ لیتی تھی۔ لیکن اس سلسلے میں وقت کے ساتھ ساتھ اس کی زبان کی گھٹن بڑھتی گئی اور ایک دن گنگ ہو گئی۔ وہ باوجود کوشش کے بھی اسکے سامنے فضل کا ذکر نہیں کر سکتی تھی۔ پھر اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو احساس دلایا کہ فضل کے بارے میں سوچنا سراسر دیوانگی ہے۔ تب وہ بازار کی طرف کھلتی ہوئی کھڑکی کی درز میں آنکھیں لگا کے گھنٹوں نامعلوم شخص کی آمد کا انتظار کرتی۔ اور رات کو جب خاموشی مسلط ہو جاتی تو وہ بستر پر لیٹ کر چاند اور ستاروں سے پوچھتی۔ — میں کس کی منتظر ہوں — وہ میری زندگی میں کیوں نہیں آتا؟ اے اللہ میاں — مجھے بھی میری سہیلی کی طرح بنایا ہوتا — میں کیا کروں؟ پتھریلے ستارے صرف آنکھیں ہی جھپکتے رہتے اور چاند اس کی حالت پر مسکراتا ہوا اونچی اونچی دیواروں کی اوٹ میں ہو جاتا — نیند کے ساتھ ساتھ باوجود کوشش کے جانے کیوں پھر اسکی آنکھوں میں آ جاتا اور وہ اپنی سہیلی کی قسمت پر رشک کرتی ہوئی سو جاتی جو کہ اب اپنی خالہ کے لڑکے کے ساتھ ہفتے میں ایک مرتبہ سینما بھی چلی جاتی تھی۔

فضل بھی شاید اپنے دیئے ہوئے نشان کی طرح اس کے دماغ سے چپٹ کر رہ گیا تھا۔

آخر ایک دن اس نے اپنی تمام قوت کو سمیٹ کر اپنے ہونٹوں کا تالا توڑ ہی دیا۔

"آج کل فضل کہاں ہوتا ہے؟"۔

"اسے تو چاچا چاچی کے ہاں سے آئے ایک مہینہ ہو گیا ہے۔"

"ہیں! —"

لمحہ بھر کے لئے اسے جیسے سکتہ سا ہو گیا ہو۔

"ہاں، ہاں۔ کالج میں داخلہ لے لیا ہے نا۔"

"ا — اچھا — میں نے تو کبھی نہیں دیکھا۔" ضبط کے باوجود الفاظ اس کی زبان سے پھسل گئے۔

"صبح کا کالج گیا شام کو لوٹتا ہے۔"

جمیلہ نے دل ہی دل میں کہا — "اور"

"اب تو ماشاءاللہ اتنا جوان ہو گیا ہے کہ شاید پہچان بھی نہ سکو۔"

"میں اماں سے نہ پوچھ لوں؟" یہ بھی اس نے اپنے دل ہی میں کہا۔

"میرے بڑے بھیا اچھے ناول لاتے ہیں — تم پڑھوگی؟"

"ضرور — میں نے آج تک کوئی ناول نہیں پڑھا۔"

اپنی ماں کے منع کرنے کے باوجود جمیلہ کی آنکھیں چھت پر لگی رہتیں۔ فضل وہاں سے گزرتا اور جمیلہ کی نگاہیں اس کے اوجھل ہونے پر بھی اس کا تعاقب کرتی رہتیں۔ اس نے دو ایک مرتبہ کھڑکی کے اوپر سے چھوٹے چھوٹے کنکر مار کے اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن اس مٹی کے مادھو کو قطعاً احساس نہ ہوا کہ کوئی اس کی خاطر کھڑکی میں کھڑا رہتا ہے اور دیوانوں کی طرح چاند اور ستاروں سے باتیں کیا کرتا ہے۔ ان چاند اور ستاروں سے جو اس کے اپنے گھر کے اوپر بھی چمکتے تھے۔

اس کی سہیلی اسے مختلف ناول لا کر دیتی جنہیں وہ بہت چھپا چھپا کر پڑھتی۔ ہر کتاب کے اختتام پر اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ ناول کی ہیروئن تھی، اور فضل ہیرو۔ اس کی آنکھوں کے پردے پر ناولوں کے دلچسپ منظر فلم کی طرح گھومتے رہتے فضل کو وہ اپنی آنکھوں میں بند کرکے سو جاتی اور رات بھر عجیب عجیب سے خواب دیکھتی رہتی جن کا کوئی سر ہوتا نہ پیر۔

اس نے کئی مرتبہ اپنی سہیلی کے سامنے اپنا دل کھولنا چاہا لیکن ہر مرتبہ دل کی کتاب کے اوراق آپس میں چپٹ جاتے — ایک دن اس نے اپنے ابا کے سگرٹوں کی خالی ڈبیا سے پنی نکال کر اس پر فضل کا نام لکھ کر بلیڈ سے کاٹا اور کتاب میں رکھ دیا۔ جانے اسے کیوں یقین تھا کہ دوسری کتاب میں فضل بھی اسطرح اس کا نام لکھ کر رکھے گا۔ جب دوسری کتاب آئی تو اس نے ایک ایک ورق الٹ کر دیکھا لیکن وہاں کاغذوں پر منہ چڑاتے ہوئے الفاظ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے سوچا، شاید وہ پنّی فضل تک پہنچی ہی نہ ہو اور کہیں گر گئی ہو۔ تب وہ ہر کتاب میں اسی طرح پنّی پر فضل کا نام کاٹ کر رکھ دیتی اور دن بھر کھڑکی میں کھڑی جاگتے خواب دیکھتی رہتی۔ اور سوچتی کہ ایک رات ایسی ضرور آئے گی جب وہ اس ناول کی ہیروئن کی طرح چارپائی کی ادوائن کھول کر کھڑکی سے باندھے گی اور اس ذریعے سے وہ نیچے اترے گی جہاں فضل کھڑا ہوگا، وہ اس کے کاندھوں پر سر رکھ دے گی اور کہے گی — "فضل! میں آگئی۔"

پھر ایک شام اس کی سہیلی نے باتوں باتوں میں اسے بتایا "فضل کو اپنی پڑھائی ختم کرنے سے پہلے ہی کسی پٹرول کمپنی میں نوکری مل گئی ہے اور وہ کل آبادان جا رہا ہے۔"

اس کے دل کی حرکت لمحہ بھر کے لئے بند ہوگئی — کاش میں اس سے مل لیتی — شاید یہ پچھتاوا مجھے دیمک کی طرح ساری عمر چاٹتا رہے — مجھے اس سے ایک بار تو ملنا چاہیئے — میں اس سے ضرور ملوں گی اور اس کو اپنا دل کھول کر دکھاؤں گی اور کہوں گی — میرے دل پر جو چرکے تم نے لگائے ہیں، پہلے ان پر مرہم لگاؤ پھر جہاں جی چاہے چلے جانا — میں تمہیں ساری عمر تمہارا انتظار کروں گی — لیکن میں اس سے کب ملوں —؟ کیسے؟ — کاش وقت تھم جائے۔

وہ کوئی بہانہ بنا کر سہیلی کے پاس سے اٹھی اور جلدی سے ایک کاغذ پر لکھا — "جانے سے پہلے مجھ سے ضرور ملو۔ مجھے بہت کچھ کہنا ہے۔" اس کاغذ کو کتاب میں رکھ کر سہیلی کو دے دی۔ "لیتی جاؤ — لائبریری واپس کرنی ہے۔"

دوسری صبح ساری دنیا اپنے خوابوں میں مدہوش پڑی تھی لیکن دو آنکھیں کھڑکی میں تڑپ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ ساری دنیا پر روشنیاں چھا گئیں لیکن آنکھیں ابھی تک کھڑکی میں جھول رہی تھیں پھر ان آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ انہیں آنسوؤں میں ڈبونے کے لئے کافی تھا۔

فضل اسٹیشن جانے کے لئے تانگے میں بیٹھا۔ اس کا ہاتھ اچانک کوٹ کی جیب میں گیا اور چند چمکیلے کاغذ نکل آئے۔ تانگہ چل پڑا۔ اس نے وہ کاغذ پھاڑ کر پھینک دیئے اور پنیوں کے پرزے نالی میں بہنے لگے — جمیلہ کی کھڑکیوں میں باندھی ہوئی رسیاں ٹوٹ گئیں، جل گئیں۔

وہ سارا دن اپنے بستر پر لیٹی دوپٹے میں سر چھپائے روتی رہی

کی ماں سے وجہ پوچھی تو اس نے سر درد کا بہانہ کر کے ٹال دیا۔

پھر اس نے اپنی سہیلی سے ملنا جلنا قریباً ختم کر دیا۔ کیوں کہ اس کا سب کچھ اس آگ میں جل گیا تھا جو وہ اپنی خالہ کے لڑکے باتیں کر کے بھڑکایا کرتی تھی۔ اور پھر وہ فضل کی بہن بھی تو تھی فضل ۔ جس نے کہ اس کے احساسات کے ٹکڑے کر کے نالی میں بہا دیا تھا۔ اس کی سہیلی جب بھی آتی تو جمیلہ اپنی ماں سے کہلوا دیتی کہ اپنے رشتہ داروں کے ہاں گئی ہے۔

وہ ہر وقت فضل کے متعلق سوچتی رہتی۔ اور اکیلے میں فضل اس کے ذہن سے نکل کر اس کے سامنے آجاتا اور وہ کہتی ــــ فضل تم نے ایسا کیوں کیا ــــ؟

میں نے ہمیشہ تمہیں اپنی آنکھوں میں بسا کر رکھا ہے ــــ لیکن تم نے مجھے آنسوؤں کے جھولے میں بٹھا دیا ہے ــــ اب پھر آہستہ آہستہ آنسوؤں کا یہ جھولا خشک ہو گیا اور رفتہ رفتہ فضل اس کے ذہن کی گہرائی میں اسی طرح غائب ہو گیا جیسے بچپن میں کوئلے سے جلنے کے درد کا احساس۔

وقت نے اس کی خواہشات کے زخموں کو مرہم بن کر مندمل کر دیا تھا اور اب وہ ان زخموں کے نشانوں کو سینے سے لگائے پھر کھڑکی میں کھڑی کسی اجنبی کی منتظر رہنے لگی۔ شام کی تنہائیوں میں بال بکھیرے اور دوپٹے کو چارپائی پر رکھ کر صحن میں چکر کاٹتے ہوئے وہ پھر کسی کی پکار کا انتظار کرنے لگی۔ کھڑکی کے لئے نئی رسی بن جانے لگی ــــ وہ وقت کب آئے گا۔ جب میں رسی کے ذریعہ سے بازار میں اتروں گی اور چپکے سے کسی کے کاندھوں پر پیر رکھ کے کہوں گی ــــ میں آگئی۔

لیکن وہ وقت نہ آیا اور وہ اپنے خیالوں کے شہزادے کے جنازے کو اٹھائے ڈولی میں بیٹھ گئی۔

جب اس کی ماں نے بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کو بتایا تھا کہ اس کے لئے بڑا اچھا رشتہ آیا ہے کوئی تنگدیا سا اس نہیں ہو گی۔ لڑکا شریف ہے۔ نمازی اور پرہیزگار ہے اور اس کو یقیناً پسند آئے گا۔ تو وہ بڑے ہی عجیب ملے جلے جذبات کے ساتھ شرما کر وہاں سے اٹھ کر پچھلے کمرے میں بھاگ آئی تھی۔ اور اس کی ماں نے بیٹی کی رخصتی کے خیال سے جمع ہوتے ہوئے آنسوؤں کو پیتے ہوئے سوچا تھا کہ ایسی بیٹیاں بہت کم خوش نصیبوں کے ہاں پیدا ہوتی ہیں جو اپنے والدین کے لئے رسوائی کا باعث نہیں ہوتیں ــــ فلاں کی لڑکی فلاں کے ساتھ بھاگ گئی تھی ــــ اس کی بیٹی کا فلاں کے ساتھ یارانہ تھا ــــ فلاں ایک ہفتہ غائب رہ کر گھر لوٹی تھی ــــ اس کی ماں نے عشاء کی بعد گیارہ نفل شکرانے کے پڑھے تھے۔

جمیلہ کو شادی کے خیال سے عجیب سی سنسنی محسوس ہوتی۔ سارا سارا دن اس کے کانوں میں شہنائیاں گونجتیں اور رات کو سوتے وقت اس کی آنکھوں میں بے شمار پھول سما جاتے جب کبھی اس کو جھولے سے کھڑکی اور رسی کا خیال آجاتا تو اس کی روح کانپ جاتی ــــ ابا اور امی کی کتنی رسوائی ہوتی۔ کتنی نادانو والی خواہش تھی ــــ لیکن پھر بھی برق رو کی طرح ایک خیال اسکے ذہن کو جھٹکا دیتا ہوا گزر جاتا ــــ کاش اس کی خواہشات کی تکمیل ہو جاتی۔

کوئی شہنائی نہ بجی، کوئی پھول نہ برسا۔ اور بڑی خاموشی سے اس کا بیاہ مولوی شریف حسین سے ہو گیا۔

جمیلہ گونگھٹ کاڑھے بستر پر بیٹھی مولوی شریف حسین کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔ وہ آرہا تھا۔ اسکے قدموں کی چاپ کے ساتھ اس کے دل کی حرکت تیز ہوتی گئی۔ اسنے کمرے میں قدم رکھا تو جمیلہ کی آنکھیں جگمگانے لگیں۔ مولوی شریف نے اسلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتے ہوئے اس کا گھونگھٹ الٹ دیا۔ جمیلہ کی آنکھوں کے دیئے بجھ گئے۔ اس کے سامنے لمبے لمبے پٹوں اور چھدری داڑھی والا ایک آدمی کھڑا تھا ــــ جمیلہ پتھرا گئی۔ مولوی شریف گلا صاف کرتے ہوئے قرات کے انداز میں صدیوں سے گھسا ہوا فقرہ کہا "زندگی دو پہیوں والی گاڑی ہے اور تم دونوں اس گاڑی کے پہیے ہیں۔ ایک پہیہ بھی خراب ہو جائے تو گاڑی کا چلنا ناممکن ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اچھی بیوی

ثابت ہوگی۔"

اس نے کورک بھری گڑیا کی طرح سر ہلادیا۔ پھر مولوی شریف نے کمرے کی بتی بجھادی اور سب کچھ اندھیرے میں ڈوب گیا اُجالا ——!

لیکن یہ اجالا اس کے لئے وہ اجالا ثابت نہ ہوا جس سے انسان کی روح تک روشن ہوجاتی ہے اس نے زندگی کے دھکے پہیے کو بڑی گریس دی لیکن وہ پہیہ اپنی ہی آواز میں چرچراتا رہا۔

مولوی شریف صبح دفتر جاتا اور شام کو گھر میں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے ٹھہر کر اپنے پیرومرشد قبلہ حاجی صاحب کے ہاں چلا جاتا اور وہاں سے رات گئے لوٹتا۔ جمیلہ کی آنکھیں اس کے انتظار سے پتھرا جاتیں اور پھر جب اس کے دل و دماغ پر مایوسیاں حاوی ہوجاتیں تو وہ سوچتی —— شریف ایسا کیوں ہے —— وہ میری ہمسائی کے خاوند کی طرح کیوں نہیں —— وہ کیوں مجھے اپنے پیر صاحب کی خواہشات پر قربان کر رہا ہے —— اُس کا میرے ساتھ مشینی برتاؤ کیوں ہے۔ اگر میں کسی چیز کی خواہش کرتی ہوں تو غربت آڑے آجاتی ہے لیکن پیر صاحب کے لئے وہ دنیا کا سب سے امیر آدمی بن جاتا ہے —— وہ بھی اسے نہیں سمجھاتے —— وہ کیوں مجھ سے میری مسرتیں چھین لینا چاہتے ہیں۔؟

جب اس کے ذہن میں کیوں کی تکرار شروع ہوجاتی تو لوبان کے دھوئیں عطر کی خوشبو اور سرسبز چادریں اس کے دماغ پر تن جاتیں جن کے پیچھے اسے کچھ نظر نہ آتا۔ جب وہ مولوی شریف سے شکوہ کرتی تو وہ بہت ناراض ہوکر کہتا —— میں دنیا کی خوشیوں کو آخرت کے لئے قربان کر کے اپنی عاقبت سنوارنا چاہتا ہوں اور قبلہ حاجی صاحب اس کا وسیلہ ہیں اور تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ تم گاڑی کا دوسرا پہیہ ہو۔

پھر وہ دنیا اور آخرت کے چکر میں پڑ جاتی اور سوچتی —— کیا واقعی دنیا میں پیروں کے کھاتے میں جمع کرائی گئی خوشیاں اس کو آخرت کے بنک سے مل جائیں گے؟

مولوی شریف کے رویّے کے متعلق وہ اپنے ابا امی سے کچھ نہیں کہتی تھی۔ اس کو پتہ تھا کہ وہ اس بارے میں کچھ نہیں سنیں گے کیونکہ انھوں نے اسے ڈولی میں بٹھاتے وقت کہا دیا تھا کہ جب والدین بیٹی کو رخصت کر دیتے ہیں تو بعد میں انہیں کسی بات پر اختیار نہیں ہوتا۔ اس کا خاوند ہی سبھی کچھ ہوتا ہے۔

ایک دن وہ بہت ہی مجبور ہوکر حاجی صاحب کی خدمت پر حاضر ہوئی اور رو رو کر سارا حال بیان کیا۔ حاجی صاحب مراقبے میں چلے گئے اور جب کافی دیر بعد برآمد ہوئے تو انھوں نے حق کا نعرہ لگاتے ہوئے کہا "یہ تو کچھ نہیں —— وہ مجذوب ہوجائے —— مجذوب۔"

اس کی دنیا اور بھی اجڑ گئی۔ اس کی امیدوں نے جس نازک شاخ پر بسیرا کیا تھا وہ حاجی صاحب کے نعروں سے ٹوٹ گئی ان کے جلال سے جل گئی۔ اس کا ذہن مفلوج ہوگیا تھا جو اپنے مستقبل کے متعلق بھی کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔

اس کے اور ساتھ کے مکان کے درمیان ایک کھڑکی تھی جو کمرے میں جاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف سے ہمسائی کی طرف کھلتی تھی۔ اس کی ہمسائی نے جمیلہ کی سہولت کے لئے اپنے گھر کی طرف سے بانس کی سیڑھی لگادی تھی تاکہ وہ اس کے گھر آسانی سے جاسکے۔ وہ کھڑکی کے ذریعے سے ہمسائی کے پاس چلی جاتی اور اس کے پاس رو رو کر جی کو ہلکا کیا کرتی اور اس کے بچے سے دل بہلایا کرتی۔ اس کی ہمسائی اس کو تسلی دیا کرتی کہ خدا کے ہاں دیر ہے۔ اندھیر نہیں —— سب ٹھیک ہو جائے گا اور وہ سوچتی —— دیر کرنے والا ہی جانتا ہے کہ یہ سب کب ٹھیک ہوگا۔

پھر اس نے مولوی شریف کا انتظار کرنا چھوڑ دیا کیونکہ اس نے اس دن سے شام کے وقت بھی آنا چھوڑ دیا۔ جس دن جمیلہ نے اسے بتایا تھا کہ اس کے پیٹ میں دوسرا دل دھڑکنے والا ہے مولوی شریف حاجی صاحب کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہتا اور اپنی ایک خواہش کو ان کے سامنے دہراتا کہ

طرح انکے ہاں لڑکا پیدا ہوتا کہ وہ اسے ان کی سپردگی میں دیتے اور وہ بھی ان کے سلسلے کی تبلیغ کرے ۔۔۔ حاجی صاحب فرماتے ۔۔۔ "خدا نے چاہا تو لڑکا ہوگا۔"

جس رات جمیلہ کو بچہ پیدا ہونے والا تھا، مولوی شریف پیر صاحب کے ہاں بیٹھا دعا میں مشغول رہا۔ گھر میں ہمسائی کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ جب تکلیف زیادہ بڑھی تو ہمسائی کے خاوند نے اس کی ماں کو تار دے کر دایہ کو بلا لایا۔ ماں کے آنے سے پہلے ہی بچہ پیدا ہو گیا ۔۔۔ لڑکی تھی!

دوسری صبح مولوی شریف آنکھوں میں رات کی نیند لیے آیا۔ جمیلہ نے شادی کی رات کے بعد پہلی مرتبہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔ مولوی شریف نے بڑی بے صبری سے پوچھا۔

"کیا ہوا ۔۔۔؟"

جمیلہ نے ہونٹوں پر ادھوری مسکراہٹیں سمیٹتے ہوئے کہا، "لڑکی"

مولوی شریف کو جیسے سکتہ سا ہو گیا ہو۔ پھر وہ الٹے پاؤں پیر صاحب کے ہاں بھاگا ۔۔۔ اس نے چیخ کر پیر صاحب سے کہا، "قبلہ حاجی صاحب ۔۔۔ لڑکی پیدا ہوئی۔"

وہ مسکرائے "یہ تو ہم نے تمہارے جانے کے بعد ہی دیکھ لیا تھا ۔۔۔ ہم نے تو صحیح کہا تھا لیکن خدا نے اپنے پیارے کی بات کو زیادہ مقدم سمجھا ۔۔۔ ارے پاگل! جس گھر میں لڑکی پیدا ہو وہاں رسول اللہ سلام بھیجتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تم ولایت کے بہت قریب پہنچ گئے ہو۔"

مولوی شریف ان کے قدموں میں گر کے انکے پیر چومنے لگا جیسے ولایت سمیٹ رہا ہو۔

جمیلہ کے دکھ بٹ گئے اور اس کی تمام پریشانیاں اپنی بچی کو خوش دیکھنے میں تبدیل ہو گئیں۔

رات کے سانچوں میں دن ڈھل ڈھل کر نکلتے رہے اور وقت پر لگا کر اڑ گیا۔

جمیلہ بڑی حیران تھی کہ عابدہ کیوں نہیں اس کی طرح سارا سارا دن چھجے میں کھڑی رہتی۔ وہ کیوں نہیں سر شام ہی کوٹھے پر چلی جاتی اور بیقراری میں ٹہلتی۔ وہ میری طرح ۔۔۔ میری طرح ۔۔۔ ایسے اجنبی کی منتظر کیوں نہیں جس کیلئے وہ کھڑکی میں رسی باندھ کر نیچے پھینکے اور اسے کہے ۔۔۔ "میں آگئی۔"

چلو اچھا ہے ۔۔۔ بے چاری خواہ مخواہ کی پریشانیوں سے بچی ہوئی ہے۔

ایک رات وہ عابدہ کے مستقبل کے متعلق سوچتی ہوئی کہ وہ اسکے لیے کیسا دولہا لائے گی۔ سونے ہی والی تھی کہ عابدہ چپکے سے اٹھی اور جمیلہ نے کمرے میں دہکتے ہوئے کوئلوں کی مدھم روشنی میں دیکھا کہ دروازہ کھول کر باہر چلی گئی ہے۔ جانے وہ بھی کیوں دبے پاؤں اس کے پیچھے آئی اور دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر اسے دیکھنے لگی عابدہ سیڑھیوں کے درمیان ہمسائی کی طرف کھلتی ہوئی کھڑکی کے سامنے رک گئی اور آہستہ سے کھڑکی کی کنڈی کھول دی۔ دوسری طرف ٹھک سے کوئی چیز دیوار کے ساتھ لگی اور عابدہ نیچے اتر گئی۔ جمیلہ نے کھڑکی سے ذرا سا سر نکال کر دیکھا اس کی ہمسائی کا بیٹا حمید، پتھروں کو بھی کپکپا دینے والی سردی میں کھڑا عابدہ سے باتیں کر رہا تھا۔ بانس کی سیڑھی جو شام کے وقت اتار کے زمین پر رکھ دی جاتی تھی، دیوار سے لگی تھی اور عابدہ اس سیڑھی کے آخری قدم پر بیٹھی تھی۔

جمیلہ کا بوکھلایا ہوا دل کھڑکی سے اچھل کر گرنے لگا ۔۔۔ لوٹ آؤ عابدہ ۔۔۔ تمہیں اپنے خاندان کی عزت کا کوئی خیال نہیں؟ شریف گھرانوں کی بیٹیاں یوں نہیں کیا کرتیں ۔۔۔ عابدہ تمہیں شرم آنی چاہیئے ۔۔۔ تمہارے ابا آلیں سہی ۔۔۔ میں کل ہی اس کھڑکی کو اینٹوں سے چنوا دوں گی ۔۔۔ کھڑکی ۔ کھڑکی ۔۔۔ رسی ۔۔۔ رسیاں ۔۔۔ میں آگئی ۔۔۔

تھوڑی دیر بعد عابدہ نے حمید کے سینے سے لگ کر کہا "اب میں جاتی ہوں۔"

اور جمیلہ فوراً ہی اندر آ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی ——— وہ عابدہ سے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ جانے اس کا تمام غصہ اتنی سردی میں اسے پسینے میں شرابور کر کے کہاں چلا گیا۔ اس کے ذہن میں بڑے عجیب سے خیالات گڈ مڈ ہوتے رہے ——— جانے کیوں اس کا دل انجانی خوشیوں سے ناچتا رہا ——— اس رات اسے پہلی مرتبہ محسوس ہوا تھا کہ دنیا میں غموں کے ساتھ خوشیاں بھی رہتی ہیں۔

وہ ہر رات عابدہ کو حمید کے ساتھ دیکھتی اور ہر رات اس کی آنکھوں میں ان دیکھی دنیا آباد ہو جاتی اور وہ عابدہ کی تمام مسکراہٹوں کو اپنے ہونٹوں پر سمیٹ لیتی۔

ایک مرتبہ ستارے اپنی آنکھیں جھپک جھپک کر گئے، لیکن عابدہ، حمید کے ساتھ باتیں کرتی نہ تھکی۔ پیر صاحب کے ہاں سے مولوی شریف کے آنے کا وقت قریب تھا اور وہ حمید کے کاندھے پر سر رکھے بیٹھی تھی۔ جمیلہ ایسے موقع پر اپنے خاوند کی آمد کے تصور سے لرز گئی۔ وہ جلدی سے اپنے کمرے میں آئی اور کمرے کی بھاری چیزیں ادھر ادھر کرنے لگی۔ عابدہ کمرے میں آواز سن کر چونکی اور بھاگ کر کمرے میں آ گئی۔ جمیلہ فوراً بستر میں لیٹ گئی۔ عابدہ نے اسے سوتے دیکھ کر اپنے دل کو تسلی دی کہ بلّی ہو گی۔

سردیوں کی ایک چمکیلی دوپہر کو جمیلہ، مکان کی چھت پر بیٹھی کروشیے سے کچھ بُن رہی تھی۔ تاگے کا گولا زمین پر جا پڑا۔ وہ گولے کو اٹھانے کے لئے اٹھی۔ جونہی اس کا سر دیوار سے اونچا ہوا ایک پتھر سامنے کی دیوار سے ٹکرایا۔ پتھر کے گرد ایک کاغذ لپٹا ہوا تھا۔ اس نے کاغذ کھول کر پڑھا۔ عابدہ کے نام حمید کا خط تھا۔ اس نے خط پڑھ کر پھر اسی طرح پتھر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد عابدہ دھلے ہوئے کپڑے دیوار پر ڈالنے آئی۔ اس کی نظر پتھر پر جا پڑی۔ اس نے دھڑکتے دل سے اٹھایا اور جلدی سے خط کو گریبان میں اڑس کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ جمیلہ اس کو یونہی گھور رہی تھی۔

"کچھ نہیں امّی ——— پتھر ہے۔ آج صبح ہی ——— جھاڑو دے کر گئی ہے پھر ...... "

"کھانا پک گیا؟"

"جی مائی روٹیاں پکا رہی ہے۔"

جمیلہ مسکرا دی اور جانے کیوں اسے گلے سے لگا لیا۔

"بڑی اچھی ہے میری بیٹی۔"

مولوی شریف نے ایک رات جمیلہ کو اٹھایا۔ اس نے عابدہ کو دیکھا، وہ سو رہی تھی۔ اس نے جمیلہ سے کہا، "میری خواہش تھی کہ میرے گھر لڑکا پیدا ہوتا اور میں اسے حاجی صاحب کی غلامی میں دے دیتا۔ لیکن میری بدقسمتی عابدہ پیدا ہو گئی۔ لیکن بزرگوں نے میرے تمام دکھ اپنا لئے اور قبلہ حاجی صاحب کو بشارت دی کہ عابدہ کو ان کے صاحبزادے کی غلامی میں دے دیا جائے ——— جمیلہ! مجھ جیسے گنہگار کے لئے یہ بہت بڑی بات ہے۔ شاید اسی طرح بخشا جاؤں۔"

جمیلہ جیسے کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔ مولوی شریف نے کہا، "میں نے ہاں کر دی ہے۔"

وہ اس سے خوب لڑی لیکن مولوی پر کوئی اثر نہ ہوا ——— اور اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا، "ہماری خوش نصیبی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ حاجی صاحب کے فرزند ارجمند کی اولاد ہمارے خاندان سے ہو گی ——— عابدہ اس مہینے کے آخر میں بیاہ دی جائے گی۔"

عابدہ اس مہینے کے آخر میں قربان کر دی جائے گی۔ اور میں دیکھتی رہوں گی ——— صرف دیکھتی رہوں گی ——— الٹھیاں ——— میری آرزوؤں کی کلیاں ——— عابدہ سے اس کا ذکر کیا تو اس کے آنسو بھی نہ بہہ سکے ——— اس کے مرجھاتے ہوئے چہرے نے اپنی ماں سے کہا "بی بی ——— کیا آپ میری خاطر کچھ نہ کریں گی؟"

"پیاری بیٹی ——— میں مولوی شریف کی بیوی ہوں ——— میں کیا کروں۔"

اس گھر کو پھر سے اداسیوں نے گھیر لیا۔

حمید کے دوسرے ہمسائے گھر میں سفیدی کرانے کیلئے وہ سیڑھی مانگ کر لے گئے تھے۔ عابدہ کھڑکی میں کھڑی رہتی اور حمید چارپائی کو دیوار کے ساتھ لگا کر اس پر چڑھ کر اس کے

قریب ہو جاتا ـــــ اور جمیلہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی سب کچھ سنتی رہتی اور اپنے آنسوؤں میں گھلتی رہتی ـــ "جانے کیا ہوا"

پھر شادی سے ایک ہفتہ پہلے عابدہ بہت جلد کھیت سے لوٹ آئی۔ جمیلہ نے لحاف سرکا کے اپنی موندی ہوئی آنکھوں کے روزن سے دیکھا۔ عابدہ نے اپنے کپڑے نکال کر گٹھری میں باندھے اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اپنی بی بی کو دیکھ کر کھڑکی میں آ گئی۔

اس نے گٹھری کھڑکی سے پھینکی جو حمید نے دبوچ لی۔ پھر وہ کھڑکی سے نیچے اتری لیکن چارپائی پیروں کی پہنچ سے باہر تھی۔ وہ بہت ہی پریشانی میں کمرے میں آ گئی اور بڑی بیقراری سے اپنے دوپٹے کے پلو کو انگلیوں سے مسلنے لگی۔

جمیلہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سب کچھ خواب میں ہو رہا تھا۔ جانے کیوں اس کی بولنے کی حس ختم ہو گئی تھی جیسے اسے اپنے اوپر بالکل اختیار نہیں تھا۔ جیسے سب کچھ سیلاب میں بہہ رہا تھا۔

پھر عابدہ نے یکدم اپنی چارپائی کی ادوائن کھولی اور جلدی سے باہر آ گئی۔ جمیلہ نے دروازے کے پیچھے چھپ کر دیکھا کہ وہ رسی باندھ کر کھڑکی سے اتر رہی ہے۔ جمیلہ کھڑکی میں آ گئی۔ اور عابدہ نے حمید سے لپٹ کر کہا "میں آ گئی" اور ان دونوں کو چاندنی میں ڈوبے ہوئے اندھیرے نے نگل لیا۔

جمیلہ نے کھڑکی سے رسی کھول کر کنڈی لگائی اور کمرے میں آ کر عابدہ کی چارپائی میں رسی پرونے لگی۔ جیسے خواب کے خوشنما اور بھیانک احساسات کو ایک دوسرے سے پرو رہی ہو۔

# گلکا تجربہ کاپی

گجرات میں اردو میڈیم کے پرائمری اسکول کے طالبعلم ابھی تک گجراتی زبان کی پریوگ پوتھی استعمال کرتے تھے جس سے انھیں نیز اساتذہ کو بڑی زحمت ہوتی تھی۔

مگر اب انھیں یہ زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں کیونکہ

گجرات اردو لٹریری اینڈ کلچرل اکیڈمی (گلکا) نے اسے اردو میں پہلی بار شائع کر دیا ہے۔ گلکا تجربہ کاپی تمام کاپیوں سے زیادہ خوبصورت اور کارآمد ہے۔ قیمت صرف دو روپئے ہے۔

ضرورت مند اسکول اساتذہ اور طالب علم "گلکا تجربہ کاپی" حاصل کرنے کے لئے ادارہ گلکا سے رابطہ قائم کریں پندرہ مئی تک ہمارے پاس آڈر آ جائیں: جنرل سکریٹری گلکا پتہ ۲۰/۱/۴۷. گجرات ہاؤسنگ بورڈ کالونی شاہ عالم احمد آباد (۱۸ــ۳۸)

ریاض انکلی (دھوراجی)

# نوحہ گر

.....اور جب میں اس کی گرفت سے آزاد ہوا تو میرے ذہن میں نجات کا ایک ہی راستہ تھا فرار ـــــ اور پھر میں اونچی نیچی سڑکوں پر دوڑنے لگا۔

دوڑنا ـــــ لمحہ بھر کیلئے محفوظ مقام پر رکنا اور حالات کا جائزہ لیکر پھر سابقہ عمل کو دہرانا ۔ دس سال کا ایک طویل عرصہ اسی طرح گذر گیا۔ جیسے صفحۂ قرطاس پر متوازی خطوط ۔ مگر ہاں ـــ اس درمیان جب میں دوڑتے دوڑتے کسی چوراہے پر پہنچا تو کچھ نئے لوگوں سے ملاقات ہوتی۔ جو دیکھنے میں بڑے سیدھے سادے لگتے مگر اندر سے کچھ اور ہوتے۔ کچھ عرصہ قبل میری ملاقات ایک گروہ سے ہوئی۔ مقام کا نام تو یاد نہیں ۔ مگر وہ بھی کوئی چوراہا تھا۔ اس چوراہے کی شہرت دور دور تک تھی۔ کیونکہ یہ شہر کا واحد چوراہا ہے، جہاں شہر کے سارے عقلمند جمع ہوتے ہیں۔ جب ان لوگوں کے سردار کی نگاہ مجھ سے ٹکرائی تو وہ سہم گیا۔ اور میرے قریب آکر میرے کان میں کچھ راز کی باتیں کہہ گیا۔ میں نے ان باتوں کو ذہن کے تہہ خانے میں بند کر دیا اور ان سے وعدہ کرکے آگے کی سمت بڑھ گیا کہ پھر کبھی ملاقات کرونگا۔ ذہن میں اس سردار کی باتیں گردش کرتی رہیں ۔ کبھی فیصلہ کرتا کہ اس سردار کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ دوں۔ مگر ضمیر للکار رہا تھا۔

"اگر تم نے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ دیا تو پھر گرفت میں آجاؤ گے ؟"

نہیں ـــ نہیں ـــ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ حرارت سے میرا سارا جسم تپ رہا تھا۔ سکون کیلئے قریب کے نل پر بیٹھ جاتا ہوں۔ آنے جانے والے میری اس حرکت پر قہقہہ لگا رہے تھے۔ مگر انہیں کیا معلوم کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں، کچھ دیر پانی لگنے کے بعد سکون ملا تو میں پھر دوڑنے لگا۔ میں جب کسی مقام پر رکتا کہ کچھ لمحہ سکون کروں تو پھر بار ایک انجانی آواز کان سے ٹکراتی اور میں سہم کر پھر دوڑنے لگتا۔

اب تک میں تھکا نہیں ہوں۔ میرے شریان کا خون گرم ہے خون ـــ گرم ـــ گرم ـــ خون ـــ میں دوڑ سکتا ہوں۔ ایک طویل مدت تک۔

اور جب میں شہر کے ایک اور چوراہے پر پہنچا تو نوجوانوں کی ایک جماعت نظر آئی۔ جو کسی بات پر آپس میں تکرار کر رہے تھے اور فیصلہ صفر نظر آرہا تھا۔ میں ان لوگوں کے قریب پہنچا تو وہ سب خوش نظر آرہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں ان لوگوں کے درمیان گھر چکا تھا۔ جماعت سے ایک نوجوان آگے بڑھا۔ اور اس نے میرے سر پہ تاج رکھ دیا۔ چند ایک کو چھوڑ کر سبھوں نے میری تائید کی۔ مجھے سرداری مل چکی تھی۔ برسوں بعد کسی نے مجھے اہمیت دی ورنہ اس شہر میں مجھے پہچاننے والا بھی کوئی نہ تھا۔ جبکہ میں پیدا اسی شہر میں ہوا۔ پرورش پائی۔ نوجوان ہوا۔ مگر ہر کوئی گرفتار کرنے کے درپہ تھا۔

ایک روز، دن تو یاد نہیں۔ مگر سردی کا زمانہ تھا۔ میں اپنے گروہ کے ساتھ گورستان کی سمت جا رہا تھا کہ وہی انجانی آواز کان سے ٹکرائی "بھائی۔ تم جس راستے پر جا رہے ہو۔ خطرناک ہے۔" آواز کے کان سے ٹکراتے ہی میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں۔ وہی گروہ کا سردار میرے پیچھے کھڑا ہے۔ اور نصیحت کے انداز میں میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے اسی راستے پر جانے سے

رُک رہا تھا۔ میری جماعت کے تمام نوجوان گروہ کے سردار کی باتیں سن کر پیچھے ہٹ گئے۔ مگر میرا عزم بلند تھا۔ میں نے پیچھے ہٹنا گوارہ نہیں کیا۔ اور تنہا آگے کی سمت بڑھ گیا۔ بڑھتا گیا۔

گورستان قریب تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ گورستان کے درمیان چند انجان شخص سر نیچا کئے باادب کھڑے ہیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعی تاخیر نہیں ہوئی کہ کوئی اس داعی اجل کو الوداع کہہ گیا ہے۔ میں ان لوگوں کے قریب پہنچا۔ میرے پہنچنے سے ان لوگوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ قبر تیار ہو چکی تھی۔ اب وہ سب تابوت کھول کر لاش کو قبر میں ڈالنے کا انتظام کر رہے تھے۔ مگر جیوں ہی ان لوگوں نے تابوت کے اوپر سے چادر ہٹایا، میں یہ دیکھ کر متحیر ہو گیا کہ تابوت میں لاش کے بجائے چند کاغذات تھے۔ اور وہ سب ان کاغذات کو بڑے احترام سے قبر میں ڈال رہے تھے۔ میں یہ سب سہما سہما دیکھ رہا تھا۔ سارا کام تمام ہو جانے پر جب وہ سب واپس جانے کیلئے مڑے تو ان لوگوں کی نگاہ میرے جسم سے ٹکرائی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان لوگوں نے مجھے گرفت میں لے لیا۔

وہ لوگ خوش ہیں کہ میں ان کا غلام ہوں، حالانکہ میں قبر میں دفن ہوں۔

---

حلیمہ فردوس (بنگلور)

# ننھا یوسف

ہر روز اذاں کے بعد دوسری چیز نکالنے والی آواز ایک ننھے لڑکے کی ہوتی تھی جو صبح سرگرم لمحات کا خیال کئے بغیر دودھ امرت بانٹتا پھرتا تھا، اس کے معصوم ہاتھوں سے دیا ہوا دودھ کا بوتل بھی امرت کے مانند نظر آتا

کالا بھجنگ، بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس یہ لڑکا پتہ نہیں کیوں میرے دل و دماغ کا ایک حصہ بن کر رہ گیا تھا، صبح کی اولین ساعتوں میں ہوا کے سرد جھونکے کے ساتھ اس کا پھٹا ہوا لباس بدن میں ایک جھرجھری پیدا کرتا اور اس نیم تیر کش کا اثر صرف چند لمحے رہتا جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور میں اپنے کام میں جٹ جاتی یعنی مشین بن جاتی تو ساری انسانیت دھری کی دھری رہ جاتی۔ البتہ دوسرے دن جب اس کا سامنا ہوتا تو میں اس کے چہرے پر مفلسی کے باوجود بشاشت دیکھ کر حیران رہ جاتی، اکثر وہ بلا جھجک دروازہ کھولے گھر میں چلا آتا اور گھر کی ساری چیزوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا یا ٹھہرے ٹھہرے بلند آواز میں کچھ گنگنانے لگتا لیکن میں اسکی ہر زیادتی نظر انداز کر جاتی اس معصوم پیکر کو ڈانٹنا مناسب نہ سمجھتی، ایسے میں گھر کا کوئی فرد اس کی زیادتی پر ڈانٹ دیتا تو گویا میرا سویا ہوا جذبہ ترحم جاگ اٹھتا، سوچتی کیا ایسی زندگی بھی گزارنے لائق ہے یہ ننھی ذات تو رحم کی بھی طالب نہیں، در اصل یہ عزم کا پیکر ہے جس کا خمیر مفلسی سے گوندھا گیا ہے امیر گھرانوں کے آہنی در و دیوار کے لئے یہ ایک چیلنج ہے، اپنا رزق آپ کمانے والی بہترین مثال یہ تو صبح آرام حرام ہے، کا سبق دیتا چلا جاتا ہے، اس کی زندگی کاہلی کے منہ پر بھرپور طمانچہ ہے۔

اس کا اور میرا رشتہ اس وقت منقطع ہوا جب ایکدن اس ننھے نادان نے میری الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑی معصومیت سے کہا، آپ کی ماں نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ اس الماری سے دو سو روپے غائب ہیں، اور اسے میں نے چرائے ہیں، اتنا کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا، میری ماں نے کہا ہے کہ ایسی نوکری کی ضرورت نہیں اس لئے میں کل سے نہ آؤں گا۔ میں اس کی صاف گوئی پر ششدر رہ گئی، اسے ماہانہ آمدنی ختم ہونے کی پرواہ تھی اور نہ چوری کا الزام سر آنے کی، وہ [illegible] پن سے مسکراتا مہینہ بھر کی کمائی جو صرف دو روپیہ تھی لے کر چلا گیا، اور میں یہ سوچتی رہی کہ غم و عقوبت سے بیشتر دامن یوسف کو بھلا کون دیکھتا ہے، خالق آزماتا تو سب کو ہے، لیکن پیغمبری صرف ایک لاکھ اسی ہزار کے ہاتھوں ہی آتی ہے، آج بھی دل یہی کہتا ہے کہ دودھ کی طرح اجلا پن رکھنے والے کا دامن دھلا کہ نہیں۔

عتیق احمد عتیق (مالیگاؤں)

## آزاد غزل

یہ دل کبھی ریگزار سا تھا
کبھی اک اجڑا دیار سا تھا
بہت سی بےنام الجھنوں کا شکار سا تھا
میں پھر بھی باغ و بہار سا تھا
یہ آگ کیسی تھی جسم و جاں میں
کہ درد کا پیڑ جل کے بھی سایہ دار سا تھا
گذر گیا جو
وہ لمحہ کیا خوش گوار سا تھا
ترے جہنم سے جسم کا لمس آتشیں بھی
میرے لئے برف زار سا تھا
جو دھیرے دھیرے کہیں سے کانوں میں آرہی تھی
سماعتوں پر اسی صدا کا غبار سا تھا
مجھے یہ دکھ ہے کہ خود سے جب آگہی نہیں تھی
تو دل پہ کیوں اختیار سا تھا
عتیقؔ! چپ کیوں ہو کچھ تو بولو
تمہیں تو اپنے وجود کا اعتبار سا تھا

ظفر ہاشمی (جمشید پور)

## غزل

ظلمتوں کی بستیاں ہولناک ہو گئیں
جگنوؤں کی دھڑکنیں تابناک ہو گئیں
جو چٹان آگئی، پاش پاش ہو گئی
سخت سخت منزلیں کرب ناک ہو گئیں
چلچلاتی دھوپ کی آگ اتنی تیز تھی
چاندنی کی رونقیں خوفناک ہو گئیں
تیز و تند آندھیوں کا چلا وہ سلسلہ
گرم گرم قربتیں، چاک چاک ہو گئیں
شاخ شاخ زہر آلود تھی کچھ اس قدر
نیلی نیلی تتلیاں سب ہلاک ہو گئیں
جب پرند چھپ گئے اک عمیق جھیل میں
دشت، سبز وادیاں خوابناک ہو گئیں
ابر بھی رہا ظفرؔ پیاس کی تڑپ لئے
گنگناتی ندیاں، جل کے خاک ہو گئیں

اختر ہوشیارپوری (پاکستان)

## غزل

لوگ بیگانے ہیں تم ناواقف
یہ کہیں شہر تمنا تو نہیں
بات پھیلی ہے جہاں میں کیونکر
ابھی ابھی دنیا ساری
لوگ کیا کچھ نہیں کہتے مجھ کو
غم ہی اپنے سے ہے شناسا اخترؔ

عشق میں کون کسی کا واقف
کوئی میرا نہ تمہارا واقف
تم مرے غم سے تھے تنہا واقف
کاش میں تم سے نہ ہوتا واقف
تو بھی کچھ فکر کہ ہے اپنا واقف
دل ہی بےدل ہے نہ ہے کیا واقف

شہپر رسول (علی گڑھ)

## غزل

دیکھتے دیکھتے ایک دن یہ جہاں چھوڑ جاؤں گا میں
لہلہاتا ہوا دشتِ آہ و فغاں چھوڑ جاؤں گا میں

پانیوں کے سفر سے نہ لوٹا اگر تو تمہارے لئے
کشتیِ خستہ جاں اور پھٹا بادباں چھوڑ جاؤں گا میں

میری اک چیز بھی دوستو! تم لٹیروں پہ مت چھوڑنا
اپنی ہر چیز پر انگلیوں کے نشاں چھوڑ جاؤں گا میں

آتشیِ دیوتا جستجو میں تری جل گیا بھی اگر
راکھ قدموں میں اور آسماں پر دھواں چھوڑ جاؤں گا میں

میرے دشمن تو خنجر کو پیاسا نہ رکھ رہبری کو تری
حاصلِ داستاں اک ادھورا بیاں چھوڑ جاؤں گا میں

ہوں سمندر مجھے آگ میں کودنا کوئی مشکل نہیں
سوچ لو ہر کسی کے لئے امتحاں چھوڑ جاؤں گا میں

مجھ پہ ہنستے ہیں کیوں یہ در و بام گرتے ہوئے جسم کے
شہپر ان سے کہو ایک دن یہ مکاں چھوڑ جاؤں گا میں

نذیر فتحپوری (پونہ)

## غزل

جب مرے چہرے سے ظاہر اسکا چہرہ ہو گیا
شہر میں اس بات کا ہر سمت چرچا ہو گیا

رنجشوں کی شاخ دونوں سمت پانی میں رہی
بڑھتے بڑھتے فاصلوں کا پیڑ اونچا ہو گیا

خواہشوں کی کوکھ نے جنمے ہزاروں وسوسے
ہر عقیدہ ریت کی دیوار جیسا ہو گیا

راستے کی چہچاتی بھیڑ گھر میں آ گئی
خواب جب ٹوٹا تو کمرے میں اندھیرا ہو گیا

سر چھپائے گی کہاں اب ڈار چڑیوں کی نذیر
سنتے ہیں پیڑوں پہ سانپوں کا بسیرا ہو گیا

عبدالحلیم ناشاد
کلکتہ

## غزل

اپنے بھی مرے لگتے ہیں اغیار کی طرح
چبھتا ہوں ان کی آنکھوں میں اک خار کی طرح

پڑھ لیجئے مجھے بھی بہت کام آئیگا
میں ہوں کسی نوشتۂ دیوار کی طرح

بڑھ کر گھٹی وگھٹ کے بڑھی اور مٹ گئی
قسمت ہے میری سایۂ دیوار کی طرح

اک جملہ "دیکھا جائیگا" کہہ کر نکل گئے
انکار بھی تو ان کا ہے اقرار کی طرح

اک روگ اپنے دل میں لگاکر خموش ہیں
ناشاد میں انھیں میں ہوں لاچار کی طرح

سلیمان اطہر جاوید (ترو پتی)

## غزل

جو ہے موجود وہ معدوم ہو گا — جو واضح ہے وہی موہوم ہو گا
تمہارا جرم تو ہم جانتے ہیں — ہمارے نام پر مرقوم ہو گا
شب تاریک ہو گا قتل پھر اک — سویرا آج پھر مغموم ہو گا
ابھی تک شمر کے ہاتھوں میں خنجر — حسین عصر کا حلقوم ہو گا
چلیں گے تیر پھر ابن علی پر — یزید کینہ خو معصوم ہو گا
اگر چہ ظلم ہم سہتے رہیں گے — مگر ظالم یہاں مظلوم ہو گا
ادا کہئے یہ پھر بھی پوچھتے ہیں — انہیں تو حال دل معلوم ہو گا
جواباً خامشی ہی خامشی ہے — کسے معلوم کیا مفہوم ہو گا
بٹے گی دولت دنیا اگر چہ — ہمارا دل مگر محروم ہو گا
چلو، یوں ہی سہی ترک تعلق — سمجھ لیں گے یہی مقسوم ہو گا

بظاہر خود کو وہ کہتا ہے زندہ
جو اندر دیکھئے مرحوم ہو گا

---

غیاث اثر (بھاگلپور)

## غزل

زخموں کو میرے نہ اب صلا دے
ہر پھول سے کہہ کہ مسکرا دے
دیوار تک آ گئی سیاہی
جسموں کے چراغ اب بجھا دے
چلتا رہا رات بھر اکیلا
تارا کوئی صبح کا دکھا دے
ہر نقش بر آب مٹ چلا ہے
لہروں کو ذرا کوئی جگا دے
اک موڑ پہ آگیا ہے دریا
پلکوں کے بھی بادباں ٹمکا دے
گر کر اثر تیری نظر سے
پتھر نہ ہے راہ کا ہٹا دے

xxxxxxxx

---

شمیم قاسمی (سسرام)

## غزل

وہ گمشدہ سا موسم جو نفس نفس میں تھا — تمام عمر میں عرفان دسترس میں تھا
یہ اور بات ہے اونچی اڑانیں بھرتا ہے — دل حزیں کا پرندہ کبھی قفس میں تھا
نواح جسم کی دیوار گر گئی آخر — یہ مانتا ہوں عجب ذائقہ ہوس میں تھا
طلب نہ کرنا کبھی کیفیت زمانے کی — میں ذہنی طور پہ مدت سے پیش و پس میں تھا
جو زندگی کی حقیقت سے بے نیاز رہا — یہ کاروبار زمانہ اسی کے بس میں تھا

یہ نرم و گرم سے بستر، یہ پھول سی چادر
مگر سکون بڑا مجھ کو خار و خس میں تھا

رعنا مہدی (مظفر پور)

## غزل

سلوک اس نے مرے ساتھ جارحانہ کیا
جو دشتوں کے سفر پہ مجھے روانہ کیا

وہ پچھلی یاد کی جھنکار تھی کہ رو بیٹھا
لباس زیب بدن میں نے جب پرانا کیا

جہاں بھی ہو گیا احساس تیرنے ہونے کا
وہیں پہ خیمہ گرایا وہیں ٹھکانہ کیا

یقین اس کو بھی آیا نہ دھندلے منظر پر
بھروسہ میں نے بھی خوابوں کا اک ذرا نہ کیا

میں چھو کے لوٹ بھی آیا وہ خوف کی سرحد
جہاں کسی نے بھی جانے کا حوصلہ نہ کیا

عزیز قادری (بجنور)

## غزل

آمادہ مہربانی پہ ہونے لگا ہے کیوں
تو آج میرے زخم کو دھونے لگا ہے کیوں

اک آدمی سمجھتے تھے سب جس کو رحم دل
خنجر میں اپنے پھول پرونے لگا ہے کیوں

پریوں نے گال نوچ لئے ہوں نہ پھر سے
بچہ چمک کے نیند سے رونے لگا ہے کیوں

آنگن میں اپنے جاگتا تھا جو تمام رات
قاتل کے گھر میں چین سے سونے لگا ہے کیوں

چومے ہیں میں نے پھولوں کی مانند جس کے ہاتھ
کانٹے وہ میری راہ میں بونے لگا ہے کیوں

کل جس کے قہقہوں سے فضاؤں میں شور تھا
وہ آج پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا ہے کیوں

گالی بھی کوئی شہر میں دیتا نہیں عزیز
تو رفتہ رفتہ آبرو کھونے لگا ہے کیوں

(اقبال دانش (الہ آباد))

## غزل

رخ پہ ترے حیا کی رمق چھوڑ جاؤں گا
نور سحر میں رنگ شفق چھوڑ جاؤں گا

گلشن میں آگہی کا سبق چھوڑ جاؤں گا
لکھ کر گل و سمن کا ورق چھوڑ جاؤں گا

دارالاماں بناؤں گا بزم حیات کو
باطل کدے میں نغمۂ حق چھوڑ جاؤں گا

آؤں گا وقت صبح اجالا لئے ہوئے
سورج کا زرنگار طبق چھوڑ جاؤں گا

کاشانۂ خرد میں بصیرت کے واسطے
افسانۂ جنوں کا سبق چھوڑ جاؤں گا

ہر لفظ ہوگی رمز و کنایات کی کتاب
ہر شعر میں خیال ادق چھوڑ جاؤں گا

آ جائے گا جو لب پہ کوئی نکتۂ بیاں
چہرے کو اہل علم کے فق چھوڑ جاؤں گا

عرض وفا سے ہونگی پشیمانیاں تمہیں
آئینۂ جبیں پہ عرق چھوڑ جاؤں گا

میں ہو گیا تباہ تو دانش نہیں ہے غم
تم بھی ملول ہو یہ قلق چھوڑ جاؤں گا

ماہر فخرالدین (یادگیر)

## آزاد غزل

ایک پیڑ ہوں جلتے ہوئے صحرا میں کھڑا ہوں
بے سایہ ہوا ہوں
دنیا تو یہ جانے ہے کہ میں کون ہوں کیا ہوں
ہر چند ابھی خود کو میں پہچان رہا ہوں
تا حشر مجھے بھول سکے گا نہ زمانہ
میں وقت کے ماتھے کا لکھا ہوں
کوئی بھی دربابِ اجابت سے نہیں جس کا تعلق
اک ایسی دُعا ہوں
سفاک اندھیروں سے مجھے کیا ہو شکایت
اجالوں میں لٹا ہوں
تم ایسی ہی بستی میں چلے آئے ہو ماہر
ہر شخص جہاں خود کو سمجھتا ہے "خدا ہوں"

XXXXX

مصطفیٰ المومن (دھنباد)

## غزل

ٹوٹے دروازوں کے اندر روشنی کب آئے گی
چاندنی پھر دل جلوں پر آگ کب برسائے گی

پھر چلیں گے دیکھنے جلتی رتوں کی کیاریاں
ڈالیاں جھوما کریں گی، گیت تتلی گائے گی

رفتہ رفتہ سوکھتا جاتا ہے ندّی کا بدن
آئے گا ساون تو دھرتی پھر ہری ہو جائے گی

میرے پورے جسم کا منظر بدل سا جائے گا
دھوپ جب چاروں طرف لہرائے گی بل کھائے گی

ڈھونڈتا رہ جائے گا وہ شاخساروں پر سکوت
اور صدا کے خوف سے چڑیا کہیں اڑ جائے گی

☆☆☆

یوسف راہی (بنگلہ دیش)

## غزل

ساتھ اپنے خود ہی اپنا سانحہ لے کر چلے
ہاتھ میں دیوانہ جیسے آئینہ لے کر چلے

خوف و دہشت خون ریزی گریۂ بے چارگی
ہر قدم پر اس طرح کا حادثہ لے کر چلے

شہر تو پر امن تھا اب خون کی ہولی کھیلنے
گھر سے اپنے وہ سیاست کی فضا لے کر چلے

ہاں زباں خاموش آنکھیں بند مستقبل کی فکر
الجھا الجھا سا ہے جو ہم مسئلہ لے کر چلے

راہ میں ہے منتظر ایٹم کی سیلاب بلا
امن کی ہم جستجو میں قافلہ لے کر چلے

آنکھ نم افسردہ چہرہ ان کی بزم ناز سے
آج راہی بھی وفاؤں کا صلہ لے کر چلے

صابر عابدی (کولار)

## غزل

حدیث محبت رقم ہو رہی ہے
جبیں ہر تعظیم خم ہو رہی ہے
محبت کی کیسی کسک رنگ لائی
خوشی ہو یا غم آنکھ نم ہو رہی ہے
یہ کشف و کرامت ہے یا معجزہ ہے
اذیت گناہوں کی کم ہو رہی ہے
محبت بلا فصل ہوتی ہے یارو
حقیقت سپرد قلم ہو رہی ہے
محبت خدایا خدا ہے محبت
یہ تکرار تیری قسم ہو رہی ہے
بہا خونِ انساں تو دھرتی پکاری
یہ تضحیک دین و دھرم ہو رہی ہے
اگر راس تنہائیاں آئیں سمجھو
کسی کی نگاہِ کرم ہو رہی ہے
ہر اک لمحہ انساں کی کشتیٔ زیست
رواں سوئے ملکِ عدم ہو رہی ہے
وفا سے، محبت سے الفت سے صابر
مری زندگی محترم ہو رہی ہے

(عجمی اورنگ آبادی (بھوج پور)

## غزل

آپ جب چاہیں آزما لیں گے
بارِ غم ہنس کے ہم اٹھا لیں گے
آپ ہم کو منا نہیں سکتے
آپ روٹھیں گے ہم منا لیں گے
بے جھجک آپ ہم سے ملتے ہیں
بات بگڑے گی ہم بنا لیں گے
اے ہواؤ! کرو نہ تم زحمت
ہم چراغ اپنا خود بجھا لیں گے
ظلم ڈھاتے ہیں جو غریبوں پر
آپ اپنی سزا وہ پا لیں گے
جان دے دیں گے اجمی لیکن
دانش کی لاج ہم بچا لیں گے

×

سید محمد شمیم جعفری شمیم (دربھنگہ)

## غزل

درد کے ہی ساز سے یہ کاروبارِ نغمہ ہے
یہ نہیں تو سونی سونی ہر بہارِ نغمہ ہے
جس کی ہر تہ میں ہی پوشیدہ شرارِ نغمہ ہے
یہ حقیقت ہے وہی دل رازدارِ نغمہ ہے
دل کے ٹوٹے تار سے نکلے جو آہِ دل نواز
اس صدا سے ہی جہاں میں یہ وقارِ نغمہ ہے
زندگی زندہ دلی۔ موت اور خاموشیاں
کیفیاتِ دل سے قائم انحصارِ نغمہ ہے
لب اگر ساکت رہیں تو موت ہے نغمے کی بس
لب اگر ہلتے رہیں تو سب دیارِ نغمہ ہے
قلبِ مضطر سے جو نکلے کوہِ شب کو کاٹ کر
صبح دم نالہ وہی پروردگارِ نغمہ ہے
اب مرے پیمانِ دل کو پھر کوئی توڑے شمیم
آج کل اس روح کو پھر انتظارِ نغمہ ہے

نظر سودی

## غزل

تم ذرا ان پر احسانوں کا اثر ہونے تو دو
یہ اندھیرے بھول جائیں گے سحر ہونے تو دو

تا بکے دیکھا کریں گے میرے دامن کی طرف
ان کے دامن کی: فوراً ان کو خبر ہونے تو دو

زندگی کے پھول میں خوشبو رہے گی اور بھی
جس قدر تم سے ہو کانٹوں میں گذر ہونے تو دو

ان کے گھر میں ہے اجالا اس لئے آتے نہیں سب
پھر نہ آئیں گے اندھیرا ان کے گھر ہونے تو دو

نام کیا ہے نام سے تو کچھ نہیں ہوتا یہاں
نام کو علم و عمل سے نامور ہونے تو دو

ہو گئی ابھی ہو رہی ہے خدمت اردو زباں
جس سے ہو جس طرح بھی ہو اسے نذر ہونے تو دو

ہنی جعفری (دربھنگہ)

## غزل

خدایا جل رہا ہے میرے دل کا گلستاں دیکھو
کبھی دیکھا نہ ہوگا تم نے یہ رنگیں سماں دیکھو

ہوئی ہیں خاک جل جل کر مری امید کی کلیاں
جگر سے اٹھ رہا ہے آرزوؤں کا دھواں دیکھو

لہو دل کا مری آنکھوں سے آنسو بن کے بہتا ہے
تماشائی ہے میری بے بسی کا یہ جہاں دیکھو

سناؤں کس کو حال دل کسے اپنا میں سمجھوں اب
زمیں کے ساتھ دشمن ہو گیا ہے آسماں دیکھو

ہنی اب زندگی پہونچی ہے ایسے موڑ پر اپنی
نہ منزل ہے نہ رستہ ہے نہ کوئی پاسباں دیکھو

روشن لال روشن (بنارس)

## غزل

پیچھے ٹھیلے بھیڑ کہ چیل
اور سامنے ہے دل دل

دھوپ کا رستہ روکے ہے
میرے آنگن کا پیپل

ٹرین کھڑی ہے پٹری پر
جانے کب ہو گا سگنل

خون کے دریا ظلم کے کوہ
آنکھیں بند تو سب اوجھل

حیوانوں کا شہر ہے وہ
انسانوں کا یہ جنگل

کھیتوں کے دل ٹوٹ گئے
دور کہیں برسا بادل

ان کا میرا ساتھ ہی کیا
وہ موٹر پر میں پیدل

خاک اڑاتا پھرتا ہے
گلیوں گلیوں آٹھ پاگل

اس نگری میں روشن جی
لوگ چلتے ہیں سر کے بل

محمود راہی (کلکتہ)

## غزل

غضب کی دھوپ ہے یارو مکاں نہیں ملتا
بدن جلنے لگا سائباں نہیں ملتا
ہر اک شئے ہوئی لمحوں کے پیچ و خم میں بکھر
سکوں کسی کو گھڑی بھر یہاں نہیں ملتا
جو لڑ رہے تھے تلاطم سے کامراں نکلے
جو ساحلوں پہ تھے ان کا نشاں نہیں ملتا
کبھی جو شاخ بریدہ تھی شام غم کا رفیق
بہار آئی تو ڈھونڈے نشاں نہیں ملتا
کسے سناؤں بھلا حال دل کا اے راہی
کوئی بھی لائق راز نہاں نہیں ملتا

★

نذیر احمد راہی (پاکستان)

## غزل

ہر کوئی خائف ہے اندھی موت کی یلغار سے
زندگی کی روشنی گم ہے۔ در و دیوار سے
اب نہ لوگوں کو سبق سکھلاؤ تم اخلاص کا
ان کو دکھلاؤ نمونہ اپنے ہی کردار سے
اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں آخرش مارا گیا
جو کہ چھپتا پھر رہا تھا دشمنوں کے وار سے
توڑتے ہو کیوں حقائق سے قلم کا رابطہ
خامشی کیوں چاہتے ہو آج کے فنکار سے
عدل کے ایواں لرز اٹھیں گے راہی دیکھنا
چیخ جو ابھری کسی کی ظلم کے دربار سے

★

احمد رضی (بھدراون)

## غزل

کیا حسنِ اتفاق تھا یہ معجزہ نہ تھا
جلتا تھا سارا جسم مگر آبلہ نہ تھا
سر جس نے اپنا قاتل کے ہاتھوں میں رکھ لیا
میرے سوا جہاں میں کوئی دوسرا نہ تھا
لپٹی ہوئی تھی باہوں سے ہر ایک کی زباں
گونگا تھا سارا شہر کوئی بولتا نہ تھا
کیا جانے لوگ سوچ کے پوجا کئے اسے
لانبے تھے ہاتھ پاؤں مگر دیوتا نہ تھا
زہریلے اتنے ہو گئے سانپوں کے درمیاں
رہتے ہوئے بھی سانپ کوئی کاٹتا نہ تھا
جسموں کی آگ سمتوں کے شعلوں میں ڈھل گئی
بھیگے ہوئے لباس میں خوں واہمہ نہ تھا
یوں اپنی گردنوں کو اشاروں پہ رکھ دیا
ٹوٹے ہوئے بدن میں کوئی حوصلہ نہ تھا
سوئے ہوئے جو تم ہو رضی آج دیر تک
ہاں! اتنی دیر رات انہیں جاگنا نہ تھا

★

قیوم شاکر (پاکستان)

# ضمیر جعفری کا جغرافیہ

**تمہید :-** برِاعظم ضمیر جعفری سینتالیس اڑتالیس برس پہلے دریافت ہوا تھا یعنی یہ کوئی نصف صدی کا قصہ ہے مگر دریافت ہو کر پڑا رہا تا آنکہ پرانی دنیا کے ایک نئے کولمبس نے اس کو نئے سرے سے دریافت کیا۔ ہم اس کا صرف حوالہ دینے پر اکتفا کریں گے ۔

اس سے زعمِ دوستی ہے جس نے میرے نام پر
یہ کہا" ہاں ہاں کوئی جغرافیہ کا نام ہے

**محلِ وقوع :-** ضمیر جعفری کا محلِ وقوع قابلِ اعتبار نہیں ہے، کبھی یہ پنجاب کے مردم خیز خطے میں ہوتا ہے، کبھی ننگر پار اور ملایا میں پایا جاتا ہے، کبھی کراچی میں بیٹھ کر حمزہ خان بن شمزہ خان سے پوٹھوار کی باتیں کرتا ہے اور ملایا راولپنڈی میں کراچی کی رنگینوں اور رعنائیوں کی قصیدہ خوانی کر کے احباب کا خون کھولاتا ہے ..... دل کہیں آپ کہیں گردشِ ایام کہیں ۔

ان دنوں اس کے تین طرف راولپنڈی میں اور ایک طرف سی ڈی اے" واقع ہے ..... لیکن سی ڈی اے واقع تر ہے جس کی وجہ سے احباب کی رسائی بہت دشوار ہو گئی ہے۔ تاہم کئی جواں ہمت اس تک پہنچ جاتے ہیں بلکہ اس کی تمام چوٹیوں کو سر کرنے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں

**علاقہ :-** مجموعی طور پر یہ ہموار میدانی علاقہ ہے جس کے بیچوں بیچ انسان دوستی کے جذبے کی ایک چوڑی سطحِ مرتفع چلی گئی ہے، اس کے بیچ ظرافت کی چوٹی کو لوگ صحت افزا مقام کے طور پر استعمال کرتے ہیں میدانوں اور ترائیوں میں کھیتی باڑی یعنی ادبی تخلیق کا کام ہوتا ہے۔ البتہ ادھر کچھ مدت سے اس زرخیز وادی کے آس پاس معروفیت اور خانہ داری کے بڑے بڑے کارخانے قائم ہو جانے کی وجہ سے زرعی پیداوار گھٹتی جا رہی ہے مگر احباب نامی مخلوق کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے غیر ملکی بھی یہاں اجنبیت محسوس نہیں کرتے

**آب و ہوا :-** ایک زمانے میں تو اس کی آب و ہوا انتہائی معتدل تھی لیکن ان دنوں اس خطے میں عجب قسم کی تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں جس کی وجہ سے گرمی میں شدت آ رہی ہے، اور سردیوں کا موسم نہ ہونے کے برابر ہو گیا ہے، ماہرین کا اندازہ ہے کہ یہاں کچھ عرصہ بعد گرمی ہی گرمی ہو گی۔ کیونکہ ضمیر جعفری عظمتِ فن کے خطِ استوا کے زد میں آگیا ہے، کچھ عرصہ پہلے یہاں سال بھر برسات کا موسم رہتا تھا، تخلیق کی اتنی بارش ہوتی تھی کہ جل تھل ایک ہو جاتے تھے، لیکن اب سی ڈی اے کی خشک ہواؤں کے باعث بارش کی اوسط میں کافی کمی واقع ہو گئی ہے۔ بعض اوقات حبس سی کیفیت بھی طاری ہو جاتی ہے، بادل چھٹتے ہیں نہ برستے ہیں لیکن جب بھی ہیری یا ریسٹ آباد کی طرف سے کوئی گھٹا اٹھتی ہے، تو اس خطے میں اتنی شدید بارش ہوتی ہے کہ راولپنڈی کی ادبی محفلوں میں سیلاب آجاتا ہے، یوں اس خطے میں گھنے گنجان درختوں کے ایسے ذخیرے موجود ہیں کہ خشک سے خشک موسم میں بھی اگر شاخوں کو نچوڑا جائے تو فرشتے وضو کریں، البتہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ لوگ کہیں ان درختوں کو کاٹ کر اس جگہ کارخانے نہ قائم کر دیں۔

**آبادی اور پیداوار:** اس خطے میں مداحوں، دوستوں اور سیاحوں کی آبادی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ غزلوں اور نظموں کی پیداوار گھٹتی جارہی ہے۔ البتہ لطائف و بذلہ گوئی کی فصل میں اضافہ ہوگیا ہے۔ یوں نباتات میں سے فکاہیہ نظمیں اور غزلیں اس خطے کی سب سے بڑی پیداوار ہیں جو کثیر تعداد میں اخبارات اور رسائل کے ذریعے برآمد کی جاتی ہے۔ سنا ہے کہ براعظم ضمیر جعفری کی اصل پیداوار تغزل سے بھرپور سنجیدہ شاعری ہے، مگر چونکہ منڈی میں اس جنس کی کھپت کم ہے اس لئے مزاح کی کاشت میں اضافہ ہوگیا ہے، کہیں کہیں فکاہیہ اور علمی مضامین بھی پیدا ہوتے ہیں۔ خوش کلامی کے سدابہار پھول اس کثرت سے مہکتے ہیں کہ ہر وقت ایک بہار کی سی کیفیت رہتی ہے، نباتات کے علاوہ یہ خطہ معدنیات اور دستکاریوں کے لئے بھی مشہور ہے، موضوعی نظموں کا ریشم یہاں کی خاص سوغات ہے، ان دنوں کانین کھود کھود کر "سی ڈی اے" سے متعلق مضامین نکلے جارہے ہیں

**ذرائع آمدورفت** براعظم ضمیر جعفری کی سطح پر چند چشموں کے سوا جن پر احباب کی کھجوریں لگی ہوئی ہیں کوئی بڑا دریا اس خطے میں سے نہیں گزرتا، البتہ زمین کے دل میں ایک سیل طوفان موجزن ہے جسے اہل نظر انسانیت کا سمندر کہتے ہیں اسکے میٹھے پانی کو ہمدردی، پیار اور مروت کی نہروں کے ذریعے دور دور تک پہنچایا جاتا ہے، اس بہتی گنگا میں ہر کوئی ہاتھ دھو رہا ہے، پھر بھی بعض ہاتھوں کی سیاہی اب تک زائل نہیں ہوئی۔ شاید ہاتھ دھونے والوں کی سیاہی دل کی سیاہی سے مستعار ہے

**پیشہ:** دوست احباب اور ملاقاتیوں کی دل جوئی اور تواضع

**ذرائع آمدورفت:** سرکاری طور پر کئی سڑکوں سے آپ اس براعظم تک پہنچ سکتے ہیں، جن پر کاریں بڑی آسانی سے چلتی ہیں، مگر جو لوگ اس براعظم کے دل تک پہنچنا چاہتے ہیں وہ شعر و ادب کے راستوں اور دوستی کی شاہراہ کے ذریعے پہنچتے ہیں اور پھر واپس نہیں جاتے۔

## بقیہ وحید بنارسی

بلا سے تو رہے تنہا جہاں میں
میں سب کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں

اس قطعہ کے لکھنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وحید بنارسی کو مزدور تحریک اور مزدوروں کے مسائل سے گہری دلچسپی اور سرمایہ دارانہ نظام سے بیزاری کا جذبہ کس قدر شدید تھا۔ میں نے گزشتہ کسی تعارف میں احمد آباد کے ایک فی البدیہہ مشاعرے کا ذکر کیا ہے وحید بنارسی بھی اس مشاعرے میں شریک تھے کافی اشعار بھی کہے تھے وحید بنارسی کی سب سے بڑی خوبی تھی کہ کتنا بھی بڑا مشاعرہ ہو، اور سامعین ہوٹنگ پر اتر آئے ہوں اور مجمع کسی طرح بھی قابو میں نہ آرہا ہو اس وقت اگر وحید بنارسی کے نام کا اعلان کر دیا جائے۔ تو وہ فوراً بے جھجک اٹھ کر مائک پر آجاتے اور دیکھتے ہی دیکھتے مشاعرے کا نقشہ بدل جاتا۔ میں نے یہ عالم کئی مرتبہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اور کبھی تو ایسا بھی ہوا ہے کہ لوگ شور مچا رہے ہیں۔ وہ کسی شاعر کو سننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس وقت وحید بنارسی بغیر کسی اعلان کے خود ہی مائک پر آجاتے اور عوام اپنے چہیتے اور پیارے شاعر کو سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہوجاتے اور اور پھر اس کے بعد مشاعرہ پر سکون حالات میں چلتا۔ وحید بنارسی اشعار بہت صاف ستھری اور عام فہم زبان میں کہتے تھے جو لوگوں کے دلوں میں اتر جاتے تھے۔ اور وحید بنارسی کو داد و تحسین سے نواز لیا جاتا تھا افسوس کہ آج ایسی ہستیاں ہم میں رہیں نہ وہ مشاعرے رہے۔ نہ وہ پرانے آداب۔ وحید بنارسی کا کلام بھی دوسرے شعرا کی طرح زمانے کی گرد میں دب جائے گا۔ میں نے انتہائی کوشش کی کہ کچھ اشعار دستیاب ہو جائیں تاکہ ہدیہ ناظرین کر سکوں مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مجھے اس میں ناکامی ملی، یہ چند سطور ہی محفوظ ہو جائیں۔ تو غنیمت ہے تاکہ آنے والے مورخ کو گجرات کے مشہور شعرا کے سلسلے میں کم سے کم نام تو مل جائیں۔

●●●

احسان جعفری (احمد آباد)

# ملک کی ترقی اور قومی یکجہتی

قومی یکجہتی ہمارے ملک کی ترقی کا بنیادی ستون ہے اور ہمارے سیاسی کردار کی روح بھی۔ قومی یکجہتی نہ صرف ملک میں امن وامان کے لئے بنیادی ضرورت ہے۔ بلکہ ہمارے آئین میں بخشی ہوئی آزادی کی کامیابی بھی قومی یکجہتی پر منحصر ہے۔

یہ بات مسلم ہے کہ ہندو مسلم منافرت کے بیج لوگوں کے دلوں میں انگریزوں نے بوئے ہیں انگریزوں سے قبل ہندوستان میں ہندو مسلم ایکتا بے مثال تھی۔ اور بادشاہوں نوابوں اور راجاؤں کے درباروں میں اونچے عہدوں پر عام طور سے دونوں قوموں کے لوگ نظر آتے تھے۔ رواداری ملنساری اور آپسی میل جول کی ایک فضا قائم تھی۔ اور اس فضا کو عوام کے دلوں تک پہونچانے میں بھکتوں اور صوفیوں نے بے مثال تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ بھکتی آندولن اور صوفی تحریک نے ہندو مسلم یکجہتی کی بڑی شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ سنت بھگت کبیر، سنت تلسی داس، سنت تری بھا، امیر البیانی حضرت نظام الدین اولیا، امیر خسرو، لیکھ داتا حضرت سید احمد دکنی، گوسوامی وٹھل ناتھ کے شاگرد رس خان، گرو نانک جی، بھائی بالا، بھائی مردانہ، حضرت بابا فرید گنج شکر وغیرہ اس دور کی بڑی بزرگ ہستیاں ہیں ان بزرگوں نے قومی یکجہتی کے لئے عوامی ذہن کو نکھارا ہے۔ اور جذبات اور احساسات کو صحیح راستے پر موڑا ہے اسی تحریک کا نتیجہ ہے کہ ہم ہندوستانی تہذیب اور کلچر میں نئے نئے رنگ نکھرتے ہوئے دیکھتے رہے فن تعمیر، فن موسیقی، مصوری، شاعری، لباس، رسم و رواج اور قومی تہواروں کی سج دھج نے نیا رنگ روپ اختیار کیا۔ اور دونوں کو موہ لیا۔ اور عوام کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبات پیدا کیے۔

ہندوستان میں پھیلے ہوئے لاکھوں دیہاتوں میں بسنے والے لوگ سکھ اور شانتی سے ایک دوسرے سے کندھا ملائے اپنے روزانہ کے کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے بزرگوں کو عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ایک دوسرے کے مذہبی رہنماؤں اور بزرگوں کے نام عزت کے ساتھ لیتے اور تعظیم کرتے تھے۔ اور ایک دوسرے کے قومی اور مذہبی تہواروں میں جوش وخروش کیساتھ شریک ہوتے تھے۔ اتنا ہی نہیں مندروں اور درگاہوں کا انتظام آپس میں مل کر کرتے تھے اور اسکی مثالیں آج بھی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ملتی ہیں۔ سنت کویوں اور صوفی شاعروں نے رام اور رحیم کی عظمت کے گیت مل کر گائے ہیں۔ صوفی شاعروں نے بھگوان کرشن، رام، گوتم بدھ، بھگوان مہاویر سوامی، سنت شری گرو نانک جی کو پیغام، وحدت سچائی امن اور ہنسا کا اوتار کہا ہے۔ اور بھکتوں کو مسجدوں میں بھگوان کے درشن ہوئے ہیں۔

لیکن برطانیہ کی غلامی نے موجودہ ہندوستان کا تانا اس کی تمام پچھلی روایتوں اور تاریخ سے توڑ کر رکھ دیا اپنی لوٹ کھسوٹ کو قائم کرنے کے لئے عوام کے دلوں میں نفاق کے بیج بو دیئے۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے سامنے صف آرا کر دیا اپنے مفاد کے لئے رنگ، نسل ذات پات اور بھید بھاؤ کی

دیواریں کھڑی کردیں۔ اور آزادی کے لئے عوامی جذبات کو خون میں ڈبو دینے کی سازش کی۔ ہندوستان کے عوامی رہنما ان باتوں کو سمجھ رہے تھے۔ اور ہندو مسلم ایکتا کے لئے کام کرتے رہے۔ راشٹر پتا مہاتما گاندھی قومی یکجہتی کی قندیل کو روشن کئے پورے ہندوستان میں گھومتے رہے۔

ایشور اللہ تیرو نام
سب کو سنمتی دے بھگوان

ہندوستان آزاد ہوا اور عوام قومی یکجہتی کی سمت میں چلنے کے لئے کمربستہ ہوگئے لیکن مفاد پرستوں نے قومی زہر پھیلانے کا کام شروع کردیا۔ اور بھولے بھالے عوام کو اپنی گرفت میں رکھنے کے قومی یکجہتی کی فضا کو زہر آلود کردیا۔

آج ملک میں فرقہ پرستی کا زہر مختلف سمتوں میں پھیل رہا ہے علاقائی تعصب اور تنگ دلی کے جذبات بری طرح سر اٹھا رہے ہیں اب فرقہ پرستی صرف ہندو مسلم جھگڑے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس نے ملک کا پورا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ آسام اور پنجاب کا جھگڑا ناگالینڈ اور میزورام کا مسئلہ۔ ایک ہی ریاست کے مختلف علاقوں کی آپس کی کھینچ تان، ہریجن ہندوؤں کے جھگڑے مختلف فرقوں میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے اور حاصل شدہ اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں بنائے رکھنے کے لئے فرقوں میں باہمی کشمکش، ہماری آزادی اور ترقی کو سلب کرنے کی حد تک قوی ہوچکے ہیں۔ اور پوری قوم کو ذاتی مفاد اور محدود وفاداریوں کا شکار بنا رہے ہیں اور اس طرح دانستہ یا غیر دانستہ طور پر اس انتشار کی فضا کو اور زیادہ پراگندہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں

عوام میں بیداری کی اتنی ضرورت کبھی نہ تھی جتنی آج ہے ہمیں سمجھوتے کی صرف راہ ہی نہیں ڈھونڈ نکالنی ہے۔ بلکہ مستقل بنیادوں پر یکجہتی پیدا کرنے کے لئے کام کرنا ہوگا۔ صرف جذباتی ہم آہنگی اب کافی نہیں ہے

اس سلسلے میں ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں پر سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے ہمیں قومی یکجہتی کے شاندار ورثے کو عوام تک پہونچانا ہے۔ اور اسکولوں سے لیکر کارخانوں اور کھیتوں میں قومی ایکتا اور مذہبی رواداری کے گیت گاتے ہیں ہم سے گرونانک، چشتی، رحیم خان خاناں، نظام الدین اولیاء، امیر خسرو بھگت کبیر، بھگت تلسی داس، رس خان، جائسی کی روح کو ہندوستان کی فضا جگاتا ہے اور کام کرتا ہے۔

جنگ آزادی کے سپاہیوں اور شہیدوں نے نئے ہندوستان میں انسانی مساوات کا جو خواب دیکھا تھا اسے شرمندۂ تعبیر کرنے میں قومی یکجہتی کی فضا کو ہموار کرنا فرض اولین ہے۔ اور ہم سب مل کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں یہی وقت کی آواز ہے۔

کیا مومن کیا کافر
کون ہے صوفی کیا رند
بشر ہیں سارے بندے حق کے
سارے جھگڑے شر کے ہیں

---


## بیان ملکیت اور دیگر تفصیلات

## ماہنامہ گلبن

| | |
|---|---|
| ۱۔ مقام اشاعت | احمد آباد |
| ۲۔ وقفۂ اشاعت | ماہنامہ |
| ۳۔ پرنٹر پبلشر ایڈیٹر | ثریا ہاشمی |
| ۴۔ قومیت | ہندوستانی |
| ۵۔ ملکیت | ثریا ہاشمی |

پتہ:۔ ۱۴۹/۲۰ گجرات ہاؤسنگ بورڈ کالونی
شاہ عالم۔ احمد آباد ۳۸۰۰۲۸

قدرت نقوی (پاکستان)

# رنگِ شکستہ

ہر تخلیق کے دو رخ ہوتے ہیں ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ظاہری روپ باطن پر اس طرح غالب آجاتا ہے کہ اس کا ادراک بہت دشوار ہو جاتا ہے گویا ہر فن پارے کا ایک تخلیقی ماحول ہوتا ہے۔ قاری، سامع یا ناظر کی رسائی اس تک اس لیے نہیں ہوتی کہ فن پارے کے ذرائع اظہار جس استعداد وسعت اور دقت نظر کے خواہاں ہوتے ہیں وہ قاری سامع یا ناظر میں مفقود ہوتی ہے۔ اسی لئے فن پارے کی فضا تخلیق کی وادیوں میں سرگردانی کرتے رہتے ہیں۔

شاعر جب شعر کہتا ہے تو اس کے پیش نظر جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اس کو بیان کرنے میں محو ہو جاتا ہے۔ یہ شعر کا تخلیقی ماحول ہوتا ہے۔ شعر مکمل ہو چکنے کے بعد تخلیقی ماحول کی طرف نشان دہی کرنے کے باوجود الفاظ و تراکیب کی ترتیب سے اپنی ایک الگ فضا بھی بنا لیتا ہے یہی فضائے تخلیق ہے جو شاعر کے پیش نظر نہیں تھی۔ اسی لئے شعر میں مختلف مطالب و معانی پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ اختلاف معنی کبھی لب و لہجہ سے بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ کبھی یہ اختلاف املا کی اشتباہ سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اختلاف قراءت کی وجہ سے۔

اب ایک ایسا شعر لیا جاتا ہے جس میں الفاظ کے معنی تک رسائی نہ ہونے اور روایات کو پیش نظر نہ رکھنے کی وجہ سے فضائے تخلیق نے مختلف روپ اختیار کرلئے۔

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا

اس شعر کی شرح اکثر حضرات نے بیان فرمائی ہے جن میں سے مع تبصرہ چند یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

سید الدین احمد "مطالب غالب" میں اس شعر کے دو مطلب بیان فرماتے ہیں۔ "رنگ شکستہ عاشق اور معشوق دونوں کی طرف منسوب ہو سکتا ہے۔ اگر عاشقوں کا رنگ شکستہ ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرا رنگ دیدنی ہے اور چونکہ اے محبوب ایسا تیری وجہ سے ہے اس لئے تجھے اپنے اس کارنامے پر ناز کرنا چاہیئے دوسری طرف رنگ شکستہ معشوق کی طرف راجع ہے عاشق کہتا ہے محبوب تیرا یہ رنگ قابل دید ہے۔ اور تجھے اپنے انداز محبوبی کو بر سر کار لانا چاہیئے۔

مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالباری آسی اور حضرت بے خود کی بیان کردہ شرحیں آغا باقر کی شرح "بیان غالب" میں بھی منقول ہیں۔ اور میں نے اس سے ہی استفادہ کیا ہے۔ مولانا حسرت لکھتے ہیں

"شب وصل کی صبح کو محبوب کا رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے۔ یعنی اس کی دل پذیری قابل دید ہے اس لئے گلہائے ناز کے شگفتہ ہونے کا یہی وقت ہے۔"

اس میں شب وصل پر مدار مطلب ہے شعر میں کسی لفظ سے اس کی طرف اشارہ نہیں پایا جاتا۔

مولانا آسی کا خیال ہے کہ "نظارہ معشوق نے میرا رنگ اڑا دیا ہے۔ اور رنگ پریدہ مثل صبح بہار اور پھولوں کا کھلنا لازم و ملزوم ہیں۔ اور وہ پھول ناز معشوق کے پھول ہیں

مناظر عاشق ہرگانوی

# عکس ریز

(کتاب کی دو جلد نہ آنے کی صورت میں تبصرہ نہیں دیا جاتا ہے)

**سورج کی صلیب ــــ صبا اکرام**

صفحات ۹۶، سائز ڈیمائی، قیمت ۲۰ روپے

ملنے کا پتہ:۔ دبستان جدید، بی ـ ۳۰۰، بلاک ٹی، شمالی ناظم آباد کراچی ۳۳ پاکستان،

صبا اکرام کی سورج کی کرن جیسی منور، شفاف اور روشن نظموں اور غزلوں کو پڑھتے وقت بہت ساری شامیں، صبحیں اور دوپہریں یاد آجاتی ہیں۔ اداس، خوش چہرہ، بولائی اور نگراں آنکھیں جن کے سہارے وقار اپنے اندر جذب ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے دریچوں کے شیشوں سے ہوائیں ٹکراتی ہیں لیکن گھٹن اور حبس نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ صبا کی شاعری میں نمایاں پہلو فضا کا احساس ہے روایت کا احترام اور نیا سماجی اور تہذیبی شعور ہے۔ زمینی حسن اور فطری تصور کو انہوں نے بنیادی قدر کی حیثیت سے قبول ہے۔ اور تغیرات کے تسلسل کی آگہی انہیں اپنی ذات کی کلیت کے ساتھ گردش پیش کی وحدت سے ہمکنار کرتی ہے

دہلیز سے مکان کے نکلا تھا ایک دن :: اور تب سے میں سفر میں برابر ہوں دوستو

گھر ہو نہ کوئی ایسا کہ شور سا نہ گھر میں :: نکلتے پھر میں کچھ بیقرار سی چڑیا

گرتا ہوں سنگ بہج کے قدموں کی آہٹیں :: میں ایک زردات کا ہوں آخری پہر

دن میں تو گیا ان کے دفتر کو سفر لے :: اب کدھ بستہ جاتے ہیں اندھیر میں شہر بھی

شگفتہ دھوپ کی مانند زیست دی لیکن :: نہ سائباں نہ کوئی شجر لکھا اس نے

ہر موسم کی دھوپ ہے جیسی، سوکھے کی رت ہر دم ہے

سردی گرمی برساتیں ہوں یاں تو ایک ہی موسم ہے

صبا کے یہاں درد کی گہری، بنیادی اور عنصری لہریں ہیں، جن کی جڑیں اس سوسائٹی میں پیوست ہیں جہاں فرد اور معاشرے اور فرد اور فرد کے مابین فطری رشتے ٹوٹ کر تار تار ہو چکے ہیں اور جہاں حقیقی انسانی رشتے جھوٹے پڑ گئے ہیں، محبت اور سچائی اور اچھائی کی قدریں بے معنی ہو چکے ہیں، لیکن ان سب کے باوجود صبا کے یہاں مایوسی کی وہ کیفیت نہیں ہے، جو زندگی کے سرچشموں میں ایسے گھلے ہوئے زہر سے ہو جانی چاہئے، انفرادی تجربے کی یہی تازگی ہے کہ صبا کا اپنا انفرادی رنگ ان کی شاعری میں نظر آتا ہے ۔

بیٹھی ہے دھوپ بھاگ کے پیپل کے پیڑ پر

آنگن میں چھاؤں پہنچی ہے جب سائبان سے

خود اپنی نظروں میں ویسے تو میں برہنہ تھا

سبھوں کے واسطے اک جسم میں نے پہنا تھا

جب تو ہوتی ہے مزہ آتا ہے، سچ ہے لیکن

میں نے ویسے بھی گزاری ہے کئی شب تجھ بن

اچھی نہیں لگتی ہیں یہ سونی سی منڈیریں

مٹی کے ہی دو چار کبوتر کو بٹھا دو

"سورج کی صلیب" میں چودہ نظمیں، بتیس غزلیں اور متفرق اشعار ہیں پیش لفظ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے اور فلیپ پر شمس الرحمن فاروقی کی رائے ہے، مجموعہ آفسیٹ پر بہت ہی خوبصورت چھپا ہے، اتنی خوبصو[رت کتاب] کبھی ہی دیکھنے اور پڑھنے کو ملتی ہے۔

بالوں کی قدرتی نشو ونما کیلئے
جڑی بوٹی سے بنا ہوا
گیسو دراز
ہیر ٹانک
بالوں کو گرنے سے روکتا ہے
لمبے اور ملائم بناتا ہے.
سفید ہونے سے روکتا ہے
بالوں کی ایک مفید اور مکمل غذا ہے
بنانے والے
حکیم جی جی فارمسی، حکیم جی جی اسٹریٹ
(سورت)
اپنے قریبی دوکان سے طلب فرمائیے.

# آپ کے خطوط

## خواجہ عبدالغفور (بمبئی)

دسمبر جنوری کا شمارہ موصول ہوا۔ اس شمارہ کو آپ نے اور آپ کے معاون، منتظم، مشیر اور ترتیب کار نے جس حسن و خوبی سے شائع کیا ہے اس کے لئے آپ بالخصوص اور دیگر حضرات قابل مبارکباد ہیں، لائق ستائش و تحسین بھی۔ اس شمارہ میں کئی جدتیں ہیں۔ نیا رنگ و روپ ہے۔ اور مزاح و فکاہات اور لطیفوں سے مزین مضامین اور نظمیں، افسانے ہر عنوان اور جملہ موضوعات پسندیدہ اور منتخب ہیں۔ آپ کی ادبی کاوشیں اسی طرح برقرار رہیں تو اردو ادب میں گلبن اور ادیبوں اور مدیروں کی فہرست میں خود آپ کی شخصیت اعلیٰ ترین مقام پر قائم اور برقرار رہے گی۔

## حمید سہروردی (بیڑ)

وسالنامہ ملا۔ کتابت طباعت خوبصورت ہے اور مواد بھی معیاری۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کرے۔

## ظفر ہاشمی (جمشید پور)

آپ کی نوازشوں کی شکل میں "گلبن" کا ہر شمارہ موصول ہوتا ہے جس کیلئے مشکور رہوں۔ اس کا سالنامہ بھی نظر نواز ہوا۔ اس بم کو دیکھنے اور پڑھنے کے بعد جو مسرت ہوئی ہے اس کا بھرپور اظہار تشنگنائے قلم کا شکار ہے۔ اسکے سرورق کی تبدیلی نے معنویت و دلکشی کی نئی چھاپ مر کردی ہے اور اور جناب مناظر عاشق ہرگانوی کی ترتیب و تزئین سے قلب و جگر کو بے حد سرشادی ملی ہے۔

جب حمد و نعت سے آگے نظر جاتی ہے تو پوسٹ مارٹم کے کالم میں محصور ہو جاتی ہے۔ منیب الرحمٰن کی اپنے موضوع پر ایک تو اچھوتی نظم، دوسرے اس پر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا پوسٹ مارٹم، مت پوچھئے کیا سرور ملا ہے۔

خواجہ عبدالغفور اور یوسف ناظم نے نئے انداز سے تیر چلائے ہیں۔ جو دل میں پیوست تو ہوتے ہیں مگر لہو کا ایک چھینٹا بھی نہیں اڑتا۔ خواجہ احمد عباس اور رام لعل بھی حسب معمول اپنی انفرادیت قائم رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ فیض کا مضمون قد کے اعتبار سے بہت چھوٹا ہے لیکن قد کے لحاظ سے قابل توجہ ہے۔ جگن ناتھ آزاد ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں جسکے ثبوت میں انکی کئی چیزیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان کا زیر نظر مقالہ اپنے موضوع کے لحاظ سے کئی صفحات لے سکتا تھا۔ لیکن انھوں نے بڑی چابکدستی سے اہم گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔

سید عبدالباری نے "جب نئے افسانے" کا بڑا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے لیکن یہ حد سے زیادہ لمبا شمیم نہ ہوتا تو اسکی افادیت اور بڑھ جاتی۔ رحمت امروہوی نے اپنے انداز بیان کی وجہ سے "لنیری" کو زندہ کر دیا ہے۔ ضیاءالاسلام کا "سدا بہار درخت" سدا بہار ہے۔ جو سبق آموز بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ حلیم جاوید کے مجموعے "فکر ریزے" پر مناظر صاحب کا تبصرہ بڑا جامع، دقیق، اور حسب حال ہے۔

غزلوں میں ڈاکٹر وزیر آغا، ناصر شہزاد، اختر ہوشیارپوری، ماجد الباقری، کرشن کمار طور، لطف الرحمٰن، نازش حیدر امام، احمد رضی، رشید اعجاز، ظہیر رسول، رئیس امروہوی اور انجم عظیم

خاص طور پر بے حد پسند آئے۔

افسانوں کا گوشہ بھی نت نئے موضوع اور اسلوب کو پیش کرتا ہے جس میں عصری مسائل کی ایک ایک سانس گرفتار ہے اس بار آپ کے افسانہ کی عدم شمولیت سے البتہ ایک تشنگی رہی۔

اس نمبر میں میری آزاد غزل کی اشاعت پر کئی تعریفی خطوط ملے ہیں میں ان سبھوں کا شکرگذار ہوں لیکن میرے مطلع کے مصرع اول کا قافیہ غلط شائع ہوا ہے یعنی "تابی" جو دراصل "عرقابی" ہونا چاہیئے تھا۔

## انجان علیم (جمشید پور)

"گلبن" کا سالنامہ نظر نواز ہوا۔ جس کا سرورق بے حد حسین ہے۔ ترتیب، فہرست بڑی ہی سائنٹفک ہے۔ اداریہ بے حد پسند آیا۔ جناب مناظر عاشق ہرگانوی کا حسب کا اظہار فکر وخیال "مجھے بھی کچھ کہنا ہے" ادبی ذہن وافکار کی نشو ونما کے لئے بے حد ضروری ہے۔ حمد ونعت تو تمام شعریت سے بلند ہے نظم "ارمغان خلوص" ایک پاک عقیدت کی غمازی کرتی ہے۔ "پوسٹ مارٹم" پڑھنے کے بعد نظم نگار اور تنقید نگار کی صلاحیتوں کا بڑا خوبصورت مرقع سامنے آتا ہے۔

نظموں میں خاص طور پر "الجھن" "یاس" "بہتے لمحے" بے حد پسند آئیں۔ "رباعیات" "گیت" "قطعات" کا انتخاب بڑا ہی شاندار اور جاندار ہے۔ افسانوں میں "انتظار حسین"، "الیاس قریشی" "ریاض انگلی" بے حد کامیاب ہیں۔ طنز ومزاح کا حصہ بھی خوب ہے۔ غزلوں۔ آزاد غزلوں اور دوہوں کا تو جواب نہیں۔ غزلوں میں وزیر آغا، مظہر امام، اختر ہوشیار پوری۔ علیم صبا نویدی۔ اقبال دانش، شہپر رسول، رشید اعجاز کی غزلیں دل کو چھو جاتی ہیں۔ آزاد غزلوں میں جناب ظفر ہاشمی صاحب اور جناب بدیع الزماں صاحب بے حد کامیاب ہیں۔ باقی آزاد غزلیں بھی معیاری اور شعریت سے بھرپور ہیں۔ "یادیں" یادوں کی دنیا میں ہلچل مچا دیتی ہیں "سفرنامہ" اپنی منزل کا پتہ دیتا ہے۔ مضامین کا حصہ مختصر ہوتے ہوئے بھی جامع ہے تمام مضامین بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے "یا ورنشا" ایک کامیاب کوشش ہے۔ بچوں کا گوشہ ایک نئی فضا قائم کرتا ہے جو دوسرے اور جریدوں میں دیکھا نہیں جاتا۔ "عکس ریزہ" اپنی جگہ ایک ایسا عکس ہے جس کی تمام لکیریں واضح اور روشن ہیں۔ خطوط کا حصہ بھی تابناک ہے۔ حسن ترتیب کے بعد بھی "حث بھی" یہ نمبر ایک سنگ میل ہے۔

## مصطفیٰ مومن (دھنباد)

دسمبر جنوری کا مشترکہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ دل باغ باغ ہوگیا۔ سالنامہ ہر اعتبار سے بہت خوبصورت ہے اور میرے لئے بہت قیمتی۔

## صابر فخر الدین (یادگیر)

گلبن کا سالنامہ ملا۔ محترمہ ثریا ہاشمی کی آبلہ پائی سے اندازہ ہوا کہ گلبن کو کتنے خارزار مرحلے طے کرنے پڑتے ہیں اور تب کہیں جاکر یہ "بن" "گلبن" ہو سکا ہے۔ حمد، نعت، ارمغان خلوص سے لیکر عکس رنگ ہر چیز نے متاثر کیا۔ گلبن کی اتنی خوبصورت اشاعت پر مبارکباد قبول کیجیے۔

## اقبال ملک تنہا (سورت)

سالنامہ ملا۔ پڑھا۔ بہت پسند آیا۔ گجرات ایسے خطے سے آپنے گلبن کا سالنامہ جس معیار پر پیش کیا ہے واقعی آبلہ پائی سے بھی کہیں زیادہ صبر آزما مرحلوں سے گذرنے کے برابر ہے۔ تعجب تو اس بات پہ ہے کہ آپ نے سالنامہ کیلئے گجرات سے لیکر یو پی تک کی راہ نوردی کی۔ پرچے کی قیمت کے اضافہ کے سلسلے میں آپ حق بجانب ہیں بلکہ آج کل ہر پرچہ تین روپئے کی قیمت سے نکل رہا ہے۔ یہ بات ضروری ہے کہ پرچہ کی قیمت بڑھادی جائے۔

| آخری بات | کیف پیدا کر سمندر کی طرح<br>وسعتیں، خاموشیاں، گہرائیاں |
| --- | --- |

گجرات سے نکلنے والا واحد علمی، ادبی اور ثقافتی

ماہنامہ

# گلبن

اپریل، مئی ۱۹۸۳ء

قیمت ۵۰-۳ روپے

ایڈیٹر۔ ثریا ہاشمی

مینیجنگ ایڈیٹر۔ ظفر ہاشمی

ترتیب کار۔ مناظر عاشق ہرگانوی

نگراں

سید محمد حکیم الدین شیرازی

مشیران

سید علی احسن بخاری

سید احمد مختار غوثی

ڈاکٹر شمس الاسلام عثمانی

بدلِ اشتراک

لائف ممبری ۲۵۰ روپے

زرتعاون سالانہ ۲۵ روپے

زرسالانہ ۲۰ روپے

غیر ممالک میں بحری ڈاک سے ۳ پونڈ

" " " ہوائی ڈاک سے ۵ پونڈ

عام شمارہ ۷۵-۱ روپے

پتہ

۱۶۹/۲۰ گجرات ہاؤسنگ بورڈ کالونی شاہ عالم

احمد آباد ۳۸۰۰۲۸۰

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر

ثریا ہاشمی

مطبع: نشاط پریس۔ ٹانڈہ فیض آباد یوپی

## فہرست

# "بحضور سرور کائنات"

(جمال قریشی احمدآباد)

السلام اے مخبر صادق اے محبوب خدا
اے امام دو جہاں اے شافع روز جزا

سوچتا ہوں مرکز وحدت سے کیسے ہٹ گئی
آپ کی امت ہزاروں راستوں میں بٹ گئی

السلام اے ابن عبدالمطلب کے نونہال
حامل بار نبوت صاحب حسن و جمال

صوفیوں نے قید ہم کو خانقاہوں میں کیا
زاہدوں نے ترک دنیا کا سبق پھیلا دیا

السلام اے محسن انسانیت اے غمگسار
اے امام ہر دو عالم رحمت پروردگار

عابدوں نے اپنے ہی حجروں کو روشن کر لیا
واعظوں نے آپ کی تعلیم کو رسوا کیا

حاضر خدمت ہوا ہوں باادب با احترام
امت مرحوم کی جانب سے لایا ہوں سلام

مفتیوں نے مومنوں کو کفر کے فتوے دیئے
مفت میں یہ صاحب سیف و قلم بن کر جئے

قابل افسوس ہے ملت کا اپنے حال زار
ہو گئے ہیں دامن ایمان اکثر تار تار

مصلحت اندیشیوں میں گھر گئے عزت مآب
آگیا غالب خدا کے خوف پر شاہی عتاب

ڈر رہا ہوں یہ نگاہ معتبر سے گر نہ جائے
داعیوں کی کاوش پیہم پہ پانی پھر نہ جائے

مشرقی خاتون بھی مغرب سے لائی ہے جواز
چادر عصمت سے مریم ہو گئی ہے بے نیاز

ایک ہی در سے فقط دامن بچایا جائے ہے
ایک ہی سر سینکڑوں در پہ جھکایا جائے ہے

بنت حوا گھر سے نکلی دفتروں تک آگئی
اور کچھ آگے بڑھی تو سرودوں تک آگئی

یہ تماشا دیکھ کر ہم ششدر و حیران ہیں
باہمی دست و گریباں صاحب ایمان ہیں

شاعروں نے جا بجا تقدیر کا ماتم کیا
عارضی محبوب کی فرقت کا رونا رو لیا

جیسے جیسے ہم فراز جہل پر چڑھتے گئے
راستوں سے منزلوں کے فاصلے بڑھتے گئے

سامنے ان کے مقام عظمت آدم نہیں
سیرت و کردار میں یہ بھی کسی سے کم نہیں

مصحف اقبال توصیفی (پاکستان)

## اندیشہ

کھڑکی کے شیشوں سے میں نے
جب بھی اس کو جھانکا ہے
آنکھوں میں اک نجانا دکھ ہرا ہوا ہے
پلکیں بھیگ گئی ہیں!
ہوا دکھی ہے — پاگل ہے
اس پانی کو جذب نہ کرے
جو کھڑکی کے شیشوں سے میری پلکوں تک پہنچا ہے۔
میرے درد کی خوشبو
کلیوں کے تکیے میں رکھ دے — کلیاں پھول نہیں
اور اس بات کا چرچا ہو
وہ جس بات سے ڈرتی ہے!
اور اس پر جانے کیا گزرے
جو مجھ سے پردہ کرتی ہے

---

صبا اکرام (پاکستان)

## رات کی فصل

ابھی بس ذرا دیر میں
رات کی فصل پک جائے گی
اور سورج
درانتی لئے اپنی کرنوں کی
آگے بڑھے گا
تو نوشتے حسیں آرزو کے
جو خوشبو کے جھونکوں سے
اٹھکھیلیاں کر رہے ہیں
سہم جائیں گے
وصل کے خواب کی
لہلہاتی ہوئی بالیاں
کتنی آنکھوں کی نم کیاریوں میں
جو پل کر بڑھی ہیں
لرز جائیں گی
دل کے ہر کھیت میں
پھر نراشاؤں کی دھوپ
در آئے گی
بس ذرا دیر میں
رات کی فصل پک جائے گی۔

---

بدیع الزماں خاور (راولپنڈی)

## ایک ہی کہانی

کشتیاں اِدھر کی ہوں
یا
اُدھر کی ہوں
دریا ایک ہی ہے
دریا کی ایک ہی روانی ہے
جو
سکوت کے اندر
سینکڑوں بھنور لے کر
اِس طرف بھی بہتا ہے
اُس طرف بھی بہتا ہے
ایک ہی وہ پانی ہے
لوگ اس کنارے کے ہوں
کہ اس کنارے کے
سب کے
پار اترنے کی
ڈوبنے ابھرنے کی
جینے اور مرنے کی
ایک ہی کہانی ہے
جو بہت پرانی ہے

---

عزیز قادری (بڑودہ)

# ماضی

میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھو
عہد ماضی کی چند تصویریں
آج بھی آئیں گی نظر تم کو

ایک تصویر جس میں ہم دونوں
بے خبر ہو کے ساری دنیا سے
ساتھ بیٹھے ہیں مسکراتے ہیں

ایک تصویر جس میں ہم دونوں
دور ہیں ایک دوسرے سے بہت
تم پریشاں ہو بے قرار ہوں میں

ایک تصویر جس میں تنہا ہوں
بیٹھ کر اپنے تنگ کمرے میں
ایک سوکھے ہوئے شجر کی طرح
اپنے ماضی کو یاد کرتا ہوں

ایک تصویر جس میں تم آکر
دے رہے ہو تسلیاں مجھ کو
میرا دم گھٹ رہا ہے سینے میں
بستر مرگ پر پڑا ہوں میں

علی عباس امید (بھوپال)

# ظلمات

پھر دبے پاؤں
دن کی ارتھی پہ
بال بکھرائے شام آپہنچی
وقت کے کینوس پہ کچھ چہرے
سر جھکائے، خموش، پابستہ
(اپنے آنسو چھپائے دانستہ
پوچھتے ہیں سفید لمحوں سے
تم نے
کل
ہم سے زندگی لی تھی؛
آج
سورج کو
کس نے قتل کیا؟

---

ظہیر غازیپوری (ڈمکا)

# تلسی کا پودا

ہم مسائل کی اک بھیڑ میں
ہانپتے کانپتے چل رہے ہیں
خود اپنی زمیں پر
مگر اپنی نظریں ہیں
مریخ پر، چاند پر
روس پر، چین پر، فرانس پر
اور گھر میں ہمارے
ننھا کومل سا تلسی کا پودا
نئی ہریالیاں کھو چکا ہے!

## جانے والے کے نام

حق اعظمی (گیا)

میں سوچتا ہوں
کُھلے بیاباں کے لمبے رستے پر
گامزن وہ ہوائیں بھی تھیں
کہ

جن کی نظروں میں
نت نئے موسموں کی
آمد کے
رنگِ پیہم مچل رہے تھے
بکھر بکھر کے
ہمارے ہمراہ چل رہے تھے
مگر نہ جانے
چڑھی ہوئی دھوپ لمحہ لمحہ اُتر کے نیچے
اندھیروں کا روپ لے چکی ہے
بھیانک

اور
خوفناک شکلوں کو جنم دے کر
بدن بدن میں سما گئی ہے۔
نظارے سارے
گپھاؤں میں پھر ڈوبنے کی خاطر
مری ہی مانند
بڑھ رہے ہیں
نگل ہی جائے گا
کیا یہ کالا سمندر آخر
جہان سارا
وجود میرا
میں سوچتا ہوں!
میں سوچتا ہوں

## مشورہ

سید اعجاز (پٹنہ)

.... بچھڑنے والوں کی فہرست میں تم آئے ہو
تم کہ عکاس ہو، عکاسِ محبت ہو تم
قوتِ جذب مقدر ہے فقط اس شئے کا
کوکھ سے جس کی کوئی لہر جنم لیتی ہے
لہر آئینہ ہے خود کرب کا بے چینی کا
جام لبریز لرزتے ہوئے ہاتھوں سے چھلکتا ہے ضرور
لرزہ کہتے ہیں جسے ہوتا ہے لہروں کا ہجوم
لرزہ، لہروں کے بنا ہو تو بتاؤ مجھ کو
عکس لہروں پہ جما ہو تو دکھاؤ مجھ کو
عکسِ سالم کو ضروری ہے سکوں کی حالت
آئینہ سطح جو رکھتا ہے برابر اپنی
ہاں آنے تک اُسے کذب کا پیکر نہ کہو
صرف اندیشہ و پرہیز نہیں ہے دنیا
وسوسے اوڑھ کے بازار میں نکلا نہ کرو

---

## پیاسا سورج

شفیع اللہ خان راز (اٹاوہ)

گونگی، بہری، چنچل لہریں
جوشِ جنوں میں،
ناچ رہی ہیں
اندھا طوفاں
ساحل، ساحل،
ملّاحوں سے کھیل رہا ہے
اک اک مچھلی ——
کانپ رہی ہے۔
موجوں کی رنگینی میں
ننگے، بھوکے،
زرد مچھیرے ——
اپنی روزی ڈھونڈ رہے ہیں۔
پیاسا سورج،
ڈوب رہا ہے ——
گہرے ساگر کے آنچل میں۔

مظہر نسیم (الہ آباد)

# زخموں کے پھول

زخموں کے پھول ہم بھی کھلاتے ہوئے تو ہیں ٭ دامانِ زندگی کو سجاتے ہوئے تو ہیں
مانا کہ ہر قدم پہ اجل سے ہے سابقہ ٭ لیکن چراغِ زیست جلائے ہوئے تو ہیں
صبحِ بہار! ہم تری کرنوں سے آج بھی ٭ تعبیرِ نو کے خواب سجاتے ہوئے تو ہیں
وہ زخم جو دیئے ہیں زمانے نے دوستو! ٭ اشعار کی ردا میں چھپائے ہوئے تو ہیں
احساس کی دکاں سے اُجالا خرید کر ٭ کاغذ پہ مہر و ماہ اُگاتے ہوئے تو ہیں
ہم لوگ ہیں کہ شہر میں بدنام ہیں مگر ٭ شعر و ادب کا نام جگاتے ہوئے تو ہیں
مایوسیوں کے گھور اندھیرے میں بھی نسیم ٭ نورِ سحر کی آس لگائے ہوئے تو ہیں

ملے پندرہ اگست ۱۹۷۲

منظر اعجاز (مظفر پور)

# چاند میں داغ نہیں

زمیں سے لیکر بلندیٔ آسماں تک اب بھی
ہزاروں جلوے ہیں بکھرے بکھرے ہزاروں جلوے ہیں نکھرے نکھرے
یہ چاند سورج یہ ننھے تارے
حسیں نظارے
نگاہ کی ضو بڑھا رہے ہیں
امید کی لو بڑھا رہے ہیں
فریب وہم و گماں نہیں ہے
یہ سبزہ زاروں پہ بکھری شبنم
چمک رہی ہے دمک رہی ہے
زمیں کی نوکِ پلک پہ ٹھہری تھرک رہی ہے مچل رہی ہے
نشیب سے میں پہاڑ کی سربلند چوٹی کو تک رہا ہوں
لہک رہا ہوں میں دل ہی دل میں
میں دل ہی دل میں مچل رہا ہوں
یہ خوبصورت سماں عجب گدگدی سی دل میں لگا رہا ہے
مگر میں تنہا ہی دیکھتا ہوں

میں چاہتا ہوں دکھاؤں اوروں کو بھی یہ منظر
حسین منظر
مگر یہ ڈر ہے
مجھے یہ ڈر ہے کہ تہمت دید رکھ کے مجھ پہ
نکال پھینکے گا مری یہ آنکھیں مسیحِ دوراں
مری ان آنکھوں کو پھوڑ دیگا
مسیحِ اندھے نگر کا اندھا مجھے یہ پاگل سمجھ رہا ہے
سبب وجہ یہ کہ خدا نے مجھ کو دو آنکھیں دی ہیں
نظر بھی دی ہے
نظر کو تابِ نظارہ دیکر کیا ہے رسوا
ذلیل کر کے رکھا ہے اندھے نگر میں مجھ کو
میں خوش ہوں رسوائیاں اٹھا کر
ذلیل ہو کر میں خوش ہوں لیکن
ضمیر میرا نہیں ہے نادم
نہیں ہے نادم ضمیر میرا

(رضا بھینسہ، بہار)

## آہ! حرمت الاکرام

(۶ جنوری ۱۹۸۳ء کی شب میں "اجالوں کے گیت" "کلکتہ اک رباب" "شبستان جلوہ" "خوشبو" اور بچوں کے لئے "کھیل کھلونے" کے مصنف مشہور شاعر حرمت الاکرام صاحب کا انتقال ہو گیا ان کے غم میں ظفر مرزاپوری کی یہ نظم ہم شائع کر رہے ہیں)

(ادارہ)

بوجھ غم کا ذہن پر رنجیدہ دل آنکھیں اداس
آج کس کو سب کی آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں آس پاس
کھو گیا آخر کہاں وہ سادہ دل سادہ لباس
بات یوں کرتا تھا جیسے آتی ہو پھولوں سے باس
بادۂ علم و ادب کا اک انوکھا جام تھا
وہ صف اوّل کا شاعر حرمت الاکرام تھا

اک صحیفہ ہی نہ تھا وہ صفحۂ مرزاپور کا
جو نہ مرجھائے وہ غالب کے چمن کا پھول تھا
ہائے وہ مہر منور شاعری کا کیا ہوا
کیوں اچانک سارے عالم پہ اندھیرا چھا گیا
بادۂ علم و ادب کا اک انوکھا جام تھا
وہ صفِ اول کا شاعر حرمت الاکرام تھا

فکر کی گہرائیوں میں ڈوبنے جائے گا کون
قلزموں میں ڈوب کر موتی نئے لائے گا کون
عظمتِ فن کے لئے دنیا کا غم کھائے گا کون
ایک گوشے سے جہاں میں نام پھیلائے گا کون
بادۂ علم و ادب کا اک انوکھا جام تھا
وہ صفِ اوّل کا شاعر حرمت الاکرام تھا

جس کے نقش پا سے روشن راہ ہوتی جائے ہر
ہر کتاب اس کی جہاں میں رہنما کہلائے ہے
"خیالوں میں قلم کاروں سے کہتے آئے ہے
"فن کے لفظوں میں لہو دل کا نچوڑا جائے ہے"
بادۂ علم و ادب کا اک انوکھا جام تھا
وہ صف اوّل کا شاعر حرمت الاکرام تھا

رفعت النساء رفعت (مئو)

## پچھتاوا

کارزار حیات میں
نظریں تماشہ بیں
لب پہ چپ لگی ہوئی
بدلتے منظر کو دیکھتی رہی
پھر نہ جانے کیا ہوا
اچانک نظر بدل گئی
دل سے کچھ یہ کہہ گئی
دل تڑپ کے بول اٹھا
فطرت میری عجیب ہے
سچ مجھے عزیز ہے
میں نہ یہ سہہ پاؤں گا
جو مجھ میں ہے کہہ جاؤں گا
دل کے اس عزم سے
زباں پہ کانٹے پڑ گئے
دل کی مگر تہ غیب پہ
ہائے لفظ تو مچل گئے
نطق پہ اگے تاثر سے
کچھ اس طرح الجھ گئے
کہ قطرۂ لہو سا بھر
لفظ لفظ سرخ تھا
لبوں کا بند توڑ کر
تڑپتے زخمی لفظ تو
کچھ اس طرح ابل پڑے
کہ داغ داغ ہو گئے
جو چہرے سامنے پڑے
اف ......... !
اف یہ میں نے کیا کیا!!

نینا جوگن (بھاگلپور)

## گمشدہ چہرے کے بیچ

ہر ایک چہرے پہ
اک نقاب وفا ہے لیکن
وفا کہاں ہے؟
یہ لوگ ہنستے ہیں لیکن انکی ہنسی میں
رنگ طرب نہیں ہے
یہ کھوکھلے چہرے جن کی نظریں
فقط خلاؤں کو گھورتی ہیں
بس اک گھنی تیرگی ہے
کوئی کرن نہیں ہے کہ جگمگائے
میں خود کو اس جھمگھٹے میں
گم کرتی جا رہی ہوں!

سردار ایاغ (بنگلور)

# رُباعیات

میں خود پہ اصولوں کی طرح روتا ہوں
معتوب رسولوں کی طرح روتا ہوں
شبنم کی بجالت پہ ہنسی آتی ہے
سوکھے ہوئے پھولوں کی طرح روتا ہوں

کچھ ہو کہ نہ ہو دست تہی کیا کم ہے
یہ کھوکھلا اعزاز سہی کیا کم ہے
اب اور زیادہ کی طلب کیا ہو مجھے
اس دور میں زندہ ہوں یہی کیا کم ہے

ہر صنف میں کی خامہ فرسائی میں نے
تا حدِ نظر جست لگائی میں نے
ماحول بھی ڈیڑھ اینٹ کی بنیاد پہ تھا
اپنی اک الگ دنیا بنائی میں نے

جب ذہن خیالوں میں پھنسا یاد آگئے
دل مجھ پہ بہت کھل کے ہنسا یاد آگئے
احساس ندامت سے حیا کے مارے
میں اپنے ہی بستر میں دھنسا یاد آگئے

باغی ہوں بغاوت ہے عقیدہ میرا
اک زندہ روایت ہے عقیدہ میرا
فردا کے بھی کام آئے گا ماضی کی طرح
ہر دور کی حاجت ہے عقیدہ میرا

بے لاگ و طبع زاد مضامیں لکھوں
حوروں کو کروں یاد مضامیں لکھوں
جنت سے نکالا ہوا انساں ہوں میں
کیسے نہ بت ایجاد مضامیں لکھوں

---

منوہر لال ہادی (دہلی)

# سانیٹ

قلم پائل، قلم گھنگھرو، قلم جھنکار کا مخزن
قلم کے بطن سے پیدا ہوئے ایسے بھی فن پارے
ترانے جن سے شرماتے ہیں کتراتے ہیں اکتارے
قلم کے دم سے پاتا ہے جلا فن کار کا جیون

قلم سے پھوٹتی ہیں ان گنت کرنیں بصیرت کی
عطا کرتی ہیں جو عقل و خرد کو شمعِ دانائی
دماغوں کی توانائی، دلوں کو حسن و رعنائی
دکھا دیتی ہیں دربارِ خدا، مسندِ مشیت کی

قلم وہ سحر دیتا ہے مسرت کے گلستاں کو
کہ ہم گلگشت کرتے ہیں تو سب غم بھول جاتے ہیں
گھڑی بھر ہی سہی، ایذا کا عالم بھول جاتے ہیں
معاً آواز دیتے ہیں خوشی کے ساز و ساماں کو

ملا کر بوند بھر تخلیق کی تکلیف سامانی
قلم کا ابر برساتا ہے فن کاروں پہ تابانی

زاہدہ حنا (پاکستان)

# صرف ایک لفظ ہیہات

ریت، سمندر، آشفتہ سر ہوا اور میں۔ ہم بہت دنوں بعد اکٹھے ہوئے ہیں۔ میں پتھر کی دیوار پر بیٹھی ہوں اور سمندر کے پار افق کی محراب کے ادھر کچھ دیکھنا چاہتی ہوں، محراب کے اُدھر انسان پر گزرا ہوا وقت پھیلا ہے۔ گزرے ہوئے وقت کا یہ سمندر بے کنارے ہے۔ یاد کی لہریں، آشفتہ سر ہواؤں کی مانند جب اس سمندر سے ہم آغوش ہوتی ہیں تو دور تک پھیلے ہوئے سمندر کے بدن میں وصال کی کپکپاہٹ دوڑ جاتی ہے۔ اس کپکپاہٹ کا خاتمہ نہیں ہے۔ گزرے ہوئے وقت کے سمندر سے یاد کی لہریں ہر لمحہ اٹھتی رہتی ہیں۔ اور خیال کے دائرے پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ لہریں پھیل کر مجھ تک آتی ہیں اور میرے سامنے گزرا ہوا وقت رقص کرنے لگتا ہے۔ پھر وقت وحشی نوجوانوں کی طرح چیختا ہے! آؤ کہ جہانِ بے خبراں میں بے خبرانہ رقص کریں۔ خیرہ سرانہ شور مچائیں خیرہ سرانہ رقص کریں۔ بے خبرانہ رقص کریں!

میں چپ چاپ سنتی رہتی ہوں۔ وقت کی دعوتِ رقص بھی اور اس کی بازگشت بھی۔ وحشیوں کی طرح شور مچاتا وقت یہ بھول گیا ہے کہ میں جہانِ بے خبراں میں رقص کرتے کرتے تھک گئی اور میرے دوسرے ناموں کو بے خبری اور خیرہ سری کا صلہ ہلاکت کی صورت میں ملا۔ میں بھی تھک گئی، میرے نام بھی تھک گئے۔

تھکن سے چور بدن کو اپنا گھر یاد آیا ہے۔ گھر، جس کی چار دیواری میں احساسِ آسودگی کا گارا استعمال ہوتا ہے، جس کی چھت پر استحکام کے پتھر چنے جاتے ہیں اور جس کا فرش آسائش کے تاروں سے بُنا جاتا ہے۔ لوگ اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں اپنی ارضِ موعود کا رُخ کرتے ہیں۔ مجھے بھی لوٹنا چاہیے۔ اپنے گھر کا راستہ ڈھونڈنا چاہیے۔ گھر کی آنکھیں میرے انتظار سے تھک کر پتھرا نہ جائیں۔ گھروں کی آنکھیں پتھرا جائیں تو وہ مر جاتے ہیں بالکل اسی طرح کہ جب وہ زندہ ہوتے ہیں تو سانس لیتے ہیں، ہنستے اور روتے ہیں۔ ہمارے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں، پھر جب ہم انھیں ترک کر دیتے ہیں تو ان کے دل ویران کھنڈر ہو جاتے ہیں۔ گزرے ہوئے وقت کی آوازیں ان خالی ڈھنڈار گھروں کی دیواروں پر سوگ کے حاشیے کھینچتی ہیں، بین کرتی ہیں۔ ان کی سینہ کوبی سے چھتوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں اور ان کے آنسوؤں کی نمی سے زمین پر کائی جمنے لگی ہے۔

میں ہوا کے ساتھ روتی ہوں۔ اُس ہوا کے ساتھ جو خالی مکانوں کو دیکھ کر روتی ہے اور اس ہوا کے ساتھ جو مجھے دیکھ کر روتی ہے کہ میرا گھر بے مکین ہوا اور میں بے مکان —— بے مکاں بے اماں اور بے زباں۔

میں ان لوگوں میں سے ہوں جو مکان سے ناتا توڑ کر وقت سے تمام رشتے منقطع کر لیتے ہیں اور بے اماں ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تسلّی کے لئے کتنے خوبصورت لفظ گھڑے گئے ہیں! امان، نجات، پناہ۔ خوبصورت مگر کھوکھلے لفظ۔

میں اور میرے نام ایسے ہی خوبصورت الفاظ کے کھلونوں سے بہلائے گئے۔ ہم اپنے خیال عذاب سے نجات پانے کے لئے گمان کے سفر پر نکلے تھے لیکن نجات کہیں نہیں تھی۔ تیر ہماری طرف آئے

تنے ایکہ خیموں میں ترازو ہوئے تھے ۔ چند پہلوؤں میں اتر گئے تھے اور کچھ نے سینہ چھلنی کیا تھا ۔ پہلے رن میں کام آنے والوں کے جسموں کے زخم گنے جاتے تھے اور میں اپنی خیمہ گاہ تک آنے والے تیر گنتی ہوں کہ میرا وجود ہی میرا خیمہ ہے اور جب وجود ہر طرف سے گھر جائے تو کوئی کہاں پلٹے اور کہاں جائے ؟ اور اب تو میں اپنے اندر تک گھر چکی ہوں ! اختتام کی گھڑی سر پر کھڑی ہے ۔ سمندر سے اٹھنے والا کہرا میری آنکھوں کی پتلیوں پر جم رہا ہے اور میری بجھی ہوئی آنکھوں میں اپنا گھر ڈھونڈ رہا ہے ۔

کہرے کو آنکھوں میں اپنا گھر مل گیا ہے ۔ لیکن میرا گھر کہاں ہے ؟ میں اپنے گھر کے ہجر میں ہوں اور سمندر کے ساتھ ، خیال کے ساتھ اور وقت کے ساتھ تنہا ہوں ۔ میں ان سب کے ساتھ ہوتے ہوئے تنہا کس طرح اور کیوں کر تنہا ہو سکتی ہوں ؟ نہیں یا پھر شاید ہاں ! انسانوں کا گروہ اگر میری طرح شک پسند ہو جائے تو وہ طرح ہر لمحہ میری ہی طرح ہونے اور نہ ہونے کے جہنم کا کندا ابنا رہے گا ۔ میں ایک ایسے ہی جہنم میں رہتی ہوں اس لیے ہو سکنے اور نہ ہو سکنے کے اندیشے ہر آن مجھے چاروں طرف سے گھیرے رہتے ہیں ۔ اس وقت بھی میں انہی اندیشوں کے نرغے میں ہوں ، یہ اندیشے صدیوں سے میرا ہانکا کر رہے ہیں اور اب ڈھول پیٹتے تاشے بجاتے یہ مجھے یہاں تک لے آئے ہیں اور تنہا لمحوں میں انہوں نے مجھے چھاپ لیا ہے ۔

کسی کے آنسو میرے پیر دھو رہے ہیں ۔ سمندر تھر تھلی سیڑھیاں چڑھتا ہوا مجھ تک آیا ہے اور میرے پیروں سے لپٹنے لگا ہے ۔ یوں جیسے کوئی افعی پاؤں سے لپٹے ۔ میں اسے جھٹکنا چاہتی ہوں لیکن وہ اپنی موجوں کے ڈنک میری پنڈلیوں میں اتار دیتا ہے اور اس کا زہر میرے بدن میں لہریں لینے لگتا ہے ۔ سمندر سیڑھیاں چڑھ رہا ہے اور تھوڑی دیوار جس پر میں بیٹھی ہوں ، اس کا قامت کم ہو رہا ہے اسی طرح جس طرح میرا اور میرے ناموں کا قامت کم ہوا ۔ یہ سمندر جو ایک تنورے ابلا مجھے اور میرے ناموں کو ڈبونے پر تلا ہوا ہے لیکن میں کو کیسے دوش دوں کہ میں اور میرے نام تو خود ہی یہاں آ بیٹھے تھے بپھرے ہوئے سمندر کے کنارے بیٹھ کر محفوظ رہنے کے خواب ہم نے جانے کس طرح دیکھے تھے خواب دیکھنا میرا پرانا روگ ہے

میں نے اور میرے بہت سے ناموں نے کیسے کیسے عجیب خواب دیکھے ہیں اور پھر ہر خواب کی تعبیر بھی چاہی ہے ۔

مجھے اپنے ناموں پر گزرا ہوا زمانہ ایک خواب معلوم ہوتا ہے ۔ ہم اپنی بستی میں قرنوں سے رہتے تھے ۔ اس زمردیں وادی میں داستانوں کے کسی طلسماتی شہر کی مانند سونے کے محل اور چاندی کی سڑکیں تھیں اور اپسرائیں اپنی اداؤں سے لوگوں کے من موہتی تھیں ۔ پھر ایک دن یہ ہوا کہ ہمیں جاگتی آنکھوں ڈراؤنے خواب دکھائی دینے لگے ۔ اپنی بستی اور اس کے گرد پھیلے ہوئے جنگل ہمیں منحوس و مقہور لگنے لگے ۔ اپسراؤں کے چہروں پر بیمار آنکھوں نے چڑیلوں کا نقاب چڑھا دیا ۔ دیوتاؤں کی جٹاؤں سے نکلتے والے پوتر دریا ہمیں سڑے ہوئے جوہڑ محسوس ہونے لگے ۔ اور پرندوں کی چہکار سے گونجتی ہوئی وادی پر ہمیں شمشان کا گمان گزرنے لگا ۔

جاگتی آنکھوں ڈراؤنے خواب دیکھنے کا عذاب بڑھتا ہی گیا ۔ پھر ایک دن ہمارے کانوں میں " یا اخی ۔ یا اخی " کی آواز آئی اور یہ آواز سن کر ہم جیسے دیوانے ہو گئے ۔ میں نے اور میرے ناموں نے بعد شتاب اپنے خیمے اکھاڑے ۔ قناتیں اپنے اپنے سروں پر دھریں ، بغل میں اجداد کی چند کتابیں دبائیں اور اس کوہِ ندا کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے جو " یا اخی ۔ یا اخی " کہہ کر ہمیں اپنی طرف بلا رہا تھا ۔

میرے بعض ناموں نے مجھے روکنا چاہا ، انہوں نے مجھے سمجھایا کہ ادھر کا رخ کرنے والے ہمیشہ کے لئے گم ہو جاتے ہیں اور پلٹ کر کبھی گھر نہیں آتے ۔ لیکن میں نے ان کے مہربان ہاتھ جھٹک دیے اور اپنے بہت سے نام پیچھے چھوڑ کر اپنے چند ناموں کے ساتھ کوہِ ندا کی طرف دوڑتی چلی گئی ۔

پھر ہم نے کوہِ ندا دیکھا ۔ اس کی چوٹیاں آسمان کو چھو رہی تھیں اور اس کے سلسلے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب غرض ہر طرف پھیلے ہوئے تھے ۔ ہم نے اس پہاڑ میں ایک دریچہ دیکھا اور میرے تمام نام ایک دوسرے کی انگلی تھام کر اس دریچے کے راستے کوہِ ندا میں داخل ہو گئے ۔ جب ہم اندر گئے تو وہاں ہر طرف دھول اڑ رہی تھی ۔ میرے بہت سے نام اندر قدم رکھتے ہی زمین

پر گرے اور ختم ہو گئے پھر زمین نے خود ہی انہیں اپنے اندر سمیٹ لیا۔ ہمیں کوہِ ندا نے پکارا تھا۔ لیکن اب وہ کہیں نہیں تھا۔ ہم جس دریچے سے اندر آئے تھے وہ بھی کہیں نہیں تھا۔

ہم اپنا بوجھ سروں پر اٹھائے اِدھر سے اُدھر بھٹکتے پھرے میرے بہت سے نام پیاس سے ہلاک ہوئے اور بہت سوں کو بھوک نے کھا لیا۔ ہم پھر بھی چلتے رہے اور سمندر تک پہنچے، جس کے آس پاس کی زمین بنجر اور ویران تھی اور جہاں صرف ببول کے کانٹے اُگتے تھے۔ ہم اور آگے جانا چاہتے تھے اور خلا میں ہی چلنا چاہتے تھے لیکن سمندر نے جب ہمارا راستہ کاٹا تو ہم اسی کے کنارے ٹھہر گئے کیونکہ ہم میں کوئی نوح نہ تھا جو کشتی بناتا اور کوہ ارارات تک لے جاتا اور ہمارے پاس کوئی کبوتر بھی نہ تھے جنہیں ہم زیتون کی شاخ اور سرسبز زمین کے مل جانے کا مژدہ لانے کے لئے اڑاتے۔ اور چونکہ ہم میں کوئی نوح نہ تھا اس لیے ہم نے سمندر کے کنارے اپنے خیمے ایستادہ کیے اور اپنے بزرگوں کی کتابیں طاق میں رکھنے کی بجائے فرش پر دھریں، پھر ہم جو بہت تھکے ہوئے تھے، ہم نے ان کتابوں کی طرف پیر پھیلائے اور سو گئے۔

ایک نیند بروایت تاموس، مکسلمینا، ملیخا، مرطونس، بن یونس، ذونواس، کشفیطط، یونس اور قطمیر کو آئی تھی اور ایک نیند ہم سوتے رہے پھر جب ہماری آنکھ کھلی تو ہمیں اپنی گلیاں، اپنے ہرے بھرے جنگل اور سرسبز کھیت یاد آئے۔ تب ہم نے اپنے اجداد کی وہ کتابیں اٹھائیں جو فرش پر دھری تھیں۔ ہم نے ان کتابوں کو کھول کر اپنے گم شدہ موسموں اور اپنی کھوئی ہوئی گلیوں کا ذکر اور پیچھے رہ جانے والی دانش کی باتوں کو دہرانا چاہا تو ہم نے دیکھا کہ وہ کتابیں جن میں سطر سطر علم و حکمت کے موتی پروئے ہوئے تھے۔ وہ کہیں گم ہو گئے ہیں اور ان کتابوں کے تمام حروف آسمان کی طرف پرواز کر گئے ہیں، اور دانائی نے اپنے سر میں خاک ڈال لی ہے۔ اب ان کتابوں کے تمام اوراق پر سنہری روشنائی سے کسی غیبی ہاتھ کا لکھا ہوا ایک لفظ "ہیہات" رہ گیا تھا۔ تب ہم نے جانا کہ ہم نے گھاٹے کا سودا کیا ہے۔

اس دن میں نے اپنے ناموں کے ساتھ لوٹ کر اپنے گھر جانا چاہا تو دیکھا کہ زمین پر یہاں سے وہاں تک ایک خط کھنچا ہوا ہے۔ یہ ایک کھائی تھی جسے عبور کرنے کے لئے سینکڑوں نوری سال درکار تھے۔ یہ کھائی پاتال سے زیادہ گہری تھی۔ اس میں گندھک کے غلیظ چشمے ابلتے تھے اور جب ہم نے جان لیا کہ ہم آگے نہ جا سکیں گے کہ پانی نے ہماری راہ کھوٹی کی ہے اور پیچھے نہ لوٹ سکیں گے کہ کھائی نے ہمارا راستہ کاٹا ہے، تو ہم ٹھہر گئے۔ ٹھہرنے کے سوا بھلا ہم کر بھی کیا سکتے تھے؟ ہم کوہِ ندا میں رہنے آئے تھے لیکن کوہِ ندا اب کہیں نظر نہیں آتا تھا اور جب ہم اس کے طلسم سے باہر جانے کا راستہ ڈھونڈتے تو وہ بھی نہیں ملتا تھا اور ملتا بھی کیسے کہ ہم میں سے کوئی قبیلۂ طے سے نہ تھا۔

پھر ایک شام جب میرے ناموں کو اپنے گھر بہت یاد آئے تو میں اور میرے نام کفِ افسوس ملتے اور اپنی پیشانیاں زمین پر گھستے ہوئے پتھر کی ایک دیوار پر چڑھے۔ ہم نے دیوار پر بیٹھ کر گریہ کیا۔ ہمارے آنسوؤں نے سمندر کا سینہ فراخ کیا اور ہماری آنکھوں سے بہنے والی رودِ ندامت نے اسے اور لبریز کیا۔

اب میں جانے کب سے پتھر کی دیوار پر کہنیاں جمائے کاغذ کی ناؤ میں بیٹھ کر رودِ ندامت پار کرنے اور گھر پہنچنے کی خواہش کرنے والے ناموں کی غرقابی کا منظر دیکھتی ہوں۔ پھر سمندر سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہے اور پتھر کی دیوار کا قامت کم ہونے لگتا ہے تو مجھے اپنے گھر کی آنکھیں یاد آتی ہیں جو میرا انتظار کرتے کرتے پتھرا گئی ہوں گی۔ اپنے گھر کا پتا میں کس سے پوچھوں اور اسے کس طرح ڈھونڈوں کہ میرے بعد تو میرا گھر محض گرد باد تھا۔

زمین سے اپنے تمام رشتے منقطع کر کے جو وقت میں گزار رہی ہوں اس کا ایک ایک لمحہ مجھے فیثا غورثیوں کی اصطلاح کے مطابق "عظیم سال" محسوس ہوتا ہے۔ وہ "عظیم سال" جو دس ہزار سال کی مدت پر محیط ہے اور جس کے اختتام پر دنیا ختم ہو جاتی ہے اور پھر دوسرا عظیم سال شروع ہوتا ہے۔ اور وہ بھی دس ہزار سال کا احاطہ کرتا ہے اور اس میں بھی ویسے ہی واقعات اور حادثات

پیش آتے ہیں جیسے پہلے عظیم سال میں پیش آئے تھے اور اس سے بھی پہلے۔

زمین سے تمہارا ہر لمحہ ایک عظیم سال بن گیا ہے اور میں جانتی ہوں کہ اس تسلسل کا خاتمہ کہیں نہیں ہے۔ پھر جب میں گھبرا کر آنکھیں بند کرتی ہوں تو مجھے جہنم کا وہ دیو ہیکل دروازہ نظر آتا ہے جس پر لکھا ہے "مجھ سے ہو کر یہ دو تارشہر کو راستہ جاتا ہے۔ مجھ سے ہو کر ابدی عذاب کو راستہ جاتا ہے۔ مجھ سے ہو کر ان لوگوں تک راستہ جاتا ہے جو تباہ ہو چکے اور اے وہ شخص جو مجھ سے داخل ہوتا ہے تمام امیدوں سے ہاتھ دھو لے۔"

میں اس دروازے سے داخل ہوتی ہوں، اندر میرے بہت سے نام آہ و بکا میں مصروف ہیں۔ مجھے اپنا وجود نظر آتا ہے جیسے شعلے چاٹ رہے ہیں اور تا ابد یہ وجود شعلوں میں گھرا رہے گا۔ میں وحشت زدہ ہو کر آنکھیں کھول دیتی ہوں۔ میں سچ کا سامنا نہیں کر سکتی اور اس دائمی عذاب سے بھی نجات نہیں پا سکتی۔

دائمی عذاب کا یہ نظارہ مجھے اطراف شام بہنے والے دریا میں رہنے والے مینڈکوں کی یاد دلاتا ہے، جنہوں نے ایک بدبخت ساعت میں ایک دوسرے سے کہا تھا کہ "جی یوں چاہتا ہے کہ یہاں سے سفر کریں کسی اور دریا میں جا رہیں کیونکہ مسافرت میں فائدے بہت ہیں۔ فقیر غنی ہو جاتے ہیں اور مفلس مالدار، ہرگز وطن میں کسی کو دولت حاصل نہیں ہوتی۔" ان میں سے چند نے اپنے ساتھیوں کو سمجھایا تھا لیکن گمراہوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا اور وہ اپنے بھائی بند، زن و فرزند سمیت وہاں سے نکل کر کسی دوسرے ٹھکانے کی جانب چلے تھے اور جب بہ ہزار دقت و خرابی ایک چشمے تک پہنچے تھے جو ان کے خیال میں فقیر کو غنی اور مفلس کو مالدار کرنے والا تھا۔ تو اس چشمے میں رہنے والے سانپ نے ان میں سے سب کو کھا لیا تھا۔

مینڈکوں کے اس قبیلے کی طرح فنا کے قبرستان میں میرا اور میرے بہت سے ناموں کا ایک چھوٹا سا کتبہ نصب کر دیا گیا ہے اور اس کتبے پر وقت نے لکھ دیا ہے کہ یہ وہ نام تھے جنہیں خودکشی کی ہوس تھی اور جس طرح اس قبرستان میں نصب عاد و ثمود کے کتبوں کو کوئی نہیں پڑھتا اسی طرح میرے ناموں کا کتبہ بھی کوئی نہیں پڑھے گا، پھر وقت کی کائی اس کتبے کو چھپا لے گی۔

میں سوچتی ہوں کہ اٹھوں اور اس دیوار سے اتروں اور اس دنیا سے پردہ کروں۔ اسی طرح جس طرح میرے بہت سے نام اب تک دنیا سے پردہ کر چکے۔ لیکن ایک آواز مجھے اٹھنے سے باز رکھتی ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی آواز ہے۔ جیسے کوئی سمندر پر چل رہا ہو۔ ایک سایہ سمندر پر بہتا ہوا دکھائی دیتا ہے پھر ہر طرف روشنی سی پھیل جاتی ہے۔ ساحل سے ایک کشتی آ کر لگتی ہے اور اس میں سے ایک حسین مہجبیں سولہ سنگھار کیے سونے سے سنہری اور چاندی سے روپہلی، بال بال موتی پروئے کشتی سے اترتی ہے اور بڑی نزاکت سے ریت پر پاؤں رکھتی ہے، اس کے بدن سے پھوٹتی ہوئی روشنی سے ہر طرف اجالا پھیل گیا ہے۔ میں اسے دیکھتی ہوں اور ایک ٹک دیکھتی رہتی ہوں۔ وہ میری طرف آتی ہے پھر میرے پہلو میں دیوار پر بیٹھ جاتی ہے۔ سمندر اب اس کے پاؤں دھو رہا ہے اور جس طرح اروپا دیوی کی پنڈلیوں کا افشاں سے بحیرۂ روم کا پانی سنہرا ہو گیا تھا اسی طرح اس کی پنڈلیوں کو چھونے والی لہریں روپہلی ہو جاتی ہیں۔

میرا جی چاہتا ہے کہ روپ نگر کی اس رانی سے پوچھوں کہ وہ کون ہے اور مجھ تہی دست کے پاس کیوں آئی ہے لیکن پھر میں سہم جاتی ہوں۔ یہ سندر مورت شاید میرا خواب ہے، میرا وہم ہے ورنہ اس ویرانے میں یہ حسن کہاں سے آیا؟ اور یہ اتنی اندھیری اور ڈراؤنی رات میں تنہا کیوں پھرتی ہے۔ نہیں یہ سب کچھ میرا گمان ہے۔

"میں تمہارا گمان نہیں، تمہارے بزرگوں کا دھیان ہوں" وہ ہنستے ہوئے کہتی ہے اور میں اسے حیرت سے دیکھتی رہ جاتی ہوں۔ یہ دلوں کے بھید جانتی ہے جب کہ میں اپنے دل کا بھید بھی نہیں جانتی۔ "تم میرے بزرگوں کا دھیان ہو تو بہار

کیسے ہو، اور میرے پاس کیوں آئی ہو؟" میں اسے شک اور شبہے کی نظر سے دیکھتی ہوں۔

"میں اپنی راہ جاتی تھی، سیر کو نکلی تھی پر جب تمہیں دیکھا تو یہاں آ گئی۔ تم حیران نہ ہو۔ میں اندھیرے میں بھی چہرے دیکھ لیتی ہوں۔ میں انسان نہیں اس لئے انسانوں کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔" وہ بولتے بولتے چپ ہو جاتی ہے۔

"لیکن آخر تم کہاں سے آئی ہو اور اس مہیب اور اندھیری رات میں بھلا سیر کو کیوں نکلی ہو؟" میں سوال کرتی ہوں۔

"میں یہیں رہتی ہوں۔ اس سمندر کی تہ میں سونے کا ایک درخت ہے۔ یہ طلائی درخت زمردیں پتوں، پکھراج کے پھولوں اور مونگے کے پھلوں سے لدا ہوا ہے۔ جب میرا جی گھبراتا ہے میں اس درخت کی طلائی شاخوں پر بیٹھ جاتی ہوں اور درخت کو اشارہ کرتی ہوں تو وہ اونچا ہونے لگتا ہے پھر اونچا ہوتے ہوتے وہ سمندر سے اپنا سر نکال دیتا ہے۔ میں اس کی لچکتی ہوئی شاخوں میں جھولتے ہوئے سطح سمندر کی سیر کرتی ہوں بانسری بجاتی ہوں گیت گاتی ہوں۔ اور جب اس کھیل سے میرا جی بھر جاتا ہے تو میں درخت کو اشارہ کرتی ہوں اور وہ پورے چاند کی طرح گھٹنے لگتا ہے اس طرح میں آہستہ آہستہ سمندر کی تہ میں اتر جاتی ہوں۔" وہ مجھے بتاتی ہے۔

"سمندر کی تہ میں رہتے ہوئے تمہیں ڈر نہیں لگتا؟" میں اچنبھے سے پوچھتی ہوں۔ کتنی عجیب سی بات ہے کہ یہ سمندر جس نے میرا اور میرے ناموں کا راستہ کاٹا ہے اسی سمندر میں ایسی مہ جبیں رہتی ہو۔ شاید یہ سب طلسم کا کارخانہ ہے۔

سمندر کی تہ میرا گھر ہے اور گھر سے بھلا کون ڈرتا ہے؟ میں یہاں سے چلی گئی تھی، پھر لوٹ آئی ہوں۔ مجھے انسانوں سے پیار ہے، ایک انسان جس نے مجھے اس راکھشس سے نجات دلائی تھی جو میرے باپ کے سراپ کے کارن مجھ پر مسلط تھا۔" وہ کہہ رہی ہے اور میں سن رہی ہوں۔ کیسی عجیب طلسماتی کہانی ہے۔ مجھے اپنے بزرگوں کی لکھی ہوئی ایک کتاب یاد آ رہی ہے۔ اس کتاب کی کہانی اس داستان سے کتنی مشابہ ہے جو میں نے بچپن میں پڑھی تھی۔

"پھر تم اس انسان کے ساتھ کیوں نہیں رہتیں؟" میں بے ساختہ سوال کرتی ہوں۔

"تم انسانوں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ تم فانی ہو۔ میرا محبوب راجا بلبھ بھی فانی تھا۔ اس نے مجھے راکھشس سے نجات دلائی۔ پھر مجھے بیاہ کر اپنے گھر لے گیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد راکھشس کو ایک وار میں ہلاک کرنے والا، اپنی زندگی کی حفاظت نہ کر سکا۔ جب میں تنہا ہو گئی تو محل مجھے ویرانہ معلوم ہونے لگا اور میں اپنے گھر چلی آئی۔ اب میں اپنے گھر میں رہتی ہوں اور میرا گھر دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اب یوں ہے کہ جب راجا مجھے بہت یاد آتا ہے تو میں اپنے گھر کی شاخوں میں جھولتی ہوئی سمندر کے اوپر آ جاتی ہوں۔ دنیا کی سیر کرتی ہوں پھر واپس چلی جاتی ہوں۔" وہ خاموش ہو کر سمندر کی طرف دیکھ رہی ہے۔

وہ چپ ہے اور میں سوچ رہی ہوں کہ لفظ "گھر" تو میرے لئے بیتال بن گیا ہے جو میری پشت پر سوار ہے اور ہر مرتبہ برگشتہ میں جا کر الٹا لٹک جاتا ہے۔ میں راجا بکرماجیت کی طرح کب تک اس بیتال کو برگشتہ سے اتاروں۔ گٹھڑی میں باندھ کر کاندھے پر رکھوں اور اپنی راہ لوں۔

لیکن میں کوئی راہ اختیار کروں تو کیسے کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں راجا بلبھ رانی سے اپنے گھر کا راستہ پوچھنا چاہتی ہوں۔ لیکن وہ میرے سوال سے پہلے ہی غائب ہو چکی ہے وہ سمندر سے آئی تھی اور سمندر میں اتر گئی ہے۔

روشنی گم ہو گئی ہے اور ہر طرف پہلے جیسا اندھیرا پھیل گیا ہے۔ چند روشنیاں سمندر کی لہروں پر بہتی ہوئی دور سے گزر رہی ہیں۔ میں انہیں پکارنا چاہتی ہوں، اپنی طرف بلانا چاہتی ہوں۔ لیکن میرے ہونٹ خشک ہیں اور میری زبان حروف اور لفظوں کی ادائیگی فراموش کر چکی ہے۔ میں سب کچھ بھلا چکی ہوں اور خود بھی بھلائی جا چکی ہوں اور اب محض اندھیرا میرے ساتھ

بقیہ صہ ۲۲ پر

ممتاز حسین بسمل (پاکستان)

# خوشبو کا سفر

سردیوں کا موسم تھا۔ آسمان پر ننھے منے بادل روئی کے گالوں کی طرح اِدھر اُدھر بکھرے تھے۔ ہوا کے سرد جھونکوں میں ایک دلآویز خنکی تھی۔ چند ہفتوں سے مجھے بخار آرہا تھا اور میں علاج کی خاطر ایک دوست ڈاکٹر راشد کے مطب میں بیٹھا ہوا تھا۔ تقریباً ایک پہر رات گذر چکی تھی اور لاہور کا تاریخی شہر برقی روشنیوں میں اپنے جوبن پر اترا رہا تھا۔ آخری مریض کو رخصت ہوئے آدھ گھنٹہ ہو چکا تھا گلی میں کسی بھکارن نے دردناک آواز میں گانا شروع کر دیا۔

"پیتم جو میں جانتی پیت کئے دکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پیٹتی پیت کرے نہ کوئے"

میں نے یہ دل نشیں گیت برسوں بعد سنا تھا۔ راگ کی پریاں مجھے ایک خواب گیں دنیا میں اڑا کر لے گئیں۔ میری ناکام زندگی کی چند مشہور گھڑیاں بیراگی کے اس گیت سے وابستہ تھیں مگر اب وہ قہقہے لاکھوں آہوں میں گم ہو چکے ہیں۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" ڈاکٹر نے میری پریشانی بھانپ کر پوچھا۔

"اس راگ نے میری رگ رگ میں آگ بھر دی تھی" میں نے جواب دیا۔ "میری زندگی کے چند لمحات اس جادو بھرے نغمے سے متاثر ہیں مگر اب ماضی کا دبیز پردہ بیچ میں حائل ہے اور میں ہاتھ بڑھا کر اسے ہٹا نہیں سکتا۔"

ڈاکٹر مسکرایا — "ہاں۔ ہاں" اس نے کہا "ایسا ہو جاتا ہے۔ آپ کے خیال میں کون سی حس سب سے زیادہ مانوس ہے"

"آواز" میں نے جواب دیا۔

"نہیں" ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔

"نگاہ"

"نہیں"

"اب آپ ہی بتائیں" میں نے لاجواب ہو کر کہا۔

"خوشبو" ڈاکٹر معنی خیز انداز میں بولا۔

"بے شک بعض اوقات کوئی مانوس آواز ماضی کے چہرے بے نقاب کر ڈالتی ہے اور نگاہ بھولا بھٹکا زمانہ یاد دلاتی ہے۔ مگر خوشبو کا معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ ایک معطر پیرہن ماضی کے طوفانی ایام واپس لے آتا ہے اور محبت کے لطیف مناظر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ ہر پھول کی خوشبو دوسرے سے مختلف ہوتی ہے اور ہر ایک اپنی داستان جداگانہ انداز میں کہتا ہے۔ ڈاکٹر راشد نے جو عجیب داستان مجھے سنائی وہ کچھ اسی انداز کی ہے۔

---

جنگ عالمگیر اول کے بھیانک ایام تھے۔ یورپ استعمار کی خونیں قربان گاہ پر لاکھوں جوان بھینٹ چڑھا چکا تھا۔ مگر ہوس کی خونخوار دیوی کی پیاس بجھتی ہی نہ تھی۔ میں نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے ایم۔ بی۔ بی ایس کا امتحان

پاس کیا۔ رگ رگ میں ترکوں سے محبت سمائی ہوئی تھی اسے لئے
بسیار سعی کے بعد میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا اور دولت
عثمانیہ نے مجھے اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا میں استنبول کے
مصطفےٰ اسپتال میں کام کرتا تھا۔ میرے ایک عزیز ان دنوں
ترکی میں برطانوی سفیر کے دفتر میں نوکر تھے اور میں ان سے
ملنے گاہے گاہے سفارت خانے جایا کرتا۔ وہاں میری ملاقات
ایک فوجی افسر سے ہوئی۔ آپ اسے کیپٹن اسمتھ کہہ سکتے ہیں۔ وہ
ایک حسین اور مغرور نوجوان تھا۔ اس میں بہت سے نقائص تھے
مگر اب انھیں دہرانے کا موقع نہیں۔

دوستی میرے لئے ہمیشہ ایک معمہ رہی ہے۔ وہ کشش جو
دو دلوں کو ایک بنا دیتی ہے میرے لئے اب تک سربستہ راز ہے
میں شاعری اور تاریخ کا دلدادہ، کیپٹن فوجی آدمی اور مردانہ کھیلوں
کا شوقین۔ اس کے باوجود ہم ایک دوسرے کے رفیق بن گئے۔

ایک دن کیپٹن گھبرایا ہوا میرے پاس آیا۔ کیوپڈ کا
تیر اس کے سینے میں ترازو تھا۔ وہ ایک قہوہ خانہ کی خادمہ اولگا
کو دل دے آیا تھا۔ شاید آپ خادمہ کے لفظ پر چونک اٹھیں
مگر ان دنوں سورج ہر روز اپنے دامن میں سینکڑوں ہنگامے لے
کر طلوع ہوتا تھا۔ نازیوں کا بے پناہ سیل جنوب مشرقی یورپ کے علاوہ
روس کا ایک بڑا حصہ ہڑپ کر چکا تھا۔ ان علاقوں کے سینکڑوں
گھرانے استنبول میں پناہ لینے پر مجبور تھے اور ہر روز ان کی تعداد
میں اضافہ ہو رہا تھا ــــــ اولگا یوکرین کی رہنے والی تھی ــــ
مدرسے میں انگریزی اس کا اختیاری مضمون تھا۔ وہ راگ
ودیا کی ماہر تھی اور جب وہ گاتی تو پرندے چہچہانا بھول جاتے
اور دل سینوں میں دھڑکنے لگتے مگر...... وہ استنبول کے ایک
معمولی قہوہ خانے میں خادمہ تھی۔

اس کی گزشتہ زندگی ایک بہت بڑا المیہ تھی نازیوں
نے اس کے والد کو گولی مار دی۔ اس کی والدہ نے چھت سے کود
کر جان دے دی۔ بے چاری کی چھوٹی بہن اس نظارے کی
تاب نہ لا سکی اور مر گئی۔ چند روز بعد میں نے بھی اولگا سے ملاقات
کی۔ وہ اسمتھ کے مبالغہ آمیز بیان سے کہیں زیادہ خوبصورت
تھی۔ ہمکاری اور میرا عمر رفتہ کا تصور دونوں جا چکے تھے۔

شام کا وقت ہم عموماً ستوطری کے قریب ساحلی صنوبر
کے ایک گنجان جھنڈ میں گزارا کرتے۔ اولگا اپنے ماں باپ اور
بہن بھائیوں کی زندگی کے واقعات سناتی اور کیپٹن اسے پر اشتیاق
نظروں سے دیکھا کرتا۔

چند ماہ بعد اسمتھ کو مصر جانے کا حکم ملا۔ جب وہ مجھے
الوداع کہنے آیا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ جسم لرز رہا تھا اور آنکھوں
کی پتلیاں سکڑ گئی تھیں۔

"ڈاکٹر"ــــ اس نے مجھ سے کہا ــــ "اولگا نے مجھ سے
ایک تحفہ مانگا۔ ایک ریوالور۔"

"ریوالور!" میں نے تعجب سے دہرایا۔ "اس کی بھلا کیا
ضرورت تھی۔"

"میں نے اسے ایک ریوالور دے دیا ہے۔ آپ کی رائے
کیا ہے؟"

میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "آپ نے ٹھیک ہی
کیا۔"

اس کے بعد کیپٹن مصر اور وہاں سے طبروق (لیبیا) چلا گیا
وہ چاہتا تھا کہ میں اولگا کو تہران، بیروت اور کیپ ٹاؤن کے راستے
لندن بھیج دوں۔ اس نے اولگا کو طبروق سے بے شمار خطوط لکھے۔ ان
کے ایک ایک لفظ سے محبت کی خوشبو آتی اور ہر فقرہ درد دل کا مظہر
ہوتا۔ اس کی تحریر ایک آہ تھی جو ہجر کی بے چین راتوں میں دل کی
مونس بنتی ہے اور الفاظ آنسوؤں کے قطرے تھے جن میں سوز و گداز کے
سمندر بہے ہوئے تھے۔

اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ ایک کاسک عورت جو میرے
زیر علاج تھی۔ اسپتال میں فوت ہو گئی۔ چھوڑے ہوئے سامان سے
اس کا پاسپورٹ مل گیا اور اس کی وساطت سے اولگا لندن پہنچ
گئی۔

استنبول میں اولگا کبھی کبھی روسی گلہ بانوں کے گیت گایا

کرتی تھی۔ اس کی روانگی کے بعد میں نے ان کے چند ریکارڈ حاصل کر
لئے اور آج بھی ان میں سے کوئی گیت سنتا ہوں تو ماضی کا تاریک
پردہ میری نظروں کے سامنے سے اٹھ جاتا ہے باسفورس کا حسین
ساحل ــــ سرو کی قطاریں ــــ صنوبر کے جھنڈ ــــ رومانی فضا
اور چاند سا ایک چہرہ ــــ خدا جانے کیا کچھ یاد آجاتا ہے اور میں تصور
کے گورکھ دھندے میں کھو جاتا ہوں۔

اولگا کے لندن پہنچ جانے کے بعد میں لاہور آگیا اور یہاں
اپنا کاروبار شروع کرلیا۔ میں نے اولگا کو اپنا لاہور کا پتہ لکھ بھیجا
اور اس کے خطوط مجھے باقاعدہ ملتے رہے۔

جنگ ختم ہونے کے بعد لندن میں ڈاکٹروں کا ایک خاص
اجلاس بلایا گیا۔ جنگ کی بنا پر صحت کے نئے نئے مسائل پیدا ہو چکے
تھے اور نئی نئی بیماریاں رونما ہو چکی تھیں۔ اجلاس میں انھیں کے
متعلق لائحہ عمل تیار کرنا تھا اس لئے جب مجھے دعوت نامہ ملا تو میں فوراً
لاہور سے لندن روانہ ہوگیا۔ اولگا اور اسمتھ کی یاد مجھے بری طرح
ستا رہی تھی اور میں بار بار سوچتا کیا ان کے افسانۂ محبت میں شادی
کا باب درج ہو چکا ہے۔ میں نے روانگی سے پہلے اولگا کو اپنی آمد
کی اطلاع بھیج دی۔

میں لندن میں اولگا سے ملا۔ اس کے حسن کو چار چاند لگ
گئے تھے مگر وہ پہلے سے قدرے مختلف دکھائی دیتی تھی۔ وہ اپنا بیشتر
وقت کلبوں میں صرف کرتی کیپٹن اسمتھ رخصت لے کر اس کے پاس
آرہا تھا مگر وہ اس اطلاع سے پریشان تھی۔ اس نے مجھے صاف الفاظ
میں کہہ دیا کہ اسے کیپٹن سے ذرا بھی محبت نہیں۔ مگر اس کے شاہانہ
اخراجات کے لئے وہ باقاعدگی سے گراں بہا رقوم بھیجتا رہتا ہے۔
کانفرنس کا ہے گاہے منعقد ہوتی اور مجھے اولگا سے ملنے
کے لئے خاصا وقت مل جاتا۔ آخرکار اسمتھ نائجیریا سے لندن پہنچ
گیا۔ وہ بخار میں مبتلا رہا تھا۔ اس لئے ماندہ اور کمزور دکھائی دیتا
تھا۔ میں نے اسے مناسب ہدایت کے ساتھ آرام کا مشورہ دیا۔
ایک دن کیپٹن بارش میں دو گھنٹے تک باغ کے اندر اولگا
کا منتظر رہا۔ جب وہ آئی تو سردی کے مارے اسمتھ کے دانت بج

رہے تھے۔ اولگا اسے اپنے ساتھ میں لے آئی ۔۔ اور کھانا منگوایا
مگر کھانے کے دوران ہی میں کیپٹن پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔
اولگا نے مجھے ٹیلیفون کیا۔ مگر میں لندن میں نہیں تھا دوسرے دن
میں نے جا کر کیپٹن کو دیکھا مگر اس کی بیماری شدت اختیار کر چکی تھی۔
اور وہ دو دن بعد مر گیا۔
وہ انگلستان کے ایک بہت اونچے گھرانے کا فرد تھا۔ اگر اولگا
اس سے بیاہ کر لیتی تو آج اس کا شمار دنیا کی معزز ترین خواتین میں ہوتا
کیپٹن کی وفات کے بعد وہ بے حد پریشان تھی اور خود کو اس کے انتقال
کی ذمہ دار سمجھتی۔ میں نے اسے بہتیرا سمجھایا۔ مگر اس کے حواس میں فرق
آگیا تھا۔ کبھی کہتی کہ اس نے بارش میں کیوں میرا انتظار کیا۔ کبھی اپنے
آپ کو کوستی کہ وقت پر کیوں نہ پہنچی اور آخر میں سرد آہ بھر کر کہتی "اسے
مجھ سے بے پناہ الفت تھی"۔ ریوالور ابھی تک اس کے قبضے میں
تھا۔ دو ہفتے بعد اس کی طبیعت ذرا سنبھلی مگر حالات اور بھی پیچیدہ
ہو گئے۔ غم نصیب اولگا کے مطلع حیات پر مصیبت کے گھنگھور بادل چھا گئے
تھے اور اس نے غم غلط کرنے کے لئے وہ مشاغل اختیار کر لئے۔ جنھیں
وہ پہلے نہایت معیوب سمجھتی تھی۔
میں نے اس کی معصوم روح کو ان بدنام مشاغل کے چنگل سے
چھڑانے کی دیوانہ وار جدوجہد کی اور اس کے ماں باپ اور بہن بھائی
کا واسطہ دیا۔ مگر وہ اپنا ماضی فراموش کر چکی تھی۔ مجھے یہ اطلاع
بھی ملی کہ وہ افیون کا استعمال کرنے لگی ہے۔ بدنام اسمگلر بلراج اسے
یہ زہر مہنگے داموں مہیا کر رہا تھا۔
ایک دن وہ مجھ سے ملنے آئی۔ میں نے اسے روسی گلوکاروں
کے گیتوں کا ریکارڈ سنایا۔ مجھے اپنا یہ تجربہ کامیاب دکھائی دیا۔
کیونکہ اس کا اترا ہوا چہرہ دمک اٹھا تھا۔ مگر سورج غروب ہونے
سے پہلے وہ پھر بلراج کے مکان پر موجود تھی۔
دوسرے دن میں اس سے ملنے گیا اور اس کے عزیزوں کی
بات چھیڑ کر اسے تباہی کے راستے سے بچانے کی کوشش کی۔ اپنی معصوم بہن، اپنے
پیار کرنے والے باپ اور اپنی مہربان ماں کا ذکر سن کر اس کی
آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے میرے سامنے توبہ کی۔ مگر یہ عہد

صرف چند روز تک ٹھہرا یا ۔۔۔ اتفاق سے مجھے یوکرین کے ایک
جاسوس سے ملنے کا موقع ملا اور ہم دونوں یوکرین باشندوں کی
روزمرہ زندگی کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ اس کی زبانی معلوم
ہوا کہ یوکرین میں سردی نہایت شدید ہوتی ہے اور دیہاتی اپنے
کمرے گرم رکھنے کے لئے شاہ بلوط کی لکڑی جلاتے ہیں۔

دوسرے دن میں اس محلہ میں گیا جہاں بلراج کا
مکان تھا۔ اس کی ہمسائیگی میں غلام رسول نامی ایک پاکستانی
رہائش پذیر تھا۔ میں نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ بڑے
تپاک سے ملا اور گھر کے اندر لے گیا۔ وہاں میں نے پرتکلف چائے
پی اور اپنے ایک پاکستانی بھائی کی معیت میں کچھ دیر کے لئے تمام
تفکرات بھول گیا۔

بلراج اور غلام رسول کے مکان کا صحن مشترک تھا۔ اس
میں پھولوں کے چند تختے تھے اور ایک جانب خشک لکڑیوں کا ایک
ڈھیر لگا تھا۔ غلام رسول اپنا کمرہ گرم رکھنے کے لئے وہاں سے ایندھن
لیتا تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ اس کا ہمسایہ بلراج
اسمگلر ہے اور چور بھی کیونکہ موقع پاکر اس کی لکڑیاں چرا لیتا
ہے۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ آپ میرے وطنی بھائی ہیں۔ پریشان
نہ ہوں۔ میرے پاس خشک لکڑیوں کا انبار موجود ہے۔ میں لدا
ہوا ایک چھکڑا آپ کے لئے بھیج دوں گا۔ آپ میری جانب سے اپنے
ہمسائے کو اس کی ضرورت کے مطابق کچھ لکڑیاں دے دیں۔

پانچ روز گذر گئے اور میں اولگا سے ملاقات نہ کر سکا
شام کے وقت ہوٹل میں اپنے کمرے کے اندر کھانا کھا رہا تھا کہ آہٹ
سنائی دی۔ اولگا میرے روبرو کھڑی تھی۔ اس کا حسن اور بھی
دلآویز ہو گیا تھا اور نیلگوں لباس میں وہ ایک حور معلوم ہو رہی
تھی۔ اس نے میرے سامنے صوفے پر بیٹھ کر کہنا شروع کیا
"آج میں بلراج کے گھر افیون خریدنے گئی تو اچانک ماضی کا
درخشاں چہرہ میری نگاہوں کے روبرو آگیا۔ ڈاکٹر صاحب حیرت کا
مقام ہے۔ کہ میں نے اپنی پیاری بہن کی آواز سنی اور امی کو پیار سے
مسکراتے دیکھا۔ مجھے اپنی گائے سڑک پر دوڑتی دکھائی دی۔ میرا ہمسایہ
اپنا ریوڑ گھر لا رہا تھا ۔۔۔ میں نے اپنے والد کو دیکھا۔ وہ کہہ رہے
تھے اولگا نیک بچی بنو۔ جب میں یہ تمام منظر اپنی آنکھوں سے
دیکھ رہی تھی تو بلراج کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر میرے تن
بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے مجھ سے افیون کی قیمت کا مطالبہ
کیا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ریوالور میری انگلیوں کی گرفت
میں آگیا۔ کسی اندرونی جذبے سے بے اختیار ہو کر میں نے اس کی
نالی بلراج کی کنپٹی سے لگا دی۔ اس نے ہاتھ جوڑے مگر میں اسے
ہلاک کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اچانک میں نے اپنی امی کی آواز سنی۔
۔۔۔ اولگا۔ اولگا ایسا نہ کرو۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے
ابا کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ وہ مجھے اس بھیانک ارادے سے
باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے ہر چیز بالکل نمایاں تھی اور میرا
خوشیوں سے بھرا ہوا گھر میرے سامنے تھا۔ میں نے ریوالور پھینک دیا
اور باہر نکل آئی۔ ڈاکٹر صاحب میں اس زندگی سے اکتا چکی
ہوں!"

"ہم کل یہاں سے پاکستان روانہ ہو جائیں گے ۔۔۔
۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب" ۔۔۔ میں نے دریافت کیا "وہ
کون سی قوت تھی۔ جس نے اس کی ابتدائی زندگی کو ماضی کے
اندھیرے سے نکال کر اس کے سامنے لا کھڑا کیا"؟

ڈاکٹر نے جواب دیا ۔۔۔ "یوکرین کے دیہات میں عوام
شاہ بلوط کا ایندھن استعمال کرتے ہیں جلتے وقت اس میں سے
ایک خاص خوشبو پیدا ہوتی ہے میری بھیجی ہوئی لکڑیوں کی خوشبو
نے اولگا کی زندگی بچالی۔"

میں حیرت میں گم ڈاکٹر کے عجیب و غریب افسانے پر غور کر رہا تھا کہ
اچانک دروازہ کھلا اور ایک حسین دلآویز قد عورت کمرے میں داخل ہوئی۔

"معاف کیجئے" اس نے کہا "میں آپ کی گپ شپ میں حارج ہوئی"

"آ جائیے۔ آپ وقت پر تشریف لائیں۔ بسمل صاحب یہ میری رفیقۂ حیات
اولگا ہیں"

جاوید عالم جاوید (برہ پورہ)

پہلے زیادہ درد نہیں ہوتا تھا۔ اب تنہائی کا ناگ ہر وقت ڈستا رہتا ہے اس لئے بے حد تکلیف ہوتی ہے    یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ آدمی ایک بار کسی سے دل لگائے اور پھر ساری زندگی اس کا دامن پھولوں کے بجائے کانٹوں سے بھر دیا جائے۔ زندگی کیا ہے؟ زندگی کیسے گذارنی چاہیئے۔ اس کا فلسفہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا کبھی تم نے اس پر غور کیا ہے۔

"ہاں"۔    میں نے بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی سے اسکے نرم بھیگے ہوئے ہونٹ کو چھوتے ہوئے کہا۔ اُس نے آہستہ سر اپنے چہرے کو دوسری طرف پھیر لیا۔ جس سے میری انگلی خلا میں تیرتی ہوئی واپس چلی آئی۔ "میں نے اکثر اس سوال پر غور کیا ہے۔ لیکن تمہاری طرح میں بھی آج تک کچھ سمجھ نہیں سکا۔" میں نے یہ جملہ کہہ کر شاہی کی طرف دیکھا جو تیزی سے چلتے ہوئے سیلنگ فین کو دیکھ رہی تھی۔

"عجیب بات ہے    ہے نا۔؟" شاہی نے کہا "زندگی کی مختلف شکلیں ہیں کہیں وہ ایک پھول کی طرح ہے تو کہیں نوکیلا خار کہیں کوئل کی مدھ بھری کوک ہے تو کہیں زخمی یاد اگر زندگی کا ایک ہی روپ ہوتا تو کیا فرق پڑتا۔"

"دراصل ہر انسان اپنی نظر سے زندگی کو دیکھتا ہے۔ اسلئے وہ ہر جگہ بدلی ہوئی شکل کے ساتھ نظر آتی ہے۔ میری نظر میں تو زندگی ایک بے مقصد شئے ہے۔"

"بے مقصد میں بھی تو کوئی مقصد چھپی رہتی ہے،" شاہی ہنسنے لگی۔

"بے کار بکواس مت کیا کیجئے۔" میں بھی ہنس دیا۔

اکتوبر کی وہ نرم شام تھی۔ سارا دن سورج پریشان ہوتا رہا تھا اور دھوپ بھاگلپور کے گلی کوچوں میں موسلا دھار برستی رہتی تھی۔ اسلئے سردی نہیں تھی آخر کار سرخ ہوتا ہوا گول سورج مغرب میں جاکر سو گیا تھا۔ ہم دونوں گارڈن چیر پہ بیٹھے سامنے والی دیوار پر رینگتی چھپکلی کو دیکھ رہے تھے۔ کمرے کے اندر ساٹھ پاور کا بلب اندھیرے سے جنگ کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔ شاہی کا چھوٹا بھائی بستر پر گولی سے کھیل رہا تھا۔ اور اس کی ماں بار بار منع کر رہی تھی۔ چھوٹی بہن ریڈیو آن کرکے گپ کرنے میں مشغول تھی اور ریڈیو لائف لونگ بیٹری کا اشتہار نشر کر رہا تھا۔

شاہی نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ "زندگی کے مفہوم کچھ بھی ہوں لیکن اتنی بہت محرومیاں نہ ہوں تو زندگی ایسی بری بھی نہیں۔"

"ہاں اگر تھوڑا سا سکون، تھوڑی سی مسرت اور اک ذرا سی محبت ہو تو زندگی واقعی جنت ہے۔"

"لیکن بدقسمتی سے زندگی میں دُکھ زیادہ ہیں۔ اتنے زیادہ کہ ہم انہیں گن نہیں سکتے۔" پھر رک کر بولی "تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے۔"

"نہیں" میں نے پھر اس کے ہونٹوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ دراصل بات یہ ہے کہ صورت سے محروم لوگوں سے محبت کون کریگا اور محبت تو خالی جیب ہوتی کبھی نہیں۔"

اس نے شانے جھٹکتے ہوئے کہا "کیوں جھوٹ بولتے ہو"

"سچ مانو ـــ" میں نے جیب سے رومال نکال کر چہرے پر بکھرے پسینے پونچھتے ہوئے کہا۔

"اور ویسے بھی مجھے شک ہے کہ شاید کوئی لڑکی مجھے پسند کرے گی۔"

شاہی ہنسنے لگی اور پھر میری طرف انگلی اٹھا کر بولی "تم بہت بدمعاش ہو، اگر کبھی کسی لڑکی نے تمہاری جانب محبت کی نگاہ سے دیکھا بھی ہوگا تو تم نے اس کا دل توڑ دیا ہوگا۔"

میں بھی ہنس دیا۔ شاہی سے کچھ نہیں کہا، صرف دل میں سوچا ـــ یہی تو غم ہے شاہی بیگم کاش کبھی کسی نے میری طرف محبت کی نظر سے دیکھا ہوتا۔

میں اور شاہی کوئی پانچ سال سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ لیکن ہمارے جاننے کا انداز بڑا صاف ستھرا اور بے ضرر قسم کا تھا۔ اس لیے کہ میں شاہی کو روایتی انداز سے نہیں پڑھاتا۔ پڑھائی کے دوران دنیا بھر کی سیاست، کھیل، سیاحت وغیرہ کی باتیں داخل تھیں۔ اس دوران کبھی کبھی کسی کہانی کا پلاٹ سُناتا اس پر بحث بھی کرتا اُسے کہانی میں بچھڑ جانا پسند نہیں تھا۔ اس سے بہتر وہ موت کو ترجیح دیتی۔

ایک بار اس نے اندھیرے میں آنے سے منع کیا اور کہا کہ "تم ایک ٹارچ کیوں نہیں خرید لیتے؟"۔ "جیب اجازت نہیں دیتی"۔ میں نے مسکرا کہا "ٹارچ خریدونگا تو کتابوں، رسالوں، کے بجٹ میں کمی کرنی پڑے گی۔ مجھے اندھیرے میں آنا گوارہ ہے لیکن کتابوں کی خریداری میں کمی ممکن نہیں۔"

شاہی میری طرف فہمائش کے انداز میں نظر اٹھا کر بے اختیار ہنسنے لگی۔

"اتنی محبت ہے کتابوں سے۔"

"سرہانے میں اگر کتابیں نہیں ہوں تو مجھے نیند نہیں آتی" میں نے جواب دیا

"یعنی کتاب آپ کی محبوبہ ہے۔"

میں نے گردن ہلا کر جواب دیا "جی ہاں"

دو تین ماہ امتحان کی تیاری میں اس قدر مشغول رہا کہ پتہ نہیں چلا کہ شاہی کیسی ہے۔ کہاں ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس کے بھائی سے ملاقات ہو جاتی تو پوچھ لیتا۔

اور پھر ایک طوفان آیا جس نے میری زندگی کے حسین خواب، ہوائی قلعے تعمیر کئے تھے شاہی کی نظروں سے چھپا کر بہا لے گیا۔ کبھی کبھی کوئی شیشہ اچانک بغیر کسی آواز کے ٹوٹ جاتا ہے۔ بجلی گرتی ہے اور لوگ اچانک مر جاتے ہیں۔ محبت راہ تلاش کرتی ہے تو راستے میں دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔

شاہی کی شادی کر دی گئی۔ لڑکا خوب صورت اور وجیہہ قد و قامت کا تھا۔

چار سال اور گذر گئے۔ میں نے سوچا تھا کہ امیر ہو جاؤنگا، وہ نہ ہوا۔ میں نے سوچا تھا کہ لاٹری نکلے گی۔ لاٹری بھی نہ نکلی۔ میں نے سوچا تھا کہ قسمت چمکے گی، وہ بھی نہ چمکی۔ میں خوابوں کی دنیا میں رہتا ہوں۔ بڑے بڑے ہوائی قلعے تعمیر کرتا ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ ہوش آ جائے گا۔ وہ بھی نہ آیا۔ یعنی حالت سدھرنے کے بجائے بگڑتی چلی گئی۔ اور میں زندگی گذارنے کیلئے اردو کا ٹرانسلیٹر بن گیا۔

اس عرصے میں ایک حادثہ اور ہوا۔ شاہی سسرال سے میکے آ گئی۔ اسی دوران اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ دو چھوٹی بہنیں چل بسیں۔ بس ایک ماں اور دو چھوٹے بھائی رہ گئے۔

میں ایک دن شاہی کے گھر گیا۔ اس کی ماں بہت بوڑھی ہو چکی تھیں۔ سارے بال سفید ہو گئے تھے اور ان کی شخصیت میں ایک بزرگانہ دلکشی پیدا ہو گئی تھی۔ اس اثنا میں شاہی دبے دبے قدموں سے آ کر میرے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو وہ شاہی نہیں تھی جسے میں نے پانچ سال قبل دیکھا تھا۔ وہ کافی بدلی ہوئی نظر آئی۔ اداسی اس کے چہرے سے عیاں

تھی۔ میں نے رسماً خیریت پوچھی لیکن دل میں ایک درد سا محسوس ہو رہا تھا۔ اور میں تھکے تھکے قدموں سے واپس چلا آیا۔

پھر ایک دن ٹیلی فون پر شاہی کی آواز گونجی وہ کہہ رہی تھی۔

"میں تم سے ملنا چاہتی ہوں، طارق"۔

میں بہت باتیں سوچتا ہوا گھر پہونچا تو شاہی لان میں گلاب کی کیاریوں کے قریب گھاس پر بیٹھی نظر آئی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے روکھے بال چہرے پر جھکے ہوئے تھے۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"تم کیسے ہو طارق؟" شاہی کی آواز اس کی آنکھوں کی طرح اداس لگ رہی تھی۔

میں نے کہا "ٹھیک ہوں" بس کسی طرح زندگی کٹ رہی ہے۔

تم کیسی ہو، تمہارے ....... "اس نے بات کاٹ کر "ایک بات کہنا ہے تم سے اور اس بات کا تعلق ان ہی پھولوں، پتیوں اور پودوں سے ہے۔ جب میں اپنے ہاتھوں سے پکڑے ہوئے ہوں میں نے ایک دن بوڑھے مالی سے پوچھا تھا کہ ہر سال وہ اتنے اچھے اتنے خوش رنگ گلاب کیسے اُگا لیتا ہے اور جانتے ہو طارق اس نے کیا جواب دیا؟ اس نے کہا کہ اچھے گلابوں کا قلم لگانا چاہئے اور پھر عمدہ کھاد کے ساتھ اچھی دیکھ بھال بھی ضروری ہے تبھی خوب صورت، خوش رنگ اور تندرست گلاب پیدا ہوگا"۔ شاہی بڑے بڑے سرخ پھولوں کو غور سے دیکھنے لگی۔

"تو تمہارا ارادہ گلاب کی کھیتی کرنے کا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"نہیں یہ بات نہیں ـــ دراصل میرے بچے کے باپ بننے کا فرض تم قبول کرلو" شاہی کی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں یہ بات سن کر چونک گیا۔

"تم سوچ رہے ہوگے کہ اب تک جاگتے ہیں یا ابھی خواب دیکھتی ہوں۔ اُن دنوں جب تم مجھے شیکسپیر کے ڈرامے پڑھاتے تھے۔ اگر میں اتنی ہی حقیقت پسند ہوتی تو آج میرے لئے یہ خواہش مشکل نہیں ہوتی"۔ "مگر شاہی ـــ" میں نے اس کی جذباتیت کو روکنا چاہا۔

"طارق ـــ کسی بھی عورت کے لئے ایسی خواہش کا اظہار مشکل ہے" شاہی نے میری بات کاٹی۔ "میں نے بہت دن سوچنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے۔ اب میری خوشی تمہارے ہاتھ میں ہے"۔

ہم دونوں وہاں کافی دیر بیٹھے رہے۔ پھر وہ بغیر کچھ کہے اندر کمرے میں چلی گئی۔

میں وہیں بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ شاہی اب تک شاید خواب دیکھتی رہی ہے۔ مگر اب یہ پتہ چلانا مشکل ہوگیا ہے کہ ان خوابوں کا تعلق آنے والے کل سے ہے یا گذرے ہوئے اُن دنوں سے ہے جب پڑھانے کے علاوہ اخلاقیات کا سبق بھی یاد کراتا ہے۔

محمد مظہر ھاشمی (لکھنو)

## ارشادات رحمت اللعالمین علیہ الصلوٰۃ والسلام

۱ جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ رحم نہیں کرتا ہے۔

۲ سادہ زندگی گزارنا ایمان کی علامت ہے۔

۳ یہ مت کہو کہ لوگ ہم سے اچھا برتاؤ کریں گے تو ہم ان سے اچھا برتاؤ کریں گے۔ وہ زیادتی کریں گے تو ہم بھی زیادتی کریں گے۔ بلکہ اپنی ایسی روش بناؤ کہ لوگ تم سے اچھا برتاؤ کریں تو تم ان پر احسان کرو اور اگر وہ تم سے برائی کے ساتھ پیش آدیں تو عفو و درگذر سے کام لو۔

۴ جو لوگ میانہ روی اختیار کرتے ہیں وہ کسی کے محتاج نہیں ہوتے ہیں۔

۵ عبادت میں زیادتی اپنی استطاعت کے موافق کرو۔

۶ قابل رشک وہ ہے جسکو مال و دولت سے نوازا گیا ہو اور اس کو اس سب جگہوں پر اچھے طریقہ سے خرچ کرنے کی توفیق بھی عطا کی گئی ہو۔ اور قابل رشک وہ ہے جسکو علم بخشی گئی ہو اور وہ اس کے تقاضوں پر عمل پیرا ہو اور دوسروں کو ترغیب بھی دیتا ہو۔

۷ صحت کی حالت میں نیک کام کرنا۔ بیماری کے زمانے کے صدقہ وخیرات سے افضل ہے۔

نفعت قیص

# نوشتۂ دیوار

ایک مداری تھا
وہ ڈگڈگی بجا کر بندر نچایا کرتا تھا۔
بندر ناچتا ناچتا تھک جاتا تو بھی ڈگڈگی پر اسے ناچنا
پڑتا۔
ناچتا بندر تھا۔
پیسے مداری سمیٹتا تھا۔
ایک دن وہ ڈگڈگی بندر کے ہاتھ لگ گئی۔
اس نے ڈگڈگی بجائی۔
مداری ناچا
پھر بجائی
پھر ناچا
مداری ناچتا رہا — ناچتا رہا۔
یہاں تک کہ گر پڑا
گر کر مر گیا۔
مداری کو یہ صدمہ کھا گیا کہ بندر اسے نچائے۔ حیرت
ہے بندر کیسے اتنی دیر تک ناچتا رہا۔
لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں بندروں میں سب سے زیادہ قوتِ
برداشت ہوتی ہے۔

---

ایک تھی چڑیا
ایک تھا چڑا
چڑیا لائی دال کا دانہ
چڑا لایا چاول کا دانہ
دونوں نے مل کر ہنڈیا پکایا
چڑا گیا نمک لانے
چڑیا نے وہ ہنڈیا کھا لیا
چڑے کو غصہ آیا
مارا پیٹا کونے ڈال دیا
چڑیا انتظار کرتی رہی کہ چڑا اسے منانے آئے گا۔ چڑا
خودداری کا مارا مرد آدمی تھا اکڑ گیا۔
چڑیا میکے چلی گئی
انتظار کرتی رہی
چڑا نہ آیا۔
چڑیا مر گئی
چڑے نے دوسری شادی کر لی۔
اور چڑیا کو بھول گیا
چڑے عموماً پرانی چڑیوں کو بھول جاتے ہیں اور دوسری شادی
رچا لیتے ہیں

---

ایک گھر تھا۔
اس میں ایک بوڑھا باپ تھا
اکھڑ مزاج اور خرد ماغ
اس کے پانچ بیٹے تھے۔
دو بیٹے گھر سے بھاگ گئے تھے۔

ایک بچہ گھر پر رہ گیا۔
لڑکیوں میں سے ایک بیاہی گئی
ایک کنواری رہ گئی
۴۰ سال بیت گئے
پھر باپ مر گیا
اور لڑکی ۴۹ سال کی ہو گئی۔
ایک رشتہ آیا۔ گیارہ بچوں کے باپ کا
دوسرا آیا آٹھ بچوں کے باپ کا
اور تیسرا رشتہ آیا........ یہاں معاملہ دوسرا تھا۔
بچے صرف چار تھے۔
لڑکی کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ صرف ۴۹ سال کی تھی
گیارہ بچوں کے باپ کے حق میں استخارہ کامیاب ہو گیا۔
اس کی شادی ہو گئی۔
بڑے بھائی نے بیڈ روم سیٹ دیا۔
بیاہی بہن لائی ڈائننگ سیٹ
منجھلے بھائی نے بیٹھنے کو صوفہ سیٹ دیا
چھوٹا لایا زگ زیگ مشین
اور یوں
چڑیا لائی دال کا دانہ
چڑا لایا چاول کا دانہ
سب نے مل کر پیا پکایا
اور پیا گیارہ بچوں کا باپ کھا گیا
لڑکی نے اپنی طرف سے صرف ارمانوں کی ارتھی پیش کی
اور اس پر بیٹھ کر پیا کے دیس چلی گئی ورنہ لوگ اسے طعنے دے دے کر مار دیتے۔
لوگ غلط کہتے ہیں کہ بندر میں قوت برداشت زیادہ ہوتی ہے۔
قوت برداشت لڑکی میں زیادہ ہوتی ہے۔
قسمت کے اشارے پر ناچتی ہے
اپنے شوہر کے اشارے پر ناچتی ہے
دنیا کے اشارے پر ناچتی ہے۔
اور پھر بھی نہیں مرتی
اگر مرتی بھی ہے تو عموماً طبعی موت مرتی ہے۔

## بقیہ صرف ایک لفظ

ہے اور اندھیرا میرے اندر ہے اور دنیا کی کوئی بھی زبان جاننے کا مہیب سناٹا میرے اندر ہے۔ میں نہ روشنیاں اوڑھ سکتی ہوں اور نہ آوازیں خرید سکتی ہوں کہ آج تک کھوئے ہوئے ناموں کو نہ روشنیوں کی ردا ملی اور نہ ان کی جیب میں وہ سکے ہیں جن سے گویائی خریدی جا سکے۔

ثریا ہاشمی (احمد آباد)

کوئی ندی تھی۔

صاف شفاف پانی سے لبریز بل کھاتی ہوئی، اٹھلاتی ہوئی جانے کہاں چلی جا رہی تھی۔ سرخ کپڑوں میں ملبوس موتیا کے پھولوں کا جھومر پہنے وہ ندی کے کنارے کھڑی تھی۔ اسی وقت دوسرے کنارے پر ایک بانکا سجیلا نوجوان نظر آیا اس نے شہزادوں جیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ پھر نہ جانے کہاں سے ندی میں ایک ناؤ آ گئی جو رنگ برنگے پھولوں سے سجی تھی۔ نوجوان ناؤ پر سوار ہو گیا۔ اسے کھیتا ہوا وہ اس کنارے پر لایا۔ جہاں وہ کھڑی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے سہارا دینا چاہا اس نے بھی ہاتھ پھیلائے دونوں ہاتھوں میں تھوڑا ہی فاصلہ رہ گیا۔ پھر کچھ بجلی کچھ وہ لپکا اور اس سے پہلے کہ نوجوان شہزادے کا مضبوط ہاتھ اس کے نرم و نازک ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیتا۔ ندی میں طغیانی آ گئی اور ناؤ دور ہٹ گئی پھر ہٹتی گئی، ہٹتی گئی یہاں تک کہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اور وہ اپنا ہاتھ یوں ہی پھیلائے رہ گئی۔

"اپیا"

آواز پر وہ چونکی نہ کہیں ناؤ تھی نہ ندی وہ اپنے کمرے میں اپنے بستر پر تھی اور اس کی چھوٹی بہن عذرا اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔

"یہ آپ نے ہاتھ کیوں پھیلا رکھا تھا اپیا"

"ہاتھ"؟

"ہاں۔ یہ لمبا ہاتھ۔ میں تو دیکھ کر ڈر گئی۔"

"اوہ"

اپیا کو اپنا خواب یاد آ گیا۔ انہوں نے سر میں شدت کا درد محسوس کیا پیشانی زور زور سے دبانے لگیں۔

"عذرا ذرا سر تو دبا دے۔ پھٹ رہا ہے۔"

عذرا ان کے پاس بیٹھ گئی۔ ہولے ہولے سر دبانے لگی۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولی۔

"اپیا آج وہ لوگ آ رہے ہیں؟"

"ہاں" اپیا کراہیں۔ "کیا وقت ہو رہا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"۷ بج رہے ہیں۔"

"عذرا ذرا سر کے درد کی کوئی گولی کھلا دے۔ لگتا ہے سر کھل جائے گا۔"

عذرا نے فرسٹ ایڈ بکس سے سر درد کی ،
ایک ٹیبلیٹ نکال لے اپیا کو کھلایا پھر تھوڑی دیر
بعد پوچھا۔

"اپیا یہ لوگ کس کے لئے آرہے ہیں"؟

"تمہارے لئے۔ اور کس کے لئے"

"مگر میں شادی نہ کروں گی" عذرا بولی۔

"کیوں"؟ اپیا نے اسے غور سے دیکھا۔

جب تک آپ کی شادی نہ ہو گی۔ میں اپنی شادی
نہ کروں گی" اتنا کہہ کر عذرا سسک سسک کر رونے
لگی۔

اپیا گھبرا کر اٹھ بیٹھیں انہوں نے عذرا کو اپنے
سینے سے لگا لیا۔ بولیں۔

"میں نے اپنے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے
میرا وقت بیت گیا ہے۔ عذرا ۔۔ ندی میں طوفان
آئے یا نہ آئے۔ فاصلہ بہرحال قائم رہے گا۔

آنسو بہتے بہتے عذرا نے اپیا کو دیکھا۔ بولی

"آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی اپیا۔"

اپیا نے دونوں ہاتھوں سے عذرا کے معصوم
چہرے کو تھام لیا اور بولیں

"عذرا میری طرف دیکھو۔ چند سال پہلے اس
چہرے پر جو تپش تھی اب وہ نہیں رہی ہے اور
میں نہیں چاہتی کہ راکھ کا یہ ڈھیر تمہارے راستے
میں زیادہ دن حائل رہے۔ اور ایسا نہ ہو
کہ ۔۔۔

اپیا نے اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ لاکھ پتھر
سہی آخر کو وہ بھی انسان تھیں۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں
اور وہ ماضی کے جھولے میں جھکولے کھانے لگیں

وہ بیس سال کی تھیں کہ ان کے ابو اس جہان
فانی سے رخصت ہو گئے۔ وہ تو خیر سمجھ دار ہو گئی
تھیں۔ ایم۔ اے میں پڑھ رہی تھیں مگر ان
کا بھائی جاوید صرف دس سال کا تھا اور
بہن عذرا تو اسکول جانے کے قابل بھی نہ تھی
مصیبتوں نے چاروں طرف سے یلغار کر دیا
تو انہوں نے پڑھائی ترک کر دی اور ایک اسکول
میں پڑھانے لگیں۔ امی ابھی زندہ تھیں۔ سب کو
اپنے سائے میں لئے تھیں مگر وہ بھی زیادہ دن
سہارا نہ دے سکیں دو سال بعد وہ بھی ابو سے جا
ملیں ۔۔ امی کے جدا ہو جانے پر جاوید اور عذرا کا
مستقبل کچھ اس طرح منہ پھاڑے اپیا کے سامنے
آ گیا کہ خود ان کی ہستی زیر و زبر ہو کر رہ گئی۔ اور
انھوں نے دونوں بچوں کو اپنے سینے سے اس
طرح لگایا کہ وہ جلد ہی والدین کو بھول گئے۔ وہ اپیا
کے محور پر گردش کرنے لگے اور اپیا ان کے گرد گھومنے
لگیں۔

اپیا بھی حسین تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی
قوس و قزح رقص کرتی تھی۔ ان کے گلابی رخساروں
کو دیکھ کر بھونرے للچایا کرتے تھے۔ جدھر سے
گذرتی تھیں ذرے ذرے کو مہکا جاتی تھیں
ان میں وہ سب کچھ تھا جو کسی بھی لڑکے کو اقل
بیتمل کر رکھ سکتا تھا۔

مگر یہ سب پندرہ سال پہلے کی بات تھی۔ اس
وقت جب ابو اور امی زندہ تھے اور وہ اپنی ہی
ہستی میں ڈوبتی اور ابھرتی رہتی تھیں اپنے ہی
سائے سے بدکتی رہتی تھیں۔ اپنی ہی خوشبو سے
ڈرتی رہتی تھیں۔ اس وقت جب ان کے جسم
میں چیونٹیاں رینگتیں۔ بچھو ڈنک مارتے جسم
یکایک جھنجھنا اٹھتا اور آنکھیں شعلہ بار ہو جاتیں
تو ان کا جی چاہتا کہ کوئی صورت نکل آئے جس

سے ان کا انگ انگ جل ترنگ کی مانند جھنجھنا
اٹھے۔۔۔ ابّو اور امی کی موت کے بعد بھی یہی سب
ہوتا رہا۔ ان کے لئے شادی کے پیغام بھی آئے۔
مگر اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کو اپنے ہی مکان کی
چوکھٹ پر آنسو بہاتے ہوئے چھوڑ کر ڈولی میں سوار
ہونا انہیں گوارا نہ تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی اپنے
شب وروز اپنا آج اور کل سب کچھ جاوید اور
عذرا پر قربان کر دینے کی قسم کھالی تھی۔ رشتہ داروں
نے سکھی سہیلیوں نے اپنوں اور پرایوں نے
سمجھایا۔ بجھایا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔
"میرے بعد جاوید اور عذرا کا کیا ہوگا۔۔۔
بس یہی ایک سوال تھا۔ جو انہیں پوری شدّت سے
جکڑے ہوئے تھا۔ صبح ہوتی تو وہ اپنے ہاتھوں
سے ناشتہ بناتیں جاوید اور عذرا کو پراٹھے چائے
سے کھلاتیں۔ انہیں اسکول کے لئے تیار کرتیں اور
جب وہ دونوں اچھلتے کودتے چلے جاتے تو وہ
اپنے بوجھ کو پیروں پر اٹھائے اسکول جاتیں۔ واپس
لوٹتیں تو عذرا اور جاوید کو منتظر پاتیں۔ لپک کر دونوں
کو گلے لگاتیں۔ ان کے کھانے پینے کا انتظام کرتیں
اپنے کپڑوں لتوں۔ ذوق سنگار سے بے بہرہ ہر
وقت جاوید اور عذرا کے بارے میں سوچتی رہتیں
ان کے لئے اچھے کپڑے بنواتیں خود معمولی کپڑے
پہنتیں۔ اچھا سے اچھا انہیں کھانا کھلاتیں۔ اور
خود روکھا سوکھا کھا کر بھی رہ جاتیں۔۔۔ غرض کہ
بذات خود وہ کچھ نہ تھیں۔ انہوں نے اپنی شخصیت
بھلا کر جاوید اور عذرا کے جسموں میں ڈھال دیا تھا

وقت جو رحم دل بھی ہے۔ اور ظالم بھی پل
پل گزرتا رہا اور زندگی بوند بوند ٹپکتی رہی۔

جاوید کی دلہن جب آئی تو آپا کا روتے روتے
برا حال ہوگیا۔ وہ اتنی خوش تھیں کہ آنسو تھمتے ہی نہ
تھے۔ وہ ہنستی بھی تھیں اور روتی بھی تھیں۔ اور
آنسو تھے کہ دونوں ہی صورتوں میں رواں دواں۔
دو کمروں کا مکان تھا۔ ایک کمرہ دلہن کو سونپا گیا۔
اور جاوید میاں نے خود کو اس میں قید کر لیا۔ اب
وہ آپا سے ملتے تو بس رسمی باتیں کرتے اپنے کمرے
میں گھس جاتے وہاں سے برآمد ہوتے
تو دفتر چلے جاتے دفتر سے لوٹتے تو وہی کمرہ ہوتا
اور اس میں بناؤ سنگار کئے بیٹھی ہوئی ان کی دلہن
۔۔۔ وہ مگن تھے اور آپا بھی مطمئن کہ چلو ایک کو
تو انہوں نے منزل تک پہنچا دیا۔۔۔ اور اب عذرا
رہ گئی ہے۔
مگر عذرا بھی کچھ ایسی نکلی تھی کہ ادھر اشارہ
ہوا ادھر پروانے ٹوٹ ٹوٹ پڑے۔۔۔ کسی دن
بھی اس کے ہاتھوں مہندی لگائی جا سکتی تھی۔
وہ ایم۔اے کا امتحان دے چکی تھی۔ نتیجہ کا
انتظار تھا کہ ادھر نتیجہ نکلے اور ادھر اس کی ڈولی

مگر وقت ظالم بھی تو ہے ٹک ٹک کرتا
گزر گیا۔ آپا نے اپنے پندرہ سال جاوید اور عذرا
کی گود میں ڈالے تو مگر ان کے چہرے پر پندرہ
سالوں کی دھوپ گذر گئی۔ اندر کی وہ آگ جو
رہ رہ کر بھڑکتی تھی سرد پڑ چکی تھی وہ آتش
سیال جو خون کی جگہ نسوں میں گردش کرتی تھی
ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ ان پندرہ سالوں میں جب
بھی انہوں نے اپنے بارے میں سوچا۔ جاوید
اور عذرا نے یورش کر دی اور انہیں ہتھیار ڈالنا
پڑا۔ ہتھیار ڈالتے ڈالتے اب وہ بزدل ہو گئی تھیں

پست ہمت شکستہ اور کرچیں کرچیں ان کے چہرے کی قوس و قزح گرد میں ڈوب گئی تھی اور ادھر دو چار سالوں سے تو انہوں نے اپنے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا

مگر یہ خواب؟

بہت دنوں بعد انہیں پھر خواب دکھائی پڑا وہی شہزادہ پھر آیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ ان کا ہاتھ تھامتا۔ ندی میں طغیانی آگئی اور ناؤ دور ہوتے ہوتے آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

○

"اپیا۔ آپ کچھ کہہ رہی تھیں"۔۔۔ عذرا کی آواز پر وہ چونکیں

"ان۔ ہاں۔ میں کہہ رہی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی عمر کی اس منزل پر آجاؤ۔ جہاں خوابوں سے ڈر لگنے لگتا ہے۔

عذرا کا پورا جسم کانپ گیا۔ اس نے سوچا وہ بھی تو بائیس سال کی ہو گئی ہے۔ اب کونسا وقت آئے گا مہندی رچانے کا اپیا ٹھیک ہی کہتی ہیں ان کا وقت تو دبے پاؤں نکل گیا کہیں میں بھی لپیٹے میں نہ آجاؤں کہیں مجھ پر بھی اپیا کا سایہ نہ پڑ جائے ابھی تو مجھ پر چاروں طرف سے پھولوں کی بارش ہو رہی ہے لیکن ایسا نہ ہو کہ سارے پھول سوکھ جائیں اور میں بھی اپیا کی طرح پرت پرت ادھڑ جاؤں

"اسی لیئے کہتی ہوں کہ ضد چھوڑ دو۔ تیار ہو جاؤ۔ مہمانوں کا خیر مقدم اور خاطر مدارات تمہیں کرنی

تھیں۔ انہوں نے پیشانی کو دوپٹے تھا اور پلنگ کے نیچے

جھک کر چپل تلاش کر رہی تھیں۔

○

عزیز میاں بارات لے کر آئے اور عذرا کو بیاہ لے گئے۔ بہن کو رخصت کرتے وقت اپیا ایسے پھوٹ کر روئیں کہ در و دیوار تک کانپ گئے بہنوں میں ایسا پیار۔ کسی نے نہ دیکھا تھا نہ سنا۔ دیکھنے والے عش عش کر کے رہ گئے۔ اپیا کی قربانی ہر شخص کے لیئے مثال بن گئی تھی جسے دیکھو اپیا کو فرشتہ کہہ رہا تھا مگر یہ تو اپیا ہی جانتی تھیں کہ وہ فرشتہ نہیں گوشت پوست کی انسان ہیں جن کے سینے میں ایک دل ہے۔ جو دھڑکتا ہے۔ نسوں میں خون ہے جو دوڑتا ہے اور جو کئی بار ابل بھی چکا ہے۔ فرشتہ کا خطاب پانے کے لیئے انہوں نے اپنے اندر کے آدمی کو کس بے رحمی سے مارا تھا یہ تو وہی جانتی تھیں۔

عذرا رخصت ہو کر سسرال چلی گئی۔ ادھر اپیا اپنے کمرے میں اکیلی رہ گئیں دوسرا پلنگ جس پر عذرا الھڑ پن سے بڑی خراٹے لیا کرتی تھی۔ خالی پڑا تھا بغل کا کمرہ البتہ جاوید میاں اور ان کی دلہن کے ہنگاموں سے ہر وقت بیدار لگتا تھا مگر اپیا اپنے بستر پر پڑی چھت کو تکا کرتی تھیں یہ کمرہ تو ان کے وجود سے چپک گیا تھا۔ جاوید میاں کی دلہن بھی اپنا گھر چھوڑ کر یہاں آگئی تھیں اور عذرا بھی یہ کمرہ چھوڑ کر سسرال چلی گئی تھی۔ مگر وہ تھیں کہ ان کے مقدر میں وہی ایک کمرہ رہ گیا تھا جو ان کی تنہائیوں کا ساتھی تھا۔ ان کی امنگوں کا راز دار اور ان کے آنسوؤں کا مونس اب اگر وہ اسے بھی چاہتیں تو وہ ان کے قدم پکڑ لیتا انہیں تو مر کر ہی اس کمرہ سے نکلنا تھا۔ اس کمرہ سے ان کا دیرینہ رشتہ

ہوگیا تھا جو ایک مردے کو اپنی قبر سے ہوتا ہے۔ اور شاید قیامت تک کے لیے۔

مگر ہوا یوں کہ عزیز میاں کا تبادلہ اسی شہر میں ہوگیا اور ایک رات وہ عذرا کو لیے وارد ہوگئے

اپیا نے لپک کر عذرا کو لپٹا لیا۔ حال چال پوچھا۔ اپنی تو کچھ نہ کہی۔ کہنے کو رہ ہی کیا گیا تھا۔ اللہ عذرا کی سب ہنسی کس طرح سسرال میں ہر شخص اس پر جان چھڑکتا ہے وہ بھی اسے کتنا چاہتے ہیں وہ کتنی خوش ہے۔

عذرا کی زبان چلتی رہی۔ پھر بات تبادلہ کی نکلی عزیز میاں بولے کہ تبادلہ خلاف امید ہوگیا۔ حکم ہوا کہ فوراً جا کر چارج لو میں تو کسی ہوٹل میں ٹھہرنا چاہتا تھا مگر عذرا بضد ہوگئیں کہ اپنا گھر ہوتے ہوئے ہوٹل میں ٹھہرنے کی کیا ضرورت۔

اپیا کچھ نہ بولیں۔ مسکراتے ہوئے عذرا کو دیکھنے لگیں اور عذرا چہک کر بولی۔

”ہاں اپیا اب گھر ہوتے ہوئے ہوٹل میں ٹھہرنے کا کیا تک ہم تو اب آپ کے پاس رہیں گے۔ سب لوگ اکٹھے رہیں گے بڑا مزا آئے گا۔

کھانا ہوچکا تو مسئلہ سونے کا اٹھا۔ جاوید میاں تو مطمئن تھے انہیں کون چھیڑتا۔ ان کی دلہن لپک کر اپنے کمرے میں گئیں اور اندر سے بند کرلیا۔ عذرا اپیا کے کمرے میں گئی اور اپنے کنوارپنے کے پلنگ پر دھڑام سے گر پڑی اور گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بولی۔

”اللہ کتنے دنوں بعد مجھے اپنا پلنگ ملا ہے“
عزیز میاں بھی پیچھے پیچھے آئے اِدھر اُدھر تاک کر دھیرے سے بولے

”مگر اپیا کہاں رہے گی“

”ہاں اپیا“ عذرا اٹھ کر بیٹھ گئی۔۔۔ ”یہ تو میں بھول ہی گئی تھی“

اپیا گلا صاف کرتے ہوئے اندر داخل ہوئیں اور وہ بھاری بھاری قدموں سے چلتی ہوئیں اپنے پلنگ تک آئیں بستر لپیٹا اور اسے بغل میں داب کر جانے لگیں۔

عزیز میاں بول پڑے
اپیا آپ اسی کمرے میں رہیئے ہم لوگ گیلری میں بستر لگا ........

مگر اس سے پہلے کہ عزیز میاں کے منھ سے پوری بات نکلتی عذرا نے اشارہ کردیا اور وہ چپ ہوگئے۔

اپیا نے عذرا کو اشارہ کرتے دیکھ لیا تھا انھیں پہلی بار احساس ہوا کہ پندرہ سالوں کی دھوپ جو ان کے چہرے سے ہوکر گذری ہے بے کار گئی۔

سوسو من کا بیر لئے اپنے بے مقصد وجود کو گھسیٹتے ہوئے وہ باہر نکلیں انہوں نے گیلری میں اکر فرش پر بستر لگا دیا۔ اور جب دونوں کمروں کی روشنیاں گل ہوگئیں تو انہوں نے اپنے آنسوؤں کو دوپٹہ میں جذب کیا گیلری کی بتی جلائی اور آنکھوں پر چشمہ چڑھا کر اسکول کی ڈائری لکھنے لگیں۔ ● ● ●

حلیم صبا نویدی (مدراس)

مجھے نور کی تلاش تھی۔ اسے سرور کی ۔۔۔ ہم دونوں ایک ساتھ
چل رہے تھے جنگل، پہاڑ، جھیل، جھرنے، تالاب سے گزرتے ہوئے میں اپنی
جستجو میں چور تھا۔ اور وہ مناظر فطرت کی ان دیکھی لذتوں میں مسرور ــــ
بستی بستی، گاؤں گاؤں کے سرسبز نظاروں سے میں بے زار ــــ
وہ اِن ان گنت نظاروں کی مستیوں میں بیدار شہر
شہر، سڑک سڑک، گلی گلی کی بھیڑ اور ہنگاموں میں
میں تنہا وہ ان بھیڑ اور ہنگاموں میں ملوث ۔۔۔ گویا ہم دونوں
زندگی کے ہر موڑ پر ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے بھی
ایک دوسرے سے بہت دور ــــ

آخرش زندگی کی سانسیں ٹہلتے ٹہلتے ایک ایسے مرکز پر
رکیں، جہاں مجھے میری جستجو کا وہ نور ملا۔ جسے اس نے صرف روشنی سے
تعبیر کیا ــ ۔۔۔

—

## آزاد غزل

عتیق احمد عتیق (مالیگاؤں)

ہر شخص آپ اپنا لہو چاٹ جائے گا
وہ دن بھی آئے گا
یوں موسموں کی دھول سے چہرا اٹا ہے اسکی سمجھ میں نہ آئے گا
وہ دیکھ کر بھی مجھ کو نہ پہچان پائے گا
شیشے کے پر لگا کے وہ مجھ کو اڑائے گا
پھر چمن سے اپنے سنگِ صدا پر گرائے گا
سورج کا ہمسفر بھی رہے گا تو میرا "میں"
سائے لٹائے گا
نکلے گا جو بھی صبح کی تخلیق کے لئے
اس رہگذر پہ، رات کی زد میں تو آئے گا
میرے بدن کی خاک سے اب وہ
اپنے بدن کی آب و ہوا تک بچائے گا
کچھ کہہ کے دیکھ لو
تم کو وہ دوسری ہی کہانی سنائے گا
سایوں کے ہفت خواں سے گزرتے ہوئے عتیق
اک ناعبورِ دھوپ کا صحرا بھی آئے گا۔

## آزاد غزل

قتیل شفائی (پاکستان)

رات کے رنگ رسیلے کب تھے
مجھ کو حاصل ترے وعدوں کے وسیلے کب تھے
مجھ پہ طاری تھا خود اپنا ہی خمار
میری آنکھوں میں ترے خواب نشیلے کب تھے
اب ہوا سانس بھی لیتی ہے جہاں
اس جگہ پچھلے برس ریت کے ٹیلے کب تھے
درمیاں تیری طلب تھی ورنہ
بے سبب دست و گریباں قبیلے کب تھے
اُنظ کی دھار سے کاغذ کٹتا
اس قدر غم کے مضامین کٹیلے کب تھے
تیرے انکار پہ اصرار بڑھا
ورنہ پہلے ترے عشاق ہٹیلے کب تھے
سب کا ماضی تھا قتیل ایک مگر
میرے ہم عمر مری طرح سجیلے کب تھے

نہ وہ ماحول نہ میراث کی حد سے نکلا
یوں نکلنے کو تو قیدِ ابد سے نکلا
کاروبارِ نفس و جسم تھا صدیوں پہ محیط
حاصلِ زندگی بس ایک عدد سے نکلا
میں خفیف اور ہوا اس کے مقابل آ کر
یعنی اونچا وہ بہت اپنے ہی قد سے نکلا
ہیں ابھی شہر میں خوش وضع کماندار بہت
یہ گماں چھوڑ کہ میں تیروں کی زد سے نکلا

تاک میں پھرتے رہے دشت جنوں کے صیاد
وہ ہرن تو نہ کبھی کنجِ خرد سے نکلا
ہمت افزا ہے بہت اس کا یہ خونریز سلوک
کام اپنا، اسی خنجر کی مدد سے نکلا
صیدِ ابنائے زمانہ ہوں یہی میرا نصیب
میں کہاں، وقت کی فتراک حسد سے نکلا
ٹوٹ گئے چارہ نوازانِ ازل کے ناخن
میں وہ کانٹا، جو نہ پہلو سے ابد تک نکلا
لفظ تا لفظ رہا، معنیِ پنہاں کا غبار
کچھ نتیجہ نہ فضا اس ردّ و کد سے نکلا

کرشن موہن (دہلی)

## آزاد غزل

فکر اشعار ذراعت کا بدل ہو جائے
پھر کوئی تازہ غزل ہو جائے
کامنا تیرے لمن سے ساجن
کھل اٹھے اور سپھل ہو جائے
یوگ سے لطف اٹھائے جو بشر
مسئلہ زیست کا آرام سے حل ہو جائے
کار دنیا کیلئے
حرص زر دو جہہ خلل ہو جائے
رہ گئی کامنا اجزاں بنکر
زندگی رنگ محل ہو جائے
موہ مایا بھرے سنسار میں اپنا جیون
ایک پاکیزہ کنول ہو جائے
کرشن موہن ہے غضب پیری تبھیں
زیست بھر رنگ اجل ہو جائے۔

---

کرشن کمار طور (دھرم شالہ)

## آزاد غزل

بند موسم کی دہلیز پہ سلسلہ ہوا رکھ کے دیکھ
نشہ خود نما رکھ کے دیکھ
ایک ہی بوند خون کی اسے کھینچ لائے گی تیری طرف
اپنے دل کا دریچہ کھلا رکھ کے دیکھ
طائروں کا اب اک کھلے آسماں سے تعارف کرا
اپنے ہونٹوں پر کوئی دعا رکھ کے دیکھ
لوٹ آئیں گے اب گھر کی جانب سبھی راستے
غم کے احساس کا رخ جدا رکھ کے دیکھ
عمر بھر زنگ آلود رشتوں کو کیسے نبھائے گا
اپنے پاؤں میں پھر ایک نیا راستہ رکھ کے دیکھ

---

ظفر ہاشمی (جمشید پور)

## آزاد غزل

ہر لحظہ لہو میں تر پھولوں کی قبائیں تھیں
کیسی وہ بہاریں تھیں
بھونرا ہی کبھی تنہا تو گیت نہ گاتا تھا
کلیوں کے لبوں پر بھی بے نام صدائیں تھیں
میخانہ مقفل تھا
اور ٹوٹ کے آنے پر ساون کی گھٹائیں تھیں
سورج بھی نشیبوں میں غرقاب ہوا آخر وہ گھر بھی نہ آیا تو
بے چین نگاہیں تھیں، بدمست ادائیں تھیں، زہریلی ہوائیں تھیں
اک سمت گلابوں کے پھولوں کی قطاریں تھیں
الفاظ کی چادر جب معنی کے بدن پر تھی کیوں اس کو ہٹاتے ہم
کچھ میری حکایت تھی، کچھ ان کی بھی باتیں تھیں
وہ عہد ظفر گذرا جب اپنے ہی تن پر بھی
رشتوں کی خراشیں تھیں

---

## آزاد غزل

فرحت قادری (گیا)

جب عدم سے سر اٹھاتے جا رہے تھے بحر و بر
سوگ میں ڈوبے ہوئے تھے جانور

اس زمیں کا چپہ چپہ چھان مارا دوستو!
اب چلیں آکاش پر

ایک رشتہ تھا جو پانی کو ہی باقی نہیں
خشک دریا کے کنارے ہو گئے اک دوسرے سے بے خبر

جگمگاتی بجلیوں نے ہم کو اندھا کر دیا
لٹ گئے ہم روشنی کے نام پر

اب سہانے خواب کیا دیکھے گا وہ
آنکھ ہر آہٹ پہ کھل جاتی ہے جس کی چونک کر

ظلمتوں کی زندگی لمبی ہے، اب سو جائیے
اب نہ آئے گی سحر

کیا متاعِ آرزو بھی لٹ گئی
چین سے سویا ہے فرحت آج ننگی کھاٹ پر

◉

## غزل

نازؔ قادری (مظفر پور)

ڈاکٹر لطف الرحمٰن کے نام

سکوں نہیں تھا مگر اتنا انتشار نہ تھا
ہمارے چاروں طرف خوف کا حصار نہ تھا

تمام عمر خزاں نے ہمارا ساتھ دیا
ہمارے سر پہ کبھی سایۂ بہار نہ تھا

ذرا سی ٹھیس لگی اور چھن سے ٹوٹ گیا
ہمارا شیشۂ دل سنگ ریگ زار نہ تھا

ہر ایک ہاتھ سے پتھر نکل کے چھوٹ گیا
کہ شہر میں کوئی گنہگار نہ تھا

جسے قریب سے پڑھ کر کوئی سمجھ لیتا
فصیلِ شہر پہ چسپاں وہ اشتہار نہ تھا

ہوا کا ایک ہی جھونکا جسے مٹا دیتا
نواحِ ذات میں ایسا کوئی حصار نہ تھا

ہر ایک لفظ میں مضمر تھا دفترِ معنی
کہیں بھی نازؔ مگر حرف اعتبار نہ تھا

◉

## غزل

ذکاء الدین شایاں (اپلی بھیت)

آئینۂ فریبِ تمنا دیا گیا
ہر رخ سے اہلِ دید کو بہلا دیا گیا

اس کی طلب سے کم نہ ہوئیں پیاسی بستیاں
دریا لبوں کے پاس تھا، صحرا دیا گیا

صبحیں پکارتی ہیں، کہاں تک لٹے گا زر
راتیں یہ کہہ رہی ہیں، انہیں کیا دیا گیا

سختی اسی پہ سجی رہیں عیار نرمیاں
پتھر تھا گرم، موم کو پگھلا دیا گیا

انساں خلاء میں، اور یہ صدیاں لہو لہو
سچائیوں کے نام پہ دھوکا دیا گیا

◉

نذیر فتحپوری (پونہ)

## غزل

اپنے خول میں رہنے والو!
خوابوں کے ملبوس اتارو

میرے قد پر ہنسنے والو!
چٹانوں سے نیچے اترو

دیکھو سورج جاگ پڑا ہے
نیندوں کی آغوش سے نکلو

شمسی کرنوں کی سچائی
برفیلے تودوں سے پوچھو

اکھڑ چکا ہے جھوٹ کا خیمہ
سچائی کے پرچم کھولو

وقت کی لَے پر تم بھی نذیر اب
کوئی انوکھا گیت سناؤ

شمیم قاسمی (سہسرام)

## غزل

زمیں سے پہلے کبھی سخت آسماں بھی تھا
قدم قدم پہ مگر ایک امتحاں بھی تھا

یہ میرا قتل اسی بات کی گواہی ہے
وہ شخص میرے لئے کتنا مہرباں بھی تھا

کسی کا روٹھنا یوں سخت جان تھا لیکن
رہِ حیات میں تب رنگ کہکشاں بھی تھا

رگوں میں دوڑتی بے نام سی خلش بھی تھی
ترے خیال کا موسم دھواں دھواں بھی تھا

بکھر گیا تھا گئے وقت کی صدا بنکر
وہ اپنی ذات میں خود ایک داستاں بھی تھا

مہدی پرتاپگڈھی (پرتاپگڈھ)

## غزل

دل کی قندیل جلائے رکھو ٭ کچھ اندھیرے کو ڈرائے رکھو
سو نہ جائے کہیں جینے کی لگن ٭ درد سینے میں جگائے رکھو
یہ بھی ہے ایک سیاست کی ادا ٭ فاصلے دل کو بنائے رکھو
ہے نگہداری کا اتنا سا اصول ٭ اپنا ہی ذہن جگائے رکھو
سنگ باری کرو لیکن اپنا ٭ آئینہ خانہ بچائے رکھو
رہگذرِ دل میں نہ پائیں آرام ٭ حوصلہ اپنا بنائے رکھو

کون دنیا میں کسی کا مہدی
خود صلیب اپنی اٹھائے رکھو

## غزل

کاظم نائطی (مدراس)

مناظر صاحب کی نذر

بھیڑ میں بھی میرا چہرہ گم ہوا
ان حدوں سے بھی میں گذرا گم ہوا

آفتابوں سے تھا رشتہ نام کا
میرے قدموں کا بھی سایہ گم ہوا

نور کی وادی پہ میں اک داغ تھا
نقش تھا مجھ میں جو سجدہ گم ہوا

حادثے یوں بھی لب جو ہو گئے
پیاس سے پہلے ہی پیاسا گم ہوا

جوئے باراں کی طرح تھا عارضی
کاظم اپنا رشتہ ناتا گم ہوا

## غزل

ش۔ م۔ عارف ماہر آروی (پٹنہ)

ہو جائے ہرن ایسا وہ نشہ بھی نہیں ہے
زہر آبِ غمِ زیست تو کڑوا بھی نہیں ہے

ننگا ہے ہر اک پیڑ تو پتہ بھی نہیں ہے
دھرتی پہ مرے واسطے سایہ بھی نہیں ہے

کیوں ہم سے ہوا جاتا ہے برہم یہ زمانہ
دل ہم نے کسی کا تو دکھایا بھی نہیں ہے

میں اپنی بلندی کی سزا پاتا ہوں ہر وقت
حالانکہ مرا قد تو کچھ اونچا بھی نہیں ہے

لگتا ہے کہ گھٹ جائے گی سینے میں مری سانس
لیکن یہ ہے معلوم ابھی مرنا بھی نہیں ہے

ہم ڈوبنا چاہیں تو کہاں ڈوبنے جائیں
آغوش میں لے لے مجھے دریا بھی نہیں ہے

تم جان کے انجان جو بنتے ہو تو کیوں کر
تم سے تو کوئی راز چھپایا بھی نہیں ہے

جو نشہ ہوا طاری تری ذات سے ماہر
وہ ترشیٔ حالات سے اترا بھی نہیں ہے

## غزل

رئیس الدین رئیس (علی گڑھ)

مرا میں پتھروں کو آب کر دے
مجھے کچھ اس طرح بیتاب کر دے

مری راہیں کریں مسدود تو نے
مری آنکھوں کو بھی بے خواب کر دے

ترا یہ مخملیں سانس اک دن
مرے ملبوس کو کمخواب کر دے

مری بستی میں سب پختہ مکاں ہیں
ادھر کو بھی رخِ سیلاب کر دے

ہے تاریکی بہت شہرِ ادب میں
مرے ہر لفظ کو مہتاب کر دے

بلکتی ہیں بہت تشنہ زمینیں
فلک ان کو کبھی سیراب کر دے

مجھے کافی رئیس الدین ہونا
زر افشاں وادیٔ احباب کر دے

## غزل

شعیب راہی (ڈالٹن گنج)

یہ شاعری جہاں بھی تھی بے گھر کہیں نہ تھی
باد صبا چمن میں تھی باہر کہیں نہ تھی

مدت سے ایک عمر ادھوری گزر گئی
جو سر سے پاؤں تک ہو وہ چادر کہیں نہ تھی

ہوتی اگر تو اڑ نہیں جاتا قفس کے ساتھ
طائر کے دل میں قوتِ شہپر کہیں نہ تھی

محبت کا فیض سب کے نصیبوں کا حق نہ تھا
روئے صدف پہ تابشِ گوہر کہیں نہ تھی

راہی جو [illegible] دیپ میں تنہا جلا کیا
ساتھ [illegible] کے فانوس پہ [illegible] کہیں نہ تھی

## غزل

جمیل قریشی
(اودے پور)

زخمِ تنہائی فصیلِ جسم پر آ جائے گا
خون کا پیاسا درندہ میرے گھر آ جائے گا

دیکھنا اک روز اس کو چھوڑ جائینگے بھی
اور الزامِ وفا میرے ہی سر آ جائے گا

بجھ کے رہ جائیں گے آنکھوں کے دیئے دہلیز پہ
شب کی پیشانی پہ جب نورِ سحر آ جائے گا

روز معذرت آخر اسے کب تک بلائے کا کوئی
اس کو آنا ہے تو قصہ مختصر آ جائے گا

دل کو اپنی ملکیت سمجھے تھے ہم کب تھی خبر
ایک دن یہ حسن کے زیرِ اثر آ جائے گا

میں بس ترکِ تعلق بھی بلا ڈالوں گر اسے
وہ نہ آنا چاہتا ہوگا، مگر آ جائے گا

## غزل

نیاز الدین نیازی
(سیتامڑھی)

دائرہ ہی دائرہ ہر سمت میرے گھر میں ہے
مسلوں میں قید ہر منظر پس منظر میں ہے

مختلف رنگوں میں یوں تو اڑ رہا ہے ہر پرند!
کون جانے؟ کرب کتنا؟ کس شگفتہ پر میں ہے

برف کے ٹکڑوں پہ چہرے شل نہیں ہو پائیں گے
آبگینے کے رگ و پے اک آگ سی پتھر میں ہے

ڈھونڈتا رہتا ہوں جس کے نقش پائیں کو بکو
سرخ مٹی کا وہ پتلا جانے کس لشکر میں ہے

زرد شاخوں سے لپٹ جاتی ہیں آکر تتلیاں
کچھ نمی شاید ابھی سوکھے ہوئے پیکر میں ہے

## غزل

سحر سعیدی (اورنگ آباد)

جب ہم خیالِ یار میں غرقاب ہو گئے
تنہا ہوئے کچھ اتنے کہ پایاب ہو گئے

موجود تھے تو ایک زمانہ تھا منحرف
جب کھو گئے تو گوہرِ نایاب ہو گئے

لائی صبا نوید جو فصلِ بہار کی
جنگل میں جتنے پیڑ تھے شاداب ہو گئے

ہمسائے کا مزاج بھی اب پوچھتا ہے کون
رشتے خلوص پیار کے سب خواب ہو گئے

امید جب وصال کی دم توڑنے لگی
ارمان دل کے دیدۂ گرداب ہو گئے

غیروں سے ہم نے اور مراسم بڑھا لئے
جب بے نیاز اپنے سب احباب ہو گئے

جو شاعری کی آبرو سمجھے گئے سحرؔ
دیوان سب وہ زینتِ محراب ہو گئے

طلحہ ما.س (پربھاپلدرھ)

## غزل

ٹوٹتے رشتوں کے یگ میں آسرا کوئی نہیں،
اب ہمارا آپ کے غم کے سوا کوئی نہیں

سب مرے چہرے کی رنگت دیکھ کر ہیں مطمئن
زخم کتنے دل میں ہیں یہ دیکھتا کوئی نہیں

آگئی خود اعتمادی کی وہ منزل زیست میں
مسکرانے کے سوا اب راستہ کوئی نہیں

مارتا ہے شہر کی رونق پہ شب خوں وقت آج
سب کے منہ میں ہیں زبانیں بولتا کوئی نہیں

میری آوارہ مزاجی کی ہے شہرت ہر طرف
کس سے کس سے یہ بتاؤں اب مرا کوئی نہیں

ہوگئی مضبوط اتنی تیز لمحوں کی گرفت
اس مشینی دور میں ٹھہرے ذرا کوئی نہیں

ہوگیا ہوں ان سے ہم آہنگ جینے کیلئے
رنج و غم سے مجھ کو تابش اب گلہ کوئی نہیں

روشن ہواں (سوان)

## غزل

بیوفائی سے محبت کا صلہ دیتے ہیں
یہ وہی لوگ ہیں جو درسِ وفا دیتے ہیں

میرے اشکوں کو محض اشک نہ سمجھو لوگو!
یہ وہ قطرے ہیں جو طوفان اٹھا دیتے ہیں

آپ سے بات بھی کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے
آپ ہر بات کا افسانہ بنا دیتے ہیں

ہوش میں وہ کبھی آجائے یہ ممکن ہی نہیں
چشم سے بار سے وہ جس کو پلا دیتے ہیں

یہ تو توہین نشیمن ہے کہ بجلی پھونکے،
آشیاں آپ ہی ہم اپنا جلا دیتے ہیں

وہ گھنی زلفیں وہ آنکھوں کے چھلکتے ساغر
عہدِ رفتہ کی مجھے یاد دلا دیتے ہیں

بخشش دی جاتی ہیں ان سب کی خطائیں روشن
اس کی چوکھٹ پہ جو سر اپنا جھکا دیتے ہیں

سکندر عرفان (کھنڈوہ)

## غزل

بچے بھولی بھالی باتیں کرتے ہیں
روشن مستقبل کی باتیں کرتے ہیں

جانے کب آئے گا موسم گیتوں کا
سوکھے پیڑ پہ پنچھی باتیں کرتے ہیں

ویراں ویراں اجڑا اجڑا شہرِ وفا
لوگ یہاں کے روکھی باتیں کرتے ہیں

مہکائیں گے ہم بھی اک دن ویرانہ
خارِ مغیلاں کیسی باتیں کرتے ہیں

دوست مرے جب ٹوٹ کے مجھ سے ملتے ہیں
پہلے وہ بھی رسمی باتیں کرتے ہیں

زہر کا ساگر پینے والے گہرے لوگ
میٹھی میٹھی پیاری باتیں کرتے ہیں

لوگ ہیں اگلے وقتوں کے عرفانؔ!! سنو!
یہ جو بھولی بسری باتیں کرتے ہیں،

## غزل

نثار محمد نثار (دھام سعد عرب)

ہے کیا غم اگر بجلیاں اور بھی ہیں
چمن میں مرے آشیاں اور بھی ہیں
ستم پیشہ نامہرباں اور بھی ہیں
زمیں کے لئے آسماں اور بھی ہیں
غبار مسافت سے نکلے تو دیکھا
کہ پیچھے کئی کارواں اور بھی ہیں
میں تنہا نہیں پردہ دار محبت
غم عشق کے رازداں اور بھی ہیں
نثار ابتدائے جفا سے نہ گھبرا
جو سر ہیں تو سنگ گراں اور بھی ہیں

*

## غزل

سہیل صدیقی (بھوپال)

کرے گا کون اپنی ترجمانی
انہیں ہے ہم سے یونہی بدگمانی
تیرا یہ حسن دلکش عارضی ہے
محبت ہے ہماری غیر فانی
ارے، چھوڑو یہ ہم کیا سن رہے ہیں
زباں پر آپ کے اپنی کہانی
سفینہ ظالموں کا غرق ہوگا
سہیل اونچا ہوا ہے سر سے پانی

*

## غزل

عنبر ہاشمی (احمد آباد)

کہیں کیا نکہت گل ہے کہاں ایسی گلستاں میں
کہ جو خوشبو ہے جان جاں تری زلف پریشاں میں
نظر ملتی ہے جب ان کی نظر سے پھر نہیں ہٹتی
نہ جانے کیا کشش ایسی ہے یارو چشم جاناں میں
شب غم جو رہا تھا دل میں کچھ نشتر سا جب دیکھا
ترا تیر نظر تھا جو چھپا تھا قلب ناداں میں
جو ہے کیف اپنے نغمے میں ریاض دہر میں عنبر
کہاں ہے کیف ایسا نغمۂ اہل گلستاں میں

*

## غزل

عبدالمتین نیاز (بھوپال)

کیا کہا حادثے ٹل گئے
دیکھ پھر سلسلے چل گئے
شاہ کو زخم کاری لگا
مات کھا کر جو پیدل گئے
سر پہ ہے دھوپ کا آسماں
جتنے سائے تھے سب جل گئے
کتنے بھی غم ہوں جی لیں گے ہم
پھول کانٹوں میں جب پل گئے
روشنی تو ملی صبح کی
لیکن ایسی کہ ہم جل گئے
ہم ہی ناداں نہ بدلے مگر
لوگ ہر رنگ میں ڈھل گئے

*

جگن ناتھ آزاد (جموں)

# دوشنبہ کی ایک جھلک

(زیرِ طباعت سفرنامے "پشکن کے دیس میں" کا ایک غیر مطبوعہ باب)

کسل مندی کے باعث ناشتہ کوئی ساڑھے نو دس بجے کیا۔ یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور دلی مسرت بھی کہ ناشتے کی میز پر ایک خوب صورت اسٹینڈ پر ریشمی کپڑے کا بنا ہوا ترنگا لہرا رہا تھا۔ یہ ہندوستان سے آئے ہوئے مہمان کی عزت افزائی کی خاطر تھا۔

اس وقت تک عبدالستار بھی پہنچ گئے۔ انھوں نے اپنا مزید تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ تاجکستان رائٹرز یونین میں صدرِ شعبۂ نثر ہیں اور اس حیثیت میں ان کی زیرِ نگرانی "صدائے مشرق" کے نام سے ایک تاجک جریدہ شائع ہوتا ہے۔ ان کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ تاجک فلمز کے Editing commission کے رکن ہیں غالباً یہ وہی عہدہ ہوگا جو ہمارے یہاں فلم سنسر بورڈ کے رکن کا ہوتا ہے۔

ناشتے کے بعد ہم لوگ ہوٹل سے نکلے۔ اس شہر کی سیاحت کی ابتدا اب بھی لینن ایوی نیو سے ہوئی اور ہم اوپرا اور بیلے تھیٹر، کلاسیکی آرٹ گیلری، فردوسی لائبریری، مایکادسکی تھیٹر، کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے دفتر، سیاسی تعلیم کے ادارے، سکول، انڈسٹریل انسٹی ٹیوٹ اور زراعتی کالج سے ہوتے ہوئے رودکی کے مجسمے تک جا پہنچے۔ رودکی یہاں سے ۲۲۰ کلو میٹر دور پنج رود نامی ایک مقام پر پیدا ہوا تھا۔ رودکی کے مجسمے کے نیچے پتھر پر رودکی ہی کا یہ شعر کندہ تھا۔

ہر کہ بے محنت گذشت از روزگار
ہیچ ناموزد ز ہیچ آموزگار

وہاں سے آگے چلے تو سامنے سے چار ریش دراز مولوی صاحبان آتے ہوئے دکھائی دیے۔ یہ لوگ تہمد باندھے تھے۔ عبدالستار نے بتایا کہ یہ بنگلہ دیش کے لوگ ہیں۔ میں السلام علیکم کہہ کے ان سے مخاطب ہوا۔ انھوں نے بھی بڑی فصیح اردو میں میرے ساتھ بات چیت کی۔ میں نے اپنا نام اور پتہ بتایا۔ انھوں نے میرا کارڈ مجھ سے لیا اور اپنے نام میزا احمد، محمد حبیب اللہ، محمد ادریس اور عبدالواحد بتائے۔ پتہ چلا کہ وہ بھی اسی تاجکستان ہوٹل میں مقیم ہیں جس میں میں مقیم ہوں۔

یہ لوگ بات چیت کر کے رخصت ہوئے تو عبدالستار نے کہا "مردمان دیندار ہستند"۔ میں نے عبدالستار سے پوچھا "آغا عبدالستار شما ہم دیندار ہستید؟" بولے "نماز ہیچ، روزہ ہیچ" "ویکسے را فریب نمی دہم دروغ نگویم۔ شیوہ کن راستبازی است" میں نے جواب میں کہا کہ میرے معیار سے تو آپ بھی دیندار ہیں۔

گاڑی کوئی پانچ منٹ اور چلی ہوگی کہ ایک اور قبر ہمارے سامنے تھی۔ نیچے اتر کے قریب گئے یہ بابا جان غفوروف کی قبر تھی۔ اوپر بنایا بنا ہوا ایک مجسمہ رکھا تھا۔ جو ابھی تک نصب نہیں ہوا تھا۔ نیچے پتھر پر کچھ تراش خراش کا کام بھی ابھی باقی تھا۔ مجسمے کو دیکھ کے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ غالب صد سالہ تقاریب کے موقعے

پھر وہیں میں بابا جان غفوروف کے ساتھ میری ملاقات ہوئی تھی۔ ان کا انتقال چند ہی برس قبل ہوا جب میں سری نگر میں تھا۔ میں نے اقبال کی تاریخ ولادت کے معاملے میں سب سے پہلے "ہماری زبان" علی گڑھ میں انہی کے ساتھ اپنے اختلاف رائے کا اظہار کیا تھا۔ بڑے عالی ظرف انسان تھے۔ مجھے ہر سال روس سے نئے سال کی پہلی تاریخ کو سال نو کا کارڈ بھیجا کرتے تھے۔ آج میں ان کی قبر کے آگے خاموش کھڑا تھا۔ دست دعا اٹھائے ہوئے۔

دو چار دن قبل لینن گراڈ میں ان کی عالم بیٹی غفوروف سے ملاقات ہوئی تھی اور ہم دونوں کچھ دیر ان کی باتیں کرتے رہے تھے۔ اب اس وقت سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ

ہنگامہ گرم ہستی ناپائدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

ذرا آگے چل کے صدرالدین عینی کا مقبرہ تھا۔ قبر پر ان کا مجسمہ نصب تھا۔ ساتھ ہی تین ننھے اور تھے جن پہ اُن کے تخیل کا شاہکار جو صدرالدین عینی کے زمانے کی روداد سنا رہے تھے۔

صدرالدین عینی ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ گویا علامہ اقبال کے ہم عمر تھے اور ہم عصر لیکن دونوں ایک دوسرے کے کمالات سے ناواقف رہے۔ دو ایک ماہ قبل ان کی پہلی صد سالہ سالگرہ منائی گئی تھی۔ جس میں ہندوستان سے علی سردار جعفری اور عصمت چغتائی نے شرکت کی تھی۔ عبدالستار ترسون زادہ نے بتایا کہ ہندوستان کے سفیر کیدار ناتھ اندر کمار گجرال بھی ان تقاریب میں شرکت کے لئے ماسکو سے تشریف لائے تھے۔ اور انہوں نے اس موقعہ پر ایک تقریر بھی کی تھی۔

عبدالستار کی زبانی (جو اپنے آپ کو ستار ترسون کہتے تھے) معلوم ہوا کہ صدرالدین عینی شاعر، مصنف، نثر نگار، اہل قلم، زبان شناس، ادب شناس، تاریخ دان اور موسیقی شناس تھے۔ اسی شام کو مجھے رائٹرز یونین کی طرف سے آغائے مومن قناعت آغائے فاتح نیازی اور آغائے باقی رحیم زادہ نے اور کتابوں کے ساتھ صدرالدین عینی کے حالات اور کلام کے متعلق ایک ضخیم کتاب عنایت کی جس کے سرورق پر لکھا ہے۔

کارنامہ
استاد صدرالدین عینی
باکوشش واہتمام
کمال حسن عینی
زیر نظر محمد عاصمی
رئیس فرہنگستان علوم جمہوری شوروی تاجکستان نشریات
"عرفان" شہر دوشنبہ ۱۹۷۸ء۔

یہ کتاب تاجیک (بخط روسی) روسی، فارسی (بخط نستعلیق) اور انگریزی میں ہے اور استاد صدرالدین عینی کی دختر نیک اختر کمال حسن عینی نے اسے مرتب کیا ہے۔

اگرچہ نظم یا نثر کے طویل اقتباسات پیش کرنا میرے اس سفرنامے کے اسکوپ سے باہر ہیں۔ لیکن محض تفنن طبع کی خاطر استاد صدرالدین عینی کے چند اشعار دیکھیے اور ان کی طبع رسا کی داد دیجیے۔

ہمسایہ ز ہمسایہ بخود رنگ بگیرد
ہر تار ز تار دگر آہنگ بگیرد
آہنگ دو گونہ است، مخالف و موافق
دانا شو اندر کہ ہم آہنگ بگیرد
آہنگ مخالف رسد از ساز عداوت
ایں ساز بکف شخص دژآہنگ بگیرد
آہنگ موافق رسد از تار محبت
ایں جمل تیس صاحب نہ ہنگ بگیرد
ما درستی خلق جہاں پیشہ گرفتیم
از ملامت ہر کس کہ چنیں ننگ بگیرد

○

استاد صدرالدین عینی کی قبر اور مجسمے کے چاروں جانب

چنار اور سرو کے اشجار تھے۔ سامنے پہاڑ تھا۔ اور منظر ایسا حسین تھا کہ یہاں سارا دن بسر کیا جا سکتا تھا۔

پہاڑ کے ذکر سے یاد آیا کہ دوشنبہ پہاڑوں سے گھرا ہوا ایک شہر ہے۔ گویا کہ ایک طرح سے وادی میں ہے۔ سری نگر کے مانند لیکن یہاں کے پہاڑ خشک اور بے آب و گیاہ ہیں۔

ہوٹل میں ہمارا کمرہ سب سے اوپر کی منزل پر تھا اور دو طرف کھلتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دونوں طرف پہاڑ ہیں طلوع کے وقت یہ پہاڑ بہت خوب صورت معلوم ہوتے تھے۔ رات کو ایک اور ہی منظر نظر آتا تھا۔ جیسے سارے شہر میں چراغاں ہو رہا ہو۔

یہ ایک جملہ معترضہ درمیان میں آگیا ہے۔ میں شعرا اور مصنفین کی قبروں کی زیارت کا ذکر کر رہا تھا۔ صدر الدین عینی کی قبر سے چل کے ہم لوگ مرزا ترسون زادہ کی قبر پر آ گئے۔

مرزا ترسون زادہ دوشنبہ سے ۴۵ کلومیٹر کے فاصلے پر کرافوخ نامی ایک شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ ابھی گزشتہ ہی برس ان کا انتقال ہوا ہے۔

ان کی قبر بڑی سڑک سے بہت دور ایک غیر آباد مقام پر ہے۔ بڑی سڑک سے قبر تک ایک نئی سڑک تعمیر کی گئی ہے۔ قبر کے ہر طرف چنار اور سرو کے اشجار لگائے جا رہے ہیں۔ یہاں ایک بہت بڑا باغ بنے گا۔ جہاں لوگ آ کے بیٹھیں گے۔ قبر کی زیارت کریں گے۔ اور ساتھ ہی پکنک منائیں گے۔

یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں قبروں کی زیارت کر رہا تھا اور میرے رفقا میں فاتحہ پڑھنے والا کوئی نہیں تھا۔

یہاں سے ستار ترسون ہمیں ایک نمائش دکھانے لے چلے۔ اس کا نام تھا "نمائش ترقی اقتصادی"۔ کوئی ایک گھنٹہ یہ نمائش دیکھنے میں صرف ہوا اور تاجکستان کی اقتصادی ترقی کی ایک بہت خوب صورت تصویر نظر کے سامنے آگئی۔

("پشکن کے دیس میں" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی کے زیر اہتمام شائع ہو رہی ہے۔)

بالوں کی قدرتی نشوونما کیلئے
جڑی بوٹی سے بنایا ہوا
گیسو دراز ہیئر ٹانک
* بالوں کو گرنے سے روکتا ہے۔
* لمبے اور ملائم بناتا ہے۔
* سفید ہونے سے روکتا ہے۔
* بالوں کی ایک مفید اور مکمل غذا ہے۔
بنانے والے
حکیم جی جی فارمیسی
اپنے قریبی دکان سے طلب فرمائیے

ڈاکٹر احراز نقوی

# اردو صحافت کا پہلا محقق

اشرف نقوی کے والد کا نام سید رجب علی نقوی تھا.
ن کے والد کا انتقال لڑکپن ہی میں ہوگیا۔ ابتدائی تعلیم گھری
ہوئی۔ بقیہ تعلیم خیرآباد میں حاصل کی۔ اس زمانے میں خیرآباد
م و فضل کا گہوارہ تھا۔ منشی امیر علی اس زمانے میں واجد علی شاہ
کے دربار میں امیر منشی کے اعلیٰ عہدے کے علاوہ شاہی اخبار
یس تھے۔ تعلیم کے بعد موصوف کو منشی جی کے پاس بھی رہنے کا
اتفاق ہوا۔ واجد علی شاہ کا صحافت خانہ سیکڑوں صحافیوں پر
شامل تھا۔ فن صحافت کا سبق اشرف علی نقوی نے یہیں سے
حاصل کیا اور اس کی اہمیت کی سب سے بڑی تحریک یہیں
ے ہوئی۔ با دل ناخواستہ انھیں پولس کے محکمے میں نوکری کرنا پڑی
پہلے اپنے بیوی کے نام سے اختر پریس کھولا۔ یہ خبر سپرنٹنڈنٹ پولس
پولس کے کانوں تک پہونچی اور نوکری سے انھیں الگ ہونا پڑا۔
پنے اخبار اشرف گزٹ اور اختر ہند نکالنے لگے۔

۱۸۷۹ء میں "تہذیب الآثار" کو اعزازی طور پر ترتیب
دیتے رہے۔ اختر شہنشاہی کی ابتدائی قسطیں بالاقساط اسی
پرچے میں ذخیرۂ اشرف کے نام سے طبع ہوتی رہیں۔ ان کی پہلی بیوی
بیا کا انتقال ہوگیا تو موصوف نے دوسری شادی لکھنؤ کے ایک
معزز گھرانے میں کرلی۔ اور باقاعدہ لکھنؤ محلہ منصور نگر میں رہنے لگے
لکھنؤ میں ۱۸۸۸ء میں ان کی بلند پایہ صحافت کی کتاب
"اختر شہنشاہی" کے نام سے طبع ہوئی جو مطابع اور ہندوستانی
اخبارات کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اشرف گزٹ اور اختر ہند کے
بند ہونے کے بعد اشرف نقوی اپنے آبائی وطن سیتاپور چلے آئے
اور محلہ گوڑین ٹولے میں رہنے لگے۔ مطالعہ اور تصنیف زندگی کا
شغل تھا۔ اخبارات جمع کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ انکا
گھر اخبارات کا ایک عجائب خانہ تھا۔ نادم سیتاپوری کا بیان
ہے کہ ہندوستانی اخبارات و رسائل کی اتنی بڑی لائبریری شاید
ہی کہیں ہو۔ "شجرات طیبات" سے انکی ۲۹ شادیوں کا علم ہوتا
ہے۔ اسکے بعد تین نکاح اور کئے۔ اولاد صرف تین بیویوں
سے ہوئی۔ آخری زندگی میں ذہنی توازن بگڑ گیا۔ اور ۲۷ جولائی
۱۹۲۹ء کو موصوف کا انتقال ہوگیا۔

اختر شہنشاہی کا مقام ہماری صحافت کی تاریخ میں بہت ہی
اہم ہے۔ گذشتہ صدی کی صحافت پر تحقیق کیلئے ہمارے پاس دو ہی
ماخذ ہیں "اختر شہنشاہی" اور "مقالات گارساں دتاسی" دتاسی کی تحقیق
۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء کے زمانے کے اخباروں پر روشنی ڈالتی ہے بے شمار
ہندوستان کے اخبارات اسکی تحقیق کی گرفت سے محروم ہیں۔ اشرف نقوی
کی تحقیق پوری ۱۹ ویں صدی کا احاطہ نہیں کرتی بلکہ ۱۸۸۸ء پر جا کر
دم توڑ دیتی ہے موصوف نے کل ۵۱۸ اخباروں کا ذکر کیا مگر اس میں
پریس، ماہنامے، گلدستے اور گورنمنٹ گزٹ بھی شامل ہیں یہ اس
کتاب کا بڑا نقص ہے۔ اس اعتبار سے اختر شہنشاہی ایک منفرد کتاب
ہے جس میں نہ صرف اخباروں اور دیگر رسائل کی تاریخ ملتی ہے۔
بلکہ ہماری زبان کے پریس کی بھی تاریخ موجود ہے۔ اخبار و رسائل پر
تاریخ و تبصرہ یقین کے اعتبار سے نہیں حروف تہجی کے لحاظ سے کیا
ہے اخباروں پر تبصرہ کرنے میں بہت اختصار سے اور کہیں کہیں پر
بہت بخل سے کام لیا ہے۔

یہ کتاب اختر پریس محلہ اختر نگر لکھنؤ سے جون ۱۸۸۸ء میں طبع
ہوئی۔ سرورق پر حصہ اوّل بھی لکھا ہوا تھا۔

ڈاکٹر شمیم افزا قمر (بھاگلپور)

# سہیل عظیم آبادی کے فن پر انکی شخصیت کا اثر

نومبر کی ۲۹ تاریخ ........ آسمان پر گھنے بادل تھے بوندیں آہستہ آہستہ ٹپک رہی تھیں اور رات تنہا تنہا اندھیری سے خنک اور اداس موسم میں خواہ مخواہ ہی تشویش ہوتی ہے گھر پر ہر ایک نے کتابوں میں پناہ لی تھی۔ میں اس سے بے پناہ خاموشی سے الجھ رہی تھی۔ دل کی اداسی پر قابو پانے کے لئے میں نے یونہی ٹرانزسٹر کا بٹن دبا دیا۔ آواز آنے لگی ..........

... الٰہ آباد میں اردو کے مشہور افسانہ نگار جناب سہیل عظیم آبادی کا دیہانت ہو گیا.......... میں نے اور قمر التوحید صاحب نے گھبرا کر ایک ساتھ کہا کون؟ سہیل عظیم آبادی" اپنے کانوں پر کچھ یقین نہیں آیا تھا۔ ویسے ہی قمر صاحب کی ایک جذباتی تقریر شروع ہو گئی۔

صرف ایک ماہ قبل کی بات ہے۔ میں قمر کے ساتھ پوجا کی تعطیل میں پٹنہ گئی ہوئی تھی ان دنوں سہیل بھائی روز ہی آجاتے اور دیر تک کتابوں کہانیوں کی باتیں کیا کرتے۔ آئندہ کا پروگرام بناتے اور بھاگلپور" ضرور آنے کا وعدہ کراتے۔ آتے ہی آواز دیتے اور کہتے "جلدی سے چائے بنا لاؤ" یہ کہتے جاتے ہونا میں لیموں کی چائے پیتا ہوں۔

میں کہتی "یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کتنی شکر لیتے ہیں"

پھر بھی کبھی چائے میں لیموں زیادہ ہو جاتا کبھی چائے بہت عمدہ بن جاتی جیسی چائے بنتی وہ اسی مناسبت سے تعریف کرتے اور اتنی ہی مقدار میں چائے پیتے۔ اکثر وہ رکشہ روک رکھتے اور جب باتوں میں الجھ جاتے تو میں رکشہ والے کو بھی چائے بھجوائے جاتی کہ وہ غور نہ کرے مگر اکثر رکشہ والے بھی ان کے بہت اپنے ہی ہوا کرتے تھے سو وہ خاموش انکا انتظار کرتے۔

میں جب بھی پٹنہ جاتی پہلے انھیں خبر کروادیتی وہ آکر ضرور پوچھتے، کیسی ہو؟ ان دنوں کیا لکھ رہی ہو؟ پھر اکثر اپنی کہانیوں کے کردار کے متعلق بتاتے رہتے۔ آج جی چاہتا ہے کہ اٹھا کر پوچھوں کہ آپ نے کس کردار کے متعلق کیا کہا تھا۔

میں قمر کے رشتہ سے انھیں بھائی کہتی۔ وہ میرے والد مرحوم کے رشتہ سے مجھے بھتیجی کہتے۔ کبھی بہت ناراضگی سے کہتے "نظام بھائی کو اتنا عزیز رکھتے تھے تم مجھے صرف چچا ہی کہہ سکتی ہو۔ میں کہتی آپ شاید قمر کو ذرا بھی عزیز نہیں رکھتے وہ ہنسنے لگتے اور کہتے نہایت نالائق بھتیجی ہو نہیں بلکہ تم دونوں ہی نالائق ہو۔

مخدوم محی الدین کی موت پر زینت ساجدہ نے لکھا تھا۔

"مخدوم! میں تمہارا پرسا کیسے دوں"

سہیل بھائی! میں بھی پوچھتی ہوں کہ آپ کا پرسا کیسے دوں؟

کچھ محبت کرنے والے" اتنے اپنے" اتنے خاص محسوس ہوتے ہیں کہ ہر ایک انہیں بالکل اپنا سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان پر اپنا خاص حق سمجھتا ہے۔ ایسی محبت کرنے والی ہستیاں مشکل سے، اتفاق سے، پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن ہو ہی جاتی ہیں۔ شاید ہم جیسے کم ظرفوں کو رلانے کے لئے اور محبت کا سبق سکھانے کے لئے۔ سہیل عظیم آبادی انھیں چند بزرگ ہستیوں میں ایک تھے۔

سہیل صاحب ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کے ایک مراسلہ میں تحریر فرماتے ہیں "خط ملا اور "چار چہرے" پر تبصرہ بھی۔ اندازہ ہوا کہ تم نے غور سے کہانیوں کو پڑھا۔ اور اس کی روح تک پہونچنے کی کوشش کی ہے۔ خوش رہو۔

اپنی ساری کمزوریوں اور بدکاریوں کے باوجود ہم ہندوستانیوں کا عورت کے بارے میں ایک خاص نقطہ نظر ہے۔ ہم ہمیشہ اس میں تقدس پاتے ہیں۔ اور دیکھنا چاہتے ہیں عورت ماں ہے۔ بہن ہے، بیوی ہے، بیٹی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم اسے گرتی ہوئی حالت میں دیکھنا پسند نہیں کر سکتے۔ اور جب کسی عورت کو گری ہوئی حالت میں دیکھتے ہیں تو دکھ ہوتا ہے اور اپنی کمزور حالت کا شدید احساس، یقین جانو عورت کے متعلق جو تقدس اور پاکیزگی کا تصور ہندوستانیوں کا ہے وہ کسی دوسری قوم کا نہیں ........ خواہ کوئی ہندوستانی کتنا ہی بڑا غلط کار ہو اس کا تصور بلند ہی رہتا ہے۔ میری یہ کمزوری ہے۔ بعض دوستوں کو شکایت ہے کہ میں خواہ مخواہ Idealize کرتا ہوں۔ جس شخص کے پاس کوئی آئیڈیل نہ ہو وہ قابلِ رحم انسان ہے۔

سہیل صاحب ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

........ میں آجکل اپنا نامکمل ناول کی تکمیل میں مصروف ہوں۔ اس ناول کا مرکزی کردار تو نہیں لیکن ایک اہم کردار عورت ہے۔ اور بے حد پہلودار ہے۔ اب دیکھو اسے مکمل کرنے میں کتنی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ اب صرف پڑھنا اور لکھنا چاہتا ہوں اور اپنے حلقے کو باقی رکھنے اور نوجوانوں کو گمراہی سے بچانے کے لیے رسالہ نکالتے رہنا چاہتا ہوں اور کوئی مقصد نہیں۔ مالی منفعت تو بالکل نہیں .......

انشاءاللہ اپریل میں بھاگلپور ضرور پہونچونگا۔

اب منشی پریم چند کے دو خطوط کے چند سطور بھی ملاحظہ فرمائیے جو انھوں نے ۲۶ دسمبر ۱۹۳۴ء میں اندر ناتھ مدن کو انگریزی میں لکھے تھے، جسے جناب نذیر احمد چودھری نے "سویرا" میں اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا

پریم چند لکھتے ہیں۔

آپ کا ۱۹ر کا خط پاکر خوشی ہوئی۔ آپ کے سوالات کے جواب اسی ترتیب سے یہاں دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔

(۱) میرے اپنے خیال میں رنگ بھومی میری تمام تصانیف میں سب سے بہتر ہے۔

(۲) میں اپنے ہر ناول میں آئیڈیل کردار رکھتا ہوں۔ جس میں انسانی بھول چوک اور خوبیاں دونوں ہوتی ہیں۔ لیکن ہوتا بہر صورت آئیڈیل ہے .....

(۳) پلاٹ میں ہمیشہ بنتا ہوں۔ اس خیال سے کہ انسانی کرداروں میں جو کچھ خوبصورت اور سرفروشانہ ہے اسے باہر نکال سکوں۔ یہ ایک پیچیدہ عمل ہے کبھی ایک آدمی سے متاثر ہو کر یا ایک واقعہ سے یا ایک خواب سے لیکن مجھے اپنی کہانی کے لئے کچھ نہ کچھ نفسیاتی بنیاد ضرور چاہیئے۔

(۴) میرے کرداروں کی اکثریت اصل زندگی سے لی ہوتی ہے یوں کافی ڈھکی چھپی۔ جب تک ایک کردار کی بنیاد اصلیت پر نہ ہو وہ دھندھلا اور غیر یقینی اور مطمئن نہ دلا سکنے والا ہے۔

(۵) لگاتار محبت میں بھروسہ رکھتا ہوں رومین رولاں کی طرح

(۶) میں سماج ارتقا میں ایمان رکھتا ہوں۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ ہمارا مقصد عوامی ذہنیت کی تعلیم ہے ...

(۷) میرا عورت کا تصور ہے۔ ایثار، خدمت، پاکیزگی سب مل ملا کر ایک ایثار بغیر کسی انتہا کے، دائمی خدمت بے ناک بھوں چڑھائے اور پاکیزگی سیزر کی بیوی جتنی الزام کی زد سے بھی دور۔

(۸) پہلے میں ایک پرمیشور پر اعتقاد رکھتا تھا کسی سوچ بچار کے نتیجے کے طور پر نہیں بلکہ محض روایتی اعتقاد کی نوعیت سے وہ اعتقاد ٹوٹ رہا ہے ......"

سہیل صاحب اور پریم چند کے خطوط کو اگر دیکھا جائے تو اندازہ ہو جائیگا کہ دونوں فنکار ذہنی اور جذباتی

طور پر کسقدر ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ فرق صرف ایک
ہے کہ پریم چند ترقی پسند ادب کی زنجیر کی ابتدائی کڑی تھے اور
سہیل عظیم آبادی آخری۔

دونوں ہی آئیڈیل پرست تھے۔ دونوں ہی لگاتار محنت
پر بھروسہ رکھتے تھے۔ دونوں ہی سماجی ارتقا میں ایمان رکھتے
تھے۔ (اپنے نفع و نقصان کی طرف انھوں نے کبھی دھیان
نہیں دیا) اور دونوں ہی عورتوں کے لئے بے حد آئیڈیل
قسم کے خیالات رکھتے تھے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ انکے آئیڈیل
کو حقیقت سے لگاؤ ہے یا نہیں۔

ہر بڑا فنکار آئیڈیل پرست ہوتا ہے۔ یہی حال پریم چند
اور سہیل عظیم آبادی کا تھا۔ مگر سہیل صاحب کے فن پر کچھ
کہنے سے قبل ایک اور مختصر سا اقتباس پیش کرنے کی ضرورت
ہے۔ یہ اقتباس ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی پہلی کانفرنس
(منعقدہ لکھنؤ اپریل ۱۹۳۶ء) کی ہے جس کے صدر پریم چند تھے
.........ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ
وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا
بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو
فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں۔ ان
کا فرض ہے کہ وہ ایسے ادبی رجحانات کو نشو و نما پانے سے
روکیں جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال
کی حمایت کرتے ہیں۔

ہماری انجمن کا مقصد ادب اور آرٹ کو ان ادب
پرست طبقوں کے چنگل سے نجات دلانا ہے جو اپنے ساتھ
ادب اور فن کو بھی انحطاط کے گڑھوں میں ڈھکیل دینا چاہتے
ہیں۔ ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے
زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں
ہم اپنے کو ہندوستانی تہذیب کی بہترین روایات کا
وارث سمجھتے ہیں اور ان روایات کو اپناتے ہوئے ہم اپنے
ملک میں ہر طرح کی رجعت پسندی کے خلاف جد و جہد کریں
گے۔ اور ہر جذبے کی ترجمانی کریں گے۔ جو ہمارے وطن کو
ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے......

اب سہیل صاحب کی کہانیوں پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا
کہ ان کی زیادہ سے زیادہ کہانیوں کے کردار عوامی ہیں۔
سماجی اور ملکی ہیں۔ ان کے موضوع اور مسائل نچلے طبقے
نچلے متوسط طبقے اور متوسط طبقے کے ہیں۔ انکی کہانیوں میں
بورژوا طبقہ کی عکاسیاں نہیں ہوتیں۔ اس کی وجہ شاید یہی
ترقی پسند ذہنیت اور اقرارنامے ہیں۔ جو چند ترقی پسند
مصنفین نے پریم چند کی سربراہی میں کئے تھے۔ اسکی اصل وجہ
یہ بھی تھی۔ کہ حقیقتاً مسائل اور مشکلات کا سامنا تو کچھ انہیں
طبقوں کا مقدر ہے۔ بورژوا طبقے اپنی پریشانیوں کو روپیہ
کے اوزان پر ہمیشہ نیلام کرتے رہے ہیں۔ اور ترقی پسند
مصنفین کا خاص مقصد یہ تھا کہ ادب عوام کی زندگی کے
نزدیک لایا جائے اور صرف خواص کے لئے مخصوص نہ ہو اور ادب
محض برائے ادب نہ رہ جائے۔ نیز ہندوستانی روایت اور
اسکی تہذیب ادب میں باقی رہے۔

سہیل عظیم آبادی کی زبان نہایت سادہ صاف اور
روزمرہ کی شگفتہ زبان ہے۔ یہاں وہ اپنی بساط میں ترقی
پسند مصنفین سے کچھ زیادہ ہی آگے نکل جاتے ہیں۔ کیونکہ
ترقی پسند مصنفین جب جوش میں آتے ہیں تو وہ نعرہ بازی سے
بھی گریز نہیں کرتے حد یہ کہ علی سردار جعفری جیسا بڑا شاعر
بھی "لال سویرا" میں چیخنے لگتا ہے۔ اس اعتبار سے سہیل
عظیم آبادی واقعی عظیم ہیں۔ انکی کہانیوں کا موضوع اصلاحی
ہوتے ہوئے بھی نصیحت آموز سبق نہیں بنتا۔ کبھی ان کے
موضوع طنز یہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن ان کے طنز میں ایک ایسی
لطافت اور خوش سلیقگی ہے۔ جو تعمیری عمل کو جنم دیتی
ہے۔ "بے جڑ کے پودے" اس کی ایک اچھی مثال ہے
دراصل اس ناولٹ پر مصنف کے مزاج کی چھاپ
بھرپور ہے سہیل عظیم آبادی ایک درد مند دل رکھتے تھے

اور ہر کس و ناکس سے محبت کئے جاتے۔ پھر وہ طنز کرنا کیا جانیں۔ مسٹر سنہا گنہگار ہیں۔ انھیں اپنے گناہ کا احساس ہے وہ اسکا ازالہ بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اور کرتے بھی ہیں۔ لیکن پورا ناولٹ ختم کرنے کے بعد بھی مسٹر سنہا قاری کی ہمدردیوں کو سمیٹ لیتے ہیں۔ ناولٹ کا موضوع طنزیہ رہنے کے باوجود طنز میں نشتر کی کاٹ نہیں۔ بلکہ کانٹے کی ایسی کھٹک اور چبھن سی محسوس ہوتی ہے جو انسان کو اس کی کمزوریوں سے آگاہ کرتا رہتا ہے۔ حقیقت کے آئینے دکھاتا ہے۔ طنز کی کڑواہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ نہ مسٹر سنہا سے ہی نفرت محسوس ہوتی ہے۔ پورا ناولٹ ایک نرم گداز دکھ سے شروع ہو کر اسی دکھ پر ختم ہو جاتا ہے۔ شاید مصنف نے اپنے دل کی آنچ اپنے فن میں پیوست کر دی ہے۔

"چار چہرے،، ان کی چار طویل کہانیوں کا آخری مجموعہ ہے۔ ان چاروں کہانیوں کا موضوع عورت اور انکی مجبوریاں ہیں۔ ان کہانیوں میں سہیل عظیم آبادی کا خاص انداز یعنی ان کی فطرت کا ہمدردانہ احساس اور ایک دھیمے دھیمے دلوں کی آنچ اور اسکی تپش محسوس ہوتی ہے۔

چندرا ساوتری اور ردھیا کا دکھ قدرت کے فیاض ہاتھوں کے ذریعہ بخشا ہوا دکھ ہے۔ جیسے اس کے مجبور بندے تمام ہمدردیوں کے باوجود دکھ اور بڑھا ہی دیتے ہیں بانٹ نہیں لیتے۔ اس لئے کہ وہ بھی اپنے اپنے دلوں سے مجبور ہوتے ہیں۔ یہ موضوع ایک ایسا ہی موضوع ہے۔ جو کھلے عام طنز ہے لیکن سہیل عظیم آبادی نے اس میں درد کی چاشنی اس طرح گوندھی ہے کہ وہ کہانی طنز نہیں دکھ کی آنچ بن جاتی ہے۔

کانچی اس اعتبار سے کچھ الگ ہے یہ رومانی اور دلچسپ کہانی تجسس سے بھرپور، اپنے بہترین اختتام کے ساتھ کامیابی کی منزلوں کو چھوتی ہوئی ایک جاندار کانچی کا کردار پیش کرتی ہے۔

سہیل عظیم آبادی ذہنی طور پر پریم چند سے بے حد قریب ہیں۔ نتیجتاً ان کی تحریر اور ان کے فن پر بھی پریم چند کی چھاپ نمایاں ہے۔ فرق صرف ایک ہے وہ یہ کہ سہیل صاحب کی کہانیوں کا بہترین حصہ اسکا اختتام ہوتا ہے۔ وہ تمام وقت تجسس پیدا کرتے ہیں۔ اور قاری کو ایک چونکا دینے والا اختتام پیش کرتے ہیں۔ لیکن نہایت حد تک صحیح اور منطقی۔ یہی ان کے آرٹ کا کمال ہے۔ لیکن پریم چند کو مہارت کردار نگاری پر ہے سہیل عظیم آبادی کے یہاں کردار کی روپ ریکھائیں تو ملتی ہیں۔ لیکن حجم نہیں ملتا۔ انکی مختلف کہانیوں کے کردار مثلاً ردھیا، کانچی، اور رائے صاحب میں وہ جامعیت اور ٹھوسیت نہیں۔ جو پریم چند کی نرملا میں، یا ہوری میں ہے۔ لیکن جہاں سہیل عظیم آبادی کہانی کے اسلوب اور ترتیب پر فوقیت رکھتے ہیں وہاں پریم چند اپنے ناول کے پلاٹ میں خود ہی الجھ جاتے ہیں۔

سہیل عظیم آبادی سادہ زبان لکھنے کے عادی تھے شاید یہ سادگی بھی انکی فطرت کی دین تھی۔ فنکار کی تحریر یا اسکے فن پر خود فنکار کا عکس نمایاں ہوتا ہی ہے۔ خواہ وہ خود کو اپنے فن سے کتنا ہی الگ رکھنے کی کوشش کیوں نہ کرے۔ سہیل صاحب کی سادگی فطرت انکی بصیرت، انکی عمیق تجربہ کاری اور انکا محبت بھرا انداز انکی کہانیوں میں نکھرا نظر آتا ہے۔

وہ ایک کہنہ مشق فنکار تھے۔ انکا فن کلاسیکی حدود میں داخل ہو چکا ہے۔ انکا تعلق پریم چند اسکول سے تھا اور محض اتفاق کہیے یا فن کی محبت کہ انھوں نے جان بھی دی تو پریم چند کے صاحبزادے امرت رائے کے گھر جا کر!

...

نیک خواہشات کے ساتھ
اروند مل اینڈ اسٹریز
نزد کلیان مل
نروڈا روڈ
احمد آباد ۳۸۰۰۲۵
مینوفیکچرر
کوالیٹی گرے آئرن کاسٹنگس
فون 374468
374519
گرام ENGCAST

مازح (پاکستان)

# مکمل کلید بیان بازی

اگر آپ اخبارات کا مطالعہ باقاعدگی سے کرتے رہتے ہیں تو آپ نے یہ ضرور محسوس کیا ہوگا کہ اخبارات میں ایک چیز بڑی باقاعدگی اور یکسانیت کے ساتھ روز آنہ نظر آتی ہے اور وہ ہیں بیانات۔ آپ میں اگر اتنی استطاعت اور صبر کی طاقت ہے اور آپ کے پاس اتنا فالتو وقت ہے کہ آپ انکا مطالعہ کرسکیں تو آپ دیکھیں گے کہ ایک مدت سے یہ سلسلہ بڑی باقاعدگی سے جاری ہے۔ اگر بیان جاری کرنے والے حضرات وہی ہیں جو برسوں سے یہ کام کر رہے ہیں۔ بیانوں کا متن بھی کم وبیش وہی ہوتا ہے۔ تھوڑی بہت تبدیلی کبھی کبھار ناموں اور اداروں یا تنظیموں کے سلسلے میں بوقت ضرورت اور بموقع محل دیکھ کر کر دی جاتی ہے۔

بیانات کی دو بنیادی قسمیں بہت زیادہ مستعمل ہیں ویسے تو ان کی کئی اقسام ہیں جو ہم آگے چل کر بیان کریں گے دو سب سے بڑی قسمیں ہیں موافقت اور مخالفت میں بیانات جاری کرنے کی اگر کسی حکم، تحریک، عمل، پروگرام ضابطہ اور قانون کی حمایت میں کسی طرف سے کوئی بیان چھپا ہے تو یہ لازم ہے کہ دوسرے روز اس کی مخالفت میں کم از کم (ایک ورنہ دو تین) بیان آئیں۔ اور یہ موافقت اور مخالفت کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ یا تو اخبار تنگ آکر ان بیانات کو چھاپنا بند نہ کر دے۔ یا پھر کوئی نیا شوشہ یا سلسلہ ان لوگوں کے ہاتھ نہ آجائے اور جس کی طرف بیان دینے والے متوجہ نہ ہو جائیں۔ ان بیانات کے الفاظ اور مفہوم ہمیشہ ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں صرف چند الفاظ کا فرق ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی تو وہ بھی نہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ بیانات جاری کرنے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بیانات کے موضوع بھی بدلتے جا رہے ہیں۔ اور ان کی تعداد بھی مسلسل بڑھ رہی ہے۔ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عوام کے فائدے اور گاہکوں کے آرام کے لئے ہیز کمپنی بذا کی مشہوری کی خاطر ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہر موضوع پر تیار بیانات تھوک اور خوردہ نرخوں پر اپنے سرپرستوں کو مہیا کریں اس کے کئی فائدے ہونگے۔

بڑے غور وخوض اور ایک مدت تک ریسرچ کرنے اور اخباروں کے مطالعہ اور مختلف اقسام کے بیانات پڑھنے کے بعد اور اپنے معاشرتی سیاسی سماجی اور معاشی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت چھپنے والے بیانات، بیان دینے والوں میں بہت مقبول ہیں اور ہر موقع کی مناسبت سے چھپوائے جا سکتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اگر آپ اکثر چھپنے والے بیانات کا غور سے مطالعہ کریں تو انھیں کافی حد تک مضحکہ خیز اور بے معنی پائیں گے۔

سیاسی۔ ہمارے ملک میں سب سے زیادہ تعداد سیاسی بیانوں کی چھپتی اور پڑھی جاتی ہے۔ ہمارے یہاں کے ہر آدمی میں ایک سیاست داں چھپا بیٹھا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اس جذبہ کو چھپائے یا دبائے بیٹھا ہے۔ مگر یہ جذبہ ہوتا ضرور ہے۔ کوئی بھی تقریب ہو یا جلسہ ہو۔

جہاں دو چار دوست احباب اکٹھے ہوئے پھر کسی نہ کسی
بہانے اکثر جگہ بات حاضرہ تک ضرور پہونچے گی۔ سب سے
اچھی بات سیاست پر بات کرنے کے سلسلے میں یہ ہے کہ
آپ کا سیاست داں ہونا یا سیاست کی تھوڑی بہت شدبد
ہونا قطعی ضروری نہیں ہے۔ پبلک کے رجحان اور ضروریات
کو دیکھ کر ہم نے سیاست سے متعلق ہر قسم کے بیان موقع کی
مناسبت دیکھتے ہوئے تیار کئے ہیں۔ مثلاً

۱۔ تعریفی:۔ مختلف اقدامات کی تعریف میں واہ واہ
سبحان اللہ اور زمین و آسمان کے قلابے ملانے والا بیان

۲۔ مذمتی:۔ پہلے بیان کا بالکل الٹا ہر قسم کی خرابیوں اور
برائیوں کی نشاندہی کرنے والا۔ بیان۔

۳۔ ہاتھ مضبوط کرنے والا بیان

۴۔ قوم میں اتحاد کی ضرورت پر زور دینے والا بیان۔
یہ بیان بہت مستعمل ہے۔

۵۔ "ملک بڑے نازک دور سے گذر رہا ہے" پچھلے چونتیس
سال سے یہ بیان مستقل مختلف ناموں سے چھپ رہا ہے اور ہنوز
مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

۶۔ بے مطلب بیان، جس کا صرف ایک مقصد ہوتا ہے کہ
عوام اور خصوصاً خواص کو یہ پتہ چل جائے کہ بیان جاری کرنے
والا ابھی زندہ ہے اور سیاست سے کنارہ کش نہیں ہوا ہے
اور اگر کوئی عہدہ مل جائے تو دعائیں دیں گے یا دوسرے الفاظ میں

کچھ تو ادھر بھی یا
ہم بھی پڑے ہیں راہوں میں

۷۔ ایک دوسرے کو غیر نمائندہ یا غیر جمہوری جماعت
بنانے والا بیان۔

۸۔ ایک دوسرے کو غیر ملکی ایجنٹ یا غدار قرار دینے
والا بیان۔

۹۔ "اصولوں پر کوئی سودے بازی نہیں ہوگی یا سمجھوتہ
نہیں ہوگا" یہ بیان بھی بہت پسندیدہ ہے۔

**معاشی:۔** معاشی بیانات کا زیادہ تعلق قیمتوں میں
استحکام۔ معاشی ناہمواری کم کرنے یا امیر غریب کا فرق مٹانے
تنخواہوں اور اجرتوں میں اضافہ وغیرہ سے ہوتا ہے۔ اس کے
علاوہ کچھ کاروائی کرنے کا مطالبہ ہوتا ہے اور کچھ پردہ دھمکیاں
بھی ہوتی ہے۔ ہمارے پاس اس قسم کے متعدد بیانات تیار ہیں

۱۔ "قیمتوں میں استحکام پیدا کرو" کون کرے یہ بتانا ضروری نہیں

۲۔ ذخیرہ اندوزوں اور منافع خوروں کے خلاف عبرت
آموز کاروائی کا مطالبہ۔ یہ بیان تیوہاروں کے موقع پر بہت
زیادہ تعداد میں جاری ہوتے ہیں۔ ویسے بجٹ کے موقع
پر بھی ان کی مانگ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۳۔ مزدوروں کا استحصال بند کرو۔ محنت کش کو اس کی
محنت کا صلہ دو۔

۴۔ ہڑتال کی حمایت اور مخالفت میں بیان۔

**مذہبی:۔** مذہبی بیانات کے سلسلے میں سب سے زیادہ
چھپنے والا بیان ایک دوسرے کو اسلام کے دائرے سے
خارج کر دینے اور کافر قرار دینے والا بیان ہے۔ جب سے
ہم نے ہوش سنبھالا ہے یہ بیان سنتے اور پڑھتے آرہے ہیں
اور اب تو ہمیں یہ بیان لفظاً بہ لفظاً یاد ہو گیا ہے۔ کوئی ہفتہ یا
مہینہ مشکل سے ہی جاتا ہوگا جب یہ بیان کسی نہ کسی شکل
میں نہ چھپتا ہو۔

اسی کے ساتھ ایک اور بیان بھی ہے جو اتنا ہی مقبول
ہے اور جس دن سے ہم نے اخبار پڑھنا شروع کیا ہے اس
بیان سے مفر نہیں اور وہ ہے ...... "اسلام نازک دور
سے گذر رہا ہے" اسی کے ساتھ مسلمانوں میں اتحاد کی
ضرورت والے بیان کی بھی کافی مانگ ہے۔

**سماجی:۔** اس زمرہ میں وہ بیانات آتے ہیں۔ جو
سوشل ورکرز یا ان کے لیڈر وقتاً فوقتاً اپنی اہمیت اور
زندگی کا ثبوت دینے کے لئے جاری کرتے رہتے ہیں۔ کسی
بھی سماجی مسئلہ یا منصوبہ کے حق میں یا اس کے خلاف

بیان کسی بھی ٹی۔ وی۔ یا ریڈیو پروگرام کو جاری رکھنے یا بند
کرنے کے متعلق یا کسی فلم کے خلاف یا حمایت میں جاری ہونے
والے بیانات ان تمام بیانات کی زبان اور نفس مضمون ایک
سا ہوتا ہے۔ صرف نام اور مقامات بدلتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے
کا مقبول ترین بیان ہے "سماج دشمن عناصر کا سر کچل دیا
جائے" آج کل باوجود ساری کوشش کے یہ نہیں معلوم ہو سکا
کہ یہ عناصر کہاں پائے جاتے ہیں اور ان کے سر بھی ہوتا ہے
یا نہیں

**تعلیمی**: تعلیم اور طلبار کے سلسلے میں چھپنے والے
بیانات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جن کا طلبار کے مطالبات
سے تعلق ہوتا ہے اور دوسرے وہ جن کا ان کے اساتذہ
کے مطالبات سے واسطہ ہوتا ہے۔ طلبار کے زیادہ تر بیانات
ان عنوانات کے تحت چھپتے ہیں۔
۱۔ امتحان ملتوی کرو ۲۔ تعلیمی ادارے کھولو یا بند کرو
۳۔ طلبار کی سزائیں معاف کرو ۴۔ "ایشیا سرخ ہے یا سبز ہے"
پتہ نہیں ان دونوں رنگوں کے علاوہ طلبار میں دوسرے رنگ
کیوں مقبول نہیں ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کئی ایک رنگ
بہت خوبصورت اور پکے بھی ہوتے ہیں۔

**ادبی**: بیانات زیادہ تر ادبی تحریکوں اور تنظیموں
کی حمایت یا مخالفت میں جاری ہوتے ہیں۔ جن میں ترقی پسند
جدیدیت پسند اور اسلام پسند سرفہرست ہیں۔ البتہ ادب پسند
کم دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے پسندیدہ ادیب
یا شاعر کی مستند حیثیت یا عظمت منوانے یا پھر اس کی
مخالفت میں شائع ہوتے ہیں۔

**کھیل**: کھیلوں کے متعلق زیادہ تر بیان یا تو
کسی تنظیم کی مخالفت یا موافقت میں ہوتے ہیں۔ یا پھر ٹیم کے
چناؤ کے وقت کسی مخصوص کھلاڑی کے ٹیم میں شامل
ہونے یا نہ ہونے سے تعلق رکھتے ہیں۔ خصوصاً ٹیم کا کپتان
نظر کئے جانے کے خلاف یا اس کی حمایت میں۔

بیانات کی ایک قسم وہ ہے جو اپیل کی شکل میں شائع
ہوتی ہے۔ چندہ کی اپیل کے علاوہ بقیہ تمام اپیلیں کسی نہ
کسی کے نام پر کی جاتی ہیں۔ مثلاً خدا کے نام پر، اسلام کے
نام پر، یا پھر انسانیت کے نام پر (اگر اس نام کی کوئی چیز
ہوتی ہے)۔ بعض لوگ شرافت اور ہمدردی کے نام پر بھی
اپیل کرنا پسند کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ شاید اسی طرح
کسی کا دل پسیج جائے یا ؎
شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات ...

رحمت امروہوی (احمد آباد)

# فخرِ گجرات فخر احمد آبادی

میں نے جب احمد آباد میں قدم رکھا اور احمد آباد کی علمی و ادبی فضا میں جس نام کی گونج سنی وہ پہلا نام فخرِ گجرات فخر احمد آبادی کا تھا۔ بوڑھے ہوں یا جوان ادبی یا غیر ادبی لوگ غرض ہر شخص فخر احمد آبادی کا نام عزت و احترام سے لیتا تھا فخر صاحب احمد آباد تین دروازے کے قریب محلہ کھارو کے ناکے میں ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے تقریباً نصف صدی تک علم و ادب کی خدمت کی فخر صاحب کو حضرت سہیل سورتی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حضرت سہیل سورتی مشہور استاد شاعر جناب اعجاز بھڑوچی کے شاگرد تھے اور اعجاز بھڑوچی کا تعلق مرزا اسد اللہ خاں غالب سے تھا اس اعتبار سے فخر احمد آبادی کا سلسلہ غالب سے جا ملتا ہے۔

فخر احمد آبادی نے احمد آباد اور گجرات میں علمی و ادبی فضا کو سازگار بنانے میں بہت بڑا کام کیا لوگوں کو اردو لکھنے پڑھنے پر اکسانا اور شعر و شاعری کا ذوق پیدا کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا آپ کے شاگردوں کی تعداد پورے گجرات میں ہے جنہیں کچھ شعرائے احمد آباد میں امتیازی مقام حاصل کیا مرزا کوثر بیگ، وحشی، فرخ احمد آبادی، شاغل نظامی، عقیل احمد آبادی اکمل احمد آبادی، دلیر احمد آبادی۔

سرزمین ولی احمد آبادی کو فخر گجرات نے شعر و سخن کا گلزار بنا دیا تھا فخر صاحب کی زندگی میں حسینی دروازے کا مشاعرہ ایک خاص اہمیت کا حامل تھا جو ہر سال محرم کی ۷ تاریخ کو بہت ہی اہتمام کے ساتھ فخر گجرات کی نگرانی میں منعقد ہوتا تھا اور آج بھی یہ مشاعرہ اسی طرح محرم کی ۷ تاریخ کو منعقد ہوتا ہے اب جگہ تبدیل ہو گئی ہے اور یہ مشاعرہ حضرت موسیٰ میاں صاحب "جانشینِ درگاہ حضرت شاہ عالم"، اپنی نگرانی میں منعقد کرتے ہیں۔

جیسا کہ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں فخر گجرات کا نام ہر شخص عزت و احترام سے لیتا تھا۔ چنانچہ مجھے اس ہستی کو دیکھنے اور ملنے کا اشتیاق پیدا کیا حالانکہ میں اس زمانے میں شعر نہیں کہتا تھا لیکن ادب اور مشاعروں سے ایک خاص لگاؤ تھا چند روز بعد شہر میں ایک آل انڈیا مشاعرے کے پوسٹر آویزاں نظر آئے جس میں بیرونی شعراء کے علاوہ فخر گجرات کا نام بھی سرفہرست تھا یہ مشاعرہ غالباً یتیم خانے میں منعقد کیا گیا تھا وقتِ مقررہ سے قبل ہی مشاعرہ گاہ میں پہنچ گیا تھا تھوڑی ہی دیر کے بعد شعرا آنے شروع ہوئے انجم فوقی بدایونی یہ فخر گجرات کے ہمعصر تھے اور ان کے شاگردوں کی تعداد بھی کافی تھی آگے آگے انجم فوقی بدایونی اور انکے پیچھے انکے شاگردوں کا غول اس زمانے کا یہی دستور تھا انجم صاحب اسٹیج پر جا کر بیٹھ گئے اور ان کے پیچھے ان کے شاگرد ........ کچھ دیر بعد زخمی دہلوی حزیں قریشی، کلیم احمد آبادی، مہر احمد آبادی یہ سب مقامی شعرا اسٹیج پر تشریف لے آئے چند لمحوں بعد ایک شخص وارد ہوا سفید شیروانی سفید پاجامہ سفید داڑھی سر پر ترکی ٹوپی ساتھ میں کافی لوگ تھے اسٹیج پر سب نے استقبال کیا سامعین کی نظریں آنے والے شخص کی طرف مرکوز ہو گئیں میں نے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا یہ کون شخص ہیں جواب ملا "فخر گجرات" واقعی چال ڈھال متانت سنجیدگی بزرگی ہر طرح سے متاثر

کرنے والی شخصیت تحت اللفظ میں بلند آواز سے پڑھنے کا انداز
انتہائی دلکش تھا اس مشاعرے میں بیرونی شعرا کون کون شریک
تھے اب کوئی بھی نام ذہن میں نہیں ہے غالباً ظریف دہلوی بھی
اس مشاعرے میں شریک تھے انھوں نے اپنی احمد آباد کی آمد کے
سلسلے میں ایک قطعہ پڑھا تھا جس کے دو مصرع ذہن میں رہ
گئے ہیں۔

دھول میں اور پسینے میں نہاتے آئے
تیل کی پھلکیاں اور سیو چباتے آئے

اس مشاعرے میں احمد آباد کے ایک نوجوان شاعر مہر
احمد آبادی نے سامعین کو بہت متاثر کیا گودھرے میں آگ لگنے
کا واقعہ اس وقت نیا نیا تھا اور اس کی مناسبت سے مہر احمد آبادی
نے جو نظم پڑھی تھی اس کا ٹیپ کا مصرع کچھ اس طرح تھا۔

" جلتا ہے گجرات میرے ساتھی جلتا ہے گجرات "

غرض فخر گجرات سے یہ پہلی ملاقات تھی اور اس کے بعد تو بارہا
شاعروں میں دیکھا اور ساتھ بھی مشاعرے پڑھے۔

اساتذہ میں چشمکیں اس زمانے کا دستور تھا اور غالباً ہر جگہ
ہر شہر میں ہوتی تھیں چنانچہ احمد آباد میں بھی یہی کچھ ہوتا تھا انجم فوقی
بدایونی کے شاگردوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ لیکن حکیم بشیر احمد خاں
زخمی کا کوئی شاگرد نہیں تھا اور وہ ہر معرکہ میں تنہا مقابلہ کرتے تھے
سنا ہے اس زمانے میں شاگرد شعرا کے بہتات کے پیش نظر ایک
فی البدیہہ مشاعرہ بھی منعقد ہوا جس میں کچھ شعرا وقت مقررہ تک
بھی شعر نہ کہہ سکے اور کاغذ کورا ہی چھوڑ آئے۔

اساتذہ کی برسر مشاعرہ نوک جھونک اور فی البدیہہ اشعار
کبھی کبھی بہت لطف دے جاتے تھے حکیم بشیر احمد زخمی دہلوی
کے ساتھ فخر گجرات کی نوک جھونک ایک طویل عرصے تک چلی
لیکن دونوں اساتذہ ایک دوسرے کا احترام ملحوظ خاطر رکھتے
تھے کبھی بھی کوئی بداخلاقی سرزد نہ ہوتی تھی زخمی صاحب کے
ساتھ ایک الجھن یہ تھی کہ اساتذہ کے پڑھنے کا مقام سب سے
آخر میں ہوتا تھا اور فخر گجرات اپنی ضعیف العمری اور علالت کی
وجہ سے اپنے مقام سے قبل ہی پڑھ لیا کرتے تھے اور مشاعرے سے
رخصت لے لیا کرتے تھے اگر کبھی کوئی قطعہ یا شعر جس میں استاد زخمی
کیطرف اشارہ ہوتا تھا زخمی صاحب اسکا جواب اسی وقت
فی البدیہہ کہہ لیا کرتے تھے لیکن مدمقابل سننے والا نہ ہوتا تھا صرف
شاگردوں کی زبانی فخر صاحب کو اطلاع ملتی تھی اور اسکا جواب
کسی اگلے مشاعرے کے لئے محفوظ ہوتا تھا ایک مرتبہ رکھیال روڈ
پر طرحی مشاعرہ تھا مصرع طرح تھا۔

" انساں بنادیا ستم روزگار نے "

فخر گجرات نے طرح میں جو غزل پڑھی مقطع میں زخمی صاحب کیطرف اشارہ تھا

اے فخر ہوں میں زندہ سلامت ابھی تلک
بیکا نہ بال بھی کیا دشمن کے وار نے

اور زخمی صاحب نے بھی اسکا فی البدیہہ جواب دیا غرض اس قسم کی
چشمکیں اساتذہ میں چلتی رہتی تھیں جو بہت لطف دیتی تھیں
اور نئے شعرا کو سیکھنے کو بھی ملتا تھا معمولی سے معمولی غلطی پر بھی
اساتذہ کی نظر رہتی تھیں کہیں بھی کسی سے چوک یا سہو پیدا ہوا فوراً
اس کا اظہار ہو جاتا تھا۔

غرض فخر صاحب جب تک زندہ رہے علم و ادب کی خدمت کرتے رہے
گجرات کی تاریخ میں جلی الفاظ میں فخر گجرات کا نام لکھا جائیگا آپکی قبر
موسیٰ سہاگ قبرستان میں ہے اور ایک خوبصورت مقبرے کی شکل دیدی گئی ہے
مقبرے کے اطراف میں دیوار و پر فخر گجرات کی رباعیاں اور اشعار تحریر ہیں
فخر گجرات کا نعتیہ مجموعۂ کلام "سفینۂ غوث" انکی زندگی میں شایع ہوگیا تھا لیکن
غزلیات کا کوئی مجموعہ ابتک شایع نہ ہو سکا کاش شاگردان فخر گجرات یہ
کام اپنے ذمہ لے لیں اور اس شاعر بے بدل کا کلام جسنے گجرات میں نصف صدی
تک اردو و ادب کی خدمت کی محفوظ کرلیں ورنہ کتنے ہی اور شاعروں کیطرح
فخر صاحب کے کلام کے اوراق پریشان بھی وقت کی گرد میں دب جائینگے اللہ پاک
انکے شاگردونکو یہ توفیق دے فخر گجرات کی یاد میں ہزاروں روپیہ خرچ کر
کے ایک مشاعرہ کا اہتمام کرنا اس سے کہیں بڑی بات یہ ہے کہ اس
شاعر کا کلام طبع کرا کے محفوظ کر دیا جائے تاکہ آنے والی نسلیں
استفادہ کرسکیں۔

مناظر عاشق ہرگانوی

# عکس ریز

(کتاب کی دو جلد بھیجیں ورنہ تبصرہ شائع نہیں ہوگا)

## ننھی کتاب ——— بدیع الزماں خاور

صفحات ۴۸، سائز ڈیمائی، قیمت چھ روپے
ناشر:- موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲

اردو میں بچوں کے ادب کی کمی کا احساس ہم سب کو ہے۔ دوسری فعال زبانوں کے مقابلے میں اس زبان کے بچوں کا ادب اس لئے مالا مال نہیں ہے کہ ہر موضوع پر تازہ بہ تازہ کتابوں کی اشاعت نہیں کے برابر ہے

بدیع الزماں اردو کے قادر الکلام شاعر ہیں غزلیں نظمیں اور آزاد غزلیں کہنے والوں میں انھوں نے اپنا اعتبار قائم کیا ہے۔ اپنی شناخت بنائی ہے اور اب بچوں کے شاعر کی حیثیت وہ سامنے آتے ہیں۔ "ننھی کتاب" میں چھوٹی عمر کے بچوں کے لئے تیس نظمیں اور تین غزلیں شامل ہیں نظموں کی زبان بہت ہی آسان اور بہت ہی پیاری ہے کم عمر بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر "جب میں چاند پہ جاؤں گا" "ایک تھی سردی" "دال روٹی اور انگور" "مونے کی چوری" "بھائی مولو رام" "ہماری نانی جان" "دادا جی کے خراٹے" "ہو جاتی ہے بجلی فیل" "افریقہ کے جنگل میں" "چوہا ڈھول بجانے بیٹھا" "ایک اونٹ نے منت مانی" اور دوسرے موضوعات پر بدیع الزماں خاور نے بہت ہی دلچسپ نظمیں کہی ہیں، ایک نظم "افریقہ کے جنگل میں" دیکھئے ؎

### افریقہ کے جنگل میں

ایا جی بتلاتے ہیں
پیڑ کچھ ایسے بھی ہیں جو
جادو سے اُگ آتے ہیں
پیڑ وہ ناچا کرتے ہیں
پیڑ وہ گانا گاتے ہیں
جادو کے اس جنگل میں
لوگ بہت کم جاتے ہیں
کیوں کہ اس جنگل سے لوگ
بونے بن کر آتے ہیں

کتاب بہت ہی خوبصورت چھپی ہے۔ کاغذ سفید کتابت طباعت عمدہ اور سرورق دلکش ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہر نظم میں موضوع کے اعتبار سے تصویریں بھی شامل ہے لیکن کتاب کی قیمت زیادہ ہے۔

## عہد محمد شاہی کے چند فارسی شعراء ——— ڈاکٹر عبدالغفار انصاری

صفحات ۶۴، قیمت پانچ روپیہ
پتہ:- ڈاکٹر عبدالغفار انصاری، صدر شعبہ فارسی ٹی این بی کالج بھاگلپور (بہار)

ڈاکٹر عبدالغفار انصاری، فارسی ادب کے استاد ہیں
ان کی عمر کا ایک قیمتی اور اہم حصہ تہران میں گزرا ہے۔ یوں تو انھوں
نے شیراز، رے، قم، اصفہان، مشہد، ہمدان، کرمانشاہ، بغداد
مدائن، کوفہ، کاظمین، نجف اشرف وغیرہ کی بھی مسافرت کی ہے
لیکن ان جگہوں کے ساتھ تہران کے علمی و ادبی خزانے سے
سب سے زیادہ انھوں نے استفادہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے
کہ علمی تجربے سے وہ مالا مال ہیں۔ فارسی ادب پر خصوصاً انھیں
دسترس حاصل ہے اور اکثر و بیشتر وہ تصنیف و تالیف کا
کام کرتے رہتے ہیں۔

عبدالغفار انصاری کی تازہ تصنیف "عہد محمد
شاہی کے چند فارسی شعراء" ہے۔ محمد شاہ کا عہد ہندوستان
میں فارسی شاعری کا آخری زریں دور تھا۔ چونکہ خود محمد شاہ
کو شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ اس لئے اس نے اہل علم اور
شعراء کی بھرپور سرپرستی کی، انھیں اعلیٰ عہدے بھی دیئے۔ یہی وجہ
تھی کہ اس کے عہد میں بعض ایسے شعراء بھی گذرے ہیں
کہ اس دور میں ایران میں ایسے نامور شعراء موجود نہیں تھے۔

تذکرہ کی اس کتاب میں شیخ محمد علی حزیں،
شاہ فقیر اللہ آفریں لاہوری، نظام الملک آصف جاہ، حکیم علوی
خاں، میر شمس الدین فقیر عباسی، سراج الدین علی خاں آرزو
میر غلام علی آزاد بلگرامی اور عماد الملک غازی الدین خاں بہادر فیروز
جنگ پر بھرپور مواد موجود ہے۔ ہندوستان سے ایران تک
لائبریریوں سے استفادہ کرنے کے بعد مختلف فارسی تذکروں
اور دواوین کو سامنے رکھ کر مندرجہ بالا شعراء پر جامع مواد
اکٹھا کیا گیا ہے۔

کتابت طباعت صاف اور روشن ہے۔ سرورق
سادہ ہے۔

# شہر نامہ

قارئین کرام کی خواہش پر شہر نامہ کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا جا رہا ہے۔ اس کالم کے تحت گجرات میں ہونے والی ادبی ثقافتی سماجی اور مذہبی سرگرمیوں کی رپورٹ مختصراً پیش کی جائے گی "ایڈیٹر"

## رسم اجراء ایک آواز

جناب خلش بڑودوی، بڑودہ شہر کے ہی نہیں گجرات کے مشہور و معروف شاعر ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی اردو زبان کی خدمت کے لئے وقف کر دی ہے۔ آپ اردو کے ایسے شاعر ہیں اس کے علاوہ گجراتی زبان میں بھی آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔ خلش بڑودوی کی کتاب "ایک آواز" جو قومی یکجہتی کے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور جس پر حکومت گجرات انھیں رول انعام دو ہزار روپئے سے نوازا ہے۔ (یہ کتاب ہندی میں بھی شائع ہو چکی ہے۔) اسکی رسم اجراء مورخہ ۲۶ مارچ ۸۲ء کو بڑودہ میں ادا کی گئی جناب امین قریشی صاحب نے اس موقع پر فرمایا کہ اردو زبان و شاعری میں جہاں جہاں بڑودے کا ذکر آتا ہے۔ خلش بڑودوی کا نام بھی ضرور لیا جاتا ہے۔ بڑودہ شہر کے میئر شری دی سی پٹیل نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ نائب وزیر مزدور حکومت گجرات شری سی این پٹیل نے اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کا تذکرہ کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ وہ اسے گجراتی زبان میں شائع کرانے کی کوشش کریں گے۔ بھارتی جنتا پارٹی بڑودہ کے صدر شری بھوپیندر رہینڈر سے نے بھی اس موقع پر تقریر کی۔ کتاب کا اجراء بدست جناب حنیف مستری یعنی کے پر خلوص تعاون سے یہ کتاب شائع ہوئی، انجام پایا۔ جلسہ کی صدارت جناب وارث علوی نے فرمائی مختلف ادبی انجمنوں کی طرف سے جناب خلش صاحب کی گل پوشی کی گئی۔ خلیل دمن تجوری صاحب نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ اور معصوم بڑودوی نے مہمانوں نیز سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

## تقریری مقابلہ

اسکول نمبر ۱۲ بڑے خاں چکلے میں سورت سٹی پرائمری ایجوکیشن بورڈ کی طرف سے پرفیکٹ والا شیلڈ کا ایک تقریری مقابلہ اردو زبان میں بعنوان "قومی اتحاد" ۷ فروری ۸۲ء کو سورت میں منعقد ہوا جس میں جناب مختار غوثی اور جناب مظہرالدین بخاری نے جج کے فرائض انجام دیئے۔ اس پروگرام میں جناب عبدالحمید پرفیکٹ والا نے بھی شرکت کی۔ اسکول بورڈ کے سپروائزر جناب حیدر علی نے مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور جناب اسماعیل اکبر نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

(سید حیدر علی)

## تعزیتی جلسہ

بتاریخ ۱۶ اپریل ۸۲ء بعد نماز عشاء ابراہیمیہ دواخانہ پانچ کنواں احمد آباد پر ادارہ محوی کی مجلس عاملہ کی ایک ہنگامی میٹنگ طلب کی گئی جس میں ادارہ محوی کے مشیر کار جناب ابراہیم صاحب مینا بکری کی شریک حیات اور نورانی بارہ ہانڈی والوں کی ہمشیرہ آمنہ بی کے انتقال پر ملال پر ایصال ثواب اور جناب ابراہیم صاحب کو تسلی و تشفی دینے کیلئے ایک قرارداد منظور کر گئی۔ مرحومہ آمنہ بی نے مختصر علالت کے بعد ۱۵ اپریل ۸۲ کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا ادارہ محوی جناب ابراہیم صاحب نیز پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنی رحمت میں جگہ عنایت فرمائے آمین ثم آمین

(جمیل وصفی کانپوری جنرل سکریٹری، ادارہ محوی)

# آپ کے خطوط

**ضیا ابن فیضی** (مئو ناتھ)

گلبن بابت ماہ فروری ۸۳ نظر نواز ہوا، شکریہ! اداریہ میں
پ نے احمد آباد ریڈیو اسٹیشن کی جس امتیاز پسندی، بے حسی اور
ردو پروگراموں کی وجہ سے متعلقہ افراد کی جس لاپرواہی اور غفلت
رف واضح اشارات کئے ہیں۔ وہ ماتمی صورت حال کم و بیش
بلکہ ہے اردو جیسی عظیم اور مشہور و مقبول زبان کے ساتھ تنگ نظری و تعصب
یہ برتاؤ ایک ایسا تہذیبی المیہ ہے جس کا جتنا ماتم کیا جائے کم
ہے۔ آپ نے اس مذموم اور معاندانہ روش کے خلاف جو
صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ اردو والے آپ کے ہم آواز ہیں
ن تجھے معلوم کہ زمام کار جن کے ہاتھوں میں ہے۔ ان کے
ئم کچھ اور ہیں۔ اور وہ ایسی مجبور فریادوں کے سننے
قطعی عادی نہیں۔ بہرحال اردو کی آبرومندی کے لئے
کوششیں جاری رکھئے۔ شاید وقت کی کوئی کروٹ کتنے ہی دور
روں مشکلات پیدا کر دیئے۔ اور ہمیں تازہ ہوا مل سکے۔ پروفیسر
ناتھ آزاد کا "دل من مسافر من" اور رام لعل کا "زرد پتوں کی
۔ دونوں سفرنامے اپنی جگہ حسن دلچسپی اور معنویت کا مرقع ہیں
طرح یہ دونوں احباب اپنی سیاحت کے وسیلے سے لسانی ادبی
ثی اور تاریخی معلومات و مسائل کا جو قابل ذکر ذخیرہ فراہم
ہے ہیں۔ وہ ہمارے لئے بصیرت و عبرت کا سرمایہ ہے۔ اور
امروں کو جدید روایت کا ایک اہم اور خوبصورت جزو۔
ڈی اظہر کے پچھلے مضمون "اردو کی بھول بھلیاں" کے تعاقب
ی زتلائی نے ایک مطالعاتی جائزہ سپرد قلم کیا ہے جس میں
انے اردو قواعد اور علم (عروض) کے مباحثات پر بڑی متانت
توازن باتیں کہی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زیر
بحث مسئلہ کا وقوف و ادراک رکھتے ہیں۔ ظفر ہاشمی کا "یادوں کے دریچے"
ان کی اپنی زندگی اور شاعری کی ابتدائی حالات و کوائف پر مشتمل
ہے۔ اور خوب ہے منظومات اور افسانوں کے حصے میں نازش
سلیمان اطہر جاوید، سید جاوید اختر عنوان چشتی، جمیل زبیری، شوکت
مہدی، مہدی پرتاب گڑھی، اسد رضوی، منظر اعجاز اور رفیق ٹونکی
پسند آئے۔ مضامین کی کمی توجہ طلب ہے۔

**ایم۔ آر قاسمی** (علیگڑھ)

فروری ۸۳ کا گلبن زیر نظر ہے اداریہ میں بیباکانہ رویہ
پسند آیا۔ ہر جگہ یہی عالم ہے۔ غزل کے کالم شوکت مہدی (پاکستان) کا
نام گرچہ بالکل نیا ہے۔ مگر غزل مرقع ہے کی ترجمان ہے۔ اسد رضوی
(مظفر پور)، ڈاکٹر مجید آذر (بمبئی) کی غزلیں پسند آئیں۔ جمیل زبیری پاکستان کا
کا افسانہ آج کے افسانوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ "یادرفتگاں"
کالم تنوع پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔

**سید عبدالباری** (سلطان پور)

گلبن کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ آپ کے رسالہ کا
معیار ادھر کافی اچھا ہوتا جارہا ہے۔ آپ جس دلچسپی سے علم وادب
کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس کے لئے ہم سب اردو کے
کے خادموں کو آپ کا شکر گذار ہونے چاہیئے۔ موجودہ شمارہ
میں ماضی کے دریچوں میں جھانکنے کی کوشش اچھی ہے۔ یہ
یہ سلسلہ جاری رکھیں۔ رام لعل کا سفرنامہ بیکار ہے کئی جگہ چھپ چکا
ہے کتاب بھی آگئی ہے۔ آپ کیوں صفحات ضائع کر رہے ہیں۔

**بدیع الزماں خاور** (داپولی۔ مہاراشٹر)

گلبن کا سالنامہ ۸۳ء آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا
ایک بہترین اور کامیاب اظہار ہے۔ اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے۔

**رؤفت النساء رفعت** (مظفرپور)

[..] نامہ میری تعریف کا محتاج نہیں۔ آپ نے جتنی محنت
[..] ہے اس کی ستائش بھی میرے بس کی چیز نہیں۔ اداریہ پڑھ کر
[..] خاص اثر پڑا۔ یہ مسئلہ تو آج ہر ادبی رسالہ سے وابستہ ہے
[..] ہوں اس کی آبلہ پائی کیلئے مرہم کی فراہمی کی خاطر زرِ تعاون روانہ
[..] رہا ہوں۔ جانتی ہوں کہ قلیل رقم اس کی آبلہ پائی کو صحت کی عطا
[..] کر سکے گی۔ پھر بھی یہ یقین ہے کہ اس سے کچھ تقویت ہوگی اور تقویت
[..] شکریہ۔ اڈیٹر ایسے مسئلے سے دوچار ہوتے ہوئے پرچوں
[..] ئے میری نیک دعائیں ہیں۔ جو کہ گھر ادب کا بحرِ ذخار بنکر
[..] اور دلوں کو سبز و شاداب کرتے ہیں۔ مگر خود قاری
[..] کی وجہ سے مالی مشکلات کا شکار ہو کر موت کے
[..] سے پہلے مجبور ہو جاتے ہیں۔

**عتیق احمد عتیق** (مالیگاؤں)

سالنامہ کا ایک ایک لفظ پڑھا۔ خوب ہے مضامین
[..] کے بارے میں اگر علیحدہ علیحدہ تاثرات کا اظہار کیا جائے
[..] صفحات سیاہ ہو جائیں گے۔ پھر بھی حق تبصرہ ادا نہ ہو گا۔
[..] ئے کہ حمد سے لیکر عکس ریز تک جو مواد آپ نے پیش کیا ہے
[..] علمی وادبی افق بہت متنوع اور وسیع ہے۔ صرف فہرست
پر نظر ڈالتے تو کہنا پڑتا ہے کہ اردو کی صف اول کے ادباء و شعراء
[..] اس اجتماع نے ہند و پاک کو ایک مرکز پر جمع کر کے رکھ دیا
[..] نہ تو یہ اور کچھ کتابت و طباعت کا رنگ و حسن بھی اسے ان
[..] میں لے آتا ہے۔ جیسے گلبن اردو کے بڑے پرچوں میں
[..] ت ہو۔ میری اور جن دوستوں نے میرے یہاں سالنامہ ملاحظہ
فرمایا۔ ان سبھوں کی طرف سے آپ کو ثریا ہاشمی صاحبہ کو اور
[..] ہاشمی صاحب کو بہت بہت مبارکباد اور پرچے کی زندگی
[..] لئے ہدیہ دعا۔

**محمد ابراہیم صدیقی** (الٰہ آباد)

فروری کا شمارہ وقت پر مل گیا تھا۔ یادِ رفتگاں
[..] نسیم القادری اور یادوں کے دریچے بید پسند آئے۔ آئندہ
بھی امید ہے کہ اس طرح کی چیزیں پڑھنے کو بھی ملتی رہیں گی ڈاکٹر
جگن ناتھ آزاد کا سفرنامہ جہاں پڑھ کر مسرت ہوئی وہیں رام لعل
کے "زرد پتوں کی بہار" کے بالکل منقطع ہو جانے پر افسوس بھی ہے
ان کا سفرنامہ امتیازی وصف رکھتا ہے۔ اس ماہ کا اداریہ کافی جاندار
ہے اس میں ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔ بظاہر یہ بات مقامی
معلوم ہوتی ہے لیکن اس طرح کی بدنصیبی مختلف روپ میں
دوسرے مقامات پر بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ منظر اعجاز کا افسانہ اور
غنی زتلامی کا عروض پر وضاحتی مضمون دل کو بہت ہی بھایا۔
ڈاکٹر عنوان چشتی، شوکت مہدی، ڈاکٹر مجید آذر، آمر سورتی، رفیق ٹونکی
اور انجم نصیر آبادی کی غزلیں قابل ذکر ہیں عزیز قادری اور
نازش پرتاپ گڑھی کی شعری تخلیقات معیاری ہیں پسند آئیں۔

**رحمت امروہوی** (احمد آباد) فروری کا پرچہ موصول ہوا۔

آپ کا اداریہ پڑھا ریڈیو والوں کا یہ رویہ
مجھے بھی اچھا نہیں لگا۔ آپ نے ٹھیک ہی نشاندہی کی ہے دراصل ہم اردو
والے معمولی معمولی باتوں پر تو جھگڑتے ہیں لیکن بنیادی کمزوریوں کیطرف
توجہ نہیں دیتے۔ صرف آپ نے پہلے بھی ایک دو مرتبہ اپنے اداریہ میں
اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

**رفیق ٹونکی** (سورت) فروری ۸۲ کا گلبن ملا خاص طور اداریہ پڑھ

آپ کی یہ جرأت امید افزا کہی جا سکتی ہے بشرطیکہ کوئی شنوائی
ہو۔ میں گذشتہ ایکسال میں کئی مرتبہ اردو سیکشن کے انچارج کو براہ
راست خط لکھ چکا ہوں کہ یہ احباب پروری اور "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو"
کی بھونڈی شان آپ قائم نہ کریں مگر ان کے شاید کان ہی نہیں۔ تو جوں کہاں
رینگ سکتی ہے۔ اول تو گجرات میں صرف تین یا چار شاعر ہیں جنکو محترم انچارج نے
تعلی لگا دیا ہے۔ اور وہی لوگ ہر دوسرے تیسرے ہفتے ریڈیو پہ نازل ہوتے
رہتے ہیں۔ دوسرا ظلم یہ کیا گیا کہ فی البدیہہ مشاعرہ میں ٹھونس دیا گیا تاکہ رہی
سہی کسر بھی پوری ہو جائے۔ اگر آپ مسلسل کوشش کریں تو ہزاروں اردو
نواز آپ کا ساتھ دیں گے۔

نوٹ: ہمیں یہ مطلع کرتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ آل انڈیا ریڈیو احمد آباد کے شعبہ
اردو کے انچارج کا تبادلہ ہو گیا ہے اور نئے پروگرام ایگزیکیوٹیو نے جو لکھنؤ تشریف
لاتے ہیں۔ چارج لے لیا ہے (اڈیٹر)

**آخری بات** ہو اگر قوتِ فرعون کی درپردہ مرید ∴ قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی (علامہ اقبال)

گجرات سے نکلنے والا واحد علمی ادبی اردو مجلہ

ماہنامہ

# گلبن

جون سنہ ۱۹۸۳ء

جلد ۶ | شمارہ ۶۷ واں

ایڈیٹر :— ثریا ہاشمی
مینیجنگ ایڈیٹر :— ظفر ہاشمی
ترتیب کار :— مناظر عاشق ہرگانوی

نگراں
سید محمد حکیم الدین شیرازی

مشیران
سید علی احسن بخاری
سید احمد مختار غوثی
ڈاکٹر شمس الاسلام عثمانی

بدل اشتراک
لائف ممبری ۲۵۰ روپئے
زرتعاون سالانہ ۲۵ روپئے
زرسالانہ ۲۰ روپئے
غیر ممالک میں بحری ڈاک سے } ۳ پونڈ
ہوائی ڈاک سے ۵ پونڈ
عام شمارہ ۷۵ / ۱ روپئے

پتہ { ۲۰/۱۶۹ گجرات ہاؤسنگ بورڈ کالونی
شاہ عالم، احمد آباد ۳۸۰۰۲۸

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر
ثریا ہاشمی

مطبع :— نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد (یوپی)

## فہرست

اداریہ

# دوسرا علم

اردو داں طبقہ کے بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ اردو صرف گھر کی زبان ہے ۔ اسکول کی زبان تو وہ ہونی چاہئے جو معاشی، مادی فوائد بشمول ملازمت کے لئے سود مند ہو۔ یہ خیال صریحاً خام ہے۔ جو حالات کی جز وقتی تبدیلیوں کی عکاسی کرتا ہے ۔ مادری زبان میں تعلیم بچوں کے ذہن کی گرہیں کھولتی ہے اور بچہ اپنا مافی الضمیر، اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کا اظہار اور ترجمانی بہتر طور پر کر سکتا ہے۔ زبان، تہذیب اور ثقافتی ورثے کی نگہبانی ہوتی ہے۔ اپنی معاشرتی زبان سے گریز بچوں کو معاشرے سے بیگانہ کر دیتا ہے اس لئے وہ افراد جو اردو کو اپنی مادری زبان کہتے ہیں، جب تک احساس کمتری کے شکنجے سے خود کو آزاد نہیں کرتے، جب تک اپنے غلامانہ ذہن میں آزادی کی شمع روشن نہیں کرتے، جب تک اپنے اندر خود اعتمادی، خودداری، خود شناسی پیدا نہیں کرتے، جب تک خود کو ایک عظیم زبان کا وارث تصور نہیں کرتے وہ دوسروں کے محکوم رہیں گے۔ وہ بھلے ہی مالی اور معاشی اعتبار سے مستحکم ہو جائیں مگر اپنی معاشرت اور اپنی تہذیب سے بیگانہ ہو کر وہ اپنی شناخت کھو بیٹھیں گے اور یہ سب سے بڑا المیہ ہوگا۔

اس پس منظر میں ہمیں یہ جان کر بیحد خوشی ہوئی ہے کہ احمد آباد کے سب سے پرانے اور قابل قدر اسکول انجمن اسلام ہائی اسکول نے اردو ذریعہ تعلیم کی اہمیت کو آخرکار محسوس کیا اور اس سال سے لڑکیوں کے لئے اردو میڈیم کا درجہ ہشتم کھول کر گجرات کے نقشہ پر الف۔ ڈی ہائی اسکول کے بعد دوسرا سرخروئی کا علم لہرا دیا ـــــ ہم انجمن اسلام ہائی اسکول کو اس عظیم اقدام پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اس کے قدم آگے ہی آگے بڑھتے جائیں گے اور وہ نام نہاد اردو داں طبقہ میں پھیلی اس غلط فہمی یا یوں کہئے کہ سیاسی ایجنٹوں کی پھیلائی شر انگیزی کو دور کرنے کی ہر امکانی کوشش کریں گے کہ اردو میڈیم سے پڑھ کر بچے کسی مصرف کے نہیں رہ جاتے ۔ برخلاف اس کے اس حقیقت کو ہر خاص وعام پر عیاں کر دیں گے کہ اردو ذریعہ تعلیم سے پڑھ کر بچہ دوسری زبانوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مہذب، کہیں زیادہ ذہین، کہیں زیادہ خوددار، کہیں زیادہ ایماندار، قابل قدر اور قابل فخر انسان بنتا ہے ۔ اس لئے کہ اردو ایک زبان ہی نہیں، ایک مخصوص تہذیب کا نام بھی ہے ۔ اردو پڑھ کر انسان ایک موثر اور خوبصورت زبان تو سیکھتا ہی ہے ، ایک عظیم ترین تہذیب کی آغوش میں پلتا بھی ہے اور یہی اس زبان کی خوبی ہے جو اسے بہت ساری دوسری زبانوں سے ممیز کرتی ہے ۔

ہمیں امید ہے کہ انجمن اسلام ہائی اسکول احمد آباد کے نقش قدم پر دوسرے اسکول بھی چلنے کی کوشش کریں گے اور لڑکیوں کے علاوہ لڑکوں کے لئے بھی اردو میڈیم سے پڑھنے کی سہولت فراہم کریں گے۔

ثریا ہاشمی

## مصطفیٰ صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ

**فیاض ٹانڈوی**

اے کہ تیرے فیض سے روشن زمانے کی فضا، اے کہ تیرا روئے انور بزمِ ہستی کی ضیا
اے کہ تیری ذاتِ اقدس خلق کی حاجت روا اے کہ تو محبوبِ یکتا خالق و مخلوق کا

باعثِ تخلیقِ عالم، مظہرِ ذاتِ خدا
مصطفیٰ صلِّ علیٰ، صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ

حامد و احمدؐ، محمدؐ، مصطفیٰ و مجتبیٰ، شاہد و اشہد، مشاہد، نورِ ذاتِ کبریا
کامل و اکمل، مکمل، پیکرِ صدق و صفا اجمل و اکرم، مکرم، افتخارِ انبیا

عبدِ معبودِ حقیقی، عابدِ [illegible]
مصطفیٰ صلِّ علیٰ صلِّ [illegible]

علم و عرفاں کا سمندر، قلزمِ فہم و ذکا دانش و حکمت کا مصدر، حاملِ حلم و حیا
قبلۂ اخلاص و ایماں، کعبۂ صدق و صفا معدنِ خلق و مروت، مخزنِ لطف و عطا

راحت و رحمت کا سرچشمہ، منبعِ جود و سخا
مصطفیٰ صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ

پرتوِ دلکش ہے فرش و عرش کس کے نور کا کس کی تابانی نے بخشی ہے مہ و خور کو ضیا
یہ ثریا، کہکشاں ہیں کس حسیں کے نقشِ پا کس کی ضو نے بزمِ عالم کو منور کر دیا

کون سر سے پیر تک گنجینۂ انوار تھا
مصطفیٰ صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ

کی حیاتِ نو غلاموں اور یتیموں کو عطا غمزدوں، بیواؤں کو ذلت سے چھٹکارا ملا
جہل کی تاریکیوں کو علم سے روشن کیا ابرِ رحمت بن کے آئے چھا گئے بن کر گھٹا

بے سہاروں کا سہارا، بے نواؤں کی نوا
مصطفیٰ صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ

وقتِ مغرب کیوں طلوعِ شمس دوبارہ ہوا ماہِ تاباں اک اشارے میں شق ہو گیا؟
کس کا کلمہ کنکروں نے مشت کا میں پڑھا انگلیاں کس کی بنیں تابعِ سمندر فیض کا؟

کون ہے شمس الضحیٰ، بدرالدجیٰ، نورالہدیٰ
مصطفیٰ صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ

کس نبی کا مشتاقِ دیدار تھا ربُّ العلا مستحق کس کو بنایا اپنے قربِ خاص کا
کس لئے فرمایا حق نے قابَ قوسین دنیٰ کس کے سر پہ تاجِ سُبحٰنَ الَّذی رکھا گیا

کون تھا مہمان شبِ اسریٰ حریمِ قدس کا
مصطفیٰ صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ

سورۂ والشمس روئے پاک سے جلوہ فشاں گیسوئے اطہر میں ہیں واللیل کی رعنائیاں
ہو گیا فیاضؔ یہ آیاتِ نوری سے عیاں ہے خدا قرآں میں کس کس طرح سرگرمِ ثنا

مزمل، مدثر، یٰسین، طٰہٰ، ہل اتیٰ
مصطفیٰ صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ

سید حکیم الدین شیرازی (احمد آباد)

# قرآن اور زوال کے اسباب

عروج تو قوموں میں آتا ہے اور زوال بھی لیکن جہاں تک زوال کا تعلق ہے اس کے اسباب کا تجزیہ قرآنی نقطہ نظر سے نہایت دلچسپ اور مفید ہے۔ اسکے لیے جو مواد قرآن میں موجود ہے وہ عبرت انگیز بھی ہے اور ہمارے لیے رہنمائی کرنے والا بھی۔

قرآن پاک نے مختلف مقامات پر عروج و زوال کے اسباب بیان کئے ہیں مگر ایک جامع سورۃ ایسی بھی ہے جو دونوں کے لیے بنیادی ہے۔ وہ پارہ عمّ کی سورۃ العصر ہے۔
اس سورت میں پہلے عروج کے چار اصول بیان ہیں جنکی صداقت کیلئے قرآن حکیم نے زمانہ کی پوری تاریخ شہادت میں والعصر کہکر، فرماکر پیش کی ہے۔
وہ اصول یہ ہیں (۱) ایمان (۲) عمل صالح (۳) تواصی بالحق اور (۴) تواصی بالصبر۔
اسی سورۃ سے جب زوال کیلئے بنیادی اصول بھی مستنبط کئے گئے تو وہ یہ ہیں (۱) شرک و نفاق (۲) بے عملی و بدعملی (۳) باطل پرستی اور خود فریبی اور (۴) بے ثباتی و خود غرضی۔
یہ چار اسباب ایسے ہیں جو زوال کو لاتے ہیں۔

## شرک و نفاق کی حقیقت

سب سے پہلے صحیح طور پر شرک و نفاق کو سمجھنا ہوگا۔ شرک کا مطلب یہ ہے اللہ کی ذات و صفات اور افعال میں کسی کو شریک کرنا۔
ایک آیت پاک میں بڑے بلیغ انداز میں شرک کو ظلم عظیم فرمایا ہے۔ یعنی منعم کو اس شخص کے ساتھ برابر قرار دینا جو نعمت دینے کی قابلیت نہیں رکھتا بڑا ظلم ہے۔ ظلم کے معنی کسی چیز کو اسکے مخصوص مقام کے علاوہ کسی دوسری جگہ رکھ دینا ہے۔ شرک بڑا گناہ ہے اسلئے بڑا ظلم ہے۔
لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۖ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمٰن ۳۱)
اللہ کو کسی کا ساجھی مت قرار دینا۔ شرک بڑا ظلم ہے۔
شرک کا اصل تعلق عقیدے سے ہوا کرتا ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے جب عقیدے میں ہی تزلزل پیدا ہو جاتا ہے تو وہ کمزور پڑ جاتا ہے پھر زندگی کی کوئی کل درست نہیں رہتی۔
اجتماعیت جن بنیادوں پر قائم ہے یہ ثابت ہے کہ عقائد کی حیثیت ستون کی ہے اور قومی و اجتماعی زندگی کو اصل خطرہ اصول عقائد کے عدم اذعان ہی سے پیدا ہوتا ہے اس لحاظ سے شرک کا اثر زندگی کے تمام گوشوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ اور اسکے پورے نظام کو آخر الامر درہم برہم کر دیتا ہے۔
نفاق کے معنی دورخاپن کے ہیں۔ اسلام میں منافق وہ ہوتا ہے جو زبان و عمل سے بظاہر مسلمان تو ہو مگر دل سے خلاف عقیدے کو رکھنے والا ہو عربی میں۔ نَافِقَاء اور نُفَقَاء گوہ کا وہ بھٹ ہے جسکے کم از کم دو منہ ہوں ایک داخلے

# "پتھروں کا شہر" میری نظر میں

پروفیسر ڈاکٹر سید مجاہد حسین حسینی
(بمبئی)

بعض لوگ "حیرتِ زدگی" کو نابالغی ذہن کا نتیجہ سمجھتے ہیں
لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ حیرت زدگی ...... حصولِ علم
کی طرف بڑھتا ہوا ایک قدم بھی ہے۔ اظہارِ حیرت اس بات کی
علامت ہے کہ ہم پر کسی انجانی چیز کا انکشاف ہوا ہے اور یہ انکشاف
ہمارے جذبۂ شوق کے لئے تازیانہ ہے۔ اب یہ ہمارے شوق کی شدت
اور توفیقِ الٰہی پر منحصر ہے کہ ہم اس حیرت کی کنجی سے کس طرح علم کے
خزانوں کو کھولتے اور اپنے دامنِ مراد کو بھر لیتے ہیں۔

جناب علی عباس امید کی طویل نظم "پتھروں کا شہر" کے
مطالعے سے میرے دل و دماغ پر "حیرت زدگی" کا عمل ہوا کیونکہ اس
نظم میں بعض خصوصیات بے پناہ تشویق و استعجاب پیدا کرنے والی
موجود ہیں۔ شاعر کا نام میرے لئے نیا نہیں ہے۔ ان کا کلام عرصہ سے
ملک کے ممتاز اخبار اور مقتدر رسائل میں پڑھتا چلا آیا ہوں
یوں تو دوسرے شعراء کا کلام بھی نگاہوں سے گزرتا رہتا ہے اور
بعض اشعار کسی فنی خصوصیت کی بنا پر حافظے میں محفوظ بھی
ہو جاتے ہیں لیکن امید صاحب کا کلام پڑھ کر ایک بالکل انوکھا
تجربہ ہوا۔ ہر مرتبہ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ابھی ابھی مجھ سے
مل کر گئے ہوں۔

ممکن ہے آپ اسے محض مبالغہ سمجھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ
امید صاحب کی تازہ طویل نظم پتھروں کا شہر پڑھ کر میں آئینے کی
طرح حیرت زدہ ہو گیا کیونکہ جوں ہی نظم کی آخری سطر تک پہونچا
مجھے ایسا لگا گویا امید صاحب اپنے ساتھ مجھے بھی بھوپال لے جا
رہے ہوں ...... وہی بھوپال جو اس خوبصورت استعاراتی
شاہکار کا مرکزِ تخیل ہے۔ شہروں کو موضوعِ شعر بنانا کوئی نئی
بات نہیں۔ شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی کی نظم
تذکرۂ دہلی مرحوم، علامہ اقبال کی نظمیں "بلادِ اسلامیہ" اور مسجد
قرطبہ وغیرہ، لسان القوم مولانا صفی لکھنوی کی طویل نظم تختِ جگر
اور حضرت الاکرام کی مشہور نظم کلکتہ ایک رباب اس سلسلہ کی چند
نمایاں مثالیں ہیں۔ اربابِ علم واقف ہیں کہ ان میں ہر ایک
منفرد نقطۂ نظر اور اندازِ بیان کی مالک ہے۔ پتھروں کا شہر بھی
اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو اپنا جداگانہ رنگ رکھتی ہے

نظم پر اظہارِ خیال کرنے سے پہلے ایک امر کی وضاحت ضروری
ہے وہ یہ کہ راقم کو کبھی شہر بھوپال کی زیارت نصیب نہ ہوئی
اگرچہ بمبئی سے دہلی یا لکھنؤ جاتے وقت کئی بار بھوپال اسٹیشن
سے گذرا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس شہر میں میرے بہت سے بزرگ
احباب اور اعزہ مقیم تھے۔ حضرت کوثر چاند پوری، ڈاکٹر گیان
چند جین، جناب نادم سیتا پوری، پرنسپل ابراہیم یوسف، ڈاکٹر ابو محمد
سحر، پروفیسر عبد القوی دسنوی، ڈاکٹر مظفر حنفی، ڈاکٹر اخلاق اثر
وغیرہم کی وساطت سے بھوپال میرے لئے کوئی غیر نہیں رہا۔ مرزا غالب
علامہ اقبال، سر راس مسعود، ملا رموزی، علامہ محوی صدیقی، جاں
نثار اختر اور صفیہ اختر کی وجہ سے بہت سے اردو پرستوں کی طرح
یہ شہر میرے لئے بھی قبلۂ دل اور قبلۂ ادب رہا ہے۔ اس شہر سے
ایک قلبی ربط اور روحانی تعلق ہمیشہ سے محسوس کرتا چلا آیا ہوں
پھر بھی مجھے اعتراف ہے کہ جناب علی عباس امید کی اس نظم نے
بھوپال سے میرا بھرپور تعارف کرایا ہے۔ بے شک سید حسین
عباس عابدی کے الفاظ میں یہ تعارف ایک شاعر کی زبان سے
ہے کسی مورخ یا ٹورسٹ گائڈ کی زبان سے نہیں ہے دوسرے

لفظوں میں یہ کہیے کہ امید صاحب مجھے بھوپال کی روح سے ملوایا ہے اور یہ کارنامہ کسی مورخ یا ٹورسٹ گائڈ کے کارناموں سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

اس نظم سے پہلے بھی ڈاکٹر اثر کے تحریر کردہ تفصیلی تعارف نے شاعر کے آب و رنگ زندگی کو کافی نمایاں کیا ہے اور اس آب و رنگ کی پہچان تبصرہ نگار کے لئے بڑی حد تک معاونت کرے گی۔ موصوف راوی ہیں کہ امید صاحب علی گڈھ یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے بھوپال کو محض شہر نگاراں یا دیار ادیباں کی حیثیت سے نہیں دیکھا بلکہ ان کی نظر میں اس شہر کا معاشی پس منظر بھی ہوگا۔ سماجی علوم کا مطالعہ انسان کو فطری وسیع النظر اور حقیقت پسند بنا دیتا ہے اور علی عباس امید صاحب کی وسعت نظر کا اعتراف پروفیسر احتشام حسین مرحوم جیسے بالغ نظر ناقد نے بھی کیا تھا۔

"علی عباس امید اردو کے نوجوان ادیب اور شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کی نگاہ سماجی علوم کے مطالعہ کی وجہ سے وسعت رکھتی ہے"

امید صاحب نے اپنی نظم "پتھروں کا شہر" کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) گذشتہ (۲) امروز (۳) فردا...... گذشتہ کا انتساب اختر نقوی کے نام ہے۔ امروز کو حسین کے نام معنون کیا گیا ہے اور فردا کا حق المبہ زہرا سے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تینوں ہستیاں امید صاحب کی تاریخ حیات کے تین ابواب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان ناموں سے شاعر کا روحانی و جذباتی رشتہ کیا ہے یہ تو شاعر ہی سے پوچھا جا سکتا ہے لیکن ان ناموں کے ساتھ بالترتیب یہ ذیل مصرعے بھی قاری کو چونکانے کے لئے کافی ہیں۔

(۱) آنکھ میں گرد ہے یادوں کی دھواں چھایا ہے!

(۲) ہاتھ میں دامن حسرت ہے اور دریدہ وہ بھی!

(۳) ہوش ہے راہ گذر کا نہ پتہ منزل کا؛

اگر ہم غور کریں تو بحیثیت مجموعی ان تینوں مصرعوں کا موڈ "غم انگیز" ہی ہے۔ ان میں ماضی کی خوشگوار یادیں، حال کی بدحالیاں اور مستقبل کی تشکیک گھلی ملی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شدت احساس کا مالک شاعر زندگی کے قلزم خوں کا تماشائی نہیں بلکہ شناور رہ چکا ہے۔ ہر بھولے بھالے نیک نفس انسان کی طرح اس نے دنیا کو خوشیوں کے پھول بانٹے اور اس خدمت کے صلے میں کانٹے پائے لیکن اس کے باوجود شاعر زندہ رہا زندگی کو برتتا رہا اور دنیا والوں کو پھول ہی بانٹتا رہا۔

ہر دو چنیں زندگانی کند
جفا بیند و مہربانی کند

اب آئیے پتھروں کے شہروں کی سیر کریں۔ اس شہر کی سنگینی سے شاعر کو کتنے زخم ملے اور ان زخموں کی نوعیت کیا تھی یہ تفصیل آپ کو شاعر خود بتا سکے گا یا اس کے آس پاس رہنے والے لوگ یا پھر اس کا سوانح نگار، لیکن نظم کے مصرعے اور جذبہ، استعارات اور تراکیب کے پردے میں شاعر کی نفسیات کا جس طرح تجزیہ کرتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پتھروں کے اس شہر کا ماضی کافی درخشاں، مسرت افزا اور امید افروز تھا۔ موصوف نے پتھروں کے اس شہر کی نرمی کو گذرے ہوئے دور میں محسوس کیا ہے۔

موم دل سنگ پہ ابھرا ہوا یہ شہر قدیم
اس کی صنعت کی سند دیتے ہیں ہاتھ عظیم
دلکشی صبح ازل کی جو سمٹ کر بکھری
آکے اس دشت کی پھیلی ہوئی باہوں میں تھی

صاعقہ دست وہ لمحات حریف ظلمات
کوہ تک پہنچے تو وہ نور ہوا طور بنا

نرمی اور گداختگی کا یہ احساس شاعر کے احساس جمال کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ و افسانہ، تخیل و افسوں، شعریت و فنکاری نہایت حکیمانہ تناسب و توازن کے ساتھ جو تے اظہار کی شکل

اختیار کر کے نظم کو آگے بڑھاتے ہیں۔

نور جب بہنے لگا آبِ رواں کی صورت

سینۂ سنگ پہ سبزے نے سبک پاؤں دھرے

نخلِ موہوم میں امکان کی شاخیں پھوٹیں

اور پھر چار طرف زیست کے غنچے مہکے

نظم کا یہ ابتدائی حصہ شاعر کے رجائی خیالات اور رجائیہ جذبات کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے تابناک رخ کو اپنی نگاہوں میں سمو کر ہمیشہ زندہ رہنے، خوشی اور ابدی کامرانی کے جگمگاتے خواب دیکھنے کے لئے تیار ہے۔ اس کے یہاں بے حوصلگی کا نام و نشان نہیں قنوطیت کا ہلکا سا شائبہ نہیں۔ ہر طرف شادمانی ہے..... ہر سمت نوجوانی ہے..... کیف و سرمستی ہے سرور و انبساط ہے..... لیکن ..........

لیکن زمانہ حال نے شاعر کے خوابوں کے تاج محل ڈھا دینے کی قسم کھا لی...... مایوسی کے بادل چاروں طرف سے گھر آئے۔ حادثوں کی بارش ہونے لگی ..... شیشۂ دل پر واقعات و سانحات نے زبردست پتھراؤ شروع کر دیا۔

...... اور پھر فاصلوں کے پھیلتے صحراؤں میں

صاعقہ دست بڑھا

صاف و شفاف سا اک شعلہ اٹھا

آنکھیں پھیلنے لگیں، دل لرزا، جگر کانپ گیا

روح پر زخم لگا، درد اٹھا

ہر بلا کی کوشش بسیار پہ بھی شہر طرب پھنک رہا!

شہر کی چیخ میں تھا کرب ...

کیا ہوتا!

بے بسی کو بھی ملا ہے کہیں زخموں کا صلہ؟

بن گئی شہر کی وہ چیخ بھی گنبد کی صدا

اور ایسے خول، جن کا آغاز کا انجام ... کر اور کیا

ہو سکتا تھا کہ.........

مردِ دلِ سنگ کے اس شہر کی تہذیب و تمدن کی بہار

سبزۂ کیف..... جسے کہئے غرورِ کہسار

حسن فطرت کی پھبن

لمحوں کی عشرت کا خمار

آج دیرینہ روایت کے سوا کچھ بھی نہیں!

کسی بوسیدہ حکایت کے سوا کچھ بھی نہیں!!

کچھ بھی نہیں!!!

نظم کا تیسرا حصہ جس کا عنوان "فردا" ہے۔ کمیت کے لحاظ سے محض چند الفاظ پر مشتمل ہے لیکن کیفیت کے اعتبار سے معانی کا ایک سمندر ہے۔ اس میں لطایات کی کہانی بھی ہے بغاوت کے تیور بھی، حزن و یاس کی کسک بھی محتسب وقت کی شکایت بھی اور اندیشوں کا طوفان بھی، نظم کا اختتام یوں ہوتا ہے۔

ایک

اک

لمحہ بدلتے ہوئے اس شہر میں اے تشنہ لبی!

کون

کہہ

سکتا ہے کل محتسب وقت کا منشا کیا ہو!!

مختصر یہ کہ اپنی ہیئت، نشتریت، سوز و گداز، وحدت تاثر، رمزیت و ایمائیت اور استعاراتی انداز بیان کے باعث جناب علی عباس امید کی طویل نظم "پتھروں کا شہر" فن کا ایک اچھوتا نمونہ ہے۔

معین سریس والا ۔ (احمد آباد)

# غالبؔ کی دلّی

(۱) غالب گو پیدا آگرہ میں ہوئے تھے۔ مگر جب ہوش کی آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو دہلی میں پایا۔ اور دہلی ایسی بھائی کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ کبھی اپنا مکان بسایا نہیں صرف کرائے کے مکانوں پر اکتفا کیا مگر علاقہ بدلا نہیں آخری مکان قاسم جان کی گلی متصل مسجد تھا جس کی نسبت وہ کہتے ہیں ؎

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنالیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

یہ عہد مغلیہ کا وہ دور تھا کہ خاندان تیموریہ کا تابناک چراغ بھور کے دیئے کی طرح زندگی کی آخری ہچکیوں کے مانند ٹمٹما رہا تھا۔ اور کبھی بھی بجھا چاہتا تھا۔

دلی کی حکومت جو کبھی حکومت شاہ عالم از دلی تا پالم کی مصداق تھی حوادث زمانہ کی شکار ہو کر اور بھی سمٹ کر لال حویلی کی چہار دیواری تک ہی محدود ہو گئی تھی انگریز خاندان مغلیہ کے اعصاب پر آہستہ آہستہ سرطان کی طرح چھا رہے تھے اور وقت کی صدائے بازگشت "خلقت خدا کی ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کی تھی یوں لکھتے ہیں "شہر کا حال میں کیا جانو کیا ہے لون ردی ٹا کوئی چیز ہے وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے اناج اور آٹے کے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس پہ محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے ارد گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی دار البقا فنا ہو جائے گا رہے نام اللہ کا خان چند کا کوچہ شاہ بولا کے بڑ حد تک ڈھئے گا دونوں طرف سے پھاوڑہ چل رہا ہے باقی خیر و عافیت ہے حاکم اکبر کی آمد آمد سن رہے ہیں دیکھئے دلی آئیں یا نہیں آئیں تو دربار کریں یا نہیں۔ دربار کریں تو میں گنہگار بلایا جاؤں یا نہیں۔ بلا جاؤں تو خلعت پاؤں یا نہیں پنشن کا نہ ذکر ہے نہ کسی کی خبر ہے

اس زمانہ کی دلی کا یہ عالم تھا کہ سلطنت کو گھن لگ چکا تھا مگر دلی والے زندگی کی نشاط میں ڈوبے ہوئے اپنے اوپر اک گونہ بیخودی طاری کئے ہوئے زندگی کے رس کا آخری قطرہ نچوڑنے میں لگے ہوئے تھے۔ کیا شاہ کیا گدا کیا عوام کیا خواص۔ سبھی رنگ رلیوں کی ریت میں شتر مرغ کی طرح اپنی گردن دبائے ہوئے آنے والی کل سے بے خبر تھے

دلی والوں نے اسے خود فراموشی کا بہانہ بنالیا تھا یہاں آٹھ دن تو میلے تھے روز نت اک نیا تہوار منایا جاتا عیش و عشرت کی ہر نئی سنت ترو تازہ مذہبی رسوم۔ موسمی تہوار اور شادی و غمی کو تقریبات کا بہانہ بنالیا۔ رمضان عید۔ شب برات۔ محرم۔ آخری چہار شنبہ۔ بارہ وفات گیارہویں شریف۔ خواجہ کی چھٹی۔ رجب کے کونڈے

بسنت ۔ دسہرہ ۔ دیوالی ۔ ہولی ۔ پنکھوں کا میلا ۔ پھول والوں کی سیر ۔ سب زور و شور سے منائے جاتے

دلی والوں پہ لاکھ قہر ٹوٹ پڑے مگر نہ اخلاق بدلے نہ تو اضعداری ۔ نہ مہمان نوازی ۔ صاحب خانہ بڑی تعظیم و تکریم سے مہمان کو دیوان خانہ میں لے جاتا اور مہمان کو عطر گلاب ۔ پھلوں کی قاب اور خشک میوے کی پلیٹ رکھتا بعد ازاں پان کلوریاں یا پیچ الائچی پیش کی جاتی

اس زمانہ میں رکھ رکھاؤ اور خاندانی عزت کا بڑا خیال رکھا جاتا ۔ لوگ عہد کے پکے اور قول کے دھنی ہوتے تھے جو کہہ دیا اور جو وضع اختیار کر لی اسے مرتے دم تک نبھایا ۔ جرم پیشہ لوگ بھی اپنے اصول اور ضابطہ کے ماتحت تھے ۔

عوام و خواص کے مشاغل کسرت اور کھیل تماشے تھے ۔ کیا پنجہ کشی ۔ کیا پتنگ بازی ۔ کیا مرغ بازی ۔ کیا شطرنج ۔ کیا چوسر ۔ یہی اک دولت تھی اور یہی اک طرز زندگی تھا جسے کسی بھی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہ تھے بلکہ یہ دوران تمام فنون کے عروج کا زمانہ تھا ۔ اس زمانہ میں آدمی اپنے حسب و نسب ۔ پیشہ و شغل کے مطابق لباس پہنتے تھے درباری اور بازاری لوگ لباس سے پہچانے جاتے تھے ساتھ ساتھ عمر کا بھی لحاظ رکھا جاتا ۔ جوان وضع اور بوڑھے کی اپنی علیحدہ ۔ بانکوں کا بانکپن ۔ چھیلوں کا چھیلپن ۔ ملاؤں کی ملائی ۔ پہلوانوں کی پہلوانی ۔ شریفوں کی شرافت لباس سے بھانپ لی جاتی

اس دور میں غالب جیسی حساس طبیعت کا شخص چشم عسرت سے یہ تماشہ دیکھتا ہے اور خون کے آنسوں روتا ہے آنکھ لہو ٹپکاتا ہے ۔ غدر نے سماجی سیاسی ۔ ثقافتی اور تمدنی زندگی کا نظام درہم برہم کر دیا جسے غالب یوں بیان کرتے ہیں ۔ " نہ وہ حکام ہیں جنکو میں جانتا ہوں ۔ نہ وہ عملہ ہے جس سے میری ملاقات تھی ۔ نہ وہ عدالت کے قوانین ہیں جن کو پچاس برس میں نے دیکھا ہے ۔ اک کونے میں بیٹھا ہوا نیرنگ روزگار کا تماشہ دیکھ رہا ہوں ۔ یا حافظ یا حفیظ ورد زبان ہے "

ہندوستان کی سرزمین پر جب انگریز قابض ہوئے تو انہوں نے مہنگائی نام کا ایک بیج بویا تھا ۔ جو آج تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے ۔ جس کے ترش پھل آج تک ہم چکھ رہے ہیں ۔ غالب نے یہ کیفیت یوں بیان کی ہے "برسات بھر مینہ نہیں برسا اب تنبیہ اور کلمند کی طغیانی سے مکانات گر گئے ۔ غلہ گراں ہے ۔ رت ارزاں ہے میوہ کے مول اناج بکتا ہے ۔ ماش کی دال ۸ سیر ۔ باجرہ ۱۲ سیر گیہوں ۱۲ سیر ۔ چنا ۱۲ سیر ۔ گھی ایک سیر ۔ ترکاری مہنگی ۔ اور تو اور شراب جس سے مرزا کو خاص عشق بھی نہ تھی ۔ اور زیر آتش سیال کی ضرورت کو ٹھنڈا کرنے کے لئے کئی بار نری انگیٹھی پر گزارا کیا ہے ۔"

اکبر کو اپنے نورتنوں پر ناز تھا ۔ غالب کو سرور یہ تھا کہ مولوی امام بخش صہبائی ۔ میاں نصیر الدین کالے صاحب منشی صدرالدین آزردہ ۔ شیفتہ ۔ مومن اور ذوق وغیرہ کی صحبتیں میسر آئیں ۔ مگر ہائے ستم ظریفی زمانہ وقت کا سیلاب سب کچھ بہا کر لے گیا

جہاں دنیا امڈی پڑی تھی اور چلنے کو راستہ نہ ملتا تھا اب وہاں ہو کا میدان ہو گیا ۔ نہ قلعہ نہ شہر ۔ نہ بازار نہ نہر ۔ دلی کا نام و نشان مٹ گیا ۔ غدر کے بعد بارہ برس تک اس اجڑے دیار کی ایک ایک اینٹ کو حسرت سے دیکھتے رہیں مرے ہوؤں کا ماتم کیا ۔ بچھڑے ہوؤں کو رو لے اپنے مرنے کی آپ دعائیں مانگی اور آخر میں منہ میں زبان رکھنے والے عجب آزاد مرد نے محرومی قسمت سے یوں لب کشائی کی

" آدمیاں سید زادہ ۔ آزاد دلی کے عاشق دلدادہ ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے حسد

بقیہ ص ۵ پر

مناابن فیضی (مئونانہ)

# غزل

انھیں لفظوں کے حد میں رہنا
مینو! اپنی ہی حد میں رہنا

اب وہی جانے میں شیشہ ہوں کہ سنگ
بس مجھے تیشوں کی زد میں رہنا

نہ ہوا میرے انا کو منظور
یوں حصار اب وجد میں رہنا

کون اٹھاتا ہے یہاں کس کی صلیب
آپ ہی اپنی مدد میں رہنا

وجہ تہمت ہے یہ نیکی کا لباس
مطمئن خرقۂ بد میں رہنا

کہیں سلجھے ہیں نفس کے رشتے
روز ہی اس رد و کد میں رہنا

کام میرا ہے صفر کی صورت
فکر توسیع عدد میں رہنا

ان قیود اور حجابوں سے نکل
کیا ازل اور ابد میں رہنا

ہوں یہاں خود ہی میں اپنا محمود
چھوڑ تو میرے حسد میں رہنا

ہر شجر دھوپ کا خیمہ ہے یہاں
اپنے ہی سایۂ قد میں رہنا

بے ہنر دانش ہوں، غنیمت ہے فنا
کیف اربابِ مسند میں رہنا

---

آخر کیوں میرے جی کو جنجال پڑا ہے شبدوں کا
زار و خستہ شہزادہ بے حال پڑا ہے شبدوں کا

جانے یہ تیری خاموشی محرم ہے کن سوچوں کی
کیوں تیرے احساس نگر میں کال پڑا ہے شبدوں کا

اُس کے دل کی ٹھیس بنی ہے جانے میری کونسی بات
چاہت کے نازک شیشے میں بال پڑا ہے شبدوں کا

بازارِ تنقید میں لے آتے ہیں جب بھی جی چاہے
نقادوں کے گوداموں میں مال پڑا ہے شبدوں کا

کتنے ہی ارتھوں سے یہ بھی دلگیر و وابستہ ہیں
کرشنا موہن ان کے اوپر جال پڑا ہے شبدوں کا

---

ظہیر غازی پوری

# تجرباتی آزاد غزل

ن سے گذرو تو آنگن آئے گا
شنی کا ایک مسکن آئے گا

ا ادا سارت کا الزام مجھ کو دیں مگر
ے ہ تو آپ کا بھی احترامن آئے گا

ڈر کی ہر راہ میں
قتل فن آئے گا

دھوپ اڑ جائے گی ہر دہلیز سے
آنکھیں برسیں گی تو ساون آئے گا

آج پھر چھپر پہ بیٹھا کاگا کہہ گیا
سال گزرا چٹھیاں اب دن کی ساجن آئے گا

سوچتا ہوں خود کو پہچانوں گا کب
سامنے جب میرے درپن آئے گا

عقل کو بن باس دی جائے گی جب زندگی
توڑ کر ہر حد فاصل، نرد زر راون آئے گا

---

ایم آر قاسمی (علیگڑھ)

# غزل

غروب ہو یہ اندھیرا کوئی کرن چمکے
سواد شام مٹے روشنی کا بن چمکے

ہوں تیری ایک جھلک پر نثار سو سورج
سیاہ لباس میں جب بھی ترا بدن چمکے

سجائیں محفلیں باہر کی اب کہو ان سے
وہ جن کو اپنے ہی اندر اک انجمن چمکے

سیاہ شب کے مقابل دلوں کی فوج اتار
پھر ایک جنگ ہو جاری دلوں کا رن چمکے

مہک ہو تیرے بدن کی ہمارے شعروں میں
ترے جمال کی ضو سے ہمارا فن چمکے

انہی کے دم سے مزہ شعر خوانیوں کا تھا
اگر وہ آئے تو پھر محفل سخن چمکے

---

سلیم اختر ندیم (پاکستان)

# غزل

بھیگے موسم کی صداؤں تک ہے
شور پتوں کا ہواؤں تک ہے

تیرے بعد اس کی حقیقت کیا ہے
آئینہ تیری اداؤں تک ہے

کہکشاں دیکھ کے یوں مجھ کو لگا
راستہ یار کے گاؤں تک ہے

ہم اسی زلف کے پیاسے ہیں ابھی
سلسلہ جس کا گھٹاؤں تک ہے

میرا مہتاب رگ جاں سے قریب
چاند محدود خلاؤں تک ہے

دشت ہستی کے مسافر کا قیام
دو گھڑی سانس کی چھاؤں تک ہے

جتنی بت خانے کی رونق ہے ندیم
صرف پتھر کے خداؤں تک ہے

رضا ابرار (مظفرپور)

# غزل

غنچہ اٹھائیے نہ کوئی گل اٹھائیے
گلشن میں داغ حسرت بلبل اٹھائیے

دیتا ہے شوق زلف پریشاں کا واسطہ
خوش ہو کے ناز گیسوئے سنبل اٹھائیے

ارمان رہ گئے ہیں ادھورے تو کیا ہوا
ہمت کے ساتھ بار غم کل اٹھائیے

تنہا نہ اٹھ سکے گا کبھی زندگی کا بوجھ
انصاف تو یہی ہے کہ مل جل اٹھائیے

پیاسی نگاہ کو مہ کامل کی پیاس ہے
زحمت نہ ہو تو چہرے سے کاکل اٹھائیے

لطف فراق یاد کہاں اضطراب میں
اس لطف کو بہ صبر و تحمل اٹھائیے

آنکھوں میں آبرو کی نگاہ غزل ابھی ہے
رخ سے ذرا نقاب تغزل اٹھائیے

میر رشید (بڑودہ)

# غزل

تمہاری زلف نہیں تھی تو کس کا سایہ تھا
ضرور آنکھوں نے کوئی فریب کھایا تھا

بجھے بجھے سے کنول کھل گئے تھے سینے میں
کسی کا خط جو کبھی میرے نام آیا تھا

ابھی تک آندھیاں اس کا طواف کرتی ہیں
جو تیری یاد میں میں نے دیا جلایا تھا

وہ کشمکش وہ گلے وہ شکایتیں پیہم
وہ دن عجیب تھے تم پر شباب آیا تھا

جنون عشق ہاں اتنا تو کام آیا تھا
میری تباہی نے لوگوں کا گھر بچایا تھا

سکوت شب میں غزل کے لبوں پہ آئی تھی
یہ کس نے میر تمہارا خیال گایا تھا

ڈاکٹر پرمود سنہا (الہ آباد)

# لڑائی کہیں اور

ڈیل صاحب کون تھے۔ یہ نہیں جانتا نہ ہی یہ کہ اس تالاب کا نام ڈیل صاحب کے نام پر ہی کیوں اور کب رکھا گیا ہے۔ لیکن یہ سبھی جانتے ہیں کہ یہ تالاب اس شہر کی تمام حرکات و سکنات پر نظر رکھتا ہے۔ اس کے پکے گھاٹوں پر بیٹھ کر دن بھر محلے کے لوگ تاش کی بازی اور چوپڑ کھیلتے ہیں شام کو یہاں بھنگ چھنتی ہے۔ گانے کا دنگل لگتا ہے۔ اور میونسپلٹی کی کارروائیوں سے لیکر شہر کی سیاست تک بیلاگ تذکرہ ہوتا۔ لیکن تالاب پر آسمان رہتا آسمان پر اڑتے پرندہ کا سایہ اسمیں ہو بہو دکھائی دیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ صبح کنارے کے پکے مکانوں کی اونچی نیچی تصویریں اور شام دیے لالٹین اور بجلی کے قمقموں کی جھلملاتی روشنی کا حسن اس میں قید رہتا ہے۔ "چھٹ" کے دنوں میں صبح و شام اگ دینے لیئے سوپ میں پھل پھول کے اوپر ٹمٹماتی روشنی، ہوا کی لہروں پر تیرتی اتراتی تیرائی گئی۔ سرکی کی بنائی گئی۔ "کھن ہے" پردے اور گھروں میں نہانیوالوں کی بھیڑ شروع ہوتے جھک کر اس تالاب کے پانی کو چھوتی ہے۔ لیکن نہ جانے کتنے سالوں سے لوگوں کی روح کی غلاظت دھوتے دھوتے اب ڈیل صاحب کے پانی کا رنگ بھی بدلنے لگا ہے۔

آج تیراکی کا مقابلہ تھا۔ تالاب پر بڑی چہل پہل تھی منادی پہلے سے ہو چکی تھی۔ اس لئے آٹھ بجنے کے پہلے سے ہی رنگین سادے اور میلے کپڑے پہنے لوگوں کی ٹولیاں چاروں طرف سے تالاب سے دکن کی طرف مندر والے پکے گھاٹ پر اکھٹی ہونے لگیں تھیں۔

چبوترے کی سب سے نچلی سیڑھی پر ڈاکٹر ہری شنکر کھڑے تھے۔ ان کی جھنڈی ہلتے ہی تیراک لڑکے پانی میں چھپاک سے ایک ساتھ کودے اور دیکھتے ہی دیکھتے سات لڑکوں کو پیچھے چھوڑ گوپال کئی گز سب سے آگے نکل گیا۔

ادھر بچوں کی لائبریری سے سٹے مسجد کے پیچھے والے پکے گھاٹ کی سیڑھیوں کے نیچے چھاتی بھر پانی میں "پانی" کی رنگ برنگی رسی بندھی تھی۔ لوگ ہاتھ اٹھا اٹھا کر شور کر رہے تھے۔ تیرتے آر ہے تیراکوں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ گوپال اب بھی سب سے آگے تھا۔ اسکے ہاتھ پانی میں تیزی سے چل رہے تھے۔ وہ بہت تیز تیر رہا تھا۔ اسی وقت اس نے ہانپتے ہوئے ایک جھٹکے سے پالی چھودی اور چھاتی بھر پانی میں ابھی کھڑا ہوا تھا کہ کنارے کھڑی مودیائن نے کہا۔۔

۔۔۔۔۔۔"گوپال باجی مارے لس"

شیو مندر گھاٹ کے دوسری طرف والے گھاٹ پر بھی بڑی بھیڑ تھی۔ تیراکی کا مقابلہ دیکھنے کیلئے رنگا بابو للن جی نصرت حسین سے لیکر مہاویر مندر کے پجاری جی، تھانہ ڈیل صاحب کے سپاہی، آس پاس رہنے والے کنجڑے اور چھوٹے بڑے لڑکے لڑکیوں کا بڑا پر جوش ہجوم تھا۔ لیکن بھیڑ میں سے کسی کا دھیان مودیائن کیطرف نہیں گیا۔ مودیائن تقاضہ سے لوٹتے وقت بھیڑ دیکھ کر وہاں تھوڑی دیر کیلئے یونہی رک گئی تھی۔ مودیائن نے اپنے اوبڑ کھابڑ پائریا زدہ دانتوں کے بیچ سے تھوکا اور کترا کر اپنی دوکان کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

اس علاقہ میں مودیائن کی دوکان "مہالکشمی آیوید بھون" کے سائن بورڈ کے ٹھیک نیچے تھی۔ جس پر گاؤں سے کچہری مقدمہ لڑنے آئے ہوئے لوگ ستو کھانے چلے آتے تھے۔ گوبر سے لپٹی ہوئی دوکان میں دیوار سے سندُر چھوا مانجھ کر چمکاتے ہوئے لوٹے، جگمگاتی ہوئی تھالیاں قرینہ سے سجا کر رکھی رہتی تھیں ہوٹل ان کا استعمال ہوٹل کی نازک پلیٹوں سے بھی زیادہ اپنائیت سے کرتے تھے۔

لیموں کا اچار، مہکتی ہوئی آم پودینہ کی چٹنی اور یہ لمبا مرچ جس ڈھنگ سے وہ اپنے گاہکوں کو دیتیں۔ اس سے اسکی والہانہ اپنائیت چھلکتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ ڈیل صاحب کے تالاب کے چاروں طرف اکٹھے ہونے والے رکشہ، یکہ والوں سے لیکر ایک فرلانگ دور کچہری تک مودیائن کے یہاں آنے میں ایک عجیب سا سکون اور طمانیت کا احساس کرتے تھے کیونکہ کھانے کے بعد یہاں خوش گپی کا بھی مزہ ملتا تھا۔

دوکان میں "دوری چنگیلی" میں جو چنے کا ستو، ستوئی کی پنڈلی جو بڑی حکمت سے بنائی تھی اور مچیا کے پاس تاک پر بیٹھے لکشمی گنیش کی مورت کے نیچے والے خانہ میں مرتبان میں کھٹ میٹھا چورن بھی رکھتی جس کا ذائقہ محلہ کے لڑکوں کی زبان پر چڑھ گیا تھا۔ اپنے گھر سے ٹاؤن اسکول جاتے وقت بغل میں بستہ دبائے ایک ہاتھ سے مودیائن سے پانچ پیسے کا چورن لئے گوپال دوسرے ہاتھ سے چٹکی بھر بھر اس کو اپنی زبان پر رکھ کر اس قدر چٹخارہ بھرتا کہ دوسروں کے منھ میں بھی پانی آجاتا اور وہ رال بہاتی للچائی آنکھوں سے اس کو دیکھتے۔ اس وقت اس چٹنی کے آگے اسے کن کن شاہ کی دکان کی مٹھائی پھیکی لگتی تھی،

ٹاؤن میں اپنے دوستوں کے ساتھ اسکول کے بڑے اکھاڑے کے داہنے طرف والے بیل کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر گوپال اپنے دوستوں سے شاخ کے اوپر گھونسلہ بنانے والے الو سنسکرت اور ہندی پڑھانے والے ہیڈ پنڈت جی رونیم اور موہن

سینما کے رنگین پوسٹروں کے علاوہ کبھی کبھی گپ ہانکتے ہانکتے اس بات پر بھی بحث کر بیٹھتا کہ ڈیل صاحب کے تالاب میں کس سال کس نے کتنی بڑی مچھلی ماری تھی۔ یوں مچھلی مارنے کیلئے بنسی لگائی جاتی تھی۔ آٹے کی جگہ ستو کی گولی یا چارہ کو زمین سے نکال کر کنٹیا میں ترکیب سے پھنسانا پڑتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی دھوتی لیکر بھی دو آدمی دو کونہ پکڑ کر پانی میں داخل ہوجاتے اور دھوتی پانی کے اندر بچھا اسے اٹھا کر چھت کے مانند تانتے تو پانی خود بخود گر جاتا اور چھوٹی چھوٹی مچھلیاں نکل آتیں۔ کچھ لوگ تو پانی میں گھڑا اوندھا کر بھی چڑھتے اور برچھا لیکر "بیچوں بیچ" چلے جاتے تاکہ بڑی مچھلیوں کا شکار کر سکیں۔ لیکن ایسی حکمت کرنے والے کم ہی تھے کیونکہ "جل کنبھی" کی وجہ سے انھیں پریشانی اٹھانی پڑتی تھی۔ اسمیں "بیچوں بیچ" تیرا نہیں جا سکتا اور کبھی "جل کنبھی" میں پھنسنے کی وجہ سے مچھلیاں بھی نہیں پھنستی تھیں۔ اس وقت تالاب کی صفائی کیلئے اس کے چاروں طرف کے سڑک کے کنارے کنارے رہنے والے کھیدن لال مختار، نارائن ماسٹر، ہپن سیٹھ مودیائن، پمر ٹولی، چک ٹولی، تری محلہ اور یہاں تک کہ تھانہ ڈیل صاحب کے سپاہیوں سے بھی چندہ وصول کیا جاتا۔ جو بھی چندہ نہیں دیتا تھا، اس کے دروازے پر رات میں کھلتے سے خوب موٹی موٹی گالیاں ... جاتی تھیں۔ صبح صبح بڑا شور و شرابہ ہوتا تھا۔ لیکن اکثر یہ عذاب مودیائن کے سر پر ہی زیادہ نازل ہوتا۔ کیونکہ وہ بلا کی کنجوس تھی۔ اسکی گالیوں کی بارش کا کوئی برا نہیں مانتا تھا۔ بلکہ اس کی رم جھم میں انکی روحیں کھل اٹھتی تھیں کبھی کبھار مودیائن کے خاموشی کی غلبہ کی وجہ سے دو ایک دن بعد لوگ ... خالی ... کرتے ... اس لئے گوپال اس کو چڑانے سے باز نہیں آتا تھا۔ وہ ہر ... نئی شرارت کرتا رہتا۔ جس سے مودیائن کی زبان کا تالا بھی کھلتا رہے اور لوگوں کو مزہ بھی آتا رہے۔

تالاب کے کنارے ہی گوپال کا گھر تھا۔ گوپال سے

بابوجی کچہری میں منشی تھے۔ وہ صبح ہی صبح آسمان میں سورج کے اگتے ہی اپنے بستر سے اٹھ جاتے اور " جاگیے پری رام ویدیہی "، کا اپنا پسندیدہ بھجن گنگنانے لگتے بھجن۔ دھیان ختم ہوتے ہی کھنکھار کر اس طرح زور سے آواز لگاتے کہ گوپال کے کمرہ تک ان کی دہشت بھری کھنکھار کی آواز پہونچ جاتی بابوجی اس عادت سے گوپال کو بڑی کوفت ہوتی لیکن ان سے بچنے کا کوئی چارہ نہیں تھا کبھی کبھی گوپال چادر منہ تک تان کر اور گھٹنوں سے پیٹ کے مانند اندر سمٹ جاتا لیکن اسے اس سے چھٹکارا نہیں ملتا تھا کیونکہ آہٹ نہ ملنے پر منشی جی سیڑھیاں چڑھ کر خود اوپر آکر بیٹے کی لالٹین جلا دیتے اور اور اٹھا کر نہ پڑھنے پر ڈانٹنے لگتے تھے۔ صبح صبح ڈانٹ کھانے پر گوپال کو محسوس ہوتا کہ اس کا پورا دن خراب ہو جائے گا اور اسکول میں بھی مار پڑے گی۔ اس لئے ایسا ہی ہوتا کہ منشی جی کے نیچے سے پکارنے پر وہ بول دیتا اور پھر اپنے جاگنے کے ثبوت میں پہلے سے رٹے رٹائے سبق کو بنا آنکھیں کھولے زور زور سے دہراتا تو صبح کی ٹھنڈک میں گرم بستر سے اٹھ کر لالٹین جلانے یا میز کرسی پر بیٹھ کر کتاب کھولنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور نیچے بیٹھے بابوجی بھی سمجھتے کہ وہ خوب محنت سے پڑھ رہا ہے۔

نہا دھو کر آنے کے بعد بابوجی ناشتہ نہیں کرتے تھے اس لئے انھیں شروع سے جلدی کھانے کی عادت تھی۔ کھانے کے پہلے طاق سے اٹھا کر منہ میں نقلی دانت لگا لیتے۔ پیڑھی پر پالتی مار کر کھانا زیادہ پسند کرتے تو گوپال انکو اچھا نہیں لگتا کیونکہ دال چاول اور ستو کا چوکھا پیار سے کھاتے وقت۔ ان کے اونچے جبڑے چلنے لگتے اور منہ بند رہتا۔ وہ چاروں انگلیوں سے سان کر لقمہ منہ میں ڈال کر آنکھیں بند کر لیتے تو خوب چبا چبا کر کھانے کے سبب ان کی کنپٹی کی نسیں بھی نیلی پڑ جاتی تھیں۔ اس وقت جبڑے پر پڑنے والے دباؤ کے باوجود ان کے چہرہ سے تسکین آگیں جذبہ کو آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے۔

ڈھلان کے باہر والی دالان کی چوکی پر ہر وقت چاندنی بچھی رہتی۔ منشی جی لیموں کا شربت پی کر صبح بستہ کچہری کے کام میں منہمک ہو جاتے اور مدعی یا مدعا الیہ کیطرح سے مقدمہ کی باریکیوں کی کھال ادھیڑنے لگتے۔ وکیل صاحب کو بھی سلجھی ہوئی صلاح دینے کی تیاری کرتے موٹیا کے لال کپڑوں میں بند سے بتلے موٹے بستے انکے داہنے بائیں طرف رکھے رہتے۔ جس میں " ٹیگ " سے نتھی کئے مالگذاری اور فوجداری کے کاغذات اپنی پوری داستان اور قانونی گتھیوں سمیت اس میں بند رہتے۔ ناک پر پتلی ٹوٹی کمانی جگہ دھاگا بندھا چشمہ چڑھائے پیروی کے لئے وہ ایک ایک کاغذ کو دھیان سے پڑھتے اور کیتھی میں کچھ نہ کچھ لکھتے " کیتھی " کے الفاظ کو گوپال پڑھ نہیں پاتا۔ لیکن اس کے مڈل پاس ہوتے ہی دور اندیش باپ کے مانند منشی جی اس بات پر زور دیتے رہے کہ اسکو کیتھی سیکھ لینی چاہئے کیونکہ خاندانی پیشہ میں مہارت حاصل کرنے کیلئے اسے جاننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔

منشی جی کو اپنے پیشہ کے اور کسی دوسری بات کی فکر نہیں تھی جبکہ شہر میں بڑھے داموں کے خلاف جلوس نعروں کے ذریعہ سے مہنگائی بے روزگاری، کالا بازاری کے خلاف نوجوانوں کے اتنے زبردست مظاہرے کبھی ہوئے تھے۔ حالات کے بچاؤ کیلئے پوری طرح قضا پر پانے کی کوشش ہو رہی تھی۔

لیکن منشی جی کے گھر کا ماحول دوسرا ہی تھا۔ وہ بڑے کے سخت خلاف تھے۔ اس نے گوپال کو گھر میں بڑتا کی بابت گفتگو کرنے کی ممانعت تھی۔ بوڑھے لوگوں اپنی نظروں سے اتنے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد کچھ کھو سی گئی تھی۔ لیکن گوپال کیلئے تو ساری دنیا سے دیکھنے کیلئے پڑی تھی۔

ادھر دو ایک روز سے شہر میں بڑی ہلچل تھی

تالاب پر بھی تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس چوک سے جلوس ادھر بھی سڑک ٹاؤن اسکول اور ڈبل صاحب کے تالاب کے کنارے کنارے ہوتے ہوئے آریہ سماج مندر سے مڑ کر رمنا میدان تک جائے گا۔ وہاں عوام کو صحیح سماجی اقتصادی حالات سے واقف کرانے کے لئے ایک عام میٹنگ ہونے والی تھی تو ادھر کچھ غنڈوں نے پرسکون جلوس کو منتشر کرنے کے لئے لمبے چوڑے دعوے کئے تھے۔ جس جھگڑے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اس لئے انسپکٹر آف اسکول کے حکم سے اسکولوں میں بڑی سختی کر دی گئی تھی۔ ٹاؤن اسکول کے ہیڈ ماسٹر آنند سہائے کی نوٹس کے مطابق سب لڑکے اپنی اپنی کلاس میں ساڑھے دس بجے سے ہی واپس چلے گئے تھے کوئی بھی اسکول کے احاطے سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ خالی گھنٹوں جہاں لڑکوں کی ٹولیاں گپیں مارا کرتی تھیں یا ادھر ادھر گھومتی پھرتی تھیں وہاں آج اس وقت کلاس کے باہر کوئی دکھائی نہیں پڑتا تھا۔

ہیڈ ماسٹر کے علاوہ رنبیر مولوی صاحب، آچاری جی اور ہیڈ ماسٹر بھی اس بات سے کافی گھبرائے ہوئے تھے۔ کہ جلوس میں اپنے اسکول کے لڑکے شامل ہوں کیوں کہ وہاں کے اور ماسٹروں کی نگرانی میں اس بات کی دیکھ ریکھ کی سخت ہدایت کے ساتھ پوری ذمہ داری انھیں لوگوں پر سونپی گئی تھی۔ لیکن جلوس کے آنے پر نعروں کی تیز آواز سن کر عین موقع پر اسکول بھر میں بڑی کھلبلی مچ گئی۔ پھر صلاح کر کے گوپال اور اس کے ساتھی پیشاب کرنے کے بہانے کلاس سے نکل کر پیچھے کی اونچی چہار دیواری پھلانگتے ہوئے سرپٹ بھاگ کر جلوس میں شامل ہوئے۔ اس سے ان کو بڑا مزہ آیا کیوں کہ وہاں بھیڑ تھی۔ اتنی بڑی بھیڑ تو سادن کے دلوار یا منگل کے دن ہونے والے میلے میں بھی نہیں ہوتی تھی۔

جلوس میں سب سے پہلے کلغی صافہ باندھے رسالہ کے گھوڑ سوار تھے۔ پھر خاکی جیپوں پر لدے ہوئے پولس کے سپاہی آسمان کی طرف سنگینیں تانے سورج کی روشنی میں سب کو بتا رہے تھے۔ شاید وہ اپنے اہم مسئلہ کو سلجھانے کے لئے بڑے چوکنے انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جلوس سڑک سے گزر رہا تھا۔ اس کی دونوں جانب لاٹھی لئے جوانوں کی قطار آہستہ آہستہ قدم سے قدم ملائے ہوئے جلوس کا ایک زندہ اور دھڑکتا ہوا شعلہ بن کر چل رہی تھی۔ تھوڑا پیچھے لڑکوں کا ایک قافلہ بھی تھا جن پر آگے پیچھے بھونپو نما لاؤڈ اسپیکر لگے تھے اور ان کے پیچھے ہزاروں لوگوں کی پیدل بھیڑ چل رہی تھی۔ لوگ بڑی بڑی دفتیوں پر نعرے لکھے ہوئے ان کو ہوا میں کافی جوش و خروش سے بار بار اٹھا کر لاؤڈ اسپیکر سے بولے گئے نعروں کی بلندی سے جیسے ہم آہنگ کر رہے تھے۔

ان میں زبردست جوش اور ولولہ تھا جس کو کسی طرح بھی نہیں دبایا جا سکتا تھا۔ "محنت کش کھائیگا۔ انقلاب آئے گا"

اسکول کے باہر جلوس میں پہلے تو گوپال بھیڑ میں دبکا رہا۔ لیکن تھوڑا سا آگے بڑھتے ہی اس نعرے کے گلے کی آواز تیز ہو گئی۔ اور اور وہ بڑے اطمینان سے زور زور سے نعرے لگانے لگا تھا اپنا ہاتھ دکھ جانے کے سبب اس کے والہانہ جذبہ کو دیکھ کر ایک آدمی نے اپنی نعرہ والی تختی اس کو تھما دی۔ اور اب یہ جوش میں اپنے کو زمین سے کچھ اوپر ہی سمجھنے لگا تھا۔ جیسے ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو

جلوس ٹاؤن ہال سے ڈبل صاحب کے تالاب کے کنارے کنارے دھیرے دھیرے سرکتا ہوا متھرا دیاتن کی دکان سے آریہ سماج مندر کی طرف مڑ رہا تھا کہ گوپال کی نظر متھرا دیاتن پر پڑی تو وہ ٹھٹک گیا۔ اس کا آدھا نعرہ باہر اور آدھا پیٹ میں ہی رہ گیا۔ کیوں کہ متھرا دیاتن نے گوپال کو دیکھ منہ بچکا کر ہاتھ نچا کر منہ ادھر کیا تو اس کی دکان پر کھڑے دو تین دیہاتی متوکل بھی دانت بیہودگی سے نکال کر کھی کھی کر ہنس پڑے تھے۔

جلوس کے سیلاب میں گوپال کے اسکول کے ساتھی اس سے جانے کہاں بچھڑ گئے تھے۔ لیکن اور یہ سماج کے موڑ پر اس کی ملاقات "دو منہا کل" پر رہنے والے کپل دلیناراین سے ہوئی۔ تو دونوں ہی نعرہ لگانا بھول کر آپس میں بات چیت

لگا ہے۔ گوپال چپ تھا

"تو مودیائن کو چڑھاتا اور لوگوں کو گالی دیتا ہے"

گوپال پھر بھی چپ رہا تو منشی جی نے اس خاموشی کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے کہا۔ "تو ڈھیٹھ ہوتا جا رہا ہے۔ کپل کو دھکے دیکر اپنا زعم دکھاتا ہے۔ اس کی ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ جاتی تو . . . . . ." اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی کھڑاؤں اٹھا کر اس کی پیٹ پر اس طرح زور سے دے ماری کہ چوٹ نہ سہ سکنے کے سبب گوپال گھٹنے کے بل گر پڑا۔

پھر گوپال پر کھڑاؤں کی بارش ہونے لگی۔ "ابھی سے نیتا کی دم ہوتا جا رہا ہے۔ سبق یاد ہوتا نہیں۔ جلوس نکالیں گے۔ نعرے لگائیں گے۔ بھلے اپنی صورت دیکھی ہے۔ تمھاری سات پشت میں بھی کسی نے اس طرح نیتاگری کی ہے"۔

دہشت کا سایہ اس کے سینے پر اٹکا۔ اس لئے وہ ایک دم چپ رہا۔ اور اتھاہ درد سے پستا رہا۔

ماں نے ہمت کر کے دو بار بیچ بچاؤ بھی کرنا چاہا۔ لیکن ایک زبردست جھٹکا کھا جانے کے بعد اپنی بے بسی میں وہ رونے لگی تھی۔

شور و غل سن کر مودیائن اپنی دکان چھوڑ لاٹھی ٹیکتی ہوئی وہاں پہونچی تو منشی جی کو سرزنش کرنے لگی۔

"بڑا ہتیارا ہے! ای منشی لالہ تو گوپال کی جان مار دی"

مودیائن نے منشی جی کا ہاتھ تیزی سے جھٹک دیا تھا۔

منشی مودیائن کی بات سن کر بھی کچھ نہیں بولے کہیں نہیں، کاوٹ تو تھی ہی۔ وہ غصہ میں کوئی دوسرا طریقہ نہ ڈھونڈ نکالنے کی وجہ سے چپ چاپ غسل خانہ میں چلے گئے تو جلدی اور سنج دھج کر میٹھے پر لگاتے وقت بھی گوپال کی ماں کی آنکھیں نم تھیں اور ہاتھ کانپتا رہا تھا۔

مودیائن نے ایک دو بات اور کہی لیکن منشی جی نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ منشی جی کا لحاظ بھی کیا نہیں تھا۔ مودیائن ان کے چچیرے بھائی کی رکھیل تھی۔

اپنے مالک کے اس دنیا سے اٹھ جانے پر بھی اس کی آنکھوں کا پانی سوکھا نہ تھا۔ مودیائن بھی منشی کو اپنا دیور مانتی۔ اور بوقت ضرورت بیاج پر روپیہ کا بھی انتظام کر دیتی۔

اب بھی منشی جی کو مودیائن کی ڈھیر ساری پرانی باتیں نہیں بھولی تھیں۔ باتیں یاد آتے مودیائن کی جوانی اس کے جوڑے میں لپیٹے بیلے کے ہار کے مانند مہک کر مہکنے لگتی تھی اس وقت مودیائن جوڑے پاڑ کی ساڑی پہنتی تھی۔ ناک میں "نتھ بیسر" بانہہ میں پہونچی اور چکنے چکنے پیروں میں پائزیب پہنے سامنے رکھے پن بٹے سے لگا پان کا بیڑا گال میں دبا کر دکان میں بچھا پر اس طرح بیٹھتی کہ لوگ اس کو دیکھتے ہی رہ جاتے۔ لیکن اس عمر میں بھی زبان اتنی تیز کہ کیا مجال کوئی آنکھ دبا کر اس گلی سے نکل جائے۔ صرف منشی جی ہی رشتہ کی نزاکت سے کچھ چھوٹ پا گئے تھے۔ اسی سے کچہری جاتے وقت مودیائن انھیں روزانہ اپنے ہاتھ سے ایک بیڑا پان کھلاتی۔ تب یہ بھی کچھ نہ کچھ مذاق کر لیا کرتے تھے۔ نل کا پانی جس طرح ان کو بھگوتا جا رہا تھا۔ ان کو یاد آیا۔ کہ ایک دن کچہری جاتے وقت چوکھٹ پر کھڑے کچی کچی چنگیلوں میں ستوا کے علاوہ چورا مٹر وغیرہ دیکھ آہستہ سے انھوں نے دریافت کیا تھا ——— "آخر کا کا بیچتار و بھوجی؟"

"تہرا کے چاہیں کا؟"

"جون چاہیں اور کہاں ملے گا"

"ایسن کہہ کہہ کے پچھتا مت، ہینئے آون ہنیہے" اور مودیائن کی اس وقت کی منہ بچکا کر ہاتھ مٹکانے کی ادا یاد آتے ہی منشی جی نہاتے نہاتے دیوار کی جانب کیئے ہوئے دل ہی دل میں ہنسنے لگے تھے۔ نل کی ٹونٹی کا پانی بیچ ڈھیلا ہونے کے سبب اپنی یکسانیت میں ہل ـــ ہل ـــ ہل کر گرتا ہی جا رہا تھا۔

ادھر آنگن میں سکون ہوتے ہی ماں گوپال کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے اس کو اس کے اوپر والے کمرہ میں لے گئیں اور وہ ہرا تیل لگا کر ناتے پر خوب اچھی طرح پالش کرنے لگیں تھیں منشی جی فارغ ہوئے تو اسوں سے آنگن تب بھی زور کی

زور نکالی ــــ "گوپال کی ماں ....... ارے او گوپال کی ماں" اور آواز سنتے ہی منشیائن جلدی جلدی سیڑھیاں اترنے لگیں تھیں۔

شام ڈھلنے کے ساتھ ہی ساتھ چرند کی بانگیاں بند ہونے لگی تھیں۔ پڑوس کے کتے جو ننک کر بلند آواز میں اپنی موجودگی کا احساس کرا دیتے تھے۔ گھر میں پوری طرح سکون تھا۔ منشی آنگن میں انار کے پیڑ کے نیچے کھٹیا ڈال کر چار خانہ کی لنگی باندھے ہوئے تھے۔ ماں پنکھا جھل رہی تھیں۔ وہ فکر مندی سے کچھ گفتگو کر رہے تھے۔ لیکن پوری بات صاف صاف سنائی نہیں پڑ رہی تھی۔ بات سنتے سنتے گوپال کی ماں بیچ بیچ میں اپنی آنکھیں پونچھ لیتی تھی تو اس کو محسوس ہوا کہ اسی کی باتیں ہو رہی ہیں۔

اب منشی ٹھڈی پر انگلی رکھے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے جذبات سے عاری آسمان تاک رہے تھے۔ جیسے لڑکا نہیں گائے مارنے کے بعد دل ہی دل میں بار بار پچھتا رہے ہوں۔

کئی بار ماں کے بلانے پر روز کی طرح گوپال کھانا کھانے نیچے چوکے میں نہیں گیا۔ تو ماں لالٹین جلا کر تھالی میں دال چاول اور آلو کا بھرتا اور دہی لے آئی۔ اور اپنے ہی ہاتھ سے سان کر کھلایا پلایا۔ پھر دیر تک اس کو سمجھاتی رہی کہ اچانک پچھواڑے زور کا شور و غل ہونے لگا تھا۔ تمام لوگ گھبرا کر سکتہ میں آ گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ بات کیا ہے؟ اسی وقت لاٹھی ٹیکتی ہوئی مودیائن "گوپال کی ماں' اری او گوپال کی ماں" کہتی ہوئی اندر آ گئی۔ وہ یہ اطلاع دینے کے لئے بے چین تھی۔ کہ دن کے جلوس کی وجہ سے پولس نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ اس نے سکھوا مہاجن کے گھر گودام پر ایک ساتھ چھاپہ مارا۔ اور سینکڑوں من بنسپتی، صابن کی بٹیاں اور کروسن تیل برآمد کیا مودیائن نے بتایا۔ کہ سکھوا مہاجن کے گھر سے ہی گرفتاری ہوئی۔ ہاتھ میں ہتھکڑی اور کمر میں رسہ باندھ کر پولس تھانہ لے گئی۔ تو اس کی کیا عزت آبرو رہی..... کہتے

ہوئے ہتھیلیوں سے اپنا سر پیٹتی ہوئی مودیائن بڑے پر اعتماد انداز میں آنکھیں نچا کر سب بتاتی رہی۔ تو گوپال نے کچھ نہیں کہا۔

مودیائن کو پانی دینے کیلئے ماں کے چلے جانے کے بعد گوپال چپ چاپ لیٹ گیا۔ اور سونے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ لیکن آدھی رات تک اس کو نیند نہیں آئی۔ تو وہ بے چینی کا شدت سے احساس کرنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کو کسی کے آنے کی آہٹ ملی۔

گوپال چپ چاپ سویا رہا۔ منشی جی نے دبے پاؤں سیڑھی سے چڑھ کر گوپال کے کمرے میں دیکھا۔ پھر اس سوتا سمجھ کر تیز جلتے لالٹین کی لو کو کم کر دیا تھا۔

اس کو گہری نیند میں سویا سمجھ کر وہ شفقت سے آہستہ آہستہ اس کے سر کے بال اس طرح سہلاتے رہے کہ اس کی نیند نہ کھل جائے۔ وہ اپنے کئے پر پچھتا رہے تھے اور جی اندر سے کوٹ رہا تھا۔ اسی وقت بال سہلاتے سہلاتے اچانک ان کا ہاتھ گوپال کی پیشانی سے چھو گیا۔ تو ایکدم سے چونک گئے۔ پھر انھوں نے اس کا پیٹ دیکھا۔ پیر چھوا' ہاتھ دیکھا۔ اور بارجے پر آ کر ریلنگ کے سہارے ذرا نیچے جھانک کر گھبرائے سے گوپال کی ماں کو بلانے کیلئے آواز دینے لگے تھے۔ ماں جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی آئیں۔ اور اتنے شدید بخار میں جلتے اور تپتے گوپال کو چھو کر بری طرح گھبرا گئیں۔

شدید بخار کے سبب گوپال کا دل اسی گھر کی گود میں ڈوبتا ہی جا رہا تھا۔ ڈوبتا ہی جا رہا تھا۔ اس پر غشی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ اس کو ایسا گہرا تجربہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کبھی کھلتی کبھی بند ہوتی۔ اور وہ اپنے اندر بے چینی کا تجربہ کر رہا تھا

آہستہ آہستہ گوپال کی ڈوبتی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ شعور کی دوسری سطح پر اس نے

دیکھا کہ مودیائن کی دکان بند ہے۔ وہی مودیائن جس نے چھوٹی سی دکان سے آس پاس کے گھر محلہ میں اس طرح بیوپار چلایا کہ چڑتولی چنگولی اور ڈیل صاحب کے تالاب کے آس پاس ہی نہیں بلکہ دور دور تک لوگ اس کے اسامی بن گئے تھے۔ اب کتنی کمزور اور ناتواں ہوگئی ہے

ضرورت کے وقت لوگ رات کو بھی مودیائن کا دروازہ کھٹکھٹاتے اور ان کی اوقات دیکھ کر ان کی ضرورت پوری کی جاتی لیکن اب ڈامر سے پٹے بند دکان کے دروازہ اور استی ابن بنیوں جڑے پیتل کے کیل دور سے ہی چمکتے ہیں۔ دکان کو جانے کتنے دنوں سے گوبر سے لیپا نہیں گیا ہے۔ کنڈی نیچے چوکھٹ میں لگی ہے۔ اور اس میں بڑا سا علیگڈھی تالا لگا ہے۔ جس میں محلہ کے شرارتی لڑکوں نے پانی ڈالکر زنگ لگانے کیلئے چھوڑ دیا ہے۔ پھر بھی مودیائن گالیاں نہیں دیتی۔

گوپال کی آنکھوں کے آگے اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ اس نے دیکھا کہ مودیائن طبیعت خراب رہنے لگی۔ تو پہلے اس کے اسامی متفکر ہوئے۔ پھر وہ دینداری کی بابت لاپرواہ ہوگئے۔ جس سے اس کے بیوپار کے کاروبار کو بھاری دھکا پہونچا۔ اور سود کیساتھ مل بھی ڈوبتا جا رہا ہے۔

اچانک مودیائن کا پیغام لیکر کوئی آتا ہے۔ اس نے بابو سے ملنے کیلئے پیغام بھجوایا ہے۔ کیونکہ اس کے گھر میں بیمار کی خدمت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ ماں اور بابو دونوں ہی اس کو دیکھنے جاتے ہیں۔ اور اسی شام بیمار مودیائن کو اٹھا کر اپنے گھر لے آتے ہیں

بعض مغزی مودیائن کی جگہ لاغر ایک دم پوپلے دوالی اس کی سنٹھری دیکھ کر گوپال سکتہ میں آجاتا ہے مودیائن کو دالان میں لٹا دیا جاتا ہے اس کی حالت بھی بگڑتی جاتی ہے ماں کو اس کو رفع حاجت بھی کرانی پڑتی ہے۔

سورج کے غروب ہونے کے ساتھ ہی بھاتھ تالاب پر اداسی چھاتی جا رہی ہے۔ مودیائن کی حالت لگاتار گرتی جا رہی ہے بچنے کا کوئی آسرا نہ رہا۔ تو بابو بھیا چھوانے کا انتظام کراتے ہیں۔ وہ بھیا کے ساتھ ہی پنڈت جی کو بلوا لاتے ہیں۔ باچھی چھوائی جاتی ہے سوا روپیہ کا دان ہوتا ہے ماں تالاب کے کنارے پیپل کے پیڑ کی منت مان آتی ہے۔ لیکن کچھ نہیں ہوتا ہے۔ حالت میں سدھار نہیں ہوتی۔ کف کی وجہ سے اب مودیائن کے گلے سے گھر گھر کی ڈراونی آواز آرہی ہے۔ چہرہ سفید ہوگیا ہے۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے تو اپنے ہاتھ سے ماں نے زمین کو گوبر سے لیپا۔ پھر مودیائن کو کسی طرح اتار کر چارپائی سے نیچے اتر دکھن کر کے لٹا دیا جاتا ہے بابو مودیائن کے منہ میں گنگا جل دینے لگتے ہیں۔ ماحول میں گمبھیرتا آجاتی ہے بابو مودیائن کے سرہانے بیٹھ کر رامائن کی چوپائیاں پڑھتے ہیں۔ ماں اپنی آنکھیں پونچھنے لگتی ہیں۔

اسے دیکھ گوپال نے گھبراہٹ میں مودیائن رچ..

......... چچی کہہ کر ایک زور سے چیخ ماری۔ تو پھر وہ اس تیز بخار کی بیہوشی سے کھردری سچائی کی سطح کی ایک دوسری اصلیت میں آگیا۔ اس کے احساس کی رگ رگ پر دھمک سی ہو رہی تھی۔ وہ پسینہ سے لت پت تھا۔ اس نے دیکھا۔ کہ کھیدن لال، ہری شنکر اور ماں گوپال کو امید بھری نظر دوڑاتے دیکھ رہے تھے۔ مودیائن پھول کی کٹوری سے گوپال کا پیر جھاڑ رہی ہے کمرہ میں الماری سے سٹا کر رکھی گئی میز سے کتابیں ہٹا دی گئیں۔ اور اس پر اب برف کا برتن رکھا ہے جس میں بور بور کر بخار اتارنے کے لئے اس کے سر پر برف کے پانی کی ٹھنڈی پٹی رکھی جا رہی ہے۔

گوپال سوچنے لگا کہ مودیائن تو مرگئی۔ یہ پیر کیسے جھاڑ رہی ہے؟ وہ گھور گھور اسے دیکھنے لگا۔ تو مودیائن نے گھبرا کر پیر جھاڑنا بند کر دیا اور ماں نے اس کی جگہ لے لی۔

تھوڑی دیر پیر جھاڑنے کے بعد ماں نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے کہا ـــــ "اب تک جو کچھ ہوا اس کو بھول جاؤ بیٹا۔ انعصر تو بالمھو کا پالنی ہوتا ہے۔ آتا ہے چلا جاتا

دیتی ہے گوپال اسی تال پر دوڑنے دوڑتے پسینے پسینے ہو جاتا ہے۔ ہر بار محسوس ہوتا ہے کہ وہ ڈولتا ہوا اب گرا کہ تب گرے گا۔ لیکن اسپتال کے پھاٹک پر پہونچتے ہی اس کی بیہوشی ٹوٹتی ہے۔ اور وہ اپنے کمرہ میں خود کو گم محلہ کے لوگوں سے گھرا ہوا پاتا ہے۔

گوپال نے اس بار سامنے دیکھ کر پلکیں جھپکائیں پھر سامنے کھڑے لوگوں سے دریافت کیا کہ اب ماسٹر مدن کی کیسی طبیعت ہے۔ لیکن وہ کون ماسٹر مدن؟ کیا ماسٹر مدن کہتے ہوئے ایسے مسکراتے ہیں کہ وہ کچھ پوچھ بھی نہیں پاتا۔

کمرہ میں کافی بھیڑ ہے۔ ڈاکٹر ہری شنکر کہہ رہے ہیں کہ اور کچھ نہیں۔ کسی حادثہ کا مریض کے دماغ پر بہت زبردست اثر ہوا ہے۔ اس کو ہر طرح سے آرام دیں۔ اس کی نیند میں ذرا سا بھی خلل نہ ہو۔ میں نے جو سوئی دی ہے اس سے نیند آجائے گی۔ بخار سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دو تین دن میں اپنے آپ ہی اتر جائے گا۔

ڈاکٹر بتا رہے ہیں اور بالو اپنی گھبراہٹ کے باوجود بھی چپ چاپ سنتے جا رہے ہیں۔

گوپال کی پلکیں بھاری ہو کر پھر اسی گہرے پانی میں ڈوبنے لگتی ہیں۔ جہاں دھند اور اندھیرے میں بھی لاشعور کے محسوس کرنے کی قوت ہوتی ہے۔ وہاں سے زندگی کی ٹھوس سچائی کا بھی احساس کیا جا سکتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اخبار والا گھنٹی ٹنٹناتا ہوا آتا ہے۔ اخبار دے جاتا ہے۔ وہ اخبار پڑھنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر میں نہ دیکھتے ہوئے بھی محسوس کرتا ہے کہ بالو سیڑھیاں چڑھ کر آہستہ آہستہ اوپر آتے ہیں اور آکر پاس ہی بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ ٹوٹی کمانی کے چشمہ کے بیچ سے اس کو دیکھتے رہتے ہیں۔ کمانی کی ایک طرف لپٹا کالا دھاگا گھناؤنا لگتا ہے۔

گوپال ان کی آنکھوں کی چبھن محسوس کرتا ہے۔ لیکن چپ چاپ سر جھکائے اخبار پڑھتا ہے۔ اور بالو کی باتوں کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ ایک طویل انتظار کے بعد بالو کی خاموشی ٹوٹتی ہے — "مجھے دیکھتے ہو نا، کافی تھک گیا ہوں۔ تن سے بھی من سے بھی۔"

گوپال اپنے سامنے سے اخبار ہٹا لیتا ہے، بالو کہتے ہیں: "وکالت خانہ کی سیڑھیاں چڑھتے اترتے ہوئے میں ہانپ ہانپ جاتا ہوں۔ ہر بار چوکی پر بیٹھ کر سستانا پڑتا ہے۔ اب تو تم بڑے ہو گئے ہو۔ کچھ دن دنیا کی خبر رکھا کرو۔ دن بھر میں جتنا کھٹنے پر بھی تین آدمی کا خرچ پورا نہیں ہوتا۔ تو قرض کیسے چکایا جائے۔ نہ ہو تو میرے ہی کام میں کچھ مدد کر دیا کرو۔ چار پیسہ کمانے کا دھندا سیکھو، کچھ کام بنے۔"

پھر رک کر کہتے ہیں: "چاہو تو کچھری آ تاشہ دیکھ کر دو۔ آخر دیر سویر یہ سب تمہیں کو تو سنبھالنا ہے۔ میرے نہ رہنے پر پیار کیسے کر سکو گے۔"

اتنا کہتے کہتے ان کے چشمہ کا موٹا شیشہ دھندلا جاتا ہے۔ گلا بھر آتا ہے۔ وہ یکبارگی چپ ہو جاتے ہیں اور کان سے دھاگے کی کمانی کھولنے لگتے ہیں۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ بغیر کسی جواب کا انتظار کئے یکبارگی اٹھ کر سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگتے ہیں۔

بالو کے جانے کے بعد گوپال بے چینی محسوس کرنے لگتا ہے۔ باتیں دماغ کو کریدنے لگتی ہیں۔ کہ بالو کی طرح مقابلہ کر کے اپنے داؤں پیچ سے دلالی کے پیسے ہی کھاتا رہا تو اس سے کیا ہوگا! ساری لڑائی تو کہیں اور ہے۔ اس لئے اس کو اتنا قابل رحم نہیں ہونا چاہئے۔ اور اس چاہئے کے ساتھ ہی کا پورا چہرہ بدل جاتا ہے۔

وہ دیکھتا ہے کہ اتنی سختی اور ٹکراؤ کے باوجود اس کی ایک آواز پر ہزاروں لوگ اپنے اپنے گھر سے نکل کر تالاب کے کنارے کنارے چلے آ رہے ہیں، ہجوم بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ کوئی کسی سے کچھ نہیں کہتا کچھ بھی نہیں پوچھتا کیونکہ لوگوں کے منہ پر پٹیاں ہیں۔ ان کے دونوں ہاتھ

(بقیہ صفحہ ۲۹ پر)

از ظفر ہاشمی

# ادھورا کام

کریم نے ٹٹول کر کرتے کی ایک جیب سے بیڑی اور دوسری سے ماچس نکالی لیکن بیڑی سلگانے کے لئے جب اس نے ماچس جلانی چاہی تو اسے یاد آیا کہ داہنے ہاتھ کا انگوٹھا تو اس نے کٹوا دیا ہے۔ اس نے ماں کی گالی دی۔ پتہ نہیں یہ گالی اس نے اپنی ماں کو دی تھی یا خنّا کی ماں کو جس نے ورغلا کر اس کا انگوٹھا کٹوا دیا تھا اور ریلوے سے معاوضے کے طور پر ... ہزار روپئے دلوا دئے تھے اور خود خنّا نے بیچ سے کمیشن کے تین ہزار روپئے مار دئے تھے جس میں اس کے علاوہ بیمہ کمپنی کا ڈاکٹر، مل کا بابو اور انگلی کاٹنے والا سرجن بھی شریک ہوتے تھے۔ ایک ذرا سی نگرام سے مل سے دس ہزار روپئے مل گئے تھے جسے سب نے مل کر بانٹ لیا تھا۔ باقی دو سب تو بغیر ڈکار لئے ہضم کر گئے تھے کہ ان کا معمول ہی یہی تھا مگر کریم کو انگوٹھا کھونے کا دکھ تھا ——— اس وقت اس نے نفرت سے خنّا کو یاد کیا۔

یہ سب اس کمینے گھوڑی کی اولاد کی وجہ سے ہوا۔

اسی نے اسے پھانسا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جتنا ہی دھندا کر لیتے کہنے کو تو وہ مل میں کاریگر ہے مگر اس کی کاریگری اسانجا چلات برقرار رکھنے یا اس پہ پاس کرنے میں نہیں ہے بلکہ دوسرے مزدوروں کا "ایکسیڈنٹ" کرانے میں ہے اس کے پاس جسم کے سرغنوں کے بیٹ ہیں مجھ سے کہتا تھا کہ بائیں ہاتھ کا انگوٹھا کٹوا دو، سرکاری انگوٹھا لگ پندرہ ہزار روپیے مل جائیں گے

مگر وہ تو کبھی اس کے چکر میں نہیں آیا ——— مگر آیا کیوں نہیں ابھی تو گیا تبھی تو داہنے ہاتھ کا انگوٹھا کٹوا بیٹھا۔ اب بیڑی سلگانے کیلئے دیاسلائی کو انگلیوں میں پھنسا کر جلانا پڑتا ہے ——— سور کا بچہ ——— خنّا۔

اس نے ہینگ سے ماچس جلائی اور بیڑی کے دو تین لمبے لمبے کش لے کر گزرے واقعات کو ذہن میں تازہ کرنے لگا۔ ان سات ہزار روپیوں سے اس نے اپنے گاؤں میں دو بیگھہ کھیت خریدا تھا تو سب پر رعب پڑ گیا تھا۔ کیا مولوی کیا پنڈت کیا چمار کیا چوہڑی سب ہی کھسیا کر رہ گئے تھے۔ لیکن یہ بھی تو ہوا تھا کہ کچہری میں رجسٹرار کے سامنے جب بیع نامے کے کاغذات پر دستخط کرنے کے لئے اسے قلم دی گئی تھی تو اس نے لپک کر قلم پکڑی تو تھی مگر فوراً ہی بے بس ہو کر رہ گیا جیسے بدن سے یکایک جان نکل گئی ہو اور وہ پچک گیا ہو۔ اس نے اپنے ہاتھ کی اس جگہ کو دیکھا تھا جہاں کبھی اس کا انگوٹھا ہوا کرتا تھا۔ اور جہاں اب گوشت کا چھوٹا سا لوتھڑا تھا۔ اس نے شرمندہ ہو کر قلم رجسٹرار کی میز پر رکھ دی تھی اور کہا تھا۔ مجھے لکھنا نہیں آتا میں انگوٹھا لگاؤں گا۔ اس نے اپنے سرکاری انگوٹھے کو دیکھا تھا جس کی قیمت سالا خنّا پندرہ ہزار بتاتا تھا وہ صحیح سالم تھا اسے قدرے خوشی ہوتی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے یہ سوچ کر اس کا منہ پھر لٹک گیا تھا کہ اگر داہنے ہاتھ کا انگوٹھا کٹوانے کے بجائے اس نے سرکاری انگوٹھا کٹوایا ہوتا

وہ تو پڑھا لکھا ہوتے ہوئے بھی خود کو جاہل کیوں کہتا ——
اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کاغذات پر انگوٹھا لگایا تھا۔
گھوڑی کی اولاد۔
کریم نے جما کو پھر گالی دی۔
کمینہ اب بھی نہیں چھوڑتا۔ کہتا ہے انگوٹھا کٹوا دینے
تو داہنا ہاتھ آدھے سے زیادہ بے کار ہو ہی گیا۔ اب سارا
کام تو تم بائیں ہاتھ سے کرنے لگے ہو کیوں نہ داہنا ہاتھ پورا
کٹوا دو پچاس ہزار مل جائیں گے اور اتنے روپیوں میں تم دس
بیگھہ کھیت اور خرید سکتے ہو —— مگر اس مرتبہ میں اس
کے منہ پر تھوک دونگا"
مل بند ہو جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ کریم نے پریشان
خیالات کو ذہن سے جھٹکا۔ بیڑی کے تین چار لمبے لمبے کش لیے
پھر اسے دروازے سے باہر اچھال کر کھڑا ہو گیا۔ کھولی سے نکل کر
وہ مل کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں اسے جما مل گیا۔
کیا ہے کریم۔ کیا سوچا؟ اس نے کریم کا راستہ
روک کر پوچھا کریم سٹپٹا گیا۔ اس نے جما کو دیکھا۔ اس
کے چہرے پر بڑی خبیث مسکراہٹ تھی۔ کریم کو اتنا غصہ آیا
کہ اس کا جی چاہا وہ جما کو ماں بہن کی گالی سنا دے مگر جما معمولی
گوشت پوست کا بنا ہوا تو تھا نہیں جانے کتنے ہاتھ پیر یہاں
تک کہ گردن تک کٹوا چکا تھا۔ کریم کی کیا اوقات تھی وہ
اندر ہی اندر ابال کھا کر رہ گیا —— بولا
میں ہاتھ نہ کٹواؤں گا۔ مجھے نہیں چاہئے کھیت کھلیان
سالا۔ جانے اس کے پیٹ میں گھونسہ مار دیا ——
بڑا آیا ہاتھ والا۔ ایسے ہے جیسے برس لی کا ہاتھ لیے پھر رہا
ہو۔ ایسے زندگی بھر مل کی مزدوری کرے گا۔ ہاتھ گھس گھسا
کا گھٹریاں کی پھنٹ بن جاتے گا۔ ایسا موٹا بھدا اور کھردرا
کہ جورو بھی دیکھ کر ڈرے گی۔ پچاس ہزار روپیوں سے تو
دس بیگھہ کھیت خرید کر گاؤں کا زمیندار بن سکتا ہے۔
جن کھیتوں پر تیری سات پشتیں دوسروں کے لیے
ہل چلاتی چلاتی مر کھپ گئیں وہ کھیت تیرے ہو سکتے ہیں اور
تو چودھری بن کر مینڈھا پر کھڑا ہو کر مزدوروں کو گالیاں
دے سکتا ہے۔ ایک ہاتھ دے کر ڈھیر سارے ہاتھ مل سکتے
ہیں۔ کیا سمجھے۔
کریم کے تن بدن میں آگ لگ گئی بڑی خفگی سے بولا
میں تیرے جھانسے میں نہیں آؤنگا۔ جما۔ میں گنڈا بن کر
جینا نہیں چاہتا۔ میں جھولتی آستین سے یاری نہ کرونگا۔
میں نے انگوٹھا کٹوا کر ہی بھول کی۔ اللہ نے مجھے ٹھیک ٹھاک
بنایا تھا تو نے مجھے ناقص بنا ڈالا۔
جما ہنس پڑا —— دیکھ کریم اس معاملہ میں اللہ
اور رسول کو بیچ میں نہ لا۔ یہ اپنا پرسنل معاملہ ہے۔ اچھی طرح
سوچ لے۔۔
سوچ لیا ہے ——
اتنا کہہ کر کریم بڑی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا
اور جما وہیں کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔
مل میں جیسے ہی کریم نے اپنا سانچا چلایا کسی نے پیچھے
سے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا کریم نے مڑ کر دیکھا
تو وہاں رام دین کو پایا۔ رام دین بھی اسی کھاتے میں کام
کرتا تھا مگر ادھر بہت دنوں سے غائب تھا۔ اسے دیکھتے ہی
کریم نے پوچھا —— کہاں تھا رام دین دیس گیا تھا
نہ یار"۔ رام دین بولا —— سب کچھ ٹھیک
ٹھاک ہو جانے تو جاتی ——
کیا ٹھیک ٹھاک ... کریم نے پوچھا
اس سوال پر رام دین حیرت سے کریم کا منہ تکنے لگا
تمہیں معلوم نہیں کریم بھیا؟
نہیں —— کریم نے لاعلمی ظاہر کی —— کیا ہوا کچھ بتاؤ
جواب میں رام دین نے اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھا دیا
اس کی تین انگلیاں کٹی ہوئی تھیں — کریم کی سمجھ میں ساری
بات آگئی۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی —— بولا

کر بولا ، چلتا ہے یار ، اسی وقت ساتھ والے کاریگر نے رام دین کو آواز دی اور وہ اپنے لوم کی طرف چلا گیا۔

رام دین کے جانے کے بعد کریم نے اپنے سلنڈر پر دھیان دیا۔ اس پر ساڑی چڑھی ہوئی تھی۔ جسے دیکھ کر اسے اپنی بیوی یاد آ گئی۔ دو سال ہو گئے تھے اس سے ملے ہوئے بیچاری ہر خط میں لکھتی تھی کہ منا کو تم نے نہیں دیکھا ہے میرے لئے نہ سہی اس کے لئے آ جاؤ ۔۔۔ جب سے کھیت خرید کر گئے ہو یہ بھی دیکھنے نہ آئے کہ ان کھیتوں میں کیسی لہلہاتی فصل اُگ رہی ہے ایسی کہ نظر پڑتے ہی آنکھوں کی روشنی بڑھاتی ہے۔

بیوی اور بیٹے کی یاد نے کریم کو بہت رنجیدہ کر دیا وہ پورا وقت دل میں امڈتے طوفان پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا اور جب مل کا سائرن بجا تو اس نے اپنا سانچا بند کیا اور بھاری بھاری قدم اٹھاتا مل سے باہر آیا پھاٹک سے نکل کر وہ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ اسے شبراتی مل گیا شبراتی بھی اسی مل میں کاریگر تھا۔ مگر اور وہ بہت دنوں سے وہ کریم کو ملا نہ تھا کریم نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا بڑے ٹھاٹ تھے اس کے پتلون اور شرٹ پہنے صاحب لگ رہا تھا دھوپ کے چشمے نے تو اور بھی غضب ڈھا دیا بالکل اپ ٹو ڈیٹ۔ اس بات نے کریم نے اسے حیرت اور دلچسپی سے دیکھا۔ پوچھا۔

تو شبراتی ہے !

یس ۔۔ شبراتی نے اکڑ کر کہا۔

کریم کو ہنسی آ گئی ۔۔۔۔ پوچھا ۔۔ تیرا جنم دوبارہ ہوا ہے کیا۔

شبراتی خفا ہو گیا ۔۔ بولا ۔۔ کریم لگتا ہے تیری کھوپڑی چل گئی ہے ۔۔

پھر ؟ یہ تیرا حلیہ ایکا ایک بدل کیسے گیا اور تو اتنے دنوں تک غائب کہاں رہا ۔۔۔ ؟

میں انڈر گراؤنڈ چلا گیا تھا۔

کیا مطلب ، کریم نے پوچھا ۔۔

شبراتی کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ عود کر آئی۔

اس نے بڑے اسٹائل سے چشمہ اتارا کریم نے اس کے چہرے کو دیکھا تو گھبرا کر پوچھا۔

ارے تیری ایک آنکھ کو کیا ہوا

شبراتی نے روشن آنکھ دبائی۔ حالانکہ اس کا چہرہ اس حرکت سے اور بھی بھیانک سا ہو گیا۔ مگر کریم کی سمجھ میں بات آ گئی ۔

ایکسیڈنٹ ۔۔ !

شبراتی نے گردن ہلا دی ۔۔

کتنا ملا ۔۔ ؟

ساٹھ ہزار ۔۔

ہائیں ، کریم کو جھٹکا لگا۔ کیا کیے اتنے سارے روپے۔

گاؤں میں ایک ٹریکٹر خرید لیا ہے۔ کرایہ پر دیتا ہوں ۔۔ روزانہ کی آمدنی چالیس پچاس روپئے کی ہو جاتی ہے ہرے لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا ۔۔۔ لیکن اب سیاست میں کودنے والا ہے۔ اس بار جو پرانے ساتھیوں سے ملنے چلا آیا ورنہ اپن کو اب ٹائم کی شارٹیج ہو گئی ہے۔ سیاست کے ہتھکنڈے سیکھ رہا ہوں۔ ڈکیتی قتل اغوا سارے فن سیکھ رہا ہوں ۔

اور مل کی مزدوری

اس پر تو کب کی لات مار دی۔ کلیم پاس ہوتے ہی استعفیٰ نامہ داخل کر دیا تھا ،

کریم نے شبراتی کے چہرے کو دلچسپی سے دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

ویسے تو سب ٹھیک ہے۔ مگر ایک بات ہے شبراتی تو ایک چشمہ ہو گیا۔

شبراتی نے جلدی سے چشمہ چڑھا لیا اور خفا ہوتے

ہوئے بولا ۔

دیکھ کریم مجھے چھیڑمت ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا

اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے ۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اب تیرے ایک ہی آنکھ ہے ۔ کریم بدستور مسکراتا رہا

شبراتی کے تن بدن میں آگ لگ گئی اس کا ہاتھ اٹھنے ہی والا تھا کہ وہاں جما آ ٹپکا جسے دیکھ کر شبراتی کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا وہ لپک کر جما سے جا لپٹا ۔

بڑے ٹھاٹ ہیں بیٹے ۔ جما نے شبراتی کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا ۔

ہاں ۔ استاد یہ تمہارا کرشمہ ہے ۔

سب ٹھیک ٹھاک ہے نہ

ہاں استاد ۔ میں تو الکشن لڑنے والا ہوں ۔ ۔

جما نے قہقہہ لگاتے ہوئے ایک دھپ شبراتی کی پیٹھ پر لگائی ۔ بولا لڑو ضرور لڑو اب تمہیں کون روک سکتا ہے ۔

اتنا کہہ کر جما کریم سے مخاطب ہوا ۔ دیکھ لے کریم یہ وہ شبراتی ہے جو مجھ سے مانگ کر بیڑی پیتا تھا ۔ پاؤ روٹی اور چائے پر گزارا کرتا تھا اور اب تو ہی دیکھ لے میں کیا بولوں ۔ سامنے کھڑا ہے اور الکشن لڑنے کی باتیں کر رہا ہے ۔

استاد تم کریم کو بھی ٹرک بتاؤ شبراتی نے جما کو مشورہ دیا ۔ وہ غالباً بھول گیا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کریم نے اسے ایک جسیمہ کہا تھا

یہ تو گدھا ہے ۔ جما بولا ۔ سمجھا کر سمجھا سمجھا کے ہار گیا ۔ مگر مرغے کی ایک ہی ٹانگ رہی ۔ کہتا ہے مجھے ہاتھ چاہئے پیسہ نہیں ۔ کئی بار کہا کہ پچاس ہزار روپئے تو سیٹھ بن سکتا ہے مگر اس کی سمجھ میں کوئی بات آوے جب نہ

کیوں کریم ۔ سمجھتا کیوں نہیں ، ، شبراتی نے پوچھا ۔

مگر کریم نے کوئی جواب نہ دیا ۔ خاموشی سے ہٹ گیا

راستہ میں دلبہار پان ہاوس پر بیڑی سلگانے کیلئے رکا ۔ تو وہاں اسے بیوی کا خط ملا ۔ اسی پان کی دوکان کے پتے پر وہ خط منگوایا کرتا تھا اس نے لفافہ چاک کیا اور وہیں کھڑے کھڑے خط پڑھنے لگا ۔ بیوی نے گھر بھر کی خیریت دے کر اس کی خیریت اللہ تعالیٰ سے نیک چاہ کر اور ڈھیر ساری دوسری باتیں لکھ کر آخر میں یہ اطلاع دی تھی کہ رحیم چاچا نے داماد کو اسکوٹر بھی دے دیا مگر ساتھ ہی ساتھ افسوس بھی ظاہر کیا تھا کہ بیچارے کا انگوٹھا مل میں مشین کے نیچے آ گیا تھا اور رسٹ سے کٹ گیا تھا ۔ اسی طرح جس طرح تمہارا انگوٹھا تمہاری لاپرواہی سے کٹ گیا تھا ۔

اتنا لکھنے کے بعد اس نے لکھا تھا کہ اب ہاتھ سنبھال کر کام کرنا ۔

اس رات کریم بستی میں کھانا کھانے نہیں گیا ۔ بستر پہ پڑا سوچتا رہا اسے بیوی کی یاد نے سخت پریشان کیا ۔ اسے اپنا بیٹا یاد آیا ۔ انگوٹھا دے کر خریدے ہوئے کھیت یاد آئے جس میں فصل لہلہانے لگی تھی ۔ پھر اس کے سامنے رام دین آگیا ہنستا مسکراتا ہوا ۔ رحیم چاچا آ گئے جنھوں نے داماد کو اسکوٹر تک دے ڈالا تھا اور جوار میں اپنی طوطی بلوا دی تھی ۔ شبراتی آگیا جو چشمہ چڑھا کر صاحب بن گیا تھا اور الکشن کی باتیں کرنے لگا ۔ وہ سوچنے لگا ۔

ان میں سے کوئی بھی تو اپنی حرکت پر نادم نہ تھا ۔ سبھی خوش و خرم تھے ۔ سبھی زندہ جاوید تھے ۔ سبھی گھر بار بنائے اینٹھے پھر رہے تھے ۔ تو آخر وہ کیوں اتنا حساس ہے کہ ہاتھ کٹوانے کے تصور سے ہی بھڑک جاتا ہے ۔ کیا جما کی بات میں وزن نہیں ۔

اس کے ذہن میں یہ سوال بار بار گونجنے لگا پھر جیسے جیسے رات بھیگنے لگی وہ دھیرے دھیرے پگھلنے لگا ۔ اس کا وجود بوند بوند بن کر ٹپکنے لگا اور جب مل کے سائرن نے بارہ بجنے کا اعلان کیا تو اس نے آخری کروٹ لی اور نیند کی آغوش میں

جانے سے پہلے اس نے اپنے وجود کو سمیٹا اور جھولتی آستین سے سمجھوتہ کر کے ہوگیا۔

سارا کام بڑی تیزی، خاموشی اور ہوشیاری سے ہوا۔ ڈاکٹر نے پھٹا پھٹ آپریشن کر ڈالا۔ مل کے بابو نے کاغذات تیار کر ڈالے پھر کے ڈاکٹر نے یہاں وہاں جہاں کہیں بھی دستخط کی ضرورت تھی کر دی اور اب اس بات کا انتظار تھا کہ کریم ٹھیک ہو کر اسپتال سے واپس آجائے تو معاوضے کی رقم ادا ہو۔

مگر جس دن کریم کو اسپتال سے چھٹی ملی اور وہ جھولتی آستین کے ساتھ جما کے کندھے پر اپنا بایاں ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ اسپتال کی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اسی وقت مل کا بابو دوڑا آیا اور ادھر اُدھر تاک کر بولا —

جما غضب ہوگیا۔

کیا ہوا — جما کے پیر سیڑھیوں پر چپک گئے

بابو نے پھر اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا اور جب اسے اچھی طرح اطمینان ہوگیا کہ کوئی سن نہیں رہا ہے تو سرگوشی میں بولا —

ابھی ابھی۔ سرکار کا حکم ہوا ہے کہ ایک ہاتھ کٹنے پر یک مشت رقم نہیں دی جائے گی بلکہ ہر ماہ دو سو روپئے معاوضہ کے طور پر دیئے جائیں گے — بس۔

جما نے گھبرا کر کریم کو چھوڑ دیا وہ دھڑام سے پختہ سیڑھیوں پر گر کر بے ہوش ہوگیا۔

مل کے بابو نے کریم کو نظر انداز کر دیا اور جما کے کان کے پاس اپنا منہ کر کے بولا —

لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حکم ہوا ہے کہ اگر دونوں ہاتھ کٹ جائیں تو ایک لاکھ روپئے نقد دے دیئے جائیں :

جما کا دل قابو میں آگیا اس نے بے ہوش کریم کو اپنے کندھے پر لاد لیا اور اسپتال کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا مل کے بابو سے بولا —

تو ٹھیک ہے۔ تم پرانے کاغذات پھاڑ ڈالو اور نئے کاغذات تیار کر دو میں ادھورا کام پورا کروا تا ہوں۔

(بقیہ صفحہ اور کہیں)

پاؤں پیچھے بندھے ہیں۔ چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ بھیڑ آگے بڑھتی جا رہی ہے

وردی پوش آفیسر چیخ چیخ کر کچھ اعلان کر رہا ہے جس کو سن کر سنگینیں چڑھا دی گئیں ہیں۔ اور بھیڑ کو گھیر کر سڑک کے کنارے کنارے پولس نے قواعد شروع کر دی ہے۔

تالاب سوکھتا جا رہا ہے۔ بھیڑ کی مٹھیاں کستی جا رہی ہے۔ آسمان دھندلا ہوتا جا رہا ہے۔ اور تالاب کی سیڑھیوں کو پار کر کے بھیڑ ہندوستان کے نقشہ کی شکل میں چاروں طرف پھیلنے لگی ہے

## مجھے نہیں تھا پتہ

(فضل امام ملک (پٹنہ))

سارا شہر ڈوب گیا ہے اندھیروں میں
کرتا ہے میرے دوست!
کرا جائے میں کہیں
ماروں ——
ھیروں سے پرے
ستیں دور
لے میں آنکھ مچولی کھیلوں
شاید میں غلط کہہ گیا
ے دوست.....!
تو اب اندھیرے کے عادی ہو چکے ہو
اجالے سے ڈر لگنے لگا ہے شاید
اندھیرے ......
زندگی کے سیاہ اوراق کو
لیتے ہیں اپنی سیاہی میں
کرنا میرے بھائی!
نہیں پتہ تھا کہ
کا نام لینا، یہاں اب
جرم ہے ......
اجالوں کا ذکر کرنا گناہ
کرنا میرے بھائی
تھا پتہ

## اٹھنی مجھے چرا رہی تھی

### ایک نثری نظم

(سارا شگفتہ (پاکستان))

فقر کے سکے زمیں پر گرتے ہی
ہی کشکول جتنی بڑی ہو گئی
انسان کی آنکھیں ہمیشہ کنواری رہتی ہیں
سو میرا باپ اکثر عورت چراتا
اور اپنے بچے ہار جاتا
ہماری گلک اٹھنی سے بھر چکی تھی
کر اس میں جھنکار پیدا نہیں ہوتی تھی
اٹھنی میں نے چرائی تھی
یا اٹھنی مجھے چرا رہی تھی
میں ہاتھوں سے گری ہوئی دعا ہوں
میری آنکھوں میں ہاتھوں کا دکھ جم کر رہ گیا ہے

## خواب خواب حسرت

(شفیع اللہ خاں راز اناوی (اناوہ))

زرد ہے چہرہ
سوچ رہا ہوں۔
میں ہوں
ایک البیلا شاعر
اس کا من ہے۔
نرمل کومل شیتل سندر
کورا کاغذ۔
اک دن ——
اپنے خون سے اس پر
اپنے رنگین گیت لکھوں گا
جن کی لے سے ——
جاگ اٹھے گی۔
روح میں پیار کی دیوی
لیکن
میری خشک رگوں میں
اب تک ——
اتنا خون نہیں ہے۔
زرد ہے چہرہ
سوچ رہا ہوں

اسحاق آشفتہ (پاکستان)

## قطعات

اس طرحِ میرے واسطے اب تو
خامشی گیت سے بھی بہتر ہے
جیسے عاشق کے درد کی خاطر
غم سلاجیت سے بھی بہتر ہے

---

لاکھوں اچھی ہیں صورتیں لیکن،
تجھ سی معصوم تو نہیں ہوتیں
سبھی شیریں گلو حسینائیں،
اُمِّ کلثوم تو نہیں ہوتیں

---

موم سا چہرہ آگ سی آنکھیں،
مرحلے ہیں یہ چشمِ طالب کے
آپ کا رُخ وہ شعر ہے جس میں
داغ کی سوچ لفظ غالب کے

---

غنی رتلامی (بڑودہ)

## قطعات

(۱)
مری فکر و نظر کو برتری دے
میں شاعر ہوں مجھے پیغمبری دے
مجھے آنکھیں تو دی ہیں دیکھنے کو
الٰہی اب مجھے دیدہ وری دے

(۲)
مرے افکار کو شائستگی دے
ہنر دے علم دے اور آگہی دے
پرکھنے کے لئے وحدت کے موتی
مری آنکھوں کو خوئے جوہری دے

(۳)
نگاہوں کو مری تابندگی دے
عزائم کو مرے پائندگی دے
مرے احساس کو بیدار فرما
رگِ جہد و عمل کو زندگی دے

(۴)
خود کو مرہونِ اہلِ ناز نہ کر
ذات کو طالبِ نیاز نہ کر
صبر کر، انتظار کر لیکن،
دستِ خوددار کو دراز نہ کر

(۵)
وسوسوں کو شریکِ راہ نہ کر
شوقِ منزل کو یوں تباہ نہ کر
اے مسافر قدم بڑھائے جا
پیچ و خم کی طرف نگاہ نہ کر

گلشن بڑودوی (بڑودہ)

# زاہد رفاعی

نام سید زین العابدین
تخلص زاہد رفاعی
پیدائش ۲۳ نومبر ۱۹۰۷ء
وفات ۱۳ جنوری ۱۹۷۷ء

جب آپ بڑودہ میں ڈانڈیا بازار کے اس سرے سے گزر رہے ہوں گے جہاں سے راج محل کو جانے والی سڑک شروع ہوتی ہے تو ایک بلند سبز دروازہ آپ کی نظروں کو اپنی طرف کھینچے گا۔ یہ بلند دروازہ خانقاہ رفاعیہ کا مین گیٹ ہے۔ اس خانقاہ میں خاندان رفاعیہ کے بہت سے بزرگ محو خواب راحت ہیں۔ یہاں سال بھر میں کئی چھوٹے موٹے عرس ہوتے ہیں مگر ان میں سب سے زیادہ شان و شوکت کے ساتھ حضرت سید امیرالدین رفاعی کا عرس منایا جاتا ہے۔

اس مزاروں کے جھرمٹ میں ایک مزار حضرت زاہد رفاعی کا بھی ہے۔ جس پر مولانا اختر انصاری بڑودوی کا یہ تاریخی قطعہ کندہ ہے۔

۵۰ صاحب ہر کمال ہیں محو جمال یار ہیں
۲۰۰ شاعر خوش خیال ہیں کاتب ذی وقار ہیں
۱۰۰۰ شوکت ورا کی نسل ہیں پیر ہیں زین العابدین
ت زاہد عارف آج بھی زندہ تہہ مزار ہیں
سنہ ۱۲۵ھ

حضرت زاہد خاندان رفاعیہ کے چشم و چراغ تھے۔ پچھلے سجادہ نشین حضرت سید حسام الدین مرحوم کے آپ چھوٹے بھائی تھے۔ سبھی جانتے ہیں کہ رفاعی خاندان کا سلسلہ حضرت سید احمد کبیر سے شروع ہوتا ہے گجرات میں اس سلسلے کے بزرگ احمد آباد، بڑودہ، بھروچ، سورت، پٹلاد، کھمبات، بمبئی، کراچی (پاکستان) میں رونق افروز ہیں

حضرت زاہد صاحب کی زندگی کا ہلکا سا عکس مولانا اختر انصاری کے اس قطعہ میں نظر آتا ہے۔

امیر عالم امکاں نہیں ہیں
ہیں کہ صاحب عرفاں نہیں ہیں
شہید عشق ہیں زاہد رفاعی
قتیل خنجر دوراں نہیں ہیں

جو لوگ حضرت زاہد مرحوم سے ملے ہیں۔ جو ان کی صحبت میں بیٹھے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ زاہد صاحب کس قدر خوبیوں کے مالک تھے۔

میانہ قد، چھریرا بدن، نرم آواز، ہمیشہ کافی شیروانی میں ملبوس ٹوپی سر پر، کمر با تہمد میں زیادہ رکھتے تھے۔ مطالعے کا شوق ایسا کہ اپنی ذاتی کتابوں کے علاوہ بڑودہ کی سنٹرل لائبریری، مہاراجہ صاحب کے کتب خانہ کی ہزاروں کتابیں آپ

کی نظر سے گزر چکی تھیں۔ یہ بات میں وثوق سے اس لئے
کہہ رہا ہوں کہ وہ جو کتاب پڑھتے اس کے آخری صفحہ پر
اپنا نام اور مطالعے کی تاریخ ضرور لکھ دیتے تھے۔ اکثر ان
سے لائبریری میں میری ملاقات ہو جایا کرتی۔ وہ گھنٹوں کتابوں کی
الٹ پھیر کیا کرتے۔ انہیں ہر موضوع کی کتابیں پڑھنے کا شوق
تھا۔ اور اکثر کسے۔ ایسے ان کے پاس وقت بھی ہوا کرتا تھا
شاہد صاحب نہایت نرم اور دھیمے لہجے میں گفتگو کرتے
اپنی گفتگو میں نہ درست چنے ہی الفاظ استعمال کرتے۔
طبیعت بہت بردبار تھی۔ مگر کبھی کبھی ہلکا سا شائستہ
مذاق بھی کر لیتے تھے۔ جو لطافت دیتا۔

آپ کو جس چیز کا شوق ہوتا اسے حاصل
کرکے چھوڑتے۔ کتابت کا شوق ہوا تو اس میں مہارت
حاصل کر لی۔ آپ کے دست مبارک سے لکھا ہوا کلام پاک
کا نسخہ جامع مسجد کی لائبریری میں موجود ہے جو اہل علم و ادب کی
نگاہوں کو تسکین اور روشنی پہنچاتا ہے۔ میں اور دوسرے
لوگ اکثر شہر سے نسبت نامے، شادی کے کارڈ، تاریخی
قطعات، کتبے وغیرہ لکھوانے کے لیے آپ کی خدمت
میں حاضر ہوتے۔ اس کے لئے وہ کسی سے کوئی معاوضہ نہیں
لیتے تھے۔ بلکہ اپنی جیب سے کاغذ اور سیاہی کی رقم
صرف کرتے۔

شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ میری
شاعری کے ابتدائی زمانے میں خانقاہ رفاعیہ میں عرس کے
موقع پر شاندار طرحی مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے حضرت زاہد بھی
ان مشاعروں میں شریک ہوتے۔ مگر شہر میں ہونے والے
دیگر مشاعروں میں آپ بہت کم شرکت کرتے۔ گھر میں
[illegible] کرکے بہت سے مشاعروں میں بیٹھا تاہم لوگ
ان کے مقام و مرتبہ کا خاص خیال رکھتے اور اکثر مشاعروں
کی صدارت آپ کے سپرد ہوتی۔ حضرت افسر بڑودوی مرحوم
حضرت ضیا ندوی۔ حضرت انور بڑودوی۔ حضرت مولانا عاشق

حضرت درد بڑودوی مرحوم یہ سب اساتذہ آپ کا احترام
کرتے۔ نعت اور منقبت کے ساتھ آپ غزل بھی کہتے
تھے۔

آپ نے کسی سے اپنے کلام پر اصلاح نہیں لی۔ جو
کہا خود ہی کہا اور خوب کہا۔ آپ بہت سے رسالے بھی منگوا
کرتے تھے اس طرح عصری ادب پر بھی نظر رکھتے۔ خوش
گو بھی تھے۔ اور زود گو بھی۔ مشاعرے میں بہت آہستہ
سے اپنا کلام سناتے۔ آپ کے کلام میں ہلکا پھلکا طنز کا
رنگ بھی پایا جاتا۔ اور نظامت بھی۔ محض تغزل اور قافیہ
پیمائی کی شاعری سے دور رہتے تھے آپ کے شعروں میں
محنت اور فکر ہوتی تھی۔

آپ وقت کے بیحد پابند تھے تہجد کے بعد آپ
کے حجرے کا دروازہ بھی وقت سے کھلتا اور وقت سے
بند ہوتا۔ آپ کی اولاد میں سید احمد رفاعی بڑے پابند اور
برگزیدہ بزرگ ہیں، جو آپ کے پیغام اور مشن کو آگے بڑھا
رہے ہیں۔ دوسرے صاحبزادہ سید شاہد رفاعی انجینئر
ہیں جن کی تعلیم امریکہ میں ہوئی ہے۔ فی الحال بڑودہ میں مقیم
ہیں حالیہ سجادہ نشین سید کمال الدین رفاعی آپ کے بھتیجے
ہیں۔

آپ کے کلام کے کچھ نمونے دیکھیں۔

## غزل

خزاں کے جور و ستم لالہ زار تک پہونچے
پیام کاش یہ فصل بہار تک پہونچے
شگفتہ پھول کسی نو بہار تک پہونچے
جو خشک تھے وہ ہمارے مزار تک پہونچے
ان آبلوں کا مزا پائے کوئی کیا جانے
جو رہروی میں کبھی نوک خار تک پہونچے
سنا تو ہے کہ چمن میں بہار آئی ہے
یقیں ہو جب کہ دل سوگوار تک پہونچے

یہ تیری بزم کا دستور کیا نہیں ساقی؟
کہ دورِ جام ہر اک بادہ خوار تک پہونچے
ہیں ایک ہم کہ زمیں تک کا ہم کو علم نہیں
ہیں ایک وہ کہ سرِ تابدار تک پہونچے
فریب خوردۂ عیش و نشاط ہے زاہد
مزا تو جب ہے کسی بے قرار تک پہونچے

## اشعار :-

لذت کبھی جھکی بھی کہیں نوکِ خار کی
باتیں مگر ہیں لب پہ رسن اور دار کی

محبوبِ خدا کے روضے کی جاروب کشی کرلے زاہد
یوں بھی تو خدا خوش ہوتا ہے یوں بھی تو عبادت ہوتی ہے

جب آنکھ سے آنسو گرتے ہیں ایمان مکمل ہوتا ہے
جب آہ لبوں پر آتی ہے تکمیلِ عبادت ہوتی ہے

## غزل

دل میں تجلیات کا طوفاں نہ ہو سکا
رنگینیٔ حیات کا ساماں نہ ہو سکا

جنت کی وسعتیں تو بڑی بے پناہ ہیں
ہم سے علاجِ تنگیٔ داماں نہ ہو سکا

دل میں چھپا رکھے ہیں ہزاروں طرح کے بت
کعبے کا پاسبان مسلماں نہ ہو سکا

اب تک جما نہ مصحفِ رخسار کا خیال
میں بدنصیب حافظِ قرآں نہ ہو سکا

طوفِ درِ حبیب نہ زاہد ہوا نصیب
ذرہ فدائے مہرِ درخشاں نہ ہو سکا

چنانچہ خلش صاحب بڑودہ کے ان فسادات
سے چشم پوشی نہ کر سکے جن میں بربریت برہنہ ہو کر اپنی پوری
ہیبت کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ اور جو کچھ ہو رہا تھا خود خلش
صاحب کی نظروں کے سامنے ہو رہا تھا۔ اور وہ خود بھی اس سے
متاثر ہوئے تھے۔ لیڈروں کا تو یہ ہے کہ جب طوفان گذر
جاتا ہے تو آتے ہیں فساد زدہ علاقوں کا دورہ کرتے
ہیں زبانی ہمدردی جتاتے ہیں پھر چلے جاتے ہیں اور بیوی
بچوں کے ساتھ بیٹھ کر پیٹ یا ڈنر اڑاتے ہیں۔ لیکن شاعر کا
یہ چارہ نہیں ہوتا۔ وہ نہ کھا سکتا ہے نہ ہنس سکتا ہے
اور نہ سو سکتا ہے۔ اور اگر کہیں آنکھ لگ بھی گئی تو بھیانک
واقعات آسیب بن کر ستانے لگتے ہیں۔ اس کا دل روتا ہے
اور پھر یہ آنسو نوک قلم سے قطرات خون بن کر ٹپک پڑتے ہیں
خلش کی قلم سے جو آنسو ٹپکے ہیں۔ "ایک آواز"
میں قطعات کی صورت میں جمع ہیں۔ جیسا کہ میں نے کہا۔ یہ
زیادہ تر قطعات ۱۹۶۹ء کے فسادات سے متاثر ہو کر
لکھے گئے ہیں۔ اور قومی یکجہتی کے متعلق ہیں وہی قومی
یکجہتی جس کا نعرہ اقبال نے بلند کیا تھا۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

وہی قومی یکجہتی جس کے متعلق کوئی کہتا ہے!
جسے کہنا پڑتا ہے۔

ہر چند کہ یکجہتی ہمیں نہیں ہے۔
بے شک یہ پڑھ کر مایوسی کی صورت حال ہے۔
"ایک آواز" کا شاعر قنوطی نہیں ہے۔ بلند شاعر و ادیب کو
قنوطی ہونا بھی نہ چاہیے۔ تاہم وہ کہنے پر مجبور ہیں کہ

راگ رنگ سب بند راگنی موقوف
نغمہ و شعر و شاعری موقوف
ہو گئی ہے فساد کے کارن
زندگی کی ہر خوشی موقوف

"ایک آواز" کے شاعر کی مایوسی اور قنوطیت اس
انتہا کو پہونچ گئی ہے۔ کہ وہ جمہوریت سے متنفر ہو کر راجہ
شاہی کی تمنا کرنے لگا ہے۔ کہ راجاؤں اور عالم پناہوں
کے دور میں جنتا تو بہر حال محفوظ تھی۔ شکست و فتح کی
صورت میں صرف آقا بدل گئے ہیں۔

دھرم کا ان میں نام تک بھی نہ تھا
راج ستا کی صرف پیاسی تھی
بادشاہوں کی اور راجوں کی
جتنی جنگیں تھیں سب سیاسی تھیں

شاعر اور ادیب کی تڑپ قاری کو بھی تڑپاتی
ہے۔ اس کی کسک قاری بھی محسوس کرتا ہے قاری
بھی وہی امید افزا خواب دیکھتا ہے جو شاعر اپنی شاعری
اور افسانہ نگار اپنے افسانے میں اسے دکھاتا ہے لیکن
جب خود شاعر یا ادیب رجعت پسند بن جائے۔ مایوس
ہو جائے۔ صبح کی روشنی کی امید کرنے کے بجائے رات
کے اندھیرے کو لامتناہی پیش کرے۔ تو پھر بچارے قاری
کا کیا! شاعر اور ادیب قوم کا نباض ہوتا ہے۔ درخشاں
مستقبل کا نقیب ہوتا ہے۔ اسے مایوس نہ ہونا چاہیے
خیر تو بات ہو رہی تھی "ایک آواز" کی جس کے
متعلق ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ شاعری جو ہنگامی
ہے بڑی شاعری ہے کہ نہیں جس میں آمد ہے یا آورد!
اس کا جواب نہ میں دے سکتا ہوں نہ آپ اور خود خلش
صاحب البتہ اتنا ضرور کہوں گا۔ کہ جب مستقبل کا نقاد ہمارے
آپ کے دور کی شاعری کا ذکر کرے گا۔ اور مورخ
گجرات کی تاریخ لکھے گا۔ تو اس کتاب اور اس کے شاعر کا
نام لئے بغیر آگے نہ بڑھ سکے گا۔ اور یہ بات ہی کتاب
کو اہم بنا رہی ہے۔ اور ہمارے آپ کے دور میں تو
"ایک آواز" وقت کی اہم آواز ہے کیوں کہ یہ آواز سب
کی ہے۔ پورے ہندوستان کی ہے۔

"ایک آواز" کے مسودہ پر گجرات سرکار نے مصنف کو دو ہزار روپئے کا انعام دیا ہے۔ لکھائی چھپائی خوبصورت ہے۔ البتہ قیمت زیادہ ہے۔ اسے کم ہونا چاہئے تھا۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچ سکے۔ ورنہ ایسی کتاب لکھنے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

(منظرالحق علوی)

---

منظر بہ منظر (شاعری) ڈاکٹر مدنا منظر نالپوری
صفحات ۔ ۲۰۹ ۔ سائز ڈیمائی۔۔
قیمت ۱۵ روپئے ۔
ناشر انجمن ترقی اردو ہند (کرناٹک) بنگلور
پتہ ڈاکٹر کے مدنا 655 فرسٹ اسٹیج اندرا نگر بنگلور

ڈاکٹر کے مدنا منظر پوراں سرجن ہیں ۔ ایک غیر مسلم طبیب کا اردو زبان کا شاعر ہونا کوئی اتنا عجیب نہیں لیکن، اسلامی تصوف سے شغف ہونا یقیناً بڑی بات ہے ۔ منظر کو حضور اکرم سے جو عقیدت اور آپ کی ذات گرامی سے جو والہانہ محبت ہے اس کی مثال غیر مسلم شاعروں اور ادیبوں میں خال خال ہی میں ملتی ہے ۔ اور اس عقیدت اور محبت کا، اظہار منظر نے جس خوبی اور کامیابی سے اپنی نعتوں میں کیا ہے وہ قابل تحسین ہے ۔ ملاحظہ فرمائیں ۔

جو ظاہر تھا وہ باطن تھا جو پنہاں تھا نمایاں تھا
عمل کرتا ہوا خود وحی فرماتا ہوا آیا

ایک اور شعر دیکھیں

پابند مقدر ہو کر بھی ہر چیز پہ قادر ہے انساں
مجبور کا جب یہ عالم ہے مختار کا عالم کیا ہوگا۔

منظر صرف نعت گو ہی نہیں ۔ انھوں نے شاعری کی دوسری اصناف میں بھی اپنے فن کا بڑی خوبصورتی اور چابکدستی سے مظاہرہ کیا ہے زیر نظر مجموعہ میں ۲ نعتیں، ۱۶ نظمیں ... ۴۰ غزلیں اور چند قطعات شامل ہیں ۔ جن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر منظر اپنے پیشے کی رعایت سے حساس دل رکھتے ہیں ۔ انھوں نے زمانے کی تغیرات کو دیکھا ہے جھیلا ہے اور شدت سے محسوس کیا ہے اور ان محسوسات کا اظہار اپنے مخصوص اور منفرد لب و لہجہ میں کیا ہے ۔۔ ڈاکٹر منظر کا مطالعہ وسیع ہے وہ کئی زبانوں پر دسترس رکھتے ۔ اردو کے علاوہ کنڑی، انگریزی، اور ہندی میں بھی آپ کے شعری مجموعے شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں ۔۔

منظر بہ منظر کا ٹائٹل بہت دیدہ زیب اور معنی خیز ہے ۔ کتابت، طباعت اور کاغذ گوارہ ہے ۔ موجودہ گرانی کے پیش نظر قیمت بھی کچھ زیادہ نہیں لگتی ۔۔۔!

ظفر ہاشمی

---

## اڈیٹر گلبن کو صدمۂ عظیم

بڑے رنج و غم کے ساتھ یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ اڈیٹر ثریا ہاشمی کے بہنوئی سید سعید احمد کا ۲۲ مئی ۱۹۸۳ء کو کینسر کے مہلک مرض میں کراچی میں انتقال ہو گیا ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ مرحوم اسٹیٹ لائف انشورنس آف پاکستان میں عہدہ پر فائز تھے اور پچھلے چند مہینوں سے سخت علیل تھے ۔ قارئین سے گذارش ہے کہ وہ مرحوم کی مغفرت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں

(ادارہ)

# آپ کے خطوط

## اسد رضوی مظفرپور

زیر نظر شمارہ بہت اچھے اچھے قلمکاروں سے مزین ہے۔ صبا اکرام پر ڈاکٹر وزیر آغا کا مضمون پسند آیا۔ فہمیدہ ریاض کی نظم صرف اس لئے اچھی لگی کہ فہمیدہ ریاض کی ہے۔ بڑے بڑے قلمکاروں اردو رسالوں کو نوازتے رہنے سے نو مہر تما حافظ۔ ع۔

اس سے کہئے کہ عنایت ہو عنایت کیطرح

نہیں تو ... اکاڈمی کی نعت بہت عمدہ ہے رضا حیدری شبیر رسول کی غزلیں پسند آئیں بطور خاص۔

## روشن لال روشن بنارسی (بنارس)

ماہنامہ گلبن ہم دست ہوا۔ سرورق بہت خوب ہے لیکن سرورق پر رسالہ کا نام ہونا ضروری ہے۔ کتابت و طباعت ہی عمدہ ہے ۵۶ صفحات کے اس چھوٹے سے جریدے میں بہت کچھ ہے جو عام طور پر اردو کے ایسے ایسے جریدوں میں نہیں پایا جاتا۔ نظمیں افسانے غزلیں مضامین طنزیہ و مزاحیہ اور خصوصی مطالعہ یادرفتگاں بہت اچھے کالم ہیں انھیں جاری رکھیں۔ ایک دو غزلوں کو چھوڑ کر باقی مواد بہت ہی عمدہ ہے صبا اکرام صاحب جناب مناظر عاشق صاحب ہرگانوی کی نظم اور محترم المقام وزیر آغا صاحب کا مضمون عمدہ ہے۔ صبا اکرام صاحب کی نظم اور غزلیں معیاری اور خوبصورت ہیں۔ محترمہ فہمیدہ ریاض کی نظم "ایک مسکراہٹ کا قتل" بہت اچھی لگی۔ کرشن موہن، ظہیر غازی پوری، امداد آکاش، رشید عماد ارشد رضا کی نظمیں بھی عمدہ ہیں۔ افسانوی حصہ بھی قابل قدر ہے خاص طور پر "نوحہ گر" اور ... یوسف غزلوں میں عتیق احمد عتیق مظفر ہاشمی شبیر رسول نذیر فتح پوری وغیرہ کامیاب ہیں۔ ہاں محمود راہی صاحب کی غزل میری سمجھ سے بالاتر ہے کلام سے لگتا ہے کہ نوخیز ہیں ان کا کوئی بھی شعر مجھے پسند نہ آسکا۔ انکو یہ مشورہ ہے کہ رسالہ میں تخلیق ارسال کرنے سے پہلے کسی کو دکھلا لیا کریں۔ مہ جبیں جعفری صاحبہ کی غزل بھی عجیب و غریب ہے نذیر احمد راہی صاحب کا بھی یہی قصہ ہے۔ طنزیہ خاکہ ٹھیک ہے۔ "سورج کی صلیب" پر مناظر عاشق ہرگانوی کا تبصرہ مناسب ہے۔

## غنی رتلامی (بڑودہ)

مارچ کا گلبن موصول ہوا۔ شبیر رسول، نذیر فتح پوری عبدالعلیم ناشاد، سلیمان اطہر جاوید، غیاث اختر اور تسنیم قاسمی کی غزلیں پسند آئیں مظفر ہاشمی جمشید پور اور اختر ہوشیار پوری کی غزلوں سے بھی لطف اندوز ہوا۔

## اجنبی اورنگ آبادی (بھوجپوری)

گلبن مارچ ۸۹ء موصول ہوا۔ پرچہ ایک ہی نشست میں چاٹ ڈالا۔ نثری حصہ بھی پسند آیا۔ اور شعری حصہ بھی قابل داد ہے۔ سرورق آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا ہے۔ کتابت و طباعت دلکش ہے۔ اور کاغذ بھی اور پرچوں کے مقابلہ میں بہتر ہے۔ معیار میں گلبن اپنا ایک انفرادی مقام رکھتا ہے۔

---

## آخری بات

بیامت خرافات میں کھو گئی

عجم کی روایات میں کھو گئی

قائد ملت گلبن کو ۳۶ واں یوم آزادی مبارک ہو
ادارہ

گجرات سے نکلنے والا واحد علمی ادبی اور ثقافتی

# ماہنامہ گلبن

اگست ۱۹۸۳ء
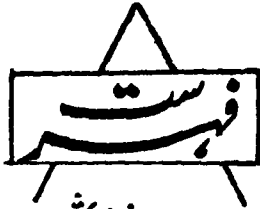
جلد ۶ شمارہ ۶۹ وال

ایڈیٹر ثریا ہاشمی
مینجنگ ایڈیٹر ظفر ہاشمی
ترتیب کار مناظر عاشق ہرگانوی

نگراں
سید محمد حکیم الدین شیرازی

مشیران
سید علی احسن بخاری
سید احمد مختار غوثی
ڈاکٹر شمس الاسلام عثمانی

بدل اشتراک
لائف ممبری ۵۰۰ روپے
زر تعاون سالانہ ۵۰ روپے
زر سالانہ ۲۰ روپے

غیر ممالک
بحری ڈاک سے ۳ پونڈ
ہوائی ڈاک سے ۵ پونڈ
عام شمارہ ۷۵/۱ روپے

پتہ: ۲۶/۱۶۹ گجرات ہاؤسنگ بورڈ کالونی
شاہ عالم، احمد آباد ۳۸۰۰۲۸

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر
ثریا ہاشمی

مطبع: نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد (یوپی)

# فہرست

اداریہ

# ایک وضاحت

جون کے اداریئے "دوسرا علم" کے تحت ہم نے اپنے قارئین کو یہ اطلاع دی تھی کہ انجمن اسلام ہائی اسکول احمدآباد نے اس سال سے اردو میڈیم سے تعلیم دینے کی شروعات کردی ہے۔ اس خبر سے ہمیں خوشی ہوئی تھی۔ ہم نے چاہا تھا کہ اس خوشی میں اپنے اردو نواز قارئین کو بھی شریک کرلیں۔ لیکن ہمیں بڑے افسوس کیساتھ اطلاع دینی پڑتی ہے کہ انجمن اسلام ہائی اسکول احمدآباد نے ابھی تک کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دیا ہے جس پر ہم اپنی خوشی کا اظہار کرسکیں۔ ہم قارئین سے معذرت چاہتے ہیں

# ایک اپیل

پچھلے دنوں گلبن کے قارئین نے اخبارات میں یہ خبر پڑھی اور ریڈیو پر سنی ہوگی کہ گجرات کے پوربندر جوناگڈھ اور دوسرے ساحلی علاقوں میں شدید بارش کی وجہ سے تباہ کن سیلاب آیا اور ہزاروں گاؤں اسکی نذر ہوگئے سیکڑوں انسان اور لاکھوں جانور مرگئے اور کروڑوں کی املاک تباہ و برباد ہوگئی ایسی صورت میں ہمارا فرض ہوجاتا ہے کہ ہم ان مصیبت زدگان کی ہر امکانی مدد کریں انھیں دوبارہ آباد ہونے میں بھرپور مالی تعاون پیش کریں اور اس سال یوم آزادی کے پرمسرت موقع پر ملک اور قوم کا حق یوں ادا کریں۔ مصیبت زدگان مدد کرنا ہر مذہب کا مطالبہ ہے۔ اور ہر انسان پر فرض ہے۔

(نجمہ ہاشمی)

خوشحال خاں خٹک
(ترجمہ: خاطر غزنوی)

# حمد و ثنا

المدد میرے خدا میرے خدائے یکتا
ہو مدد تیری تو ہر کام رواں ہو میرا
فضل ہیں تیرے بہت کیسے سراہے کوئی
پھر بھی تا حدِ تواں میں ہوں ثنا خواں تیرا
پیر بھی تو نہیں برنا بھی نہیں پھر کیا ہے
جیسے تھا روزِ ازل ویسے ابد تک ہوگا
کون ہے کر سکے جو ریگ کے ذروں کو شمار
ریگ صحرا سے زیادہ ہے کہیں حدِ ثنا
لفظ کن سے کیا تخلیق جہاں بھر کو مگر
خود نہ پیدا، نہ تجھ سے کوئی پیدا ہوگا
تو سفید اور سیہ پر ہے جہاں کے حاوی
ہر سفید اور سیہ شاہد وحدت ہے ترا
خوب تر کام ہیں سب خوبی و نیکی میں ترے
ہم تلک پہنچے کبھی نیک کبھی بد مولا
حرف خوشحال کہاں تیری ثنا کے قابل
فضل سے اپنے اسے بخش دے تو ہے اعلیٰ

اختر انصاری اکبرآبادی

# نعت

یہ کس کے ذکر سے گلزار جاگ اٹھا ہے ابھی
سنو سنو! کہ شگوفوں نے کچھ کہا ہے ابھی
تمہارا نام ہر اک پنکھڑی پہ دیکھتا ہوں
اور اتنا صاف کہ جیسے لکھا گیا ہے ابھی
ابھی ہے تازگی ذہن و دماغ میں کہ یہ دل
تمہارے طرزِ تکلم سے آشنا ہے ابھی
دمک رہا ہے عجب کہکشاں سی نظروں میں
تمہارے جلوۂ دلکش کا سلسلہ ہے ابھی
وہ تابناک ستارے، وہ جاں فروز چراغ
تمہاری بزم سے ہر شخص آشنا ہے ابھی
ابھی ہے بارشِ گل عشق کی فضاؤں میں
نگاہِ حسن سے پیغام مل رہا ہے ابھی
تمہاری چشمِ کرم ہے کہ راستے کا چراغ
تمہارا نقشِ قدم ہے کہ رہنما ہے ابھی
تمہارے نام پہ مرتا ہوں میں ہمیشہ سے
مرے شعور محبت کی ابتدا ہے ابھی

نصر قریشی (الٰہ آباد)

## ہجرت کی کتھا

خواہشوں کے سانپ نے اک خوشۂ گندم کی خاطر دربدر سب کو گھمایا
ہجرتوں کا سلسلہ روزِ ازل سے چل رہا ہے۔
قحط، طوفاں، برق، باراں، خشک سالی
جنگ، جھگڑے، بربریت، بندشیں
خون کے پیاسے درندوں کا ہجوم
کوئی چنگیزی، کوئی فرعونی لشکر کی طرح
سرزمیں کربلا، لبنان ہو یا ویتنام
ہر طرف اک لشکرِ عفریت کا بھاری پڑاؤ
اژدروں کا اک ہجوم
انگلی مالا یا سروں کی مالا گردن میں پڑی
خون کا دریا بہا کے خونی فاتح بڑھتے ہیں
بستیاں ویرانوں کی تصویر ہیں
سرحدوں کو توڑتا انسانوں کا سیل رواں
بے پناہوں، بے نواؤں کی سسکتی داستاں
وقت کی جنگ کے ماتھے پہ ناسور
ہجرتوں کے باب میں اک بابِ غم کا جوڑتا
روز اخباروں کے کالم میں کوئی تازہ کتھا
صفحے ناکافی ہوئے ہیں
حرف و لفظ و صوت گونگے ہو گئے۔
ہجرتوں کی یہ کہانی آخر ہم کب تک لکھیں؟

---

سلیم احمد (پاکستان)

## جن

بچپن میں بوڑھوں سے سنا تھا
کچھ لوگوں پر جن آتے ہیں
جو ان کو بھگائے پھرتے ہیں
وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں
اپنے آپ نہیں کہتے
جن ان سے کہلاتے ہیں
اب ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔
کچھ لوگوں پر لفظ آتے ہیں
جو ان کو بھگائے پھرتے ہیں
وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں۔
اپنے آپ نہیں کہتے
لفظ ان سے کہلاتے ہیں

---

۵

تقی حسین خسرو

# غنڈوں کے باپ

اکبر پر کچھ دنوں سے خالص اصلاحی جذبہ سوار تھا۔ اب ہر بات کو وہ تنقیدی نظر سے دیکھتا اور پھر بڑی سنجیدگی سے اصلاح کی تدبیریں سوچتا۔ چنانچہ اس وقت بھی وہ میرے سامنے کرسی پر نیم دراز تھا۔ اور اپنے مخصوص انداز سے پائپ پیتے ہوئے معاشرے کی بعض برائیوں کا ذکر بہت ہی تشویش سے کر رہا تھا۔

وہ پائپ پیتا ہوا خاصہ معتبر لگتا۔ شاید وہ اس بات سے واقف تھا۔ ورنہ وہ پہلے سگریٹ پیتا تھا۔

اس کے پائپ پینے کی عمر اس کی اصلاحی عمر کے برابر تھی مجھے یقین تھا کہ اگر وہ مجھ سے سگریٹ پیتے ہوئے اس قسم کی باتیں کرتا تو میں شاید ٹال جاتا۔ جیسا میں نے اس کے ساتھ ہمیشہ ہی کیا تھا ـــــ

اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ غیر سنجیدہ تھا۔ نہیں وہ غیر سنجیدہ نہیں تھا مگر وہ اکثر باتیں محض تفریحِ طبع کے لیے کرتا۔ اسکی اسی عادت کی وجہ سے اکثر یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا کہ کب وہ حقیقت حال کا اظہار کر رہا ہے اور کب تفریح کے موڈ میں ہے۔

مگر اب وہ ایک بالکل ہی مختلف آدمی تھا۔ بالکل ویسا ہی مختلف جیسا پائپ سگریٹ سے مختلف ہوتا ہے۔

میں نے ایک نظر اس کے بائیں ہاتھ میں موجود پائپ کو دیکھا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے پائپ کے اگلے سرے کو اس طرح پکڑا رکھا تھا کہ پائپ میں موجود آگ نظر نہیں آ رہی تھی ـــــ پائپ کا صرف وہ خمیدہ حصّہ نظر آ رہا تھا جو نازک اور خوبصورت تھا اور بار بار اکبر کے پتلے پتلے ہونٹوں کے ساتھ پیوست ہو کر وہ دھواں پیدا کر رہا تھا جو کمرے کی تمام فضا میں تحلیل ہو کر ایک دھیمی مگر مسحور کن خوشبو سی پیدا کر رہا تھا۔

میں نے کبھی سگریٹ پیا، نہ پائپ، سگار، میں نے کبھی تمباکو کو کسی بھی شکل میں استعمال نہیں کیا۔ نہیں معلوم کیوں جی ہی نہیں چاہا۔ حالانکہ اکبر نے مجھے اکثر ان طعن کیا تھا کہ "عجیب پھوہڑ قسم کے آدمی ہو! سگریٹ نہیں پیتے !! اگر تم نے فوراً ہی سگریٹ پینا شروع نہ کیا تو ہماری دوستی ختم۔ دوستی میں مشترک عادتیں ناگزیر ہوتی ہیں۔" ایسے موقع پر میں نے اس کو ہمیشہ ہی جواب دیا تھا۔

"کیا چائے کا اشتراک کافی نہیں؟" ـــــ مگر اپنی تمباکو نوشی سے اس قدر بے تعلقی کے باوجود مجھے اکبر کے پائپ سے تمباکو کی خوشبو اچھی لگتی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس میں اس کی شخصیت کی بو بھی شامل تھی۔ ورنہ تمباکو کی مجھے ہمیشہ ہی ناگوار لگتی تھی اور میں کوشش کرتا تھا کہ تمباکو پینے والوں اور اپنے بیچ ایک فاصلہ حائل رکھوں۔ یہ فاصلہ سفر میں ختم ہونے لگتا تھا۔ سفر ریل کا ہو کہ ہوائی جہاز کا ـــــ ساتھ بیٹھا ہوا آدمی مزید بانوش ہوتا ہے کم از کم میرا تجربہ یہی تھا۔ شاید

یہی وجہ تھی کہ میں سفر سے گھبراتا تھا اور اب پھر مجھے سفر درپیش تھا۔

اکبر کہہ رہا تھا۔

" ہم جس معاشرے میں پیدا ہوئے، پلے اور بڑھے ہیں وہ خود مرکزیت کا شکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی شخصیت کی دیوار کے اس طرف دیکھنا پسند ہی نہیں کرتے۔ بلکہ یوں کہوں گا کہ دیکھ ہی نہیں سکتے ہم ہر شے کو اپنے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ کوئی بھی شے کوئی بھی شخص کوئی بھی آدمی ہم سے متعلق ہو کر ہی ہمارے لئے اہم ہوتا ہے یہ خود مرکزیت جانوروں میں جبلی ہوتی ہے کہ وہ محض اپنا پیٹ بھرنا جانتے ہیں۔ انسان جانور سے اس وقت ممیز ہو سکتا ہے جب وہ اس خود مرکزیت کے سحر کو توڑنے میں کامیاب ہو جائے۔ پھر وہ ایسے پیڑ بھی لگاتا ہے جس سے آنے والی نسلیں فائدہ اٹھاتی ہیں۔ ایسے پراجیکٹ کی منصوبہ بندی کرتا ہے جن کے نتائج دور رس ہوتے ہیں۔ مگر ہم کو ابھی اس مقام پر پہنچنے میں ایک عرصہ لگے گا۔ ابھی تو ہم جس مقام پر رکے ہوئے ہیں وہاں ہمیں اپنے برابر بیٹھے ہوئے آدمی کی بھی خبر نہیں ہوتی۔

اکبر نے رک کر اپنے بجھتے ہوئے پائپ کے دو چار گہرے گہرے کش لینے کی کوشش کی۔ اس کی اس کوشش میں اس کا آگے ہی ستا ہوا چہرہ کچھ اور بھی ستا ہوا نظر آنے لگا۔ اور اس کی کنپٹی پر سفید ہوتے ہوئے بال کچھ اور بھی سفید نظر آنے لگے۔

میں نے کہا!

" بھئی کیوں اپنے آپ کو مشقت میں ڈالتے ہو؟ یہ تمہارے آگے ہی پچکے ہوئے گال کچھ اور بھی پچک جائیں گے اور پھر گالوں کی جگہ گڑھے لے لیں گے۔ میرا خیال ہے گالوں کی جگہ گڑھے تو تم بھی پسند نہیں کرتے۔"

" پسند تو میں بہت سی باتیں نہیں کرتا۔ اور میرا خیال ہے ہم ایک دوسرے کے پسند ناپسند کے معیار سے خوب واقف ہیں۔ مگر یار تم تو جانتے ہی ہو کہ ہماری پسند ناپسند کے معیار بھی کتنے ناقص ہیں! اس کی وجہ وہی ہے کہ ہم اپنی شخصیت کی دیوار کے اس طرف دیکھ ہی نہیں سکتے۔"

اکبر یہ کہہ کر اپنے بجھے ہوئے پائپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پہلے تو اس نے پائپ کو دوبارہ جلانے کی کوشش کی مگر شاید اب پائپ میں تمام راکھ تھی۔ راکھ جو آگ بائی پروڈکٹ ہے۔ اس کو کریدا تو جا سکتا ہے۔ مگر اس سے آگ پیدا نہیں کی جا سکتی۔ پھر وہ اپنے پائپ کی صفائی کرنے لگا۔ ایسے میں اس کا کسی اور طرف متوجہ ہو جانا ممکن نہ تھا۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کے پردوں کو جو دائیں بائیں سے کسی قدر ہٹ گئے تھے برابر کیا۔ شام ہو چلی تھی۔ میں اس کی آہٹ صاف سن سکتا تھا۔ میرے کانوں نے برسوں سے یہ آہٹ سنی تھی۔ مگر میرے کان اس کے عادی نہ ہو سکتے تھے اور آج بھی اس کی آہٹ پر روز ازل ہی کی طرح متوجہ ہو جاتے تھے ایک عجیب گونج تھی اسکی آہٹ میں لگتا گویا بے شمار صدیاں عدم سے لوٹ آئی ہوں اور پھر عدم ہی کی طرف جا رہی ہوں۔ آہٹ ۔۔۔! میں نے اکبر کی طرف دیکھا۔ اب وہ پائپ صاف کر چکا تھا اور تمباکو کے خوبصورت نیلے رنگ کے پیکٹ سے اپنی لانبی انگلیوں سے تمباکو نکال نکال کر پائپ میں بھر رہا تھا۔ اکبر تھوڑی دیر میں اپنا پائپ بھرے گا۔ ایک بار پھر اس کے پائپ میں تمباکو جلے گا اور ایک بار پھر اس کا پائپ راکھ سے بھر جائے گا۔ راکھ جس کو کریدا تو جا سکتا ہے مگر اس سے آگ پیدا نہیں کی جا سکتی میں نے تمام بتیاں جلا دیں۔ میں روز یہی کرتا تھا۔ شام کی آہٹ سن کر بتیاں جلا دیتا۔ اکبر پائپ بھر چکا تھا پھر اس نے اس کو جلا لیا۔ مگر اب وہ خاموش بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ لگتا تھا جیسا وہ اس کمرے میں موجود ہی نہ ہو۔۔۔ شاید نہیں یقیناً اس نے بھی شام کی آہٹ سن لی تھی۔ ہم دونوں برسوں سے مل کر شام کی آہٹ سنتے آئے تھے۔ اس سلسلے میں اس کے اور میرے احساس میں کتنی یگانگت تھی! فرق صرف یہ تھا کہ وہ اس آہٹ کو سن کر اکثر خاموش ہو جاتا۔ اور بیٹھا پائپ پیتا رہتا۔ گویا ہمہ تن گوش ہو۔ اور میری بے قراری بڑھ جاتی۔ چنانچہ میں نے پہلے تو بتیاں جلائیں اور پھر ہیٹر پر چائے سے بھری کیتلی رکھ دی۔ اور اپنے دونوں ہاتھ پشت پر کئے ٹہلنے لگا۔ مجھے

کل صبح کی پرواز سے شمالی علاقے کے دورے پر جانا تھا۔ تجارتی دورے پر! میں اس دورے کو بہت دنوں سے ملتوی کرتا آیا تھا لیکن اب مزید ملتوی کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ میں نے ایک دفعہ اور کھڑکی کے باہر پردے کے اوپر سے دیکھا اور شام کی آہٹ کو ایک بار اور محسوس کیا۔ اکبر خاموش تھا۔ اس کے تمباکو کی دھیمی مگر مسحور کن خوشبو کمرے میں گونج رہی تھی۔ ہم دونوں سن رہے تھے۔ ہم دونوں گوش برآواز تھے۔ اس وقت شام کی آہٹ کا احساس ہم دونوں میں مشترک تھا ——

مگر یہ مشترک احساس تو شاید ہماری دوستی کی بنیاد تھا دوستی جو ایک لمبے عرصے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اکثر یہ خیال آتا تھا کہ وہ کیا شے ہے جس نے ہم دونوں کو دوستی کے ایک نہ ٹوٹنے والے رشتے میں باندھ دیا تھا؟ اس دوران میں کتنی دوستیاں عارضی ثابت ہو چکی تھیں —— آج جیسے دفعتاً مجھے ہماری اس طویل اور کبھی نہ ختم ہونے والی دوستی کا راز معلوم ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں اب کچھ دنوں کے لئے باہر جا رہا تھا۔ مگر میں تو اس سے پہلے بھی تجارتی دوروں پر جاتا رہا تھا —— اب شاید ہماری عمریں بڑھ چکی تھیں۔ بڑھتی عمروں میں آنے والی دوری کا احساس کتنا جان لیوا ہوتا ہے! آنے والی دوری کے احساس ہی نے آج میری قوتِ ... کو تیز تر کر دیا تھا۔ ہماری یہ دوستی ہمارے مشترک احساس ہی کی دین تھی۔ مشترک احساس جس نے کسی طاقت ور مقناطیس کی طرح ہمیں اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ اور اب ہماری شخصیتیں اپنے تمام اختلافات کے باوجود ایک ہی مقناطیسی نظام کے تابع تھیں۔ اس مقناطیسی نظام نے ہمیں عمر بھر سے ایک دوسرے کا دوست بنا دیا تھا۔ اکبر میں کچھ دنوں سے ایک خاص جذبہ ہو گیا تھا —— مگر کیا اکبر کے اس اصلاحی جذبے میں مجھے خود اپنی خواہش جھلکتی نظر نہ آتی تھی؟ میں خود بھی اب تو سوچنے لگا تھا کہ زندگی میں کوئی قرینہ کوئی سمت ہونی چاہیئے۔ ہم نے بہت دنوں تک بے ترتیب بے سمت زندگی گزاری تھی۔ اب ضروری تھا کہ ہم اپنی زندگیوں میں کوئی قرینہ پیدا کریں اور کسی سمت کا تعین کریں۔ اس طرح اصلاح کا جذبہ صرف اکبر ہی میں نہیں مجھ میں بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اور یہ ہمارے مشترک احساس کا ایک اور ثبوت تھا ——

میں نے دیکھا میز پر رکھی کیتلی بھاپ اگل رہی تھی۔ اکبر ہنوز پائپ پینے میں مصروف تھا۔ میں نے دو پیالوں میں چائے انڈیلی اور ایک اکبر کے ہاتھ میں تھما دیا اور ایک خود اٹھا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اکبر دوستی میں مشترک عادتوں کی بات کرتا تھا اور میں جواب میں چائے کے اشتراک کی بات کیا کرتا تھا۔ مگر آج گرم گرم چائے قطرہ قطرہ پیتے ہوئے میں نے سوچا ہم دونوں محض ایک ٹی کلب کے ممبر نہ تھے۔ ہماری دوستی تو خود ہماری زندگی ہماری شخصیت کی بنیادوں پر استوار تھی۔ مشترک احساس کی بنیادوں پر! —— میں نے اکبر کی طرف دیکھا۔ وہ چائے کے پیالے پر جھکا ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا جیسے میرا سینہ ایک ناقابلِ اظہار طمانیت کے احساس سے بھر گیا تھا —— زندگی میں یہ مشترک احساس کی دولت نصیب ہوتی ہے احساس کے سنگلاخ صحرا میں کب کوئی ہم سفر ملتا ہے —— پھر جیسے ہم سفری کے اس احساس نے درپیش سفر کی صعوبت کو بہت کم کر دیا تھا

مگر اوپر سے مجھے ملک کے شمالی علاقے میں اپنا کام سمیٹنے میں پندرہ دنوں سے زیادہ وقت لگ گیا۔ میں بہت تھک گیا تھا اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اس دوران میں اس طمانیت کے احساس سے محروم ہو گیا تھا۔ جو مجھے اکبر کی دوستی میں لاشعوری طور پر حاصل رہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اکبر کے آگے سمندر کے کنارے چلنے کی تجویز رکھی تھی۔ ہم دونوں دوست جب بھی تھک جاتے تو سمندر کا رخ کرتے سمندر میں سورج کے غروب کا منظر ایک عجیب حاصل ہوتا ہے سورج اپنے سینے میں آگ ... ہے یہت حیرت سے آہستہ آہستہ سمندر کی تہہ میں اتر جاتا ہے۔ یہ کمک مجھے اس کہ اس تمام آگ کو کس خاموشی اور ... اجنبی عورت کہہ سمندر کا یہ کنارہ ہمارا جانا پہچانا تھا یہاں کوئی نخیال ارتعاش ... پر سکون! جہاں بے شمارہ

اور کنارے مٹتی ہوئی سفید سفید جھاگ جیسے ماحول کا حصہ تھی ہم ہمیشہ کی طرح کنارے پر ابھری ہوئی بڑی سی چٹان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ مگر اکبر کچھ ہی دیر بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اب سمندر کے کنارے مونگے چن رہا تھا۔ مونگے جو سمندر ہی کی طرح قدیم تھے۔ میں کچھ دیر تک اس کو دیکھتا رہا۔ دور حدِ نظر تک پھیلے ہوئے کنارے پر مونگے چنتا ہوا اکبر اور پس منظر میں بےکنار سمندر کتنا بامعنی لگ رہا تھا۔ پھر میں بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے تھرموس سے چائے پی اور دیر تک سمندر کے کنارے مونگے چنتے رہے۔ وقت کے گذرنے کا بالکل ہی احساس نہ ہوا۔ ہم اس وقت چونکے جب ہم نے چیخوں کی آوازیں سنیں جیسے کوئی مدد کے لئے پکار رہا تھا۔ ہم نے چونک کر مخالف سمت میں دیکھا۔ کچھ لڑکیاں تھیں اور کچھ لڑکے نہیں غنڈے تھے۔ یہ بات اکبر کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ غنڈے لڑکیوں کو تنگ کر رہے تھے۔ عورت اور اہانت! — اکبر نے اپنی آستینیں چڑھالیں۔ میں نے بھی تقریباً اس کے ساتھ اپنی آستینیں چڑھا لی تھیں۔ ہم دونوں کے کمزور بازوؤں میں نہیں معلوم کہاں سے طاقت آگئی تھی۔ ہم بہ آسانی غنڈوں کا سر توڑ سکتے تھے۔ انہیں سمندر میں غرق کر سکتے تھے۔ بیچاری سراسیمہ لڑکیاں! — ہم تقریباً دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے تھے جب ہم قریب پہنچے تو میں نے دیکھا غنڈے بھاگ کھڑے ہوئے وہ دیکھتے ہی دیکھتے چٹانوں میں نہیں معلوم کہاں غائب ہو گئے۔ ان کا سر توڑ دینے کی آواز انہیں سمندر میں غرق کر دینے کی ہماری دلی خواہش دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ مگر بہر حال ہم نے انہیں بھاگ جانے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اب ہم اُن لڑکیوں کی جانب متوجہ ہوئے۔ بیچاری لڑکیاں! ہمارا سانس پھولا ہوا تھا۔ نہیں معلوم غنڈوں نے کتنا پریشان کیا تھا ان بیچاریوں کو! وہ کل تین تھیں۔ ہم ان لڑکیوں سے کہنا چاہتے تھے اب انھیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اب وہ غنڈے بالکل نہیں آسکتے۔ اکبر تو شاید ان لڑکیوں کے قریب بھی چلا جاتا۔ یہ اس کی پدری شفقت کا تقاضہ تھا کہ وہ ہم دونوں میں کثیر العیال تھا۔ وہ ان کے سروں پر ہاتھ رکھتا۔ وہ آگے بڑھ بھی گیا تھا مگر ٹھیک اسی وقت ایک لڑکی نے ہماری طرف اشارہ کرکے نفرت سے کہا " بوڑھے غنڈے اور آگئے — غنڈے! مگر اس سے پہلے کہ ہم اپنے دماغ میں کچھ کہتے دوسری لڑکی نے جس نے اس دوران میں شاید ہماری کنپٹیوں پہ تیزی سے سفید ہوتے ہوئے بالوں کو دیکھ لیا تھا۔ بولی " غنڈے! یا غنڈوں کے باپ! " اس کے لہجے میں پہلی سے زیادہ نفرت تھی۔ تیسری نے کچھ کہا نہیں بس ایک دفعہ ہماری طرف دیکھ کر نفرت سے نظریں پھیرلیں۔ غنڈے! — غنڈوں کے باپ! — اکبر احتجاج کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ تو شدید اور ناقابل اظہار غصے کے احساس سے جیسے کانپ رہا تھا۔ ہم یا تو غنڈے ہو سکتے تھے یا غنڈوں کے باپ! خود میری بھی یہی کیفیت تھی۔ ہم نے ایک دفعہ اور ان لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا اور اپنے دماغ میں کچھ کہنے کی کوشش کی۔ مگر ہماری زبانیں لڑکھڑا کر رہ گئیں۔ پھر ہم وہاں رک نہیں سکے۔ ہم نے سورج کے غروب ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ مگر ہم راستے بھر خاموش رہے۔ اکبر جیسے اپنا پائپ جلانا بھول گیا تھا۔ وہ بیزار بیٹھا ونڈ اسکرین کے دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ ہمارے سینے آج بھی مشترک احساس کی دولت سے مالا مال تھے۔ مگر آج نہیں معلوم کیوں ہماری ایک دوسرے سے نظریں ملانے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ دراصل آج ہمارا مشترک احساس ہمارے سامنے ایک بالکل نئے روپ میں جلوہ گر تھا۔ وہ دوست تو آج بھی تھا مگر وہ آج طمانیت و فخر کا باعث نہیں بلکہ شرمندگی اور خجالت کا باعث تھا کہ آج ہم غنڈے تو نہ تھے مگر غنڈوں کے باپ تھے۔

❖ ❖ ❖

سیماں

# کوششِ ناکام

گرمیوں کی ایک سنسان دوپہر تھی۔

میں بچوں کے کھانے سے فراغت پا کر لیٹ گئی۔ بچے، خرم اور عاصم بڑی بہن کے پاس بے خبر سو رہے تھے۔ مجھے نیند نہ آئی تو میں نے ایک رسالہ اٹھایا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ عام طور سے کچھ پڑھنے لگوں تو نیند آنے لگتی ہے اس بار بھی ایسا ہی ہوا جلد ہی مجھ پر اونگھ غالب آگئی ــــ ابھی میں سونے نہ پائی تھی کہ باہر کا دروازہ زور زور سے بجنے لگا۔ میں گھبرا اٹھی۔ خدشہ ہوا کہ دوسرے کمرے میں سوتے ہوئے بچے نہ جاگ جائیں۔ تیزی سے جا کر میں نے دروازہ کھولا۔ ایک اجنبی عورت سامنے کھڑی تھی اس کے رخسار مرجھائے ہوئے تھے۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو؟" میں نے پوچھا۔

وہ مسکرائی۔ "کیا آپ اندر آنے کے لئے بھی نہیں کہیں گی! باہر بہت گرمی ہے۔"

میں شرمندہ سی ہو گئی۔

"آئیے اندر آجائیے۔" میں نے دروازے سے ہٹتے ہوئے کہا۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اندر آگئی اور برآمدے میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"نہیں نہیں کمرے کے اندر آئیے نا" میں اپنے اخلاق مند ہونے کا ثبوت دے رہی تھی۔

"نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں۔ ہوا آرہی ہے۔ اس کے علاوہ جلدی میں بھی ہوں" اس نے مسکرا کر کہا چند لمحے وہ خاموش رہی۔ پھر بولی ــــ "دراصل میں آج رات ہی آپ کا شہر چھوڑ رہی ہوں۔ اس وقت ایک خاص کام سے آپ کے پاس آئی ہوں۔ سمجھئے کہ کسی نے مجھے یہاں بھیجا ہے کیا آپ اپنا آبائی مکان دیکھنا پسند کریں گی"؟

"آبائی مکان؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "ہمارا تو کوئی آبائی مکان نہیں ہے۔"

"میرا مطلب ہے آپ کا سسرالی مکان، آپ ہی اب اس کی حقدار ہیں"

"آپ..... آپ کون ہیں؟" اتنی دیر میں پہلی بار میں نے یہ سوال کیا۔

"میں آپکے میاں کی خالہ زاد بہن ثریا کی دیورانی ہوں۔ میرا نام فردوس ہے" اسی نے بتایا۔

میں نے غور کیا۔ مگر مجھے کچھ یاد نہ آسکا۔ کبھی اسلم نے بھی اس نام کی کسی خاتون کا ذکر نہیں کیا تھا۔ ہاں انکے ننھیالی رشتہ داروں کا ذکر ضرور سنا تھا۔ اسلم اس وقت صرف ایک برس کے تھے جب ان کی ماں کا انتقال ہوا تھا۔ اس کے بعد میرے سسر کی شادی میری چھوٹی خالہ سے ہو گئی انھیں سے بعد میں ان کے بچے ہوئے۔ میرے سسر سن مڈل ایسٹ میں مقیم تھی۔ اب اسلم کی ننھیالی رشتے دار سے اپنے آبائی مکان کی یہ تفصیل کر سخت حیرت ہوئی اور برا بھی محسوس ہوا کہ ان لوگوں نے اب تک مجھے اس بات سے کیوں لاعلم رکھا۔ پھر میں چونک پڑی اجنبی عورت کہہ رہی تھی ــــ "چونکہ آپ کے میاں کا یہاں کوئی ننھیالی رشتہ دار

نہیں ہے اس لئے انھوں نے مجھے یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ میں آپ کو مکان دکھا دوں"

میں کچھ سمجھی نہیں۔ کن لوگوں نے آپ کو یہ ذمہ داری سونپی ہے" میں الجھ سی گئی۔

آپ کے سسرالی رشتے داروں نے — مہربانی فرما کر جلدی کریں۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے"

میں عجیب شش و پنج میں مبتلا ہو گئی میرے علاوہ اس وقت گھر میں کوئی ذمہ دار فرد نہ تھا۔ میری بڑی بیٹی صالحہ اور دونوں چھوٹے لڑکے دوسرے کمرے میں سو رہے تھے۔ انھیں تنہا چھوڑ کر جانا مناسب نظر نہ آیا۔ ملازمت کے سلسلے میں اسلم بھی ان دنوں جدہ میں تھے وہ ہوتے تو میں ان سے پوچھ کر ہی اس عورت کے ساتھ جانے کا فیصلہ کرتی۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آخر میں پوچھا۔

"ہمیں کہاں تک جانا ہے؟ وہاں سے واپسی میں کتنی دیر لگے گی دیکھئے میں اس وقت اکیلی ہوں۔ میری لڑکی اور دونوں چھوٹے بچے سو رہے ہیں اگر ان کے علاوہ گھر میں کوئی دوسرا فرد ہوتا تو مجھے ذرا پس و پیش نہ ہوتا"

کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہیں وہاں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ مکان یہاں سے بہت قریب ہے۔ مشکل سے پندرہ منٹ لگیں گے۔"

یہ سن کر مجھے خیال آیا کہ صالحہ کو جگا دوں پھر سوچنے لگی کہ تھوڑی ہی دیر میں تو واپسی ہو جائے گی خواہ مخواہ اس کی نیند خراب کرنے سے فائدہ — میں نے جلدی سے کپڑے تبدیل کئے اور عورت کے ساتھ گھر سے نکل آئی۔

ہم دونوں گلی میں چل رہی تھیں۔ فردوس بہت خاموش تھی گم صم اور کھوئی کھوئی سی۔ جیسے وہ محض اپنا فرض نبھا رہی ہو۔ میں نے بھی کوئی بات نہ کی، لیکن میری خاموشی میں کسی ابلتے ہوئے آتش فشاں جیسی تیز آنچ تھی۔ بے حد طیش آ رہا تھا کہ آخر اسلم نے مجھ سے کبھی اپنے آبائی مکان کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ میں اندر ہی اندر کھولتی رہی۔ مجھے راستہ کا ہوش نہ تھا۔ پھر جانے کون کون سی گلیوں سے ہوتے ہوئے ہم اس ویران سی پرانی گلی میں پہنچے جہاں آج سے پہلے آنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔

فردوس ایک مکان کے زنگ آلود دروازے کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ کئی منزلہ یہ مکان اپنی قدیم وضع کے سبب بہت پرانا لگ رہا تھا۔ اس کی محرابیں شکستہ اور دیواریں بوسیدہ ہو چکی تھیں گلی میں جگہ جگہ غلاظت کے ڈھیر تھے۔ دروازے میں کوئی قفل نہ تھا۔ فردوس تیزی سے آگے بڑھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے لوہے کا زنگ آلود دروازہ اندر کی طرف دھکیلا۔ سناٹے میں عجیب سی ایک بے ہنگم آواز گونجی مجھے یقین آ گیا جیسے برسوں سے یہ دروازہ نہ کھلا ہو فردوس نے مجھے اشارہ کیا۔ میں ٹھٹھکتی ہوئی آگے آئی ہم دونوں اندر داخل ہوئے اور ڈیوڑھی سے ہوتے ہوئے وسیع و عریض صحن میں پہنچے۔ سامنے ہی ایک ٹوٹا پھوٹا زینہ تھا۔ ہم اسے طے کر کے برآمدے میں آ گئے۔ یہاں دائیں گوشے میں ایک بہت ہی ضعیف و نزار بوڑھا جس نے بدن پر صرف ایک لنگی باندھ رکھی تھی زمین پر اکڑوں بیٹھا ہاون دستے سے کچھ کوٹ رہا تھا۔ اس نے ہمارے آنے کا نوٹس نہ لیا اور اپنے شغل میں لگا رہا۔ برآمدے میں ایک جھلنگا سی چارپائی پر ایک بوڑھی کمزور عورت پڑی تھی۔ اس کے سفید بال میلے سے تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر اس نے اٹھنا چاہا مگر اٹھ نہ سکی بے بسی سے اس نے ہماری طرف دیکھا اور تکیے سے ٹیک لگا لی۔ فردوس نے چیختے ہوئے کہا

میہ صغیرہ کی بہو ہے۔"

میں چونک اٹھی۔ صغیرہ میری مرحوم ساس کا نام تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر بوڑھی عورت کو سلام کیا۔

اس نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اس کی گدلائی ہوئی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔ میں سخت پریشانی میں کھڑی یہ سوچ رہی تھی کہ آخر یہ بوڑھی عورت کون ہے اور اس ویران اور کھنڈر نما مکان میں بے آسرا و بے سہارا کیوں پڑی ہے۔

"آپ — آپ شاید کچھ بیمار ہیں۔ لیٹ جائیے۔"

میں نے بوڑھی عورت کو نرمی سے پکڑ کر بستر پر لٹا دیا اور اس کا ترتیب بستر درست کرنے لگی۔ بستر کی چادر خاصی بوسیدہ تھی۔ میں نے پلٹ کر فردوس سے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔ میں نے حیرانی سے ادھر اُدھر دیکھا۔ آخر اتنی جلدی وہ کہاں چلی گئی۔ اس اجنبی ماحول میں خود کو تنہا پا کر میں ہول اٹھی۔ بوڑھے کا حقہ اسی طرح تیزی سے چل رہا تھا۔ میں تقریباً دوڑتی ہوئی اسکے پاس پہنچی۔

"بڑے میاں وہ ...... فردوس کہاں چلی گئی؟" میں نے زور سے پوچھا۔ مگر اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا تک نہیں۔ خیال آیا کہ شاید بہرا ہے۔ گھبراہٹ میں اشاروں کنایوں سے بات کرنا مشکل تھا۔ میں برآمدے سے آگے بڑھی۔ میرا دل انجانے خوف سے لرز رہا تھا کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ پھر اس کے نزدیک سے ہٹ کر میں پلنگ کی طرف چلی آئی کہ چارپائی پر لیٹی بڑی بی سے فردوس کے بارے میں پوچھوں۔ وہ آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹی ہوئی تھیں۔ قریب آکر میں نے انھیں مخاطب کیا۔

"بڑی اماں آپ کو معلوم ہے فردوس کہاں چلی گئی؟"

لیکن انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ آنکھیں بند کئے لیٹی رہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گہری نیند میں ہوں۔ آنکھیں بند کئے وہ گہری سانسیں لیتی رہیں۔

مایوس ہو کر میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ پورے مکان میں سناٹے کی حکمرانی تھی۔ طرح طرح کے اندیشے مجھے ناگ بن کر ڈسنے لگے۔

میں جلدی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھی اور چاہا کہ دروازہ کھول کر باہر نکل جاؤں مگر پوری قوت صرف کرنے کے باوجود دروازہ نہ کھلا بلکہ زور زور سے ہلانے پر مجھے محسوس ہوا جیسے قفل پڑا ہو ـــــ دہشت کی ایک لہر میرے رگ و پے میں دوڑنے لگی۔

کیا فردوس مجھے یہاں بند کر گئی ہے۔؟ اچانک مجھے خیال آیا۔ ممکن ہے وہ مکان کے اندر ہو اور اپنے کسی عزیز سے بات چیت کر رہی ہو۔ میں دروازے سے واپس آگئی۔ میرے قدم اندر کی سمت اٹھنے لگے۔ میں جلدی سے اندر آگئی۔ یہاں کا ماحول بھی باہر سے کچھ زیادہ الگ نہ تھا۔ ہر سو بوسیدگی کی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے کمرے گرد آلود تھے۔ دیواریں بے رنگ اور ٹوٹی ہوئی۔ چاروں طرف لکڑیوں کے ستنے ہوئے جالے جیسے برسوں سے یہاں کوئی آباد نہ ہو۔ مجھے شدید حیرت ہوئی آخر یہ دونوں بوڑھے یہاں کس طرح رہتے ہیں۔ بڑھاپے میں ان کا خیال کون رکھتا ہے۔ یہ خود تو کمانے کھانے سے معذور ہیں۔ کمروں سے نکلی تو سامنے اوپری سیڑھیاں تھیں۔ میں لپک کر اوپر آئی اور زینے چڑھنے لگی۔ میرے دونوں پاؤں کانپ رہے تھے۔ جونہی میں نے آخری سیڑھی پر قدم رکھا میں بری طرح ڈر گئی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا سامنے ہی ایک تخت پر کوئی بوڑھا آدمی بیٹھا تھا۔ میلے کچیلے کپڑے پہنے۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔

"کیا فردوس یہاں آئی ہے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا میری کپکپاتی ہوئی آواز بہت مدھم نہ تھی مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ نہ میری طرف دیکھا مجھے اب وحشت سی ہونے لگی۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے کیا میں پتھروں کے دیس میں آگئی ہوں۔ جہاں ہر شخص ایک بے جان مجسمہ ہے۔ میں اوپر چڑھ آئی تب میں نے دیکھا وہاں عجیب و غریب شکل و صورت والے بے شمار لوگ ہیں۔ لاغر بچے ضعیف عورتیں مدقوق اور خستہ حال مرد پھر توبہ توبہ وہ منظر۔ وہاں اتنی گندگی تھی کہ تعفن سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ مجھے ابکائی آئی۔ میں نے بے اختیار ناک پر دوپٹہ رکھ لیا۔ میری اس حرکت پر وہ سب ہنسنے لگے۔

"کیا آپ کو فردوس کے بارے میں معلوم ہے۔ وہ کہاں چلی گئی؟" میں نے ایک ایک شکل دیکھ کر کہا مگر اُن میں سے کسی نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ وہ سب ہنستے رہے۔ اُنکی ہنسی بڑی خوفناک تھی۔ "ہو۔ ہو ـــ ہو ہو" جیسے وہ ناک کے ہنس رہے ہوں۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

کیا یہ سب پاگل ہیں؟ وحشی ہیں؟" میں نے خوف زدہ

ہو کر سوچا میرے دل و دماغ میں کھلبلی سی مچ گئی۔ فردوس کی باتیں ذہن میں گونجیں۔ بھلا میرے یہاں کے ننھیالی رشتے داروں سے ان کا کیا تعلق ہے! کیا یہی وہ رشتے دار ہیں — خوف و تجسس کے ملے جلے تاثرات کے زیر اثر میں انھیں غور سے دیکھنے لگی۔

یکایک تکلیف کی شدت سے میری چیخ نکل گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری پنڈلی میں کوئی تیز دھار آر پیوست ہو گیا ہو تڑپ کر نیچے دیکھا۔ تو وہ بڑھے ہوئے بالوں والا عجیب الخلقت آدمی اکڑوں بیٹھا میری پنڈلی میں اپنے بڑھے ہوئے گندے ناخن چبھو رہا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنی ٹانگ اس کی گرفت سے چھڑائی اور چیخ مار کے دیوار سے جا لگی۔ میری پنڈلی سے گرم گرم خون نکل کر شلوار کو سرخ کر رہا تھا۔ میری چیخ کی آواز پر وہ زور سے ہنس پڑے۔ مجھے یوں لگا جیسے دور کسی اجڑے ہوئے کھنڈر میں ایک ساتھ کئی خونخوار عفریت چیخ رہے ہوں۔ میں نے بھاگنا چاہا لیکن میرے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ وہ سب میری بے بسی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ میں دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ ابھی میرے ہوش و حواس بحال نہ ہوئے تھے کہ یکایک دور کھڑے ایک بچے نے اپنے گندے دانت نکالتے ہوئے ایک بڑا پتھر مجھے دے مارا۔ درد کی ایک گہری ٹیس کے ساتھ میں نے اپنا شانہ تھام لیا۔ کچھ دیر بعد ہاتھ ہٹایا تو تمام انگلیاں خون میں لتھڑی ہوئی تھیں۔

اسی وقت ایک بھیانک شکل والی عورت نے ٹوٹا جوتا اٹھا کر میری طرف پھینکا جو باوجود بہت بچاؤ کے میرے منہ پر لگا۔ درد کی شدت سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے میرا ایک دانت ٹوٹ گیا تھا۔ منہ سے بھل بھل خون بہنے لگا۔ منہ پر دوپٹہ رکھے میں نے بے بسی سے چاروں طرف نگاہ اٹھائی۔

یکایک نگاہ ایک کھلی کھڑکی پر جا کر ٹھہر گئی۔ میری جان میں جان آئی۔ میں نے ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ دوڑتے ہوئے کھڑکی کے پاس آئی یہ ایک بھری پری سڑک تھی۔ بے شمار لوگ آ جا رہے تھے گاڑیاں، سائیکلیں، بگھیاں — ان کی آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں میں پوری قوت سے چلائی — "خدا کے لئے میری مدد کرو مجھے اس گھر سے نکالو"

مگر کسی نے میری آواز پر توجہ نہ کی۔ میری پشت پر اس عمارت کے بدہیئت باسیوں کے ہنسنے کی خوفناک آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سب ایک آواز میں ہنس رہے تھے نیچے فٹ پاتھ پر ایک شخص بھورے سوٹ میں ملبوس تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ میں نے چلا کر کہا۔

اے بھائی سنو! ذرا پچھلی گلی میں آ کے اس مکان کا تالا کھول دو بھائی۔ خدا کے لئے مجھے اس مکان سے نکالو" میرے لہجے میں لجاجت پیدا ہو گئی۔ آدمی نے ہمدردی سے مجھ پر بھرپور نظر ڈالی اور سر جھکائے آگے بڑھ گیا۔ میں سوچ رہی تھی شاید وہ پچھلی گلی میں جا کے تالا کھولے گا اور مجھے اس دہشت ناک قید سے رہائی دلائے گا۔ مگر مجھے مایوسی ہوئی۔ میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ اب بھی وہ اپنی ہنسی جاری رکھتے ہوئے آگے بڑھنے کے لئے پر تول رہے تھے ان کے ارادے کچھ خطرناک تھے۔ میں سہم کر کھڑکی کی طرف جھک گئی۔ سڑک پر کالی شیروانی پہنے ہاتھ میں چھڑی لئے ایک بزرگ وہاں سے گزر رہے تھے ان کے ساتھ سفید برقع میں ایک خاتون بھی تھیں۔ امید کی کرن پھر لہرائی میں نے چیخ کر انھیں مخاطب کیا۔

"میاں جی خدا کے لئے میری مدد کریں۔ مجھے یہاں سے لے جائیں" انھوں نے بھی غور سے مجھے دیکھا۔ وہ شاید مجھے کوئی فاتر العقل عورت سمجھے۔ برقع والی خاتون نے جھک کر مرد کا ہاتھ پکڑا اور آگے کھینچ لے گئی۔

بے بسی کے احساس سے میرا دل ڈوبنے لگا ان وحشیوں سے بچنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ اس خیال کے آتے ہی میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے میں نے واپس پیچھے جانا چاہا لیکن وہ سب اکٹھے ہو کر میرے بالمقابل کھڑے ہو گئے۔

ایک بھیانک اور کریہہ صورت بڑھیا اپنے بڑے بڑے دانت نکالے میری طرف لپکی۔ اُس کے ہاتھ میں بھاری پتیلی تھی۔ میں نے اپنے بچاؤ کی کوشش کی لیکن اس کا ہاتھ پوری قوت سے حرکت میں آیا اور وزنی پتیلی آکر میرے سر پر لگی ایک گھٹی گھٹی سی کراہ میرے حلق سے نکلی۔ میں لڑکھڑا کر گری پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا بیہوش ہونے سے پہلے دھندلی آنکھوں سے میں نے دیکھا کہ اس بدرنگ بھاری برتن سے کچھ کاغذات نکل کر فضا میں بکھر رہے ہیں اور فردوس سارے بکھرے ہوئے کاغذات سمیٹ کر مجھے دے رہی ہے اسے دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گئی۔ کاغذات پکڑنے کے لئے میرا نحیف ہاتھ کانپتا ہوا آگے بڑھا مگر اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

ہوش آیا تو میں اپنے بستر پر تھی۔ اور صائمہ میرے نزدیک بیٹھی رو رہی تھی میرے جسم پر کئی گہرے اور بڑے زخم تھے تکلیف سے تمام بدن پھٹا جا رہا تھا۔ کراہ کر میں نے آنکھیں کھولیں۔ صائمہ میرے اوپر جھک گئی اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور روتے ہوئے بولی میں نے حسّام کو نانا جان کے پاس بھیجا ہے۔ امی۔ اور خرم ڈاکٹر کو لینے گیا ہے شاید آپ کو پتہ نہیں سوتے میں آپ کے اوپر سلیب سے پرانا سامان گر پڑا تھا۔ جانے کہاں سے دو بلیاں اوپر جا چڑھی تھیں۔

نن — نہیں صائمہ — وہ بلیاں نہیں — وہ پاگل تھے۔ دیوانے لوگ" کرب اور اذیت میں بمشکل میں اتنا ہی کہہ سکی۔ پھر میری زبان اینٹھنے لگی اور اگلے ہی لمحے میں بے ہوش ہو گئی۔

دوبارہ ہوش آیا تو میرے گرد بہت سے لوگ تھے میرے ماں باپ بہن بھائی اور میرے بچے۔ فیملی ڈاکٹر جھکا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کچھ بولنا چاہا مگر ڈاکٹر نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا اس نے ایک سوئی میرے بازو میں گھسیڑ دی۔ ایک بار پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

تیسری بار ہوش آیا تو میں نے خود کو قدرے بہتر محسوس کیا۔ میرا سر اور جسم کے مختلف حصے پٹیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ دماغ میں اس وقت بھی ہلکی سی ٹیس اٹھ رہی تھی۔ اور سر تو ایک پھوڑے کی طرح ڈکھ رہا تھا۔ میں نے بڑی دقت سے اپنی گردن موڑی اسلم کو سرہانے بیٹھے دیکھ کر مجھے اپنی تکلیف کا احساس زائل ہوتا محسوس ہوا وہ بے حد محبت سے مسکرائے۔ انھوں نے نرمی سے میرا شانہ تھپتھپایا — "کیسی ہو"؟

"ٹھیک ہوں" جواباً میرے لبوں تک بھی ایک پھیکی مسکراہٹ آئی: "آپ کب آئے"؟

"صائمہ کا ٹیلیگرام ملتے ہی پہنچ گیا" وہ دھیرے سے بولے خدا کا شکر ہے اب تم پہلے سے کچھ بہتر ہو۔ ورنہ میں تو تمہاری حالت دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

میں خاموشی سے کمرے کا جائزہ لینے لگی یہ دوسرا کمرہ تھا جس میں گھر والوں نے مجھے شفٹ کر دیا تھا تاکہ میرے کمرے کی صفائی کی جاسکے۔

اسلم نے مڑ کر میری طرف دیکھا "تمہاری ذرا سی لاپرواہی کتنی پریشانی لائی ہے"۔ انھوں نے قدرے ناراض ہوتے ہوئے کہا — "میں کہتا تھا نا پرانا سامان بیچ ڈالو جو تم نے سینت کر رکھا ہوا تھا۔ اب تمہیں اس کمرے میں شفٹ کرکے سب سے پہلے صائمہ نے نرگس اور مشیر کے ساتھ مل کر سلیب کی صفائی کی ہے۔ جانے کم بخت بلیاں کس طرح اوپر جا چڑھی تھیں کہ نیند کی حالت میں تمہارے اوپر آگرا۔

"ارے وہ سامان....." مجھے یاد آیا یہ تو میری مرحوم ساس کا کچھ پرانا کاٹھ کباڑ تھا۔ پیتل کا برتن جن میں رکابیاں، کٹورے گلاس، دیگچیاں وغیرہ۔ اُس میں ایک بڑا پاندان بھی تھا۔ میں خیالات کی لہروں میں بہنے لگی۔ میرا ارادہ تھا صائمہ کی شادی کے وقت انھیں الجھا کے جہیز میں دوں گی آخر اس کی مرحوم دادی کی نشانیاں تھیں اس کے ساتھ ہی مجھے ایک ایک کرکے پچھلی باتیں یاد آنے لگیں اور میں بے ساختہ ہو کر اسلم کا ہاتھ تھام

کے فرفرو ہو میں کہا۔

"پہلے مجھے بتاؤ۔ مجھے تم لوگ زخمی حالت میں کہاں سے اٹھا کر لائے تھے۔"

"بھئی کہیں سے نہیں تم اپنے بستر پر پڑی تھیں" اسلم نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ شاید تم نے کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا۔ ایسا اکثر ہو جاتا ہے۔ ان کے چہرے پہ گہری سنجیدگی کے آثار تھے۔

مگر مجھے یقین تھا۔ وہ مجھے بہلا رہے تھے۔ میں جھنجھلا گئی۔

"یہ میری حالت دیکھ رہے ہو" ـــ میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ یہ ثبوت ہے ان پاگلوں کی درندگی کا ـــ وہ مجھے مار ڈالنا چاہتے تھے اسلم! یقین کرو"

"مگر حقیقت یہ تھی بیگم کہ تم اس وقت خواب دیکھ رہی تھیں جب تمہارے اوپر سلیب سے بھاری سامان گر رہا تھا۔ تم پاگلوں کے درمیان ہرگز نہیں تھیں" اسلم نے مجھے محبت سے دیکھ کر کہا۔

"یہ ـ یہ ـ دیکھو ـــ اس خبیث کے بچے نے میرا شانہ توڑ دیا تھا پتھر مار کے۔ اور اس پاگل خوفناک عورت نے جوتا کھینچ مارا تھا میرے منہ پر" میرا ہاتھ بے ساختہ ٹوٹے ہوئے دانت کی طرف چلا گیا۔

"نامری کا ٹیبل۔ تمہارے شانے پر چین کا گلدان گرا تھا" ـــ اسلم نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور منہ پر ایک بھاری پتیلی گری جس سے تمہارے دانتوں کو بھی نقصان پہنچا ہے۔"

"نہیں۔ نہیں مجھے بہلاؤ مت۔ میں نے ان کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے کہا وہ خواب نہیں تھا۔ وہ حقیقت تھی۔ اس روز پھر فردوس آئی تھی مجھ سے جانے دیا آپ کی خالہ زاد بہن فریال کی دیورانی"

"فریال کی دیورانی؟ فردوس؟" اسلم نے حیرت سے مجھے دیکھا "تم اسے کیسے جانتی ہو؟"

وہ خود آئی تھی اسلم! اس نے اپنا تعارف کروایا اور مجھے ساتھ لے گئی ہمارا آبائی مکان دکھانے۔

اسلم کچھ پریشان سے ہو گئے۔ مگر فوراً ہی سنبھل کر بولے دیکھو زیادہ باتیں مت کرو نامری ڈاکٹر نے تمہیں زیادہ بولنے سے منع کیا ہے۔

"پہلے مجھے بتاؤ وہ خواب نہیں تھا نا ـــ تم لوگ مجھے پاگلوں کے درمیان سے اٹھا کر لائے تھے"

"میرے علاوہ تم اپنے گھر والوں سے بھی پوچھ لو۔ کہ انھوں نے تمہیں کس حالت میں پایا تھا۔ اچھا کیا تمہارے بچے بھی جھوٹ بولیں گے تم ذرا خرم اور حسام سے پوچھو۔

انھوں نے دونوں کو آواز دے کر بلایا اور یہی سوال ان سے دہرایا۔

"امی چیخ رہی تھیں ابو۔ ان کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور منہ سے بھی" خرم سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اور ابو اوپر سے سارا سامان امی کے اوپر گر گیا تھا" حسام نے کہا۔

"تم نے ـــ تم نے بچوں کو بھی سکھایا ہے" میں نے بے اختیاری سے کہا ـــ "تم لوگوں کی یہ ملی بھگت ہے۔ میں نہیں مانتی کہ وہ خواب تھا۔

"اچھا بھئی" ـــ اسلم جھنجھلا کر بولے ـــ "جو تمہارا جی چاہے سمجھو"

اپنی بے بسی پر میرا دل بھر آیا۔ یہ سب میرے اپنے تھے مگر انھیں میرے بیان پر یقین نہیں آ رہا تھا ـــ بے اختیار میں رونے لگی۔

"دیکھو ڈیئر ـــ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ یہ بول چال بالکل منع ہے۔ غنودگی کی حالت میں بھی تم چیختی رہی تھیں۔ اسلئے ڈاکٹر تمہیں نیند کا انجکشن دے کر سلائے رکھتے تھے ـــ اب اگر تم بولتی رہیں تو وہ مجھے پکڑیں گے آ کر۔"

تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ اس بار میں نے سوچا ہے کہ تمہیں بھی ساتھ ہی جدّہ لے جاؤں — بولو۔ حج کرو گی نا؟

میں نے مسکرا کر اپنے سر کو جنبش دی۔ یہ میری دیرینہ تمنا تھی۔ لیکن اس وقت میرے ذہن میں وہی پُراسرار مکان گھوم رہا تھا۔ بات یہاں ختم ہو گئی۔ میں نے سونے کے لئے آنکھیں موند لیں۔ اسلم کے ابّو یعنی میرے خالو اور میری خالہ (میری موجودہ ساس) جو مستقل طور پر قطر میں رہائش پذیر تھے اطلاع پاتے ہی بھاگم بھاگ مجھے دیکھنے پہنچے۔ ہر ایک سے میں نے اپنی بپتا کہی۔ مگر کوئی بھی میری بات پر یقین نہ کر سکا۔ سب لوگوں کا خیال تھا کہ میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ میں عجیب الجھن میں تھی۔ میرے لئے وہ سب ایک حقیقت تھا مگر جب اس کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتی تو وہ لوگ مجھے روک دیتے کہتے میری حالت بہتر ہوتے ہی وہ ساری تفصیل سن لیں گے۔ وہ سب مل کر میرا دھیان بٹانے کی کوشش کرتے لطیفے سنا کر ہنساتے۔ آہستہ آہستہ میرے زخم بھرنے لگے البتہ سر کا زخم بھرنے لگے البتہ سر کا زخم کاری تھا اسے بھرنے میں خاصے وقت کی ضرورت تھی۔

آخر ایک روز خالو جان نے کہا۔

"تمہارے سر پہ بھاری پاندان گرا تھا نامرہ خیریت یہ ہوئی کہ اس کا صرف ایک کونا لگا تھا۔ یہ پاندان اتنا بھاری ہے کہ اگر مکمل سر پہ گرتا تو فوری موت واقع ہو جاتی۔ خدا کا شکر ہے تم بچ گئیں"۔

"اچھا خالو جان مجھے بس اتنا بتا دیں کہ کیا آپ کا کوئی آبائی مکان بھی تھا"

"نہیں"۔ انھوں نے سر ہلایا۔ "وہ صغیرہ کا آبائی مکان تھا جو اس کے جہیز میں اس کے ماں باپ نے اسے دیا تھا۔"

"وہ کہاں ہے اور آپ نے مجھے اس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا" میں نے پوچھا

"اس لئے کہ اس کے بارے میں بتانے کا اب کوئی فائدہ نہیں" خالو جان نے کہا — کاغذات نہ ہونے کی بنا پر ہم مقدمہ ہار گئے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد جس خاندان کو ہم لوگوں نے وہ مکان رہنے کے لئے دیا تھا انھوں نے اس پر قبضہ کر لیا ہے — بیٹی نامو چھوڑو ان باتوں کو"۔ — خالو جان کی آواز بھرا گئی شاید انھیں اپنی مرحوم بیوی یاد آ گئی۔

"لیکن خالو جان میں آپ کے مکان پر گئی تھی"۔ میں نے کہا اور مکان کا سارا نقشہ ان کے سامنے کھینچ کر رکھ دیا — خالو جان کے چہرے کی رنگت زرد ہو گئی — میں اپنی کامیابی پر مسکرا دی۔

"کیا اب بھی آپ نہیں بتائیں گے کہ وہ مکان کہاں ہے؟"

"کیا کرو گی پوچھ کر؟" خالو جان نے بھاری لہجہ میں کہا۔

ہم وہ مکان پھر حاصل کر سکتے ہیں۔ ان پاگل اور دیوانے لوگوں سے مقدمہ لڑ کر وہ مکان لے سکتے ہیں خالو جان"

میرے خون میں ابال آنے لگا۔

"کون پاگل اور دیوانے لوگ" خالو جان نے آہستہ سے کہا۔ وہ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"وہی جنھوں نے اس پر قبضہ کر رکھا ہے" میں نے کہا۔ خالو جان پھیکی سی ہنسی ہنس دئے۔

"میں نے تمہیں بتایا ہے نامرہ کہ وہ کاغذات ہمارے پاس نہیں ہیں جن کے برتے پہ ہم مقدمہ جیت سکیں۔ صغیرہ کی موت بہت اچانک ہوئی تھی۔ وہ کاغذات کے بارے میں مجھے کچھ نہ بتا سکی"

"مجھے یقین ہے خالو جان! — وہ کاغذات ضرور ہوں گے ان کے سامان میں کہیں"

ہم نے اس کے تمام صندوقوں اور الماریوں کی تلاشیاں لے لی تھیں وہ کاغذات سارے گھر میں کہیں بھی نہ مل سکے۔

اچانک میرے ذہن میں وہ بدرنگ بھاری پتیلی گھوم گئی

تھی جس میں سے کاغذات نکل کر ادھر ادھر فضا میں بکھرتے
گئے تھے۔
"وہ جانے فردوس مجھے چھوڑ کر اچانک کہاں چلی گئی
تھی" میں بڑبڑائی یوں لگتا ہے ضرور ان وحشیوں نے بیچاری کو
کہیں غائب کردیا ہوگا۔ وہ میری ہمدرد تھی۔ مجھے آبائی مکان
دکھانے لے گئی تھی۔ پھر آخر وقت میں کہاں سے آگئی تھی"
سوچتے سوچتے میں بلا ارادہ بستر سے اٹھ گئی میری خالہ نے جنھیں
میں باجی کہتی تھی جلدی سے اٹھ کر مجھے شانوں سے تھام لیا اور
نرمی سے بولیں۔
"ناصرہ لیٹ جاؤ۔ آرام کرو۔ تمہاری طبیعت خراب ہو
جائیگی" "باجی میں ٹھیک ہوں" اب میں نے جھنجھلا کر کہا
"بالکل ٹھیک ہوں مجھے کچھ نہیں ہوا"
شاید وہ سوچ رہی تھی کہ اب پھر میری ذہنی رو بہنے
لگی ہے۔
"مجھے اس مکان میں لے چلیں۔ خالو جان ہم سب مل کر
کاغذات ڈھونڈیں گے ہم ان کا مقابلہ کریں گے جنھوں نے
غاصبانہ مکان پر قبضہ کرلیا ہے"
میں نے جوش سے کہا اور ایک بار پھر اٹھنے لگی "ڈاکٹر
کو فون کرو اسلم" خالو جان گھبرا سے گئے۔ اسلم نے فکرمندی
سے مجھے دیکھا اور وہ اٹھ کر جانے لگے۔
"مجھے کچھ نہیں ہوا" میں نے تیز لہجہ میں کہا۔ مت بلاؤ
ڈاکٹر کو میری بات سنو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں"
مگر اسلم میری بات سنے بغیر کمرے سے چلے گئے
خالہ نرمی سے کبھی میرا ہاتھ سہلاتیں کبھی میرا سر دبانے لگتیں۔
"مجھے بتائیں خالو جان! کیا ثریا اسلم کی خالہ زاد بہن
نہیں ہے کیا اس کی دیورانی کا نام فردوس نہیں ہے"
"ہاں۔ ہاں ہے" خالو جان آہستہ سے بولے جیسے مجھے
محض تسلی دے رہے ہوں۔
"پھر ــــ پھر بتائیے وہ خواب کیسے ہوا؟"

"تم نے اسلم سے ان کا ذکر سنا ہوگا۔ انھوں نے اپنی رائے
ظاہر کی۔
نہیں۔ نہیں خالو جان۔ وہ خود حیران ہیں کہ میں انھیں کیسے
جانتی ہوں۔
اسلم کے ساتھ ڈاکٹر آیا اور میرے احتجاج کے باوجود مجھے
نیند کا انجکشن دیا گیا۔
آہستہ آہستہ میں بالکل ٹھیک ہوگئی۔ گھر کے کام کاج کرنا
روز کا معمول ہوگیا مگر وہ سب اس موضوع پر بات کرنے
سے اب بھی گریز کرتے تھے وہ مجھے بہلانے کے لئے کبھی
پکنک کا پروگرام بناتے کبھی فلم کا میرے ساتھ گھر کے تمام
لوگ سیر و تفریح کے لئے جاتے۔ ہم سب بہت لطف اندوز
ہوتے ہنستے بولتے گھومتے پھرتے مگر میں کبھی اس پُراسرار
مکان کے تصور سے چھٹکارا نہ پا سکی۔
اس روز گھر کے صحن میں سب ہی لوگ جمع تھے امی
ابو' خالو جان خالہ جان اور سب۔ میں نے وہ سارا واقعہ
انھیں تفصیل سے سنایا جسے وہ میرا خواب سمجھنے پر مصر تھے
ــــ "کیا تم ہمیں اس مکان تک لے جاسکتی ہو" خالو جان
نے اچانک پوچھا۔
میں چونک اٹھی۔ معاملہ اب سنجیدہ ہوگیا تھا میں نے
ذہن پر زور دیا راستہ میرے لئے ناقابل فہم نہ تھا۔ میں انھیں
لے جانے پر آمادہ ہوگئی۔
پچھلی گلی سے نکل کر ہم بڑی شاہ راہ پر آئے اور مختلف
گلیوں سے ہوتے ہوئے وہاں پہنچ گئے مگر یہ کیا۔ اب وہاں پرانا
مکان کہیں نظر نہیں آیا البتہ اس کی جگہ ایک بڑا شاپنگ پلازا
تھا۔ میں نے خالو جان کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔
ہاں ناصرہ یہ وہ مکان ہے جس پر ان لوگوں نے قبضہ کرنے
کے بعد شاپنگ پلازا تعمیر کیا ہے۔ اور کاغذات نہ ہونے کی
بنا پر ہم یہ مقدمہ ہار گئے تھے۔
"کاغذات" میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔

فردوس کو ضرور معلوم ہوگا کہ وہ کاغذات اب کہاں ہیں" میں نے
کہا تو ان سب کے چہروں پہ ایک رنگ سا آکر گذر گیا۔ پھر خالو جان
نے کہا۔
"فردوس کو مرے ہوئے تقریباً بائیس سال ہو گئے ہیں ۔"
شاید انکی روح تمہارے خواب میں آئی تھی ۔۔۔ باقی لوگوں
نے ایک زبان ہو کر کہا ،
اس نے ۔ مجھے کاغذات سمیٹ کر دیئے تھے ۔ اس
وقت جب اس پاگل عورت نے بے رنگ کی وزنی پتیلی
میرے سر پہ ماری تھی کاغذات اس میں سے نکل کر فضا
میں بکھر گئے تھے .... وہ ..... وہ ..... یقیناً پاندان میں ہونگے
میں نے جوش میں آکر کہا ۔۔۔ اسلم تم نے بتایا تھا نا ۔۔۔
میرے سر پہ پاندان گرا تھا ۔ کاغذات ضرور اسی پاندان میں
ہونگے ۔

میری بات سن کر سب لوگوں نے ایک دوسرے
کی طرف دیکھا ۔ ہم تیزی سے چلتے ہوئے گھر پہنچے ۔ یہاں صائمہ
اپنی دونوں خالاؤں نرگس اور مسرت کے ساتھ بیٹھی کیرم کھیل
رہی تھی ۔ اسلم نے اس سے پوچھا ، صائمہ تمہاری امی کے سر پہ
جو پاندان گرا تھا کیا اس میں کچھ کاغذات بھی تھے ۔"
" جی پاپا " اس نے بتایا ۔۔۔ " جب پاندان گرا تھا
تو وہ سارے فرش پر بکھر گئے تھے ۔ بہت بوسیدہ اور پرانے
تھے وہ کاغذات میں نے پھاڑ دے کر کوڑے میں پھینک
دیئے تھے "

" اف ۔ میں نے سر تھام لیا ۔ معلوم پہلے پھینکا گیا
کوڑا جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوگا ۔۔۔ آپ لوگوں نے
نیند کے انجکشن دے دے کر میرے ذہن کو سلائے رکھا ۔۔۔
میں نے افسوس سے کہا ۔
فردوس نے پوری کوشش کی تھی مگر آپ لوگوں نے
اسے ناکام کر دیا "
" ناصرہ ٹھیک کہتی ہے " خالو جان نے کہا ۔ اگر ہم لوگ
اس کی چیخ و پکار کو ذہنی چوٹ کا اثر نہ سمجھتے تو ممکن تھا کہ
ہم وہ کاغذات حاصل کر کے مقدمہ جیت لیتے
سب ہکا بکا ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے ۔

* * *

## بقیہ فن اور فنکار

اسکی کوشش و خوبی اسے فنکار کا درجہ دیتی ہے اور اسکی یہ
کوشش و خوبی فن کہلاتی ہے ۔
" موسیقی کو اپنانے والا موسیقار ، رنگوں سے کھیلنے
والا مصور اور الفاظ کا غازی ادیب و شاعر کہلاتا ہے موسیقی
میں الفاظ بولتے ہیں اور احساس خاموش ہوتا ہے ، شاعری
میں الفاظ خاموش اور احساس بولتا ہے لیکن رنگوں کی دنیا
ان دونوں کا مجموعہ ہوتی ہے اس میں الفاظ احساس بیک وقت
خاموش بھی ہوتے ہیں اور آواز بھی پیدا کرتے ہیں ۔
فن کی معراج یہ ہے کہ فن ذہن و روح کو محو کر دینے
کی صلاحیت پا جائے اور فن کی معراج فنکار کے عظیم ہونے
کا ثبوت ہے ۔

## ایک وضاحت

جون کے گلبن میں عکس ریز کے تحت محترم غلشن
بڈوودی کی کتاب " ایک آواز " پر تبصرہ جناب
مظہر الحق علوی نے لکھا ہے یوں تو تبصرہ کے اختتام پر تبصرہ
موصوف کا نام لکھا ہے لیکن کاتب نے غلطی سے تبصرہ کے
شروع میں باکس میں جلی حرفوں سے ظفر ہاشمی کا نام لکھ دیا
ہے جو مضحکہ خیز لگتا ہے ۔ دراصل ظفر ہاشمی نے تنقیدی
شہ پارے پر تبصرہ لکھا تھا لیکن موصوف کا نام غیر مناسب
جگہ پر بھونڈے پن سے لکھ دیا گیا ۔ ہم مصنف تبصرہ اور
قارئین سے معذرت خواہ ہیں ۔

(ادارہ)

وزیر آغا (پاکستان)

# غزل

سکھا دیا ہے زمانے نے بے بصر رہنا
عبر کی آنچ میں جل کر بھی بے خبر رہنا
تمام عمر ہی گزری ہے دستکیں سنتے
ہمیں تو راس نہ آیا خود اپنے گھر رہنا
سحر کی اوس سے کہنا کہ ایک پل تو رکے
کہ ناپسند ہے ہم کو بھی خاک پر رہنا
وہ خوش کلام ہے ایسا کہ اس کے پاس ہمیں
طویل رہنا بھی لگتا ہے مختصر رہنا
شجر پہ پھول تو آتے رہے بہت لیکن
سمجھ میں آ نہ سکا بے ثمر رہنا
عجیب طرزِ تکلم ہے اس کی آنکھوں کا
خموش رہ کے بھی لفظوں کی دھار پر رہنا
ورق ورق نہ سہی عمر رائیگاں میری
ہوا کے ساتھ مگر تم نہ عمر بھر رہنا
ذرا سی ٹھیس لگی اور گھر کو اوڑھ لیا
کہاں گیا وہ تمہارا نگر نگر رہنا

کرشن کمار طور (دھرم شالہ)

# آزاد غزل

خشک آنکھوں کو اشک تر دے۔
اپنے ہونے کی اب کوئی تو خبر دے
تیز تر کر رابطوں کے چراغوں کی ہر لو
خواہشوں کے دامن کو جہرہ جہرہ بھر دے
آزما میرے حوصلے کو کسی دن
پائے جادہ کو آغوشِ سفر دے
میرے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر بھی کر
دربدر گھوما ہوں گھر دے
راکھ خود احتسابی کی چہرے پہ مل طور
زلیست کاروبارِ زیاں ہے سر دے

کیف حسہرامی (کولاکات)

# غزل

پہنچ گئے سرِ مقصد تو جان ہار گئے
طلسمِ عارض و لب کا بیان ہار گئے
کشش نے ساتھ بھی چھوڑا تو ہم دفا کی قسم
جہانِ عقل میں اب کون پوچھتا ہے ہمیں
دلا سکیں گے یقین وفا بھی اس کو!
کچھ ایسی وضع سے تہذیبِ حسن کی اس نے

نشانہ جیت کے بھی ہم کمان ہار گئے
لذیذ تھی جو وہی داستان ہار گئے
اُس اک زمین سے سات آسمان ہار گئے
جو با اثر تھی جنوں کی وہ شان ہار گئے
اس ایک وہم میں سارے گمان ہار گئے
کہ اہلِ دل بھی غزل کی زبان ہار گئے

ظہیر فتح پوری (پاکستان)

## غزل

(اس غزل میں شاعر نے بحروں کے تجربے کئے ہیں۔ صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے —— ایڈیٹر)

مورے من موہن ترے مکھڑے پہ کھلے بیلے کا سجیلا پن ہے
نصیبہ ایکے بہت اترایا تبسم ہے یا کنول روشن ہے

لگاوٹ میں یہ سجاوٹ ہے جب لگن میں تیری چبھن کیا ہوگی
ابھی چمکا ہے حیا کا سورج ابھی سے سارا بدن کندن ہے

تمناؤں کو بہت پوجا ہے چھپے کونوں میں بہت روئے ہیں
یہ دیوانہ سا ہٹیلا دل ہی ہمارا سب سے بڑا دشمن ہے

جدائی کے جاڑو بھاڑے میں کل بھل آنکھوں سے سدھارے تھے تم
نہ جانے کیا تم پہ بیتی ہوگی ابھی سے من میں یہی تڑپن ہے

جو پھوٹی لالی تو دل کی پنگھٹ پہ یادوں کا جمگھٹا لے بیٹھے
بہت چھلکی ہے دکھوں کی گاگر جبھی اتنا تر بہ تر دامن ہے

اسی کے آگے جہاں کی ساری مدھر خوشبوئیں لجا کر گندیں
تمہاری قربت کی سندر کوری صراحی میں یہ جو سوندھا پن ہے

بڑی شوخی سے کھلے جاتے ہو ظہیر اتنا تو بتاتے جاؤ
جہاں ہمجولی سے ہولی کھیلی کہاں وہ کافر کلبندرا بن ہے

آنجہانی پریم وار برٹنی

## غزل

(زیر ترتیب مجموعہ "میرا فن میرا لہو" کا ایک ورق)

سرد سرد آنکھیں ہیں سانس سانس بھاری ہے
موسم گریزاں کی پہلی برق باری ہے

دل سی قیمتی شے بھی جس نے ہنس کے ہاری ہے
اس بساطِ عالم کا کون وہ جواری ہے

آس تیرے ملنے کی سونپ دی ہے آنکھوں کو
آنچ تیری چاہت کی روح میں اتاری ہے

عمر ہے کہیں لمبی ایک سانس کی ڈوری
ایک پل جدائی کا زندگی پہ بھاری ہے

زندگی کے رستوں دل بنا دولہا اکثر
زندگی نہ جانے کیوں آج تک کنواری ہے

ہم تو تھک گئے رو کر زخم دل کو دھو دھو کر
جاگ او شبِ ہجراں اب تمہاری باری ہے

پریم کو پتہ کیا تھا غم ہی اسکی منزل ہے
وہ تو یہ سمجھتا تھا ہر خوشی سے یاری ہے

فرحت نواز (پاکستان)

## غزل

وہ چند روز مرے پاس گو رہا بھی نہیں
مرے خیالوں سے لیکن کبھی گیا بھی نہیں
نہ کوئی پیار کا اقرار نہ کوئی وعدہ
وہ پھر بھی مرا ہے گرچہ مرا ہوا بھی نہیں
میں موسموں کے کئی رنگ چنتی رہتی ہوں
وہ مجھ سے خوش بھی نہیں ہے مگر خفا بھی نہیں
بنائے جتنے گھروندے بھی میں نے خوابوں کے
کسی میں ننھا سا تعبیر کا دیا بھی نہیں
میں دیکھ کر اسے حیرت سے سوچتی ہی رہی
وہ کوئی لمحہ تھا شاید کہ جو رکا بھی نہیں
کبھی تھے باعث آرائش چمن فرحت
اور اپنے ہاتھ میں اب دامنِ ہوا بھی نہیں

ہندی گورکھپوری

## غزل

بگولوں سے بیاباں کا مقدر کچھ نہیں کہتا
اٹھا کرتے ہیں طوفاں اور سمندر کچھ نہیں کہتا
تحیر سے زباں ہے گنگ رعب حسن ایسا ہے
تکے جاتا ہے آئینہ برابر کچھ نہیں کہتا
میں جب پر تولتا ہوں بات کرتا ہوں ستاروں سے
سمٹ جاتے ہیں بال و پر تو اکثر کچھ نہیں کہتا
بہت صبر آزما ہے صبر و استقلال کی منزل
ہے گردش میں مسلسل پھر بھی ساغر کچھ نہیں کہتا
جو کہنا چاہتا ہوں میں بھری محفل میں کہتا ہوں
کسی کو میں کبھی محفل کے باہر کچھ نہیں کہتا
خس و خاشاک ہوں یا خار ہوں یا راہ کے ذرے
چڑھے آتے ہیں سب پیرے برابر کچھ نہیں کہتا
تمہارا ظرف ہے جو چاہے کہہ لو اپنے ہندی کو
میں خود اپنی زباں سے بندہ پرور کچھ نہیں کہتا

اسد رضوی (مظفر پور)

## غزل

تیرے میرے درمیاں جو رابطہ رہ جائے گا
زندگی سے زندگی کا سلسلہ رہ جائے گا
تو ہی تو ہے زندگی بھر کی پرستش کا مآل
کھو کے تجھ کو پاس میرے کیا بچا رہ جائے گا
جاگتی آنکھوں کا موسم اور خوابوں کا عذاب
دیکھنے والا تماشا دیکھتا رہ جائے گا
ہم مسافر ہیں غبار کارواں ہو جائیں گے
منزلیں کھو جائیں گی اور راستہ رہ جائے گا
ہم زمیں والوں کی ساری سازشیں مٹ جائیں گی
آسماں پر بس خداؤں کا خدا رہ جائے گا
جگمگاتے جسم کی تابندگی رہ جائے گی
سوکھتے ہونٹوں پہ اک موسم ہرا رہ جائے گا
حرف کی صورت کتابوں میں لکھا رہ جاؤں گا
مدتوں مجھ کو زمانہ سوچتا رہ جائے گا
مسکراتے موسموں کی دلکشی کھو جائے گی
تم نہ ہوگے جب اسد دنیا میں کیا رہ جائے گا

شاہد نعیم (جدہ)

## غزل

وہ بھی تو غیر ہوا میری سنے گا کیسے
چھوڑ کر مجھ کو رہے گا تو رہے گا کیسے

دھوپ ہی دھوپ ہر اک سمت نظر آتی ہے
آدمی، سایہ نہ ہوگا تو چلے گا کیسے

آج کے دورِ سفر میں کوئی ارماں نہ کرو
تم ہی بتلاؤ کہ یہ رشتہ نبھے گا کیسے

خوف تو وہم ہے لیکن یہ بتاؤ مجھ کو
کوئی بھی جس کا نہیں ہے وہ جیئے گا کیسے

ٹھیک ہے تم مرے نزدیک ہو تم ڈرتے ہو
جس سے میں دور ہوں وہ مجھ سے ڈرے گا کیسے

میں تو رسوا ہوں مجھے اور بھی رسوا نہ کرو
ورنہ اپنا مجھے پھر کوئی کہے گا کیسے

میں اسے جینے نہ دوں گا یہی وہ کہتا ہے
میرے قبضے میں ہے وہ مجھ سے بچے گا کیسے

ایک ہی بات میں وہ مجھ سے ہوا ہے بدظن
دوسرا وار وہ سہے گا تو سہے گا کیسے

تم سزا دے نہ سکے جان کے دشمن کو اگر
اب وہ قدرت کی سزا سے بچے گا تو بچے گا کیسے

تم جو کہتے ہو کہ مانو مرا کہنا شاہد
مان لوں گا تو کوئی مجھ سے بڑھے گا کیسے

اختر منظمی (گوالیاد)

## غزل

جب لگے خود کو روشناس سے ہم
ہٹ گئے آئینے کے پاس سے ہم

شک کریں تو کسی پہ کیسے کریں
کس کو مجرم کہیں قیاس سے ہم

ملتے جلتے ہیں کس خلوص کے ساتھ
ایک احسان ناشناس سے ہم

جب بھی خوش پوش لوگ ملتے ہیں
خود کو لگتے ہیں بے لباس سے ہم

زندگی نے ہمیں دیا کیا ہے
خرچ کرتے جو اپنے پاس سے ہم

جن دنوں حاضری ضروری تھی
غیر حاضر رہے کلاس سے ہم

یہ تمنا ہی رہ گئی دل میں
دیکھتے زندگی کو پاس سے ہم

شاعری کے لئے بھی کام کی بات
ڈھونڈ لاتے ہیں آس پاس سے ہم

خوش دلی کی سزا نہ ہو منظمی
اب جو رہنے لگے اداس سے ہم

احسان شالم (بھاگلپور)

## غزل

کسی جگہ بھی نہ ٹھہرا وہ رہگذر میں تھا
سفر میں دھوپ تھی میں دھوپ کے سفر میں تھا

سمندروں کے وہ کب حلقۂ اثر میں تھا
جو ایک حوصلہ ٹوٹے ہوئے بشر میں تھا

سب اپنے شہر میں اس طرح گھورتے تھے مجھے
کہ جیسے میں ہی کوئی اجنبی نگر میں تھا

سمندروں کی وہ سوغات گھر پہ لائے تھے
مگر میں پیاس کا دریا لئے سفر میں تھا

سمجھ کے حرفِ غلط کیوں مٹا دیا مجھ کو
کہ میرا نام ترے ذکرِ معتبر میں تھا

وہ شخص دن کے اجالے میں رہ گیا محروم
دریچہ ایک نہ جس آدمی کے گھر میں تھا

بکھر گیا وہی لمحوں کی بھیڑ میں اے شالم
وہ ایک خواب جو صدیوں مری نظر میں تھا

## غزل

صالح ندیم (الہ آباد)

سمندروں کی وہ گہرائیوں میں ملتا تھا
عجیب شخص تھا تنہائیوں میں ملتا تھا

نئے تھا ہاتھ میں امن وامان کا پرچم
وہ ایک شخص جو بلوائیوں میں ملتا تھا

عجیب بات کہ دستِ خرد میں شمشیر ہے
بلا کا جوش تو صحرائیوں میں ملتا تھا

خزاں نے کر دیا اک برگِ بے اماں ورنہ
ہمارا حسن تو پرچھائیوں میں ملتا تھا

لبِ حریف پہ یہ ذکر کس طرح آیا
ہمارا نام تو شیدائیوں میں ملتا تھا

بدل کے بھیس نظر آسماں پہ آتا تھا
وہ آدمی جو کبھی کھائیوں میں ملتا تھا

یہ سرخ خون کے قطرے ندیم جو مرے دل پر
لہو کا داغ تو رعنائیوں میں ملتا تھا

## غزل

عامر رائے بریلوی
(سلطانپور)

آہ و زاری شورشِ حالات کا درماں نہیں
بے نیازِ غم بھی لیکن سنگ ہے انساں نہیں

ایک دن غنچے بھی ہو گئے زینتِ شاخِ چمن
کون کہتا ہے بہار آنے کا اب امکاں نہیں

اسکی رحمت سے ہے شکوہ سنج لیکن یہ بھی سوچ
کیوں تجھے اب تک خیالِ تنگیٔ داماں نہیں

مشکلیں ہی جذبۂ ایمان کی میزان ہیں
جو ڈرے ہے امتحاں سے صاحبِ ایماں نہیں

میں نے مانا ہے نگاہِ یار عامر مہرباں
لیکن اپنی بے نیازی کا کوئی درماں نہیں

## غزل

عنبر ہاشمی (اندور)

دردِ دل ہم ان سے جس دم کہہ گئے
جھنجھلا کر کے وہ ہم پر رہ گئے

آہ بحرِ عشق میں ہم بہہ گئے
دل کے ارماں دل ہی دل میں رہ گئے

وہ ہماری آہ بھی نہ سہہ سکے
ان کے ہم سارے مظالم سہہ گئے

دل میں ہماں جتنے تھے ارمانِ دید
سب وہ دل کے داغ بن کر رہ گئے

اشک آئے اس رخِ روشن پر کیا
چاند پر آ کے ستارے بہہ گئے

دوستو کل آ کے بزمِ ناز میں
کیسے کیسے شعر عنبر کہہ گئے

ڈاکٹر عبدالمنان طرزی (دربھنگہ)

# مظہر امام کا لہجہ

## (صرف غزلوں کے آئینے میں)

شعر یا غزل یا گفتگو جب بھی ہوگی، لفظوں کے سہارے ہوگی لفظ ہی ایک ایسا سرمایہ ہے جو بولنے والے اور سننے والے کے درمیان مشترک ہوتا ہے۔ جب اسی مشترک سرمائے سے تجربات اور مشاہدات کے اظہار کے لیے کوئی پیرایۂ بیان اختیار کیا جاتا ہے تو اس میں الفاظ کی ترتیب و تنظیم کے علاوہ مقرر یا شاعر کوئی ایسی چیز بھی داخل کر دیتا ہے جو صحت اور دیانتداری کے ساتھ ایک طرف تو شاعر یا مقرر کا مافی الضمیر سننے والوں تک پہنچانے کا کام کرتی ہے اور دوسری طرف اس ترسیل سے شاعر کی انفرادیت بھی مرتب کرتی ہے۔ یہی ترسیل اور اسلوب کی انفرادیت قاری یا سامع اور شاعر یا مقرر یا ادیب کیلئے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ ایک ہی مشترک سرمائے سے کام لینے کے باوجود بھی اگر مختلف ذہنوں کی پہچان نہ ہوسکے تو سننے والے یا پڑھنے والے "کس نے کہا" سے ناواقف رہ جائیں گے۔ پیرایۂ اظہار میں الفاظ کی ترتیب و تنظیم کے علاوہ داخل کی جانے والی چیز جو اس ترتیب و تنظیم کو اس مخصوص شاعر یا مقرر کا بنا دیتی ہے — نہ تو لفظوں میں موجود رہتی ہے اور نہ معنی میں، بلکہ ان دونوں سے الگ شاعر یا مقرر کی شخصی تعبیر میں رہتی ہے۔ اس چیز کا نام لہجہ ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ لہجہ اکتساب اور تربیت سے بھی نہیں بنتا ہے۔ اکتساب اور تربیت سے فن کاری اور تہذیب تو پیدا ہوسکتی ہے لیکن لہجہ نہیں پیدا ہوسکتا۔ لہجہ مقرر یا شاعر کی تمام تر شخصیت کے مکمل ترین ردعمل میں ریشے کی طرح موجود جاری و ساری وحدت ہے۔ ممکن ہے مقرر یا شاعر کو اسکی موجودگی کا شعوری طور پر احساس یا ادراک بھی نہ ہو۔ یہ وہ صفت ہے جو الفاظ کو اصطلاح اور لغت کے معنوی حدود سے نکال کر وسعت بخشتی ہے۔ یہ سننے والوں کے لاشعور پر کچھ اس طرح اثر انداز ہوتا ہے کہ ہر سننے والا، الفاظ کی ایک ہی ترتیب و تنظیم کی جداگانہ تاویل کر لیتا ہے۔ شاعر یا مقرر کیلئے لہجہ بذاتِ خود ایک غیر یقینی معاملہ ہے لیکن پڑھنے والے اور سننے والے کے لئے اس کے برعکس ہے۔ ولی، میر، غالب، مومن، شاد، داغ، اقبال، فیض، جمیل مظہری، پرویز شاہدی اور اجتبیٰ رضوی وغیرہ کے لہجے سننے والے یا پڑھنے والے کیلئے اس قدر متعین اور مرتب ہیں کہ ایک کے شعر پر دوسرے کا دھوکا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے پڑھنے والے کے یہاں مختلف کہنے والوں کے درمیان جو بات تمیز و تفریق کی بنیاد بنتی ہے وہ لہجہ ہی ہے۔

ہر عہد میں اپنا لہجہ رکھنے والے کچھ ہی شعراء ہوتے ہیں جن کے لہجے کی نقالی ان کے اور ان کے بعد کے عہد کے شعراء کی اکثریت کرتی ہے۔ لہجہ حقیقت یہ ہے کہ شاعر کی شخصیت کے ترکیبی عناصر کے مشترکہ خمیر سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ مشترکہ خمیر اس قدر پیچیدہ، غیر متعین اور غیر واضح ہے کہ اسکی کوئی حکیمانہ یا منطقی تعریف ممکن نہیں۔ یہ بس ہے۔ اگر ایک طرف اس کے وجود سے انکار ممکن نہیں تو دوسری طرف اس کے حدود کی تعین محال ہے ہر لہجہ ہر عہد میں جدید ہوتا ہے او کہ نہ ہو جبکہ یہی جدت لہجوں کے فرق کی بنیاد ہوتی ہے۔ کوئی دو لہجے ایک سے نہیں ہوتے۔ بات یہ ہے کہ کچھ لہجوں کی عمر طویل ہوتی ہے اور کچھ کی مختصر۔ لہجوں کی عمر کا طول شخصی خمیر کی لہروں کی شدت پر منحصر ہے۔ جتنی شدت کی لہریں ہونگی اتنا ہی طویل العمر لہجہ ہوگا۔ آخر کیوں سعادت یار خاں رنگین، جان صاحب اور بہت سارے دوسرے شعراء کے لہجے عالمِ طفولیت ہی میں دم توڑ گئے۔ اور کیوں میر غالب اور اقبال کے لہجے صدیاں منا رہے ہیں۔ اس لئے کہ نقلی لہجے

جا سکتے ہیں

اس طرف ادبی جرائد میں جدید لب و لہجہ کی کچھ باتیں سننے اور دیکھنے کو ملیں اس پر تعجب بھی ہوا کیونکہ الفاظ جدید اور قدیم ہو سکتے ہیں معانی جدید اور قدیم ہو سکتے ہیں شعرا جدید و قدیم ہو سکتے ہیں لیکن لہجے جدید اور قدیم نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ ہر لہجہ ہر عہد میں جدید ہوتا ہے۔ جبکہ کوئی دو لہجے یکساں نہیں ہوتے۔ یہاں پر یہ اعتراض بھی ہو سکتا ہے کہ جدید اور قدیم معانی بھی تو یکساں نہیں ہوتے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک مدت تک ایک لفظ ایک ہی معنی میں خواہ وہ جدید یا قدیم استعمال ہوتا ہے۔ لیکن وہ معنی الفاظ کے استعمال کرنے والے کی زندگی سے بندھا نہیں رہتا جبکہ لہجہ صاحبِ لہجہ کے ساتھ شروع ہو کر ختم ہو جاتا ہے اس بات کا صحیح اندازہ غالبؔ اور فانیؔ کے ایک شعر کے موازنے سے ہو سکتا ہے ؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں  غالبؔ

بہلا نہ دل نہ تیرگیٔ شامِ غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں  فانیؔ

سطحی طور پر دیکھنے والا شاید یہ کہہ دے کہ فانیؔ کے لہجے پر غالبؔ کا اثر ہے لیکن دونوں ہی لہجے حقیقت یہ ہے کہ منفرد ہیں۔ فانیؔ کے یہاں غالبؔ کی نقالی نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دونوں شخصیتوں میں آشنائی لذتِ غم پائی جاتی ہے لیکن اس لذت کے اظہار یا ترسیل کا انداز منفرد یا جداگانہ ہے جب کہ دونوں اشعار میں الفاظ کا سرمایہ تقریباً ایک ہی ہے۔ ایک کے مزاج میں غیبت کا غلبہ ہے جس کی طرف ننگ و نام نشاندہی کرتے ہیں۔ دوسرے کی ساخت میں تسکین کی تلاش غالب ہے جس کی طرف نہ بہلنا اور تیرگیٔ شامِ غم اشارہ کرتے ہیں۔ اس طرح لہجے ہمیشہ کسی ایک کے ہو جاتے ہیں اور ہر عہد میں ان کی حیثیت منفرد رہتی ہے اس لئے لہجوں کو جدید اور قدیم میں نہیں بانٹا جا سکتا۔

موجودہ اردو شاعری میں چند خالص لہجوں میں جوشؔ، راشدؔ، فیضؔ یوسف ظفرؔ، اختر الایمان، نفا ابن فیضی۔ احمد ندیم قاسمی۔ فراقؔ، اجتبیٰ رضوی جمیل مظہری اور پرویز شاہدی کے لہجے ہیں۔ یہ لہجے سننے اور پڑھنے والوں کے جانے پہچانے

اور متعین ہیں۔ انھیں لہجوں کی آمیزش اور نقالی سے بہت سے ذیلی لہجے اردو شاعری میں پائے جاتے ہیں۔

مظہر امام کا لہجہ نہ تو ذیلی لہجہ میں آتا ہے اور نہ محدود حلقۂ اثر رکھتا ہے۔ اس طرح یہ لہجہ خالص بھی ہے اور منفرد بھی۔ مشترک علامتوں یا لفظوں کا استعمال مظہر امام کو کسی مخصوص طبقۂ شاعری سے نہیں باندھ سکتا۔ ترقی پسند یا جدید علامتیں ذیلی لہجہ رکھنے والے شعرا کے یہاں بھی ہیں اور مخصوص لفظوں سے بندھے ہوئے شعرا کے یہاں بھی۔ لیکن ان شعرا کے یہاں شعر کی اصل قوت نہیں پائی جاتی ہے۔ بقول نیاز فتحپوری۔

"شعر کی اصل قوت اس کا Dynamic اور Suggestive ہونا ہے اور یہ قوت صرف ایجاز واختصار سے پوری کی جا سکتی ہے۔ جس کی تکمیل کیلئے تشبیہ، استعارہ، اور کنایہ وغیرہ وجود میں آئے۔"

جدید شاعری نمبر سالنامہ نگار ۱۹۴۱ء

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیاز صاحب کے یہاں شعر کی قوت کے سلسلے میں ایجاز واختصار کے علاوہ ایک کمی رہ گئی ہے اور وہ ہے انداز۔ ایجاز واختصار کے ساتھ اس کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ کیونکہ انداز ہی لہجے کی تعین کرتا ہے۔ اس مسئلے کو ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اس طرح پیش کیا ہے:

"جو چیز غزل میں اساسی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے بغیر غزل غزل نہیں رہ سکتی وہ اس کا رسائی رکھ رکھاؤ اور اس کے لب و لہجے کی ایمائیت و رمزیت ہے۔" ـــــــــ نگار سالنامہ جدید شاعری نمبر ۱۹۶۵ء

اور اس سلسلے میں رشید احمد صدیقی فرماتے ہیں:-

"...... ہیئت، موضوع، مواد سب محتاج ہیں ابلاغ کے اور ابلاغ محتاج ہے حسنِ اظہار کا جو منحصر ہے خلوص اور سلیقے پر" ـــــ نگار سالنامہ جدید شاعری نمبر ۱۹۶۵ء

مظہر امام کے ان اشعار کی قوت کا اندازہ لگایئے جن میں ایجاز و اختصار بھی ہے اور رسائی رکھ رکھاؤ بھی، لب و لہجے کی ایمائیت و رمزیت بھی ہے۔ اور پُر خلوص و پُرکار حسنِ اظہار بھی ؎

کشتیوں کی قیمتیں بڑھنے لگیں — جتنے صحرا تھے سمندر ہو گئے
دھوپ میں پہلے پگھل جاتے تھے لوگ — اب کے کیا گزری کہ پتھر ہو گئے
کر رہے تھے اپنے زخموں کا حساب — کس کے کس کے نام از بر ہو گئے
آیا تھا وہ بہار کا موسم گزارنے — اپنے لہو میں اپنا سراپا بھگو گیا
پہاڑوں پر کہیں بارش ہوئی ہے — زمیں محوِ دعا ہے اور میں ہوں
کہاں اب کیا ہے اسے لوگوں کی طلب ہے — ہم تھے تو وہ ارزاں تھا پر اب دام بہت ہے
نہ بدگمان ہوا تا کہ تیرے ہونے کا — اگر یقین نہ ہوتا تو کیوں گماں کرتے
پھر آپ نے دیکھا ہے محبت کی نظر سے — گزرے نہ کہیں گردشِ دوراں بھی ادھر سے
جو کشتی آج تک بھی ڈوبی نہیں ہے — تمہاری ہو تو ہو میری نہیں ہے
دیواریں جل رہی ہیں زمان و مکاں کی — گرتا ہوا یہ گھر کوئی آ کر سنبھال دے
نرم رو تھا تو سبھی راہ سے مڑ گئے — سنگ اٹھایا تو مرے ساتھ زمانہ نکلا
آج کے دور کی تصویر دکھائی دیگی — آ کے دیکھو یہ مکاں چھت بھی نہیں در بھی نہیں
اپنے رستے ہوئے زخموں کی قبا لایا ہوں — زندگی میری طرف دیکھ کہ میں آیا ہوں
یہ جانتے ہوئے بھی کہ لوٹیں گے فصلِ غیر — میں تخمِ خواب رات کی کھیتی میں بو گیا

کرامت علی کرامت کو مظہر امام کی غزل میں دو انفرادی خصوصیتیں نظر آئیں وہ کہتے ہیں :-

"غزل کے دھیمے اور نرم و نازک لہجے میں ہمارے ملک میں ہونے والے فسادات کی پُر خلوص عکاسی۔"

(پہلی انفرادی خصوصیت)

"ادب میں نکسلزم کا رجحان جس میں شاعر توڑ پھوڑ اور شکست و ریخت کے بعد تعمیرِ نو کا خواب دیکھتا ہے۔"

(دوسری انفرادی خصوصیت)

("یہاں شاعری کا لہجہ تیز سخت اور ٹھوس ہو گیا ہے")

دونوں باتیں بیک وقت دو طرح کے موضوعات کے اظہار ہیں ... جود ہیں اور اس لئے کرامت علی کرامت کے خیال میں "مظہر امام ... اردو کی جدید ترین نسل کے پیش رو اور امام ہونے کا شرف حاصل ... "

میں یہاں کرامت علی کرامت سے متفق نہیں ہوں ۔ کیونکہ میں ... کہہ چکا ہوں کہ لہجہ پوری شخصیت کے تعمیری خمیر سے مرتب ہوتا ہے ۔

جہاں تک "دھیمے اور نرم و نازک لہجے" کا تعلق ہے وہ مظہر امام کی شخصیت کے خمیر سے متعلق ہے ۔ بقول حرمت الاکرام :-

"مظہر امام کی شاعری کیا ہے؟ اور کیسی ہے؟ ان امور کا تجزیہ کرنے کے لئے یہ جان لینا بہتر ہوگا کہ جو نفاست، شائستگی اور وضعداری ان کی شخصی زندگی کا خاصہ ہے اسی سے انکی شاعری بھی متصف ہے ۔ وہ کوئی چونکا دینے والی بات نہیں کہتے اور نہ اچھا یا بڑا شاعر کہلانے کیلئے یہ ضروری ہے ۔ کیونکہ بڑی شاعری اس سے مطلقاً جداگانہ نہیں، تو بالاتر ضرور ہوتی ہے ۔ اور اس میں جو خاص کیفیات ہوتی ہیں وہ ذہن کو صرف چونکاتی نہیں بلکہ پورے طور پر بیکار کر دیتی ہیں ۔ محض چونکانا کسی شاعری کو زیب نہیں دیتا اس کا منصب اس سے افضل و ارفع ہے ۔"

ساقی کراچی جنوری ۱۹۶۵ء
اور تجدید مونگیر بہار ی اکتوبر ۱۹۷۱ء

تیز سخت اور ٹھوس لہجہ ان کی شخصیت کے تعمیری خمیر کے متضاد ہے ۔ یہاں پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ دھیما پن نرمی اور نزاکت میں نہ صرف اثر پذیری ہوتی ہے بلکہ اثر آفرینی بھی اس قدر ہو سکتی ہے اور ہے جتنی تیزی سختی اور ٹھوس پن میں ہے ؎

لاکھ بیباک نگاہوں سے نگاہیں لڑ جائیں
ایک سہمی ہی نظر ہو تو وہ قاتل ہو جائے

اجتبیٰ رضوی

اگر کرامت علی کرامت ان کے لہجے کو تیز، ٹھوس اور سخت کہہ کر ان کی اثر آفرینی کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں تو وہ نظریاتی غلطی کرتے ہیں ۔ اپنے ایک محترم سے دوران گفتگو میرے دائرۂ علم میں یہ بات آئی کہ۔۔ جدید طبیعات نے سختیوں اور صلابتوں کو توڑ کر نرمی اور دھیمے پن کی ہی اثر آفرینی کو تسلیم کر لیا ہے ۔ جو اشعار انھوں نے تیزی، سختی اور ٹھوس پن کے ضمن میں دئے ہیں ان سے توڑ پھوڑ، شکست و ریخت کا احساس تو نہیں ہوتا ۔ البتہ ان کے اندر چھپے ہوئے تعمیر نو کا خواب ضرور جھلکتا ہے —— اور یہی جھلک دھیمی دھیمی نرم آنچ کی طرح محسوس ہوتی ہے پھر یہ کہ انسانی

تنقید میں کرامت علی کرامت کا یہ میکانکی نقطۂ نگاہ ناقابلِ فہم ہے۔

مظہر امام کی غزلوں سے فساداتِ کے متعلق ان کے چنے ہوئے کچھ اشعار ملاحظہ فرمایئے جن میں آگ، لاش، خون جیسے الفاظ کے پیکر ابھر کر سامنے آتے ہیں :-

سایہ سایہ آگ لگی تھی — پتہ پتہ ہانپ رہا تھا
اک انجانی لاش کے آگے — پاگل کتا بھونک رہا تھا

ہر ایک لاش پہ عائد ہے قتل کا الزام
یہ سانحہ ہے مگر سانحہ نرالا ہے

سامنے جوش میں تھے آگ لگانے والے
اپنا گھر دیکھ کے ہم ان کے طرفدار رہے

تم نے آتش کدۂ شہر سے آنے والی
اجنبی چیخ کا انجام تو پوچھا ہوتا

صدیوں کا خون پی کے بھی اب تک ہے وہی پیاسی
دھرتی پکارتی ہے اب تک لہو لہو

تیشہ اٹھا لیا ہے تو اب جو بھی زد میں آئے
اس راستے میں تیری عمارت بھی آئے گی

رنگ کیا دکھاتا ہے خونِ رائیگاں دیکھو
دھار تیز ہے کتنی رکھ کے انگلیاں دیکھو

ساتھ لیکے آیا ہوں اب انھیں کی تلواریں
اک ذرا انہیں رکھ کر رنگِ دشمناں دیکھوں

ان اشعار میں کرامت علی کرامت کو تکلّم، سختی، تیزی اور ٹھوس پن معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان میں آگ، لاش، خون، جوش، قتل، تیشہ، دھار، تلوار اور دشمن جیسے الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔ الفاظ کی ساخت سے لہجے کے متعلق قیاس آرائی بجا اور درست نہیں ہے۔ ثقافت اور شدّتِ معنوی رکھنے والے الفاظ بالغ لہجے کی دھیمی اور نرم آنچ پر پگھل کر متاثر ہوتے ہیں اور سننے والوں کو متاثر کرتے ہیں۔ میں نے انھیں اشعار کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے جن کے متعلق کرامت علی کرامت فرماتے ہیں کہ یہاں لہجہ تیز، سخت اور ٹھوس ہو گیا ہے۔ "سائے کی آگ" اور "پتے کی ہانپ" دھیمے پن کو ظاہر کرتی ہے کہ تیزی اور سختی کو انجانی لاش کے آگے پاگل کتے کا بھونکنا صورت حال کو غیر سنگین بنا دیا ہے کہ انقلاب نمودار پر ظہور کرتا ہے۔ لاش پر قتل کے الزام کا سانحہ ٹھوس ہے یا نرم گھر کی حالت دیکھ کر آگ لگانے والوں کی طرفداری تیزی اور سختی کو ظاہر کرتی ہے یا نرمی اور دھیمے پن کو۔ اسی طرح زمین کی پیاس، تیشے کا غیر جانب دارانہ عمل، اپنی انگلی رکھ کر دھار کی تیزی کا اندازہ، دشمنوں کی تلوار لیکر دشمنوں کا رنگ دیکھنا، ٹھہراؤ، توازن دھیمے پن اور اعتدال کو ظاہر کرتا ہے، شدّت، تیزی یا سختی کو نہیں۔ نامناسب نہیں ہوگا کہ مظہر امام کے لہجے سے متعلق کچھ ناقدانِ فن کے اقتباسات جو میری رائے کی تائید کرتے ہیں پیش کروں :-

آل احمد سرور فرماتے ہیں۔

"ان کے یہاں غم و غصہ کے یا بیزاری کے بجائے ایک سچے فنکار کا گمبھیر لہجہ ہے۔"

غیاث احمد گدی کا خیال ہے :-

"ناموں کی بھیڑ میں مظہر امام اپنی خوبصورت شاعری اور منفرد لب لہجہ کے سبب اونچے دکھائی دیتے ہیں۔"

کرشن چندر رقمطراز ہیں :-

"وہ ایک معتدل متوازن شعری مزاج کے مالک ہیں۔"

علامہ جمیل مظہری اظہار خیال فرماتے ہیں :-

"...... لیکن جدّت پسندی اور ترقی پسندی دونوں تحریکوں کے معنوی اثرات اگر توازن و اعتدال کے ساتھ کسی ایک جگہ جمع ہیں تو وہ مظہر امام کا فن اور مظہر امام کی شاعری ہے۔"

ڈاکٹر محمد حسن فرماتے ہیں :-

"...... وہ لہجے کی نرمی اور آواز کی ملائمیت کے جادو سے واقف ہیں۔"

نشور واحدی لکھتے ہیں :-

"امام نے جدید تقاضوں کے سنگ و خشت کو ایک خاص متانت اور حسنِ اعتدال کے ساتھ صنم تراشوں کی طرح مرمریں مجسموں میں تبدیل کر دیا ہے۔"

غلام ربانی تاباں کی رائے یوں ہے :-

"مظہر امام کے کلام میں زبان و بیان کی پختگی
لہجہ کی سنجیدگی، جذبے کی شدت اور بدلتے ہوئے
حالات کا شعور بھرپور موجود ہے۔"

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اظہار خیال فرماتے ہیں :-

"مظہر امام اپنی شاعری میں کسی دھماکے سے داخل
نہیں ہوئے۔ انہوں نے فکر و خیال کو خلوص و درد
کی دھیمی آنچ میں تپا کر اپنے لئے رفتہ رفتہ جگہ پیدا
کی ہے۔ ان کی شاعری کا رُخ نئے تقاضوں کی طرف
ہے لیکن نئی سطح پر انہوں نے روایت سے اپنا رشتہ
نہیں توڑا اس سے ان کے اسلوب و اظہار میں ایک
خوش آہنگ روانی اور بے تکلفی آگئی ہے۔ ان کی شاعری
ایک سنبھلی ہوئی طبیعت اور صحتمند افتادِ ذہنی کا پتہ
دیتی ہے ....... اُن کے فکری ضبط و اعتدال نے
انہیں فکر کو جذبے میں سمونے کی راہ دکھائی ہے جس
سے اُن کے کلام میں انبساط اور آگہی کی ایک خوشگوار
امتزاجی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔"

خود کرامت علی کرامت ایک جگہ فرماتے ہیں :-

"مظہر امام کی انفرادیت جدیدیت کے برتنے کے
انداز میں ہے مظہر امام کی انفرادیت اسی میں ہے
کہ انھوں نے اپنی انسانی حسیت کے پرخلوص اظہار
کیلئے نادر مگر مناسب ترین تکنیک دریافت کی
ہے اور جدیدیوں کے ہجوم کے درمیان گم نہ ہونے والا
ایک منفرد لہجہ تلاش کیا ہے۔"

جس طرح شخصیت کا خمیر شاعر کے لہجہ میں کارفرما ہے اسی نے
شاعر کو ایسی ترکیبات کے استعمال پر مجبور کیا ہے جو نرم لطیف، زرخیز
معنی آفریں اور بلیغ ہیں۔ ابر طرح دار، بانداز التفات، قرب کی لذت کا ماہتاب
ہونٹوں کی برساتیں، نیند کی چوکھٹ، جسم کے سمندر، روح کے جزیرے،
موت، وحشتِ بے خوابی، صدائے بربطِ شب، اشکوں کی ردا، وقت
کی پالکی، لہو کی شمع، خوف اوڑھے ہوا سراپا، دیوار تمنا، سانس کا قلزم
زنجیر ملاقات، برف زدہ منہ، تخم خواب اور غمخوار سیڑھیوں کا اندھیرا وغیرہ
ایسی ترکیبات ہیں جو ایک طرف ترسیل کی دشواریوں کو آسان کرتی ہیں
تو دوسری طرف شاعر کو یہ سہولت دیتی ہیں کہ فکر مجروح نہ ہو اور ڈاکٹر رضوی
کی اصطلاح میں اسے ایک رسیّ حاشیہ تا دیل مل جائے۔

اب تک جو گفتگو ہوئی اس نے ہم کو اس نتیجے پر پہونچایا کہ مظہر امام
ایک منفرد لہجے کے شاعر ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان کے لہجے کی انفرادیت ہمیں
کیا دیتی ہے۔

غالب جب اپنا تعارف کرانا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں ؎

تو اگر بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

مظہر امام اپنا تعارف اس طرح کراتے ہیں ؎

آپ کو میرے تعارف کی ضرورت کیا ہے
میں وہی ہوں کہ جسے آپ نے چاہا تھا کبھی

غالب اور مظہر امام دونوں کے یہاں مسئلہ ایک ہی ہے لیکن
تہذیب بدلی ہوئی ہے۔ معاشی اور سماجی پس منظر بدل گیا ہے۔ اب نہ تو
گھوڑے ہیں اور نہ فتراک۔ متعارف کرانے کے لئے جو ہستی جو اشارات غالب
نے دیئے تھے وہ نذر حوادث ہوگئے۔ مظہر امام نے جو ہستی اشارات
دیئے ہیں اس کا تعلق انفرادی پسند اور ناپسند ہے۔ پسند اور
ناپسند ہمیشہ رہیگے غالب نے اپنا تعارف کرانے کیلئے اپنے ماحول کی
علامتوں کو اختیار کیا مظہر امام نے شخصی ذہنی کیفیت کو۔ ایسا کیوں ہوا
جب کہ اس وقت بھی ماحول میں ایسی ہیئتیں یا علامتیں ہیں مثلاً گاڑی
کی اسٹپنی، سائیکل کا کیریر، ڈرائنگ روم کا صوفا وغیرہ۔ میرے خیال میں ایسا
اسلئے ہوا کہ غالب لہجے کے اعتبار سے ترکستانی مزاج رکھتا ہے اور مظہر امام
لہجے کے اعتبار سے ہندوستانی مزاج رکھتے ہیں۔ غالب کے لہجے میں ترکمانی
تیزی اور اکھڑپن ہے۔ مظہر امام کے یہاں ہندی توازن اور ٹھہراؤ اسی لئے
دونوں کے یہاں جب تعارف کا معاملہ ٹھہرا تو جو لہجہ اختیار کیا گیا اس
میں ایک جگہ اکھڑپن کے ساتھ تیز رفتاری اور دوسرے کے یہاں گمبھیرتا
آگئی ہے۔ لہجہ کے دھیمے پن کی نے پسند اور ناپسند کی بنیاد کو تعارف

کا وسیلہ قرار دیا۔

اسی طرح تلاش منزل کے بارے میں غالب کہتے ہیں ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

اور مظہر امام نے کہا ہے ؎

رہبروں نے یہ کہا ہے ہم سے
کچھ دنوں اور بھٹکتے رہئے

دونوں ہی جگہ تلاش منزل کا مسئلہ ہے دونوں نارسائی کا ذمہ دار رہبر کو ٹھہراتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ غالب اپنے ترکستانی مزاج کی وجہ سے تھوڑی دور تیز روؤں کو رہبر بنا کر انھیں چھوڑ دیتا ہے نتیجہ اس کا یہ ہے کہ منزل تک نہیں پہنچتا۔ یہ انکی طبیعت کی تیزی کی وجہ سے ہے کہ انھوں نے اپنے لہجے کے ذریعہ اپنی تیز رفتاری کا اظہار کیا کیونکہ شعر میں کہیں اس نے یہ نہیں کہا کہ وہ تیز روؤں کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے یہ بات کئی تیز روؤں کیساتھ تھوڑی دور چلنے سے مرتب ہو جاتی ہے۔ الفاظ میں یہ معنی نہیں ہے۔ یہ لہجے سے متعین ہوتا ہے۔ جب کہ مظہر امام اپنی میانہ روی اور اعتدال پسندی کی وجہ سے رہبروں کو چھوڑ کر چلنا پسند نہیں کرتے اسلئے ان کے کہنے کو نقل کر کے منزل کی دوری پر صبر کرتے ہیں۔ ان کے شعر کے الفاظ سے بھی یہ بات مرتب نہیں ہوتی کہ یہ رہبروں کے ساتھ ہیں۔ یہ بات صرف لہجے سے آتی ہے کہ رہبروں کو نہیں چھوڑتا ہے۔

ایک بات اور یہ ہے کہ غالب کے زمانے میں لیڈر شپ اتنی متشکل نہیں ہوئی تھی جتنی اب ہے نہ دعوئی لیڈری کا اتنا کیا جاتا تھا جتنا اب کیا جاتا ہے اسلئے غالب کو یہ سہولت تھی کہ وہ جب جہاں سے چاہے لیڈر بدل لے لیکن سیاسی اور ادبی گٹ بندی کے اس دور میں یہ بات ذرا مشکل ہو گئی ہے۔ ترقی پسندوں کیلئے باوجود ترقی پسندی سے بنیادی اختلاف رکھتے ہوئے بھی اس کا ترک کرنا مشکل ہوتا ہے۔ رجعت پرستوں کو رجعت پرستی سے اختلاف رکھتے ہوئے بھی اس کا ترک کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں دوریٔ منزل پر مکمل اظہار اور حالات کے اثرات کی اتنی صحیح عکاسی محض لہجے کے ٹھہراؤ اور دھیمے پن سے ہی ہو سکتی ہے۔ اسی طرح سامعین لہجے کے فرق کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار میں لگا سکتے ہیں ؎

اگر کہیں ہے تو دل سے بچھڑ کر دکھا مجھ کو
تو اپنی ذات کا عرفان دے خدائی نہ دے — مظہر امام

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے — غالب

پھر آپ نے دیکھا ہے محبت کی نظر سے
گذرے نہ کہیں گردش دوراں بھی ادھر سے — مظہر امام

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
ہے اک شکن پڑا ہوا طرف نقاب میں — غالب

چلو ہم بھی وفا سے باز آئے
محبت کوئی مجبوری نہیں ہے — مظہر امام

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو — غالب

"زخم تمنا" اور "رشتہ گونگے سفر کا" مظہر امام کے لہجے کے دھیمے پن اور ٹھہراؤ سے بھرپور ہے۔ موازنے سے الگ چند مثالیں پیش ہیں ؎

لے دے کے ایک وصل کی خیرات مانگ لی
جیسے کچھ اور شوق کو آتا رہی نہ تھا

نرم رو تھا تو سبھی راہ سے منہ موڑ گئے
سنگ اٹھایا تو مرے ساتھ زمانہ نکلا

اجنبی وادیاں، کوئی منزل، نہ گھر
راستے میں کہیں بھی اتر جاؤں گا

سامنے جوش میں تھے آگ لگانے والے
اپنا گھر دیکھ کے ہم ان کے طرفدار ہوئے

کسی تالاب میں لہرے ہی بناتے گنتے
وہ بھی دشت ہیں ہم ہاتھ میں پتھر بھی نہیں

اس صنم نے تو رفاقت ہی طلب کی تھی امام
ہر خزف ریزہ اب اپنے لئے سجدہ مانگے

ہم خود ہی اعتبار کے قابل نہیں رہے ✻ کس منہ سے تجکو دوست کہیں اے ادیب! —

کوئی دیوار تو حائل تھی کہ ہم تم برسوں
ایک ہی گھر میں رہے پھر بھی شناسا نہ ہوئے

دشمنی احتیاط سے کیجئے        دوستی کی ادا نہ آجائے

کشتیوں کی قیمت بڑھنے لگیں
جتنے صحرا تھے سمندر ہوگئے

دھوپ میں پہلے پگھل جاتے تھے لوگ
اب کے کیا گزری کہ پتھر ہوگئے

کرلیے تھے اپنے زخموں کا حساب
کس کے کس کے نام ازبر ہوگئے

غرض کہ یہ لہجے ہی کا ٹھہراؤ ہے جو سُننے والوں کو تھوڑی دیر کے لئے روک لیتا ہے۔ سامع کو روک کر اس کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لینے کی یہی قوت مظہر امام کے لہجے کی انفرادیت ہے۔ اس کے لئے ممکن تھا کہ کالرج کی طرح الفاظ کے ارتعاش سے سامع کے ذہن کو پکڑا جاتا یا جوش کی طرح آہنگ کے زیر و بم سے قاری یا سامع کے ذہن کو اپنی گرفت میں لیا جاتا یا غالب کی شوخی سے یا مومن کی پرکاری سے یا میر کی غم انگیزی سے یا اجتبیٰ رضوی کی سحر طرازی سے یا جمیل مظہری کے بانکپن یا پرویز شاہدی کی ترقی پسندانہ طنازی سے یہ نتیجہ مرتب ہوتا۔ لیکن ان میں سے کوئی لہجہ مظہر امام کا لہجہ نہیں ہے۔ یہ تو ایک نیا اور منفرد لہجہ ہے جو بہت قریب آکر اپنی جگہ بناتا ہے اور دور رہتے وقت محسوس ہو جاتا ہے۔ جب تک ہم اس کے حلقۂ اثر میں رہتے ہیں اجنبی اور نیا نہیں لگتا اور جب ہم اس کے حلقۂ اثر سے نکلنے لگتے ہیں تو ہمیں جھٹکا لگتا ہے۔ بالکل ویسا ہی جیسا کسی مقناطیسی حدِ کشش سے نکلنے پر لگتا ہے۔ یہ بات خود مظہر امام کی شخصیت میں بھی ہے۔ جب وہ ہمارے درمیان بیٹھے رہتے ہیں تو وہ چھائے ہوئے نہیں لگتے لیکن جب وہ اٹھ کر جانے لگتے ہیں تو کچھ دور تک سب کو کھینچتے ہوئے لے جاتے ہیں۔ یہی شخصی تعمیر خمیر انکے اسلوب کا بھی خمیر ہے جسے ہم مظہر امام کا لہجہ کہتے ہیں۔

عبدالمنان طرزی

مقصود اظہر (بمبئی)

# فن اور فنکار

جب انسان ماحول، معاشرے اور ارد گرد کی
مخالف ہوا کے باعث اپنی فطرت و خواہشات میں ایک مسلسل
خلاء پاتا ہے یا کسی قسم کی زیادتی کا دباؤ اُسکی ذات میں بڑھ جاتا
ہے جس سے اس کی روح بے چین اور شعور حساس بن جاتا
ہے۔ روح کی بے چینی کے سبب وہ شعور کے احساس سے اس
کمی و زیادتی کو ہموار کرنے کی پیہم کوشش کرتا ہے اور جب باوجود
انتھک محنت اور سعیٔ مسلسل کے اِس خلاء کو پُر کرنے میں کامیاب
نہیں ہو پاتا تو پہلے لاشعوری طور پر اُس کا ذہن ماحول معاشرے اور
اپنے مخالف حالات سے فرار چاہتا ہے اور یہ لاشعوری فرار اُسے
شعوری طور سے احساس کم تری یا احساس برتری میں مبتلا کر دیتا ہے۔
نتیجتاً وہ اپنی فطرت کے مقام سے ہٹ جاتا ہے اور فطرت خواہشات
کی تکمیل کیلئے سازگار ماحول و معاشرے کی تلاش و کھوج کرتا
ہے۔ اور یہ تلاش اُسے ذاتی تصوراتی دنیا کا خالق بنا دیتی ہے۔
بحیثیت خالق وہ اپنی تخلیق میں اپنی فطرت، خواہشات، اصول
اور آدرش کا اظہار بس بہرہ تجربے ہی بیباکانہ انداز میں کرتا ہے۔
بعض اوقات انسانی فطرت سماج کی جابرانہ ترتیب بے رحمانہ بے
انصافی اور بے جا بندشیں برداشت نہیں کر پاتیں، جسکی وجہ سے
اُسکے وجود میں گھٹن، بے چینی اور ہیجان پیدا ہوتا ہے اور اِس
کا اظہار فن کہلاتا ہے۔

فن کا اظہار کئی طریقوں سے کیا جا سکتا ہے: جن میں موسیقی
مصوری اور شاعری (ادب) اسکے خاص دائرے ہیں۔ جن کے
ذریعے فن روح کی گہرائیوں سے ابھر کر نظروں کی دسترس میں آتا ہے
اور اُس کا نظروں کی دسترس میں آنا ہی فن کا ظہور کہلاتا ہے۔
فنکار اپنی تصوراتی دنیا کا خالق بنتا ہے جسکے تانے بانے حقیقی
دنیا سے ہی اخذ کئے جاتے ہیں۔ فنکار اپنی اس تعمیر کردہ تصوراتی
دنیا کا خدا ہوتا ہے۔ اس کا آغاز و انجام، فنا و بقا نشیب و فراز
اسکی ایک جنبش قلم سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اس تصوراتی دنیا کے
محرکات اس کے اپنے شعوری ہیجان پر منحصر ہوتے ہیں۔ وہ کبھی منفی
کو مثبت بنا کر پیش کرتا ہے اور کبھی مثبت کو منفی میں ڈھال
دیتا ہے۔ کیونکہ وہ بیک وقت بیباک اور خوف زدہ ہوتا ہے۔
وہ بڑی بیباکی سے حقیقت کو تصوراتی بنا کر پیش کر دیتا ہے۔ مگر
اُسکا خوف اسے حقیقت کے مقابل عمل سے روکتا ہے اور اس
کیلئے "آواز" "رنگ یا" "الفاظ" کا سہارا لیکر وہ اپنے احساس
و روح کو اطمینان اور ہیجان کو سکون بخشتا ہے۔ لیکن یہ اطمینان
و سکون عارضی ہوتا ہے بالکل سمندر کے طوفان کی مانند، جہاں
تہہ آب میں ہلچل ہو سطح آب پر طوفان برپا ہو جاتا ہے اور یہی
طوفان فن کو کسی مخصوص دائرے رنگ، آواز، الفاظ کے روپ میں
پیش کرتا ہے۔ اسے نکھارتا ہے سنوارتا ہے وقت کے ساتھ ساتھ

فن کے اندر نکھار اور اُجلاپن پیدا ہوتا ہے اور یہ حقیقت کا آئینہ بن جاتا ہے۔

فن سماج اور تہذیب و تمدن ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں تہذیب کا ارتقا، سماج کی ٹوٹ پھوٹ کا عکس فن پیش کرتا ہے اور دوسرے پہلو سے تہذیب کا ارتقاء و سماج کی ٹوٹ پھوٹ کے پیش آنے میں فن کی کوشش شامل ہوتی ہیں فن عوامی اور اجتماعی دو طرح سے عالم وجود میں آتا ہے۔ ذاتی فن کسی ایک ذات کیلئے مخصوص ہو جاتا ہے۔ اس میں ہیجان اپنی حد کو پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ کمی و بیشی کی بے انصافی کے خلاف جو محرکات وقوع پذیر ہوتے ہیں اپنے ذاتی فن کا سبب بنتے ہیں۔ اس میں شدت کی آمیزش ملے گی۔ دوسری جانب اجتماعی فن کا نزول ۹۹ فی صد مثبت انداز میں ہوتا ہے یہ سماج اور تہذیب کی تعمیر و ترقی کیلئے ہمہ وقت کوشاں ہوتا ہے اسکے اندر بے انصافی کے خلاف غصہ اور جوش ضرور پیدا ہوتے ہیں مگر اسمیں ہیجان و شر پسندی برائے نام پائی جاتی ہے۔ ذاتی فن پہاڑی آبشار ہوتا ہے جبکہ اجتماعی فن پر سکون جھیل سے عبارت ہے۔

بیشک فنکار بھی عام انسان ہوتے ہیں مگر فن ایک عام انسان کو اسکی عامیت سے بلند کرنے کا ذریعہ بنتا ہے اور فن ہی کی بدولت ایک عام انسان اور فن کار میں تفریق پیدا ہوتی ہے اور جب انسان عامیت کے نکتے سے ہٹ جاتا ہے تو وہ دو شقیں پستی یا بلندی میں سے کسی ایک شعبہ میں مہارت حاصل کرلیتا ہے چونکہ فن خوبی میں گردانا جاتا ہے اسلئے فنکار بلندی و عظمت پاتا ہے اور فنکار اس سماجی عظمت و بلندی کو پاکر کمی و بیشی کے ہیجان و تلاطم کا کسی حد تک مداوا پاتا ہے۔ لیکن تب بھی اسکے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھری ہوتی ہے کیونکہ مکمل سکون۔ اطمینان فن کو حل کرسکتا ہے یہ باتیں ذاتی فن تک محدود ہیں۔

فن کا انحصار فنکار کے ظاہر و باطن دونوں پہ ہوتا ہے مگر اکثر ظاہر کی بہ نسبت باطن زیادہ جھلکتا ہے ظاہر و باطن کی بہ نسبت کتنی وسیع تر اور کہیں تنگ نظر آنے والی ہوتی ہے یہ بات واضح ہے کہ یہ موضوع ذاتی فن سے متعلق ہو سکتا ہے اس کا اثر اجتماعی فن پر اپنی گرفت نہیں جما پاتا۔

جدید دور نے فن کی قدر و منزلت بڑھا تو دی ہے مگر اس کیلئے وقت کو مختصر و معین کردیا ہے انسانی فطرت فن کو پسند کرتی ہے اور اس سے لطف اٹھانا چاہتی ہے مگر زندگی کی رفتار اور دیگر حالات اس کیلئے بہت ہی مختصر سے لمحات مہیا کرتے ہیں چونکہ فن کسی طرح بھی مادی فوائد کو ظاہر نہیں کرتا۔ اسلئے اسکی حیثیت اپنا مقام برقرار نہیں رکھ پاتی۔ آج سائنس کی ترقی نے انسان کو مادی فوائد سے روشناس کروا کر فن کے مقابلے میں خود کو بلند کرلیا ہے اور فن برائے فن جانا جانے لگا ہے۔ گو فن میں نئی وسعتیں پیدا کی جارہی ہیں لیکن فن کی وسعت کا زیادہ تر حصہ موسیقی کی گرفت میں بھی ہے اور بقیہ حصے کو رنگ و تحریر نے اپنے لئے ضرورت کے مطابق منقسم کر رکھا ہے۔

فن، سماج اور تہذیب کا رشتہ جو کسی حد تک آ گئے وضاحت پا چکا ہے لیکن اگر اسکے دوسرے پہلو پر نظر ثانی کی جائے تو فن کی حیثیت پابند قید نظر آتی ہے یہ سماجی اصول و قوانین کی گرفت میں ہوتا ہے مگر دباؤ بڑھنے کی صورت میں بغاوت بھی اختیار کر جاتا ہے۔ تہذیب کی دیوالائی روایتوں کو لیکر چلنا فن کی خوبی جانا جاتا ہے۔ لیکن فن نے ہر دور میں پرانی روایات سے بغاوت کرتے ہوئے تہذیب کو نئی روایات سے روشناس کروایا ہے۔ فنکار کے وجود کی عدم موجودگی، ناہموار ہیجان اور سماجی ذمہ داری کے احساس نے ہی نئے سماج کی تخلیق کی ہے پرانی اور لغو روایات کا چہرہ کر اسے ایک نئی شکل میں ڈھالا ہے۔

کمی و بیشی ہیجان و بے چینی اور جوش کو تسکین دینے کیلئے انسان آواز، رنگ و الفاظ کا سہارا لیتا ہے اور یہی ذرائع تسکین "فن" کہلاتے ہیں فنکار کیلئے ضروری نہیں بلکہ وہ سماج و معاشرے کی اصلاح، تہذیبی روایتوں کا تعین ہی کرے۔ فنکار حقائق کا عکس پیش کرتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۴۱ پر)

انوار احمد زئی

# مسئلۂ آغازِ گفتگو کا!

ہم کہ حلقۂ یاراں میں نصیب دشمناں خاصے خوش گفتار مشہور ہیں۔ ایک ایسی محفل میں جا پھنسے، جہاں پہلی بار اس مصرعے کے معنی کھلے کہ ؎

؏ بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی

اور ہمیں پہلی بار احساس ہوا کہ جب مختلف عمر اور مختلف ذوق کے لوگ یکجا ہوں اور جن سے پہلے سے تعارف بھی نہ ہو، تو اس محفل میں گفتگو کرنا ایک قسم کے جہاد سے کم نہیں ہوتا۔

بدیسی لوگ ایسے موقعوں پر موسم کا ذکر کیا کرتے ہیں ہمارے ہاں موسم کی بے کیفی اور لوگوں کی بدذوقی کچھ اس افراط سے نظر آتی ہے کہ اس کے سامنے افراطِ زر تک غیر اہم معلوم ہوا۔ اس لئے اس موضوع سے آغازِ گفتگو کرنا اور بھی دشوار لگا۔

ہمیں یاد آیا کہ خواتین ایسے نازک معرکوں کو پلک جھپکتے میں سر کرنے کا فن خوب جانتی ہیں، وہ ریل کا ڈبہ ہو یا بس کا اڈہ۔ اجنبیت کی دیوار صرف ایک جملہ کے زور سے زمین بوس ہو جاتی ہے۔

"اے بہن! یہ سب سے چھوٹا ہے، جو گود میں ہے؟"

"ہاں بہن! اللہ رکھے اس سے چھوٹے تین اور ہیں یہ ذرا ضدی ہے اس لئے ساتھ لے آئی۔"

"خدا عمر دراز کرے کتنے بچے ہیں؟"

"چھ"

"شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟"

"یہی کوئی چھ سال۔"

"کہاں جا رہی ہو؟"

"اسپتال۔"

"کسی بچے کی دوا لانا ہے؟"

خدا نہ کرے بہن۔ بس ذرا خود کو دکھانے جا رہی ہوں اور پھر بچوں کے ابا کی نوکری، تنخواہ، خاندان، ذات، بہنوں کی تعداد بھابھیوں کے نخرے، ساس کے مظالم، نندوں کی زیادتی اور خود اپنی مظلومیت سے ہوتی ہوئی گفتگو یا تو کسی رشتہ کے تعین پر ختم ہوتی ہے یا فریقین میں سے کسی ایک کی منزل کے آجانے پر۔ عموماً یہ دونوں مرحلے ساتھ ساتھ طے ہوتے ہیں۔

مگر اب سنا ہے کہ محکمۂ آبادی منصوبہ بندی کے بیشتر کارکنوں کے سبکدوش ہو جانے کے بعد محکمہ کی کارکردگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ خواتین کے لئے تعارفی گفتگو کا آغاز شاندار اسٹروک سے نہیں ہوتا، بلکہ انہیں بھی بات کرنے کے لئے سوچنا پڑتا ہے کرکٹ کے کھلاڑیوں کی طرح۔ گفتگو کرنا اتنا ضروری بھی نہیں ہے مگر جب منی بس کی فضا قربت کے عجیب موقعے فراہم کرے اور لوگ ایک دوسرے کی پسلیوں میں کہنیاں گاڑے بیٹھنے پر مجبور کر دیئے جائیں، تو منہ سینا دشوار ہو جاتا ہے، مگر ایسے موقعوں پر حسین ترین موضوع کو چھیڑنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ اور لوگ خون کے سے گھونٹ پینے میں دشواری تو محسوس کرتے ہیں تاہم پبلک اور روڈنگ کے موضوع کو حلق سے باہر نکالنے کی بجائے نیچے اتار لینے میں عافیت سمجھتے ہیں کہ کہیں اس ذکر کے ساتھ انہیں بھی نیچے نہ اترنا پڑے۔

بعض جگہ موضوع ساتھ سے گرتے ہیں، اس لیے عموماً
رمضان میں تجارتی گفتگو کے لئے زیادہ دشواری پیش نہیں آتی
اور لوگ گرمی کی شدت میں روزے کی آزمائش کو کچھ اس طرح بیان
کرتے ہیں کہ روزہ خوروں تک کو روزے کا مزا آجاتا ہے تاہم یہ
موضوع اسقدر گھس گیا ہے کہ اس کا سہارا لینے میں بھی تامل
رہتا ہے۔

دیکھا یہ گیا ہے کہ لوگ پڑھے لکھے ہوں تو کھیل کود کی بات
کرتے ہیں، بعض کرکٹ، ہاکی، خونی دنگل، اور خانگی جھڑپوں کی بات
نسبتاً کم پڑھے لکھے لوگ کرتے ہیں۔ فہم میں یہ پڑھے لکھوں سے کم
ہوتے ہیں مگر کتنے ہوتے معیار تعلیم جیسے از کار رفتہ موضوع پر گفتگو
کرتے ہیں۔ ان کی باتیں عموماً یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ہونے والی
تخریبی کارروائیوں اور تشدد کی وارداتوں تک محدود رہتی ہیں یہ لوگ
یہ لوگ جلسے فخر سے بیان کرتے ہیں کہ وہ ایسی جگہوں پر کبھی نہ پڑھے
ورنہ جانے ان کا حشر کیا ہوتا؟ اساتذہ کے درمیان عموماً نقل کا
رجحان موضوع بحث ہوتا ہے جبکہ والدین کو مل بیٹھنے کا جب بھی
موقع ملے تو وہ اساتذہ کی کارکردگی اور اسکولوں کی تعطیلات پر دل
کے پھپھولے پھوڑتے ہیں۔

طلبہ کی بات الگ ہے۔ عموماً یہ ایک دوسرے سے ملتے
ہوئے آج کل کتراتے ہیں، مبادا کہ مقابل کی آستین میں کوئی اژدہا
چھپا ہو۔ نہ بھی ہو تو ایک دوسرے سے مانگنے میں کیا دیر لگتی ہے قلم نہ
مانگا خنجر مانگ لیا۔ یوں بھی تقدیم و تاخیر کے اعتبار سے شمشیر
و سناں کا مقام پہلے اور طاؤس و رباب کی منزل بعد میں آتی ہے
تعارف کے لئے طلبہ ایک دوسرے کا نام بعد میں پوچھتے ہیں
رنگ پہلے دریافت کرتے ہیں، سرخ اور سبز کی تمیز مٹ جائے
تو سلام دعا کا مرحلہ آتا ہے، ورنہ مورچے بننے میں دیر نہیں لگتی،
ان ہم نصابی سرگرمیوں کے علاوہ نصابی موضوعات پر بات کرنے
میں طلبہ کو اس لئے تامل ہوتا ہے کہ ان کے بقول آج کل نقل
کے پہلے سے مواقع نہیں رہے، ہر آنے والا وقت نئی خبریں
اور کوئی بندش لا رہا ہے، مروت نام کو نہیں رہی، ساتھ کانی بیچے

اور وی سی آر دیکھنے والے اساتذہ بھی کمرۂ امتحان میں یوں نظریں
پھیر لیتے ہیں، جیسے کھلاڑی سے امپائر۔ اب ایسی بھی نگرانی
کیا کہ کارتوس تک میسر نہ کر سکیں، ادھر اساتذہ کو یہ شکایت ہے کہ
نقل کرنے کی اجازت دینے میں تو تامل ہے کہ جان سب کو پیاری
ہوتی ہے مگر بار بار کارتوس لیکر ایک سرے سے دوسرے سرے
پر بیٹھنے والے لائق شاگردوں تک پہنچانا بہت تھکا دینے والا
کام ہے اور اس کے لئے صرف ایک فلم یا ایک دعوت سراسر گھاٹے
کا سودا ہے غالباً اساتذہ اور طلبہ کے درمیان افہام و تفہیم کی فضا
پیدا کرنے کی غرض سے پچھلے دنوں نقل کرنے والے طلبہ کے نمائندوں
نے ایک پریس کانفرنس طلب کی جس میں پریس کے نمائندوں کی
بجائے ہم جیسے پانچویں سواروں نے شرکت کی۔ طلبہ کا کہنا تھا کہ پریس
والوں کو اس لیے نہیں بلایا گیا کہ ان کے سوالوں کے آگے پریس کانفرنس
دم توڑ دیتی ہے اور اس سے خطاب کرنے والا اس قدر پریس ہوجاتا
ہے کہ وہ کچھ نہیں کہہ پاتا۔ جو وہ کہنا چاہتا ہے بلکہ وہ سب کچھ کہہ
ڈالتا ہے جو پریس والے اس سے کہلوانا چاہتے ہیں۔ ہم نے کہا بھی
کہ اس نام نہاد قسم کی پریس کانفرنس سے کیا فائدہ؟ جس میں اصل
پریس کے لوگ تو موجود ہی نہیں ہیں۔ اس پر انھوں نے دہرا جواب
دیا۔ ایک تو یہ کہ بیچارے پریس والے ایسی کانفرنسوں میں آتو جاتے ہیں
مگر اس کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں، سو تصویروں میں تو آپ بھی خاصے پریس
شدہ بلکہ پریس زدہ نظر آرہے ہیں دوسرے یہ کہ ہمیں اپنے فائنرز کو صرف
کانفرنس منعقد کرنے کا یقین دلانا ہے۔ اس سے آگے ہماری ذمہ داری
ختم ہو جاتی ہے۔

آغاز گفتگو کی دشواری نقل کرنے والے طلبہ کے نمائندوں کو
بھی تھی مگر جلد ہی باہر سے کمک آجانے پر ان کے حواس قائم ہوتے
اور وہ بولے: "ہم نقل کی لعنت کو ختم کرنا چاہتے ہیں ہم لوگ نقل کر کر
کے تھک گئے ہیں۔ آخر آپ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ ہم لوگ ساری
عمر کارتوس بنانے اور اسے آزمانے میں صرف کر دیں۔ کیا ہماری زندگی
کا یہی مقصد ہے۔ ہم آپ سے تعاون کے طلب گار ہیں۔ خدارا
نقل ختم کرنے میں ہماری مدد کریں۔

ایک نے سوال کیا: وہ کیسے؟ جواب دینے والے نے اسی یقینی سوال بلکہ لازمی سوال کا کارتوس تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھی نے تعریف پاکر اس کی مدد کی اور وہ مطلوبہ پرزہ اٹھا کر بولا، وہ اس طرح کہ نقل اور املا میں کیا فرق ہے؟۔ املا ایک بولتا ہے اور سب لکھتے ہیں۔ نقل ہر ایک الگ الگ کرتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ نقل کی لعنت ختم ہو اور املا کا سلسلہ شروع ہو۔"

پھر کسی نے کہا وہ کیسے؟۔ جواب ملا۔ اس سوال کا جواب دیدیا گیا ہے۔ مددگار نمائندہ نے کہا، دوسرا سوال ہے اس کا کارتوس ہوگا۔ ذرا غور سے دیکھو۔ ذرا توقف و تلاش کے بعد اس کا جواب بھی مل گیا۔ اس نے پڑھ پڑھ کر اٹکنا اور اٹک اٹک کر پڑھنا شروع کر دیا۔ جناب! ذرا غور کریں۔ ایک ہی قسم کے سوالوں کا جواب تلاش کرنے کے لئے ہزاروں طلبہ کو ہزاروں طریقوں سے کوشش کرنی پڑتی ہے۔ کتنا قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے اس طرح، کتنی انرجی ضائع ہوتی ہے ہم مستقبل کے معماروں کی۔ پھر بتائیے ہم اپنی توانائی ملک و ملت کے لئے کیسے بچا سکتے ہیں اس لئے جناب والا! ہمارا مطالبہ ہے کہ کمرہ امتحان میں نگراں امتحاں خود سوال کا جواب بولیں اور ہال میں موجود تمام طلبہ املا کے طور پر اسے اتار لیں۔ خدا دیکھئے اس طریقہ کار سے کس قدر فائدے ہونگے۔ یہاں اگر وہ ٹھٹک گئے تو ان کے مددگار نے ان کے ہاتھ سے پرزہ لیکر پڑھنے کی کوشش کی۔

"اس سے پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ نقل کا سلسلہ جڑ سے ختم ہو جائیگا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ممتحن کو مختلف سوالات پڑھنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑے گی۔ تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ تمام طلبہ کو یکساں نمبر ملیں گے جس سے ان کے درمیان جذبہ مساوات اور فضائے یکجہتی قائم ہوگی چوتھا فائدہ یہ ہوگا کہ طلبہ جو قیمتی وقت کارتوس بنانے میں صرف کرتے ہیں بچ جائے گا اور اسے وہ تعلیمی اداروں میں اپنے اپنے گروہ قائم کرنے بلکہ انہیں مضبوط بنانے اور مخالف گروہوں کو کمزور کرنے بلکہ ختم کر ڈالنے میں صرف کر سکیں گے اس سے ان اداروں میں گروہوں کی تعداد ممکنہ حد تک کم ہو سکے گی جس سے متاثر ہو کر ملک میں سیاسی جماعتوں کی تعداد کم ہونے کے امکانات روشن ہونگے جناب! اس سے پانچواں فائدہ یہ ہوگا کہ ہماری املا تو کم از کم درست ہو جائے گی۔ یہ تو نہ ہوگا کہ ہم آج تک اپنی لاعلمی کے سبب "عمر کوٹ" کو عین سے لکھتے رہے تھے۔ یہ کارتوس لکھتے وقت ایک استاد کا بھلا ہو جس نے ہماری املا درست کروائی" یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا تو اصل نمائندہ پھر سے تازہ دم ہو کر بولا " ایک فائدہ اور ہوگا جسے بتانا میرے ساتھی بھول گئے تھے۔

سب نے کہا" وہ کیا؟"

پہلی بار نمائندہ نے کارتوس کی مدد لئے بغیر کہا" اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہمارے اساتذہ کے تلفظ درست ہو جائیں گے؟ آخر وہ بھی تو ہم سے کچھ سیکھیں گے نا؟"

یہ سب خیال باری باری آتے رہے اور ہم اجنبی محفل میں گونگے بنے بیٹھے رہے اتنے میں ایک صاحب نے کہا، ٹی وی پر بچوں کے لئے سب سے اچھا پروگرام الف لیلیٰ پیش کیا جاتا ہے۔ انھوں نے الف لام اور ف کو ملا کر بولا تھا۔ ہمیں موقع مل گیا آغاز گفتگو کا اور غلط تلفظ کی معذرت پر لوٹنے کے لئے پر تولتے ہوئے ہم نے کہا" الف نہیں الِف لیلیٰ" خدا کا شکر ہے کہ اس محفل میں بھی لبقراط ہم ہی ٹھہرے۔

یادِ رفتگاں

# حکیم بشیر احمد خاں زخمی دہلوی

رحمت امروہوی (احمد آباد)

کھدر کی ٹوپی کھدر کا پاجامہ اور کرتا کھدر کی جاکٹ ۔ داڑھی مونچھیں صاف سر سے پیر تک گاندھی وادی مرتے دم تک کانگریس سے وابستہ رہے ہمیشہ صاف کھری بات کہتے تھے ونہایت بے باک اور نڈر اصول کے پابند ایک مرتبہ کارپوریشن کا الیکشن لڑا اور کامیاب ہوئے جھوٹ اور جھوٹ سے ہمیشہ پرہیز کیا ہمیشہ ایک ہی حال میں اپنی وضع قطع کے ساتھ زندگی بسر کی ۔ ان کی اس سخت اصول پسندی کے تحت اکثر لوگ اُن سے خفا بھی رہتے تھے ۔ شاعری میں استادانہ حیثیت کے حامل فنِ شاعری اور علمِ عروض پر گہری دسترس ۔ شعر میں کسی قسم کا عیب برداشت نہیں کرتے تھے خواہ وہ اپنے یہاں ہو یا کسی دوسرے کے یہاں برملا اظہار کر دینا انکی فطرت میں شامل تھا فخرِ گجرات اور دوسرے استاد ہمعصر شعرا کے ساتھ انکی چھڑپیں مشہور ہیں نعت گو اور فی البدیہہ اشعار کہنے میں ماہر اچھا شعر خواہ کسی کا بھی ہو خوب داد سے نوازتے تھے۔

ایک مرتبہ راقم الحروف نے ان سے کہا کہ زخمی صاحب آپکی یہ عادت مجھے اچھی نہیں لگتی آپ شعرا کو برسرِ مشاعرہ ٹوک دیتے ہیں ... یہ سنتے ہی ماتھے پر بل پڑ گئے رحمت میں نو مشق شعرا کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتا ہوں لیکن جب مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں شاعر نے اصلاح کا کام شروع کر دیا اور اپنے شاگرد بنا لئے ہیں تب میں اس شاعر پر خاص نظر رکھتا ہوں اور اس کی غلطیوں کو برداشت نہیں کرتا ۔ فنِ شعر گوئی برسوں کے ریاض اور محنت کے بعد حاصل ہوتا ہے آج کل شاعروں نے شاگرد بنا اور اصلاح کرنا ایک فیشن بنا لیا ہے ..... زخمی صاحب کے جواب میں معقولیت نظر آئی اور میں خاموش ہو گیا ...

زخمی صاحب بیان یزدانی میرٹھی کے شاگرد تھے ۔ دہلی کے پاس گڑگانواں ایک قصبہ ہے یہی ان کا وطن تھا ۔ مستقل سکونت احمد آباد ہی میں رہی اور یہیں انتقال ہوا ۔ احمد آباد آنے کے کالوپور گجراتی دواخانے میں ملازمت کی بعد میں اپنا خود کا مطب لیا تھا ۔ اسکے بعد کالوپور دروازے کے باہر ایک چائے کا ہوٹل کر لیا آج بھی ان کے بیوی بچے یہیں مقیم ہیں اور وہ ہوٹل ا بچے چلاتے ہیں ۔ جنگِ آزادی میں ایک دو مرتبہ جیل بھی گئے مشاعروں میں اکثر فخرِ گجرات محمد نظیر نصیری اور دیگر اساتذہ ساتھ ادبی چوٹیں ہوتی رہتی تھیں جو بہت پُر لطف اور معلومات ہوتی تھیں ۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کسی نے کوئی گھٹیا قسم کا کسی کی ذات پر حملہ کیا ہو ایک دوسرے کا ادب ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے ۔ زخمی صاحب شاعری کے علاوہ دورانِ گفتگو زبان کے معاملے میں بھی بہت محتاط رہتے تھے کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی کی زبان سے کسی لفظ کا غلط تلفظ ادا ہوا اور زخمی صاحب نے فوراً ٹوک دیا کبھی کبھی یہ انداز بحث کی صورت اختیار کر لیتا تھا ایک روز دورانِ گفتگو نصیری صاحب کے کسی کاتب پر گرما گرمی ہو گئی یار لوگوں نے بہت لطف لیا نصیری صاحب ناراض ہو گئے اور بہت دن تک ایک دوسرے

میں بات چیت کا سلسلہ منقطع رہا لیکن معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ زخمی صاحب بھی روزانہ آتے رہے اور نصیری صاحب بھی۔ اگر کبھی زخمی صاحب پہلے آگئے اور نصیری نہیں آئے تو آتے ہی دریافت کیا کیوں آج نصیری نہیں آئے اور اگر نصیری پہلے آگئے تو وہ زخمی صاحب کی خبر پوچھ لیا کرتے لیکن گفتگو بند رہی اسی عرصے میں نصیری صاحب کی لڑکی کی شادی طے پائی۔ رقعے تقسیم کئے گئے۔ زخمی صاحب کی بھی دعوت دی گئی شادی سے ایک روز قبل گجراتی دواخانے پر زخمی صاحب سے میری ملاقات ہوگئی۔ میں نے کہا کہئے زخمی صاحب آپ جائیں گے نصیری صاحب کے یہاں شادی میں؟ میرا خیال تھا جواب نفی میں ملے گا.... ہاں جاؤنگا ضرور جاؤنگا اسکی لڑکی کی شادی ہے اگر لڑکے کی شادی ہوتی تو شاید نہ جاتا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ افسوس اب ایسے وضع دار لوگ کہاں ملیں گے؟ نہ نصیری رہے نہ زخمی صرف یادیں باقی رہ گئیں ہیں۔ زخمی صاحب نے شادی میں شرکت کی۔ دونوں استاد گلے ملے نہ شکوہ نہ شکایت۔ وہی پرانا معمول روز ملنا خوش گپیاں کرنا، شاعری اور ادب پر گفتگو کرنا۔

اب ایسے اگلے وقتوں کے وضع دار لوگوں کا ملنا مشکل ہے دمہ کے پرانے مریض تھے اور اسی مرض نے ان کی جان لے لی۔ زخمی صاحب نے تقریباً پینسٹھ سال کی عمر پائی۔ احمدآباد کے ادبی ماحول کو بنانے سنوارنے میں زخمی صاحب کا ایک خاص حصہ ہے جو بھلایا نہیں جاسکتا۔ انتقال کے بعد ہم لوگوں نے کوشش کرکے انکا کلام ادارہ اشاعت اردو کے ذریعہ شایع کرایا ان کے مجموعۂ کلام کا نام 'کائنات' ہے

نمونۂ کلام:

## غزل

بلا سے ہم کہیں، پامال ہوں کہ مر جائیں
یہ آرزو ہے کہ یہ راستے سنور جائیں

ہرن سمجھ کے شکاری شکار کرتا ہے
یہ شیر ہیں کہیں ایسا نہ ہو بپھر جائیں

ذلیل ہو کے بھی کانٹے رہیں گے گلشن میں
مگر وہ پھول نگاہوں سے جو اتر جائیں

یہ چند سانس غنیمت ہیں کچھ تو کہہ سن لوں
قریب آئیں اقارب یہ چارہ گر جائیں

O

جان پر جو کھیلتا ہے جام پر
دور چلتا ہے اسی کے نام پر

ہو نہ غافل آکے منزل کے قریب
لاکھ خطرے ہیں انہیں دو گام پر

ان کے قدموں کے نشاں آئے نظر
سجدہ لازم ہوگیا ہر گام پر

کم نصیبی فرصتِ ماتم کہاں
ہنس رہا ہوں کوششِ ناکام پر

## قطعات

جنت میں ہوئی بھول ہوا دنیا میں آنا
دنیا میں ہوئی بھول تو دوزخ ہے ٹھکانا
لیکن جو کوئی بھول ہوئی مجھ سے وہاں بھی
اللہ بتا پھر مرا کس جا ہے ٹھکانہ

O

زاہد کو بس یہ دھن ہے کہ صوم و حج و زکوٰۃ
کہتا ہے فلسفی بھی نئی روز ایک بات
زخمی سب اپنے اپنے ٹھکانے پہ ٹھیک ہیں
سمجھا نہیں ہے کوئی ابھی مقصدِ حیات

O

عنوان ہے گناہ میری رسم و راہ کا
عادی ہوں میں شروع سے کارِ سیاہ کا
اب دوسرے گناہ کی تیاریوں میں ہوں
عالم مقیم ہے مرے پہلے گناہ کا

# عکس ریزہ

شبنم غم ـــ اسحاق آشفتہ / مرتب: اختر مسعود شیخ
صفحات: ۸۰ ۔ قیمت درج نہیں ہے
پتہ: 55/۹ ، نظام پورہ ، لالہ موسیٰ ، گجرات (پاکستان)

"شبنم غم" اسحاق آشفتہ کے قطعات کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اسحاق آشفتہ پرگو اور زودگو شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کی فنی توانائی میں مردانہ رعنائی اور مجنونانہ دانائی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ لیکن غزلوں کے ساتھ ساتھ وہ قطعات کے شاعر ہیں۔ ان کے قطعات میں فلسفیانہ و ماشقانہ خیالات کے اظہار کے وسیلے سے زندگی کے معاشرتی، اخلاقی اور اصلاحی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے ؎

تیری الفت کی راہ میں اکثر
خندگی یوں بھی جھلملاتی ہے
جیسے مفلس پہ کوئی دوشیزہ
ہوتے روتے بھی مسکراتی ہے

تیرے پیکر کی اف رے گہرائی
تو نہیں ہے! جو ظاہری ہے تو
تو مری جان ہے کہ اے جاناں
مرزا غالب کی شاعری ہے تو

کوئی بالغ نظر جو بتلا دے
میرے عرفاں کو جان مل جائے
اس کو دنیا میں کیا نہیں ملتا
جس کو اچھی زبان مل جائے

موت سے آدمی تو مرتا ہے
صدقِ انساں تو مر نہیں سکتا
جیسے سو سال کا فراق سنو!
دوستی کم تو کر نہیں سکتا

اسحاق آشفتہ کے قطعات میں لذت آمیز احساس سے بھرپور اور تشنگیٔ شوق کے نمائندہ (GUSTATORY) اور لمسی پیکر ملتے ہیں جن سے حسیاتی آسودگی اور مسرت آمیز بصیرت حاصل ہوتی ہے یہ حسیاتی آسودگی اور مسرت آمیز بصیرت اسحاق آشفتہ کے تخلیقی تجربات ہیں جو حرکت (MOVEMENT) کی پہچان ہیں اور ذہن اور موضوع کے جوہر (ESSENCE) کا پتہ دیتی ہیں۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ان پیکروں کا داخلی آہنگ (INTER RHYTHM) بہت اہمیت رکھتا ہے اور زندگی سے انسانی رشتے کی پیچیدگی اور تہہ داری کے دلکشی اور تابناک عکس، دائرہ در دائرہ شدت سے محسوس کراتا ہے۔

کتاب نہایت خوبصورت چھپی ہے۔ سرورق پر شاعر کی تصویر ہے۔ اختر مسعود شیخ نے کتاب کی ابتدا میں اسحاق آشفتہ کی شاعری پر ڈاکٹر سید عبداللہ، رئیس امروہوی، نصیر الدین نصیر، شبیر افضل جعفری، سید عارف، سید ضمیر جعفری، ایس لکھنوی اور راسخ کانپوری کی آراء دی ہیں۔

**مناظر عاشق ہرگانوی**

ناشر — اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ
صفحات — ۸۰ قیمت ۲/۵۰ روپئے

اترپردیش اردو اکادمی نے تحریک آزادی سے متعلق اردو ادب کی تدوین و اشاعت کا ایک جامع منصوبہ مرتب کیا ہے "مشاعرۂ زنداں" کی اشاعت اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ تحریک خلافت کا عہد شباب ۱۹۱۹ء سے شروع ہوا اور ۱۹۲۲ء میں رو بہ زوال ہوا اس مختصر مدت میں ہندو مسلم اتحاد کے جو مناظر دیکھنے میں آئے وہ برطانوی دور اقتدار میں پہلے کبھی دیکھنے کو نہ ملے تھے۔ ہر ایک کے دل میں جذبۂ آزادی اور ہر ایک کی زبان پر نغمۂ آزادی تھا۔ ہندوستانیوں میں ایسا جذبۂ آزادی بیدار ہو چکا تھا کہ وہ جیل جانا نیک فال تصور کرتے تھے جب مولانا آزاد کلکتہ میں گرفتار کئے گئے تو جشن چراغاں منایا گیا۔ احمق پھپھوندوی گرفتار کئے گئے تو شیرینی تقسیم کی گئی۔ شاعر اور ادیب قیدخانوں کو کیا سمجھتے تھے اس کی ترجمانی احمق پھپھوندوی نے اسطرح کی ہے ؎

جیل خانوں میں ہوں سسرال کی مانند احمق
کوئی تکلیف یہاں پر مجھے زنہار نہیں
وہی حیرت وہی فکریں وہی رونق ہے اے احمق
نئی گڑھ جیل کیا ہے کانگریس والوں کا دفتر ہے

سیاسی قید میں جب شعرائے کرام قیدخانوں کو سسرال سمجھتے رہے ہوں تو وہاں ادبی جشن کی گرم بازاری کیوں نہ ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آگرہ جیل کی چار دیواری کے اندر اسیرانِ ملت نے ایسے ایسے عظیم الشان مشاعرہ کا انعقاد کیا جس کے ذکر کے بغیر اردو شاعری کی تاریخ مکمل نہیں کہی جا سکتی۔

زیر نظر کتاب میں آگرہ جیل میں منعقدہ چار مشاعروں کی رپورٹ اور انتخاب کلام پیش کیا گیا ہے۔ جسے روزنامہ "زمیندار" لاہور کی ۲، ۲ فروری، ۲۴ فروری، ۷ مارچ اور ۴ مئی سنہ ۱۹۲۲ء کی اشاعتوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ ان مشاعروں میں مولانا نذیر احمد خجندی، خواجہ عبدالمجید، فراق گورکھپوری، مولانا شاہد فاخری، سید صغیر حسن اسیر، ساہر بیابانی، حافظ محمد عثمان، رتن لال زخمی، حفیظ الرحمٰن، ایم زبیر، کنور بھلا ماتھر، کرشن کانت مالوی، عبدالمجید سالک [illegible] وغیرہ رہبران قوم جذبۂ آزادی سے سرشار ہو کر مصرع طرح پر غزلیں [illegible] تھے۔ اور دوسرے سیاسی قیدی جن کی تعداد تقریباً تین سو تھی [illegible] خوب داد دیتے تھے۔ ان مشاعروں میں زیادہ تر غزلیں ایسی تھیں جو تحریک آزادی کے پس منظر میں کہی گئی تھیں اور حب الوطنی کے جذبات سے معمور تھیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے

دار پر وار گئے پھر بھی میں بے جاں نہ ہوا
ہے یہ ارمان کہ پورا میرا ارماں نہ ہوا (مولانا نذیر خجندی)

بس کہ سینے میں چھپالی تھی تمہاری تصویر
ہم سے وحشت میں کبھی چاک گریباں نہ ہوا
(خواجہ عبدالمجید)

کھل گیا صورت گل دل جو چلا ناوک یار
ہوئی اک موجِ صبا تیر کا پیکاں نہ ہوا
(فراق گورکھپوری)

ہم تو ہیں قید میں اور گھر میں پڑے ہیں پرنس
سارے عالم میں کوئی آپ سا مہماں نہ ہوا
(مولانا شاہد فاخری)

صلۂ قوم فروشی کی تمنا ہی رہی
مرشد شیخ خوشامد میں گرفتار نہ ہوا
(احمق پھپھوندوی)

کتاب کی ابتدا میں جوش ملیح آبادی کی ایک نایاب نظم "لمعات جوش" بھی شامل ہے۔ اردو اکادمی یوپی کا ہمیں مشکور ہونا چاہئے جس نے ہندوستان کی تحریک آزادی کے سلسلے میں جیل کی چار دیواری کے اندر اردو کی خدمات کی تاریخ ہمارے سامنے پیش کی ہے جس سے اردو کو بھی دیگر زبانوں میں امتیازی شان عطا ہوتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ادبی حلقے میں "مشاعرۂ زنداں" کا خصوصی خیر مقدم کیا جائے گا۔

گجرات سے نکلنے والا واحد علمی ادبی اور ثقافتی

ماہنامہ

# گلبن

نومبر ۱۹۸۳ء

جلد ۶ شمارہ ۲، ۷ واں

ایڈیٹر: ثریا ہاشمی

منیجنگ ایڈیٹر: ظفر ہاشمی

...تب کار: مناظر عاشق ہرگانوی

**نگراں**

سید محمد حکیم الدین شیرازی

**مشیران**

سید علی احسن بخاری

سید احمد مختار غوثی

ڈاکٹر شمس الاسلام عثمانی

**بدل اشتراک**

• لائف ممبری ۵۰۰ روپے

• زر تعاون سالانہ ۵۰ روپے

• زر سالانہ ۲۰ روپے

**غیر ممالک**

• بحری ڈاک سے ۳ پونڈ

• ہوائی ڈاک سے ۵ پونڈ

• عام شمارہ ۱٫۷۵ روپے

...گجرات ہاؤسنگ بورڈ کالونی شاہ عالم احمد آباد ۳۸۰۰۲۸

...پبلشر، پروپرائٹر: ثریا ہاشمی

... نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد (یو۔ پی)

## فہرست

ظفر ہاشمی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　اداریہ

# اردو میڈیم اسکول

گجرات میں اردو میڈیم پرائمری اسکولوں کا جائزہ لیا جائے تو ایک حقیقت فوری طور پر محسوس ہوگی کہ ہم نے اگر کسی چ
نظرانداز کیا ہے اور کسی شعبہ کو مجرمانہ غفلت اور ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے مجروح ہی نہیں تقریباً مفلوج کر رکھا ہے تو
اردو میڈیم اسکول ہیں۔ یہاں مینوسپل اور ضلع پنچایت کے اردو اسکول عام طور پر اس انداز سے چلائے جاتے ہ
حساس والدین وہاں اپنے بچوں کو داخل کرانے میں پس و پیش کرتے ہیں۔ یوں تو بے حسی اور پست کارکردگ
ملک اور معاشرے کی خصوصیت ہے لیکن اردو میڈیم اسکولوں کا یہ مزاج بن چکا ہے جس کا اثر مجموعی طور پر ا
نظام تعلیم پر پڑتا ہے اور یہ ہماری سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔ آج اردو میڈیم اسکول سہ طرفہ حملوں کے شکار
ایک طرف اہل حکومت اور حکام کا مجرمانہ اور تعصبانہ رویہ اور دوسری طرف مطلب پرست مسلم سیاسی بازیگروں
معاندانہ برتاؤ اور تیسری طرف خود ان اسکولوں کے اساتذہ اور سپروائزر کی لاپرواہی اور تساہل۔ ہمیں اس حقی
سے انکار نہیں کہ احمد آباد میں چند اردو میڈیم اسکول ایسے ضرور ہیں جو مثالی ہیں اور جن کے نقش قدم پر دوسر
اردو میڈیم اسکول ہی نہیں بلکہ دوسری زبانوں کے اسکولوں کو بھی چلنا چاہیئے ہمیں ایسے اسکولوں پر فخر ہے
ہمیں اس حقیقت کا بھی اعتراف ہے کہ تقریباً تمام اسکولوں میں کچھ ایسے اساتذہ بھی موجود ہیں جو تدریس کو مقدس
سمجھ کر عبادت کی شکل میں طالب علموں کے سامنے ادا کرتے ہیں ہم عقیدت سے ان کے سامنے اپنا سر خم کرتے
ــــ لیکن دو چار اچھے اسکول یا دس بیس اساتذہ تو اس کینسر کو نہیں روک سکتے جو اردو اسکولوں کے جسم میں
رہا ہے۔ اور جس کی وجہ سے اردو اسکولوں کی صحت گرتی چلی جا رہی ہے آخر کیا وجہ ہے کہ ساتویں جماعت پاس ک
کے بعد بھی بچہ پوری طور پر اردو لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ آخر کیا بات ہے کہ سات سال تک ان اسکولوں میں ز
رہ کر بھی وہ ذہنی طور پر پست، ڈرا، سہما اور سمٹا سمٹا نظر آتا ہے۔ اردو زبان کا پہلا درس خود اعتمادی اور برت
پھر کیوں اردو میڈیم کا بچہ احساس کمتری کا شکار رہتا ہے۔ اسے اپنی زبان کے آہنی کردار کا احساس کیوں
دلایا جاتا۔ اُسے اردو تہذیب کے پرکشش لباس میں ملبوس کیوں نہیں کیا جاتا۔ اسکے اندر احساس برتر
نہیں پیدا کیا جاتا۔ اسکی تعلیم کی طرف بھرپور توجہ کیوں نہیں دی جاتی۔

اور یہ سارے فرائض ان محترم اساتذہ کے ہیں جن کے ہاتھوں میں والدین اپنے معصوم بچوں کو اس
ہیں کہ وہ انھیں اردو تہذیب کا پروردہ بنائیں گے ان کے اندر خودداری، خود اعتمادی، تیز طراری پیدا کر
اور ایسی ٹھوس اور مکمل تعلیم کا بیج بوئیں گے جو بچوں کے اندر شش جہت کو مسخر کر دینے کا ولولہ پیدا کر د
ــــ اس لیے نہیں کہ خود وہ اپنی ہی نظروں سے گر جائیں اور مستقبل ایک سوالیہ نشان بن کر
سامنے کھڑا ہو جائے۔

ریدین ظفیر (بریہ پورہ)

# مناجات

کرم تمہارا جو خیر الانام ہو جائے
میرے گناہ کا قصہ تمام ہو جائے

قسم خدا کی نگاہیں بچھائے گی دنیا
اگر تمہارے غلاموں میں نام ہو جائے

بلالو مجھ کو مدینے میں یا رسول اللہ
ہمارے دیدۂ تر کا سلام ہو جائے

مدینہ جا کے خدا کی قسم نہ لوٹوں گا
درِ حضور جو میرا قیام ہو جائے

نصیب روضۂ اقدس کی ہو جو جاروبی
ہماری عمر اسی میں تمام ہو جائے

تمہاری ایک نگاہِ کرم اچٹتی سی
گناہگار کا جنت مقام ہو جائے

ظفیرؔ گنبدِ خضرا کو جا کے چوموں گا
مدینہ جانے کا جو انتظام ہو جائے

# نعت

عشق کا اب تو میرے اثر دیکھئے دل شب و روز میرا مدینے میں ہے
اب کسی روشنی کی ضرورت نہیں نورِ احمد میرے آج سینے میں ہے

کوئی مدِ مقابل کہیں بو نہیں سوسن و گل میں بھی کوئی جادو نہیں
مشک عنبر میں بھی ویسی خوشبو کہاں جو ہمارے نبی کے پسینے میں ہے

آپ نبیوں میں رحمت لقب پا گئے آپکے بعد کوئی پیمبر نہیں
آپ کی شان معراجِ عرش بریں زلف کا ذکر قرآں کے سینے میں ہے

کچھ نہیں غم مجھے لاکھ طوفاں اٹھے جا رہا ہوں شکستہ یہ کشتی ہے لئے
ہاں وہی نور روشن ہے جس سے جہاں ناخدا بنکے میرے سفینے میں ہے

جلوۂ پاک کی کوئی حد تو نہیں اے ظفیرؔ اپنی قسمت پہ حیران نہ ہو
دل کو معمور نورِ محمدؐ سے کر ساری دولت اسی اک خزینے میں ہے

مناظر عاشق ہرگانوی۔

# پوسٹ مارٹم

ابھی ابھی ایک شعری مجموعہ مطالعہ میں آیا ہے شاعر کا نام ایمن جعفری ہے اور "عکس الہام" مجموعہ کا نام ہے۔ یہ مجموعہ مغربی بنگال اردو اکیڈمی کے تعاون سے شائع ہوا ہے اور ایمن جعفری ہوڑہ (کلکتہ) کے شاعر ہیں۔

"عکس الہام" کے مطالعہ کے دوران مجھے بار بار مظہر امام کا مجموعۂ کلام "رشتہ گونگے سفر کا" دیکھنے کی خواہش ہوتی رہی آخر کتابوں کی الماری "رشتہ گونگے سفر کا" نکالنا پڑا۔ مظہر امام کا مجموعہ ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا تھا اور "عکس الہام" ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آیا۔ دونوں مجموعہ کی اکثر غزلوں میں خیال اور بندش کی مماثلت ہے۔ چند اشعار بانمونہ ملاحظہ فرمایئے۔

کوئی لشکر آئے گا طوفان کی صورت امام
سر سے وہ خوابوں کا خیمہ بھی اڑا لے جائے گا

رشتہ گونگے سفر کا ص ۴۴

بڑھ گیا طوفان تو ساری طنابیں توڑ کر
سر سے احساسات کا خیمہ اڑا لے جائے گا

عکس الہام ص ۴۲

اس طرح گرنے نہ دو یادوں کی شبنم دیر تک

رشتہ ...... ص ۶۶

بے سبب یادوں کے ساحل ٹوٹ کر گرنے نہ دو

عکس الہام ص ۲۲

سیل بیم اک روز اس کو بھی بہالے جائے گا

رشتہ ص ۴۴

وقت کا سیل رواں اس کو بہالے جائے گا

عکس الہام ص ۲۲

سچ کے صحرا میں انھیں ڈھونڈ کے تھک ہار گئے
جھوٹ کے شہر میں یاروں کا بسیرا نکلا!

رشتہ ص ۵۰

جھوٹ کے دشت سے نکلے تو ہوا یہ معلوم
بند ہے شہر میں بھی سچ کا ہر اک دریا یارو

عکس الہام ص ۲۰

جاتے ہو تو بچوں کو بھی ساتھ اپنے لئے جاؤ
جب لوٹ کے آؤ گے تو یہ گھر نہ ملے گا

رشتہ ...... ص ۴۴

جس کو چھوڑ کے جاتے ہو وہ نشاں نہ پاؤ گے
جب پلٹ کے آؤ گے یہ مکاں نہ پاؤ گے

عکس الہام ص ۹۰

لمحوں کی طرح گذری ہیں صدیاں تو بارہا
اک پل بنا ہے کیسے زمانہ کہا نہ جائے

رشتہ ...... ص ۹۸

وہ ایک پل کہ جس میں ہے صدیوں کا اضطراب
لمحہ کہا نہ جائے زمانہ کہا نہ جائے

عکس الہام ص ۱۰۱

اپنا مکاں اجاڑ کے صحراؤں کی طرف
وہ شخص کیوں ہوا ہے روانہ کہا نہ جائے

رشتہ ...... ص ۱۱۰

بے سمتیوں کے کرب مسلسل سے اوب کر
کب کس طرف وہ ہوگا روانہ کہا نہ جائے گا

عکس الہام ص ۱۱

خیال اور بندش کی اس مماثلت کو سرقہ کہا جائے یا توارد؟

شباب للت (شملہ)

# داستان پریوں کی

سبھی خوش حال ہیں، کوئی نہیں بھوکا نگر میں
زمیں خوشس آسماں خوش ہے
مری نظر دل میں تو سارا جہاں خوش ہے.
گرانی ؟ بھکمری ؟ افلاس، بے کاری
کہاں ہے ـــ ـ ـ ؟
یہ پریوں کی خیالی داستاں ہے،
خیالی داستانوں میں نہ الجھاؤ مجھے لوگو!
کہ مجھ کو اور بھی دھندے بہت ہیں
ہزاروں گتھیاں ہیں منتظر میری توجہ کی،

(۲)

سبھی خوش وقت ہیں، خوش کام ہیں، کرتے ہیں نمبر دو کا دھندا
خریدیں بھی یہ مہنگا اور بیچیں بھی یہ مہنگا
ہے میرے سایہ شفقت میں سارا شہر آسودہ
سبھی ہیں مطمئن، مشغول عیش و استراحت ہیں

(۳)

خوطیت کے رسیا
وابھی شاکی ہیں اک آشوب ذہنی کے
نہیں کہہ دو، بدل لیں زاویہ تھوڑا سا وہ اپنی نگاہوں کا
خوب و زشت، نیک و بد کے پیمانوں کو بدلے مدتیں بیتیں
وہ جن قدروں کے شیدا ہیں
وہ قدریں بھی
ل و شوخ پریوں کی خیالی داستانیں
ن ابچکی کب کی
رافت اور نیکی کے نئے معیار
عداقت و دیانت کے نئے معنی

خوش آئند و حسیں ہیں کس قدر لوگو! (خدائے پاک کی سوگند)
کتنی خوبصورت ہے یہ دنیا ـــ ؟
سبھی مسرور ہیں، مخمور ہیں اپنے گھروں میں
فلک پر مالک کون و مکاں خوش ہے
خدائی خوش، زمیں خوش آسماں خوش ہے
غرض سارا جہاں خوش ہے.

# "کھاد" فارغ بخاری (پاکستان)

شرق سے تا غرب
ہنگامہ سا ہے جو چار سو
دور تک پھیلے ہوئے دنیا کے آنگن میں
ہمارے روبرو
پیڑ، سبزہ، غنچہ و گل، رنگ و بو
کوہ و صحرا
شہر، جنگل
دشت و دریا
کوٹھیاں، بنگلے، مکاں
ان کے مکیں
لہلہاتے کھیت
کھیتوں کی زمیں
جو بھی ہے موجود
اور اپنا وجود
ہر گذرتا لمحہ اپنے ساتھ لے کر
ان کے ٹھنڈی راکھ کے بجھتے شرر
ماضی میں کرتا ہے سفر
موت اس کی
اک بشارت ہے زمانے کے لیے
کھاد بنتا جا رہا ہے.
مستقبل گرمانے کے لئے.

اِنکسار چندن (جموں)

# ایک نظم

مضامین یہ
رسائل میں چھپے ہیں
کئی اخباروں کی سرخی یہی ہے
کہ انساں کے لیے
روٹی ضروری شے
نہیں رہ جائے گی اب
یقیناً
معجزہ سائنس کا ہے یہ
مگر یہ کیا
پروٹین اور وٹامن
کی بھی گولی۔
نہیں روٹی سے سستی!
علاج مفلسی
کرنے کی فرصت
کسی کو بھی نہیں ہے۔

منوہر لال ہادی

# سانیٹ

سوچتا ہوں شہر والے کس کو کہتے ہیں تضاد
کیا یہ کوئی زندگی کا جلوۂ صد رنگ ہے
ذرۂ صد رنگ ہے یا شعلۂ صد رنگ ہے
یا ہمارے سوچنے کے ڈھنگ کا یکسر فساد
سوچتا ہوں باغ والے کس کو کہتے ہیں تضاد
کیا یہ اشیائے چمن کا جلوۂ صد رنگ ہے
منظرِ صد رنگ ہے یا غنچۂ صد رنگ ہے
یا گلابوں اور سبزے کے سفر کی روئداد
سوچتا ہوں بحر والے کس کو کہتے ہیں تضاد
کیا یہ دریائے صور کا جلوہ صد رنگ ہے
ان صور کا راگ ہے یا نغمۂ صد رنگ ہے
یا ہماری آنکھ سے اوجھل نگار از دیار
سوچتا ہوں کہ سکیں کس کو سبھی ہیں تضاد
ان کی باتیں آسمان زاد ہیں یا گیتی نژاد

---

شہزادی روبینہ شاہین

# ایک نظم

یہی کچھ
عبادتوں کے دن تھے
جب ہماری آزمائش کے
لمحے
ہمیں معصوم آنکھوں سے
تک رہے تھے
اور انہی دنوں
تم نے مجھ سے
میری ریاضت چھین کر
مجھے نرم لذتوں کا
تحفہ دیا تھا
جس کا کسیلا نمکین ذائقہ
مجھے اب بھی نیندوں میں جگا دیتا ہے۔
پرانے لمحوں کی یاد
دلا دیتا ہے۔

# اپنا گھر

محمد منشا یاد (پاکستان)

میں گندگی اور بدبودار نالیوں میں چاروں طرف سے گھرا ہوا
تالاب۔
بارش اور تازہ پانی کی بوندوں کو ترستا ہوا۔
ایک جیسی صبحیں ایک جیسی شامیں۔
وہی گھر وہی آنگن۔ وہی شہر اور سڑکیں۔
وہی ہر طرف مداریوں کی طرح چتر چالاک آدمی اور آ[illegible]یں
ٹھنگی لگانے والی بارہ تالن عورتیں۔
منافقت سے اٹی ہوئی صورتیں۔
خودغرضی کے جالے۔ سازشوں کی مکڑیاں۔ اور وہی ٹانگیں
کھینچتے اور میرے اٹھنے کی جگہوں پر مرغیوں کی طرح گندگی پھیلاتے
احباب!
وہی ہر روز ایک ہی طرح سو کر اٹھنا اور وہی سنتر سنتر قدم
پیچھے ہٹ کر ایک دوسری سے ٹکریں مارتی گھر کی دیواریں۔
بھاگم بھاگ دفتر کے لئے تیار ہونا
وہی میز اور وہی ایک جیسا ناشتہ
وہی دفتر اور وہی مردار کے انتظار میں بیٹھے ہوئے گدھوں کی
طرح افسران بالا کی نظریں۔
وہی فائلیں اور وہی ایک جیسے قے کئے ہوئے لفظوں سے
انکا پیٹ بھرنا۔
باہر سے تھک کر گھر آنا اور گھر سے اکتا کر باہر نکل جانا
کوئی ایسا کام بھی کرتا لگتا صدیوں سے یہی کر رہا ہوں۔
دفتر میں ٹیلیفون سنتے وقت ہیلو کہتا تو معلوم ہوتا جب سے پیدا
ہوا ہوں ہیلو ہیلو کر رہا ہوں۔ ڈپو سے آٹا لینے کے لئے قطار
میں کھڑا ہوتا تو لگتا جب سے کھڑا ہونا سیکھا ہے آٹا لینے
کے لئے قطار میں لگا ہوں اور کبھی باری نہیں آئے گی۔
منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے کسی دوست کے گھر
جاتا تو وہاں بھی وہی سب کچھ پرانا اور برتا ہوا معلوم ہوتا۔
وہی میز اور کرسیاں اور وہی انکی ہمیشہ سے دیکھی ہوئی
ترتیب۔ باتوں کے ایک جیسے موضوعات وہی ہر گھر کی
اپنی ایک مخصوص خوشبو یا بدبو۔ ایک جیسی چائے اور چائے
کے برتن وہی ایک طرح میزبان کا ہر بار مصنوعی خندہ
پیشانی سے استقبال کرنا اور خیریت پوچھنا اور وہی ایک
جیسے کھوکھلے اور بناوٹی قہقہے۔
اکتاہٹ اور بیزاری کی بارش سے بچنے کے لئے
میں نئی نئی مصروفیات اور مشاغل کی چھتریاں تلاش کرتا
گہری خاموشی اور سناٹے میں پتہ بھی گرے تو اس کی
آواز چونکا دیتی ہے۔ گھپ اندھیرے میں جگنو بھی دیا معلوم
ہوتا ہے۔ میں گھر میں کپڑے لٹکانے والی نئی کھونٹی لاکر ٹھونکتا
یا بیوی نئے رومال میں لپیٹ کر روٹی لاتی تو کچھ دیر کے
لئے گھر نیا نیا لگنے لگتا۔ ہم دونوں میاں بیوی کماتے اور
چھوٹی بڑی چیزیں خرید خرید کر گھر کو باسی ہونے سے بچانے
کی کوشش کرتے رہتے [illegible] پرانی ہو جاتی
پھر ہم میزوں کرسیوں صوفوں اور پلنگوں کی ترتیب بدل
کر کام چلاتے آپس میں لڑتے جس سے لڑائی سے

ان سے صلح کر لیتے اور جن سے کالی چھن رہی ہوتی ان سے دشمنی مول
لے لیتے لیکن بات نہ بنتی مزہ نہ آتا۔ لگتا جیسے ہم ایک مدت سے
کنویں میں قید ہیں اور باہر نکلنے کے لئے دن رات ہاتھ مارتے اور
لہولہان ہوتے رہتے ہیں۔

ایک روز میں نے ایک کتاب پڑھی اور جلدی سے بند کرتے
ہوئے کہا "پتہ چل گیا ہے" اس نے پوچھا "کس بات کا"!

"باسی ہو جانے کا"

"وہ کیسے!"

"وہ اس طرح کہ ہم نے اپنے لیئے بہت سی دشواریاں اور
مشکلات خود پیدا کی ہوئی ہیں، ہمیں خود نمائشی تکلفات اور تصنع کی
زندگی ترک کرکے سادہ اور فطری زندگی گذارنی چاہیئے آسائشوں اور
سہولتوں نے ہم سے اصل زندگی کا ذائقہ چھین لیا ہے۔ اور سادگی کی
ابتدا آج ہی سے ہونی چاہیئے"

اس نے کہا "کیوں نہ ہم چھٹیاں لے کر کچھ دنوں کے لئے گاؤں
چلے جائیں اور بے تکلفی سادگی اور فطری زندگی گذارنے کی عادت
ڈالیں اور کھوئے ہوئے سچے ذائقوں سے آشنائی حاصل کریں"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک ہے مجھے بھی گاؤں گئے ہوئے
کئی برس ہو گئے ہیں۔ گاؤں والے جب بھی آتے ہیں شکایت
کرتے ہیں کہ میں گاؤں کو بھول گیا ہوں۔ ممکن ہے آب و ہوا کی
تبدیلی سے باسی اور بدبودار ہونے کا یہ احساس کم ہو جائے جو
ہمیں ایک جیسے باہر سے چمکتے مگر اندر سے سیاہ لوگوں میں رہتے
ہوئے دن رات گھیرے رکھتا ہے"

اس نے کہا "پروگرام بنائیے۔ میں بھی ایک جیسے برتنوں
میں آلو گوشت اور گوشت آلو پکا کر اکتا گئی ہوں کہیئے کب چلنا ہے"

"تم تیاری شروع کر دو" میں نے جواب دیا۔

اور گاؤں جانے کی تیاری شروع ہوئی

اور اخراجات کا تخمینہ لگایا گیا ہم نے اپنے اپنے دفتروں میں
چھٹی کی درخواستیں دیں اور منظور کرائیں ریل کی سیٹیں بک کرائیں
اور ایک دوست سے کہہ کر ایک قابل اعتماد قسم کا آدمی تلاش کیا
جو ہماری غیر حاضری میں گھر کی چوکیداری کر سکے۔ اسے دو تین روز
پہلے بلا کر سب کچھ سمجھا دیا گیا کہ پانی کا نل اور سوئی گیس کا چولہا
کس طرح بند کرتے ہیں۔ اُسے تاکید کر دی کہ وہ رات کو زیادہ دیر
تک بتی نہ جلائے رکھے۔ دودھ والے سے ایک پاؤ سے زیادہ دودھ
نہ لے۔ اخبار والے کو منع کر دیا ہے مگر وہ غلطی سے اخبار ڈال جائے
تو اس کی دکان پر واپس کر آئے مرغیوں کو دانہ ڈالتا رہے قصاب
کی دکان سے چھیچھڑے لا کر بلی اور کتے کو ڈالنا نہ بھولے اُسے ڈاک
کے بارے میں بھی بتا دیا گیا کہ کہاں اور کیسے سنبھال کر رکھنی ہے
اور بیرنگ خطوط کس طرح واپس کرتے ہیں اور اگر کوئی مہمان آ
جائے تو اس کے مرتبہ کا اندازہ کس طرح لگانا اور اس کے ساتھ کیا
سلوک کرنا ہے۔ ٹیلی فون کس طرح سننا اور کیا جواب دینا ہے اور
رانگ نمبر سے کس طرح نمٹنا ہے۔

چوکیدار شریف اور اچھا آدمی معلوم ہوتا تھا پھر بھی ہم نے
پڑوسیوں کو فرداً فرداً تاکید کر دی کہ وہ ہمارے گھر اور چوکیدار
کا خیال رکھیں اور اس کی نگرانی کرتے رہیں کہ وہ اپنی ڈیوٹی خوش
اسلوبی سے انجام دے رہا ہے یا نہیں اور اگر کوئی ایسی ویسی
بات ہو جائے تو وہ ہمیں گاؤں کے پتہ پر تار دیں۔

اس کے بعد سامان بندھنے لگا بچوں کے لیئے خاص طور
پر ایسے کپڑے سلوائے گئے تھے جو گاؤں کی گلیوں کی کیچڑ اور
گرد و غبار میں بھی کام دے سکیں۔ اپنے لیئے ہم نے ریشمی اور
قیمتی کپڑوں کے علاوہ سیدھے سادے اور رات کے پہننے والے
کپڑے بھی ساتھ رکھ لئے تولیئے بنیانیں، انڈرویئر جرابیں، مفلر
کمبل، ٹائیاں ازار بند، سوٹ، کوٹ اور پتلونیں۔ اس کے علاوہ
سوئیٹریں، کوٹیاں، پاجامے، شلواریں، کرتے اور ہر قسم کے جوتے
اور چپلیں، پتہ نہیں کس چیز کی کب ضرورت پڑ جائے اور آخر گاؤں
میں ہمیں والدین کے گھر میں تو بند نہیں رہنا تھا اور پھر گاؤں والے
کیا سوچتے کہ ان کے پاس بس یہی دو چار جوڑے کپڑوں کے ہیں
جنہیں یہ بدل بدل کر پہنتے رہتے ہیں۔

اس خیال سے کہ گاؤں میں اچھی قسم کی چائے کی پتی نہیں

ملیگی۔ ہم نے چائے کے دو ایک ڈبے بھی ساتھ رکھ لیئے اور اس خیال
سے کہ خالص دودھ کی چائے شاید بچوں کو ہضم نہ ہو پائیں اس
دودھ سے مہک آنے خشک ولایتی دودھ کا ایک ڈبہ بھی رکھ دیا۔
پپّو کے لئے دو چار تیل فالتو رکھ لئے اور ضد کرنے کی صورت میں
اُسے منانے کے لیئے ٹافیاں بسکٹ اور چیونگم بھی۔ بلکہ چند ایک
غبارے بھی رکھ لئے وہ جب بھی ضد کرتا تھا غبارے کر بلکہ پھاڑ
کر چپ ہوتا تھا، تاہم ہم نے غباروں میں ہوا نہیں بھرائی کیونکہ ہم
تبدیلی آب و ہوا کے لئے ہی تو جا رہے تھے۔ اور گاؤں میں ہوا شہر
کی نسبت زیادہ صاف اور خاصی مقدار میں دستیاب تھی!

گاؤں کی چھوٹی سی دکان پر چیزیں اچھی نہیں ملتی اور پھر
مہنگی بھی ہوتی ہیں، اس لیئے کپڑے دھونے کا پاؤڈر، نہانے
کا صابن شیمپو، ہیئر ٹانک اور ہیئر کریم، ٹوتھ پیسٹ اور منجن، شیونگ
اور میک اپ کا سامان بھی ہم نے ساتھ رکھ لیا۔ ریڈیو ٹرانسسٹر
اور ٹیپ رکاڈر تو بہر حال ضروری چیزیں تھیں گاؤں میں گزار
ہوئے لمحوں کو محفوظ کرنے کے لیئے کیمرے میں نئی فلم بھی ڈلوائی
بڑے لڑکے کو عرصہ سے بندوق کا دھاکہ سننے کی خواہش تھی
اس لیئے کچھ کارتوس کے ساتھ بندوق بھی ساتھ رکھ لی۔ کیا پتہ کچھ
شیکار وغیرہ بھی مل جائے۔ گاؤں میں جوتے جلد خراب اور میلے
ہو جاتے ہیں اس لیئے مختلف رنگوں کی پالش اور برش بھی ضروری
تھے۔ لکھنے پڑھنے کا سامان، رائٹنگ پیڈ دو چار خوبصورت
بال پوائنٹ، سادہ اور ڈاک کے لفافے اور ٹکٹیں۔ گاؤں میں بیٹھ
کر دوستوں اور جاننے والوں کو خطوط لکھیں گے اور گاؤں کی
سادہ اور فطری زندگی کی تصویر کشی کریں گے،

پڑھے لکھے آدمی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ لکھتا
یا پڑھتا ہوا دکھائی دے، اب گاؤں میں اخبار ملنے کا تو کوئی امکان
ہی نہیں تھا چنانچہ ہم نے ایک رسالے شاعری اور افسانوں کے
مجموعہ انگریزی کے چند ایک ناول جنہیں خرید کر محض سجاوٹ
اور بھرم قائم رکھنے کے لئے بک شلف میں رکھا ہوا، ساتھ لے
لیئے کہ فراغت ہوگی اور مطالعہ کریں گے، ساتھ ہی لوگوں کو حیران
کریں گے یہ اتنی موٹی موٹی کتابوں کے اتنے باریک باریک الفاظ کیسے
پڑھ لیتے ہیں۔ بیوی کو کبھی کبھی پتے کا درد ہو جاتا تھا اس لئے حفظ
ماتقدم کے طور پر فوری اثر کرنے والی گولیوں کی شیشی ننھے کا
گلا خراب ہو جانے کے امکان کے پیش نظر اسکا سیرپ اور ہنگامی
ضرورت کی دوسری دوائیں اور تھرمامیٹر۔ گاؤں میں اچھی برانڈ
کے سیگریٹ کہاں، چنانچہ دو چار کارٹن سیگریٹوں کے خوشنما کیس
لائٹر اور لائٹر گیس کی شیشی۔

بچے ناشتہ میں ڈبل روٹی کے عادی تھے چنانچہ رس اور
ڈبل روٹی لینوں کا انتظام بھی کر لیا گیا۔ کسٹرڈ پاؤڈر، سیویاں اور
خشک میوے ہم ویسے ہی گاؤں والوں کے لئے تحفے کے طور پر
لے جاتے تھے اور گھر میں ڈپو سے منگا کر جو چینی رکھی ہوئی تھی وہ
بھی ساتھ رکھ لی بلکہ بیوی نے بہت سی آرٹ آف فیشن ہو جانے والی
کماگری بھی ایک بڑے سارے ڈبے میں بند کر لی۔ اس کا ارادہ
تھا وہ واپسی پر یہ کماگری وہیں چھوڑ آئے گی اور ڈبے میں چاول بھر
لائے گی۔

جس روز ہمیں جانا تھا اس رات کو بارش ہو گئی۔

ریل سے اتر کر گاؤں جانے کے لئے بس کا سفر کرنا پڑتا تھا
اور ایسے موسم میں پھسلن کی وجہ سے بس کے حادثے کا ڈر تھا ہم
نے ریل کار کے ٹکٹ واپس کئے اور ریلوے کے ایک بڑے افسر
سے سفارش کرا کے دو روز بعد کی سیٹیں بک کرائیں مگر اسی شام
کو اچانک والد صاحب آ گئے انھیں معمولی اور میلے کچیلے کپڑوں میں
دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ ہل چلاتے یا چارہ کاٹتے ہوئے اچانک کوئی بُری
خبر سُن کر اُٹھ کھڑے ہوں اور کپڑے تبدیل بغیر آ گئے ہوں ان کے
پاس کوئی سامان نہیں تھا ہم پریشان ہو گئے۔ خدا خیر کرے۔

سلام دُعا کے بعد پوچھا تو کہنے لگے "آج صبح نلائی کرتے ہوئے
اچانک تم لوگوں اور بچوں کو دیکھنے کے لئے تڑپ اٹھا میں نے گھر جا کر
تمہاری والدہ کو اطلاع دی۔ کرایہ لیا اور چلا آیا۔ سوچا اپنے گھر تو جا رہا
ہوں"۔

ڈاکٹر احمد سہیل (پٹنہ)

# نئی تفہیم

لمحے بولتے ہیں!
لمحے سوتے ہیں ——— ! لمحے جاگتے ہیں ——!!
کون سے لمحے ——؟
وہی —— جس کے تم متلاشی ہو۔
غلط! میں کسی شے کا متلاشی نہیں!
سچ کہہ رہے ہو —— ؟
ہاں —— بالکل سچ ——!! اچھا یہ بتاؤ تم ہو کون —— ؟
میں ——؟ میں بھی وہی ایک لمحہ ہوں ——!
وہی لمحہ ......!
ہاں! بالکل وہی ——!! جسے پکڑنے کیلئے تم پھیل پھیل کر سمٹتے ہو۔ اور سمٹ سمٹ کر بکھر جاتے ہو۔
لیکن ....؟
خیر چھوڑو.........
نہیں ——— ہاں ——؟
اگر نہیں تو تم سے بات کرنا بیکار ہے اور اگر جانتے ہو تو ———
تو.........؟
غور سے میری طرف دیکھو۔ تم جان جاؤ گے، میں کون ہوں —— ؟ میں کیا ہوں ——!
لیکن تمہارا چہرہ ——؟ تاریکی کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔
غور سے دیکھو ——!!
کیسے غور سے دیکھوں ——؟ کچھ دکھائی بھی دے تب نا ——؟

ایسے نہیں ——
پھر کیسے ——؟
اپنی آنکھیں بند کر لوں؟
پھر کیسے دیکھوں گا ——؟
دیکھو گے اور اچھی طرح دیکھو گے۔
مگر ——؟
اگر مگر کچھ نہیں —— بات سوچنے کی ہے —— صرف
آخر تم بتاتے کیوں نہیں ——؟ تم کون ہو ——؟
تم نے اب تک نہیں پہچانا ——؟
نہیں بالکل نہیں! میں بھی کوئی ولی اللہ ہوں کہ......
جھوٹ! بالکل جھوٹ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔
آخر تمہیں یقین کیوں نہیں ——؟ میں تمہیں قطعی نہیں جا[نتا]
غلط —— ! تم بھلے ہی زبان سے اقرار نہ کرو لیکن تم ..
اب تمہیں کیسے سمجھاؤں ——!!
تم مجھے کیا سمجھاؤ گے ——! سمجھنے اور سمجھانے کی بات ہیں جو بے وقوف نہیں ہوتے۔
تو کیا ——؟ میں ——؟
ہاں! اب تم دھیرے دھیرے صحیح راستے پر آ رہے ہو
کیوں وقت برباد کر رہے ہو؟ میرا پیچھا چھوڑو۔ وقت ...
وقت ——! ہاں وقت ہی کی تو بات کر رہا ہوں
کیا خاک کر رہے ہو ——؟ اب تک تم نے کوئی بات بتائی

ے غور کیا ہی نہیں ـــــ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی ۔
جھنے کی کوشش نہیں کی ؟
۔ ۔ ! اور کیا ـــــ ؟
ت وقت لگا رکھی ہے ؟
۔ پھر لمحوں کی طرف لوٹ آئیں !
۔ ۔ ۔ !
۔! وہی لمحہ ـــ ! وقت کی حرکت کا دار و مدار بھی تو اسی لمحہ

سا لمحہ ـــ ؟
۔ ـ جسے پانے کی تمنا میں تم بار بار پھیل پھیل کر سمٹتے ہو اور
سمٹ کر بکھر جاتے ہو ۔
ی نہیں بکھرتا ـ ! کبھی نہیں ٹوٹتا ـ !
لط ـــ تم ہر پل ہر لمحہ بکھرتے اور ٹوٹتے رہتے ہو، تمہیں اس کا
ی نہیں !
! قطعی نہیں !! میں کچھ نہیں جانتا ۔
نے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی تو جانو گے کیسے ـــ ؟
ز اپنی بکواس بند کرو، کوفت محسوس ہو رہی ہے ۔
ے ہو ـــ ؟
۔! نہیں ـــ ! لیکن ؟
کیا ـــ ؟
!
ـــ تو آؤ میرے ساتھ ـــ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ
، سمجھ جاؤ گے ۔
؟
ت ـــ ! ہاں اسی لمحے کی طرف جسے پانے کی تمنا نے
زاہش نے تمہیں مجبور کیا کہ تم اپنے قد کو اتنا اونچا کرو اتنا اونچا
آسمان کی بلندیوں کو چھو لے ـــ تمہارے قدم پاتال کی سرحد
ہو جائیں ـــ ہاتھ پھیلتے پھیلتے دشاؤں میں تبدیل ہو
ـ ہاں اسی لمحہ کی طرف پھر لوٹ آؤ ۔ سب کچھ سمجھ جاؤ

گے
سب کچھ ـــ ؟
ہاں سب کچھ ! پھر سمندروں کی بیکرانی ایک قطرے میں تبدیل ہو جائے
گی ۔
ایک قطرے میں ـــ ؟
ہاں ! بس ایک قطرے میں ۔ آسمان کی بلندیاں اور وسعتیں ـــ زمین
کے نشیب و فراز سب کچھ ختم ہو جائیں گے ـــ سب کچھ سمٹ
کر ایک نقطے میں سما جائیں
لیکن ........ !
لیکن کیا ـــ ؟
تم دکھائی ہی نہیں دیتے ـــ تمہارے پیچھے کیسے آؤں ؟
میں نے کہا تھا نا ـــ ! اپنی آنکھیں بند کر لو ۔ سب کچھ دیکھنے کے قابل
ہو جاؤ گے ابھی تمہاری آنکھوں کی پتلیوں میں اتنی قوت برداشت
نہیں کہ وہ انہیں دیکھ سکیں ـ ـ اگر دیکھ لیں تو پتلیاں جل جائیں ۔
پھر ـــ ؟
اسی لئے کہتا ہوں ! پہلے اپنی آنکھیں بند کر لو ـــ اور جب تم انہیں
دیکھنے کے قابل ہو جاؤ تو میرے پیچھے پیچھے چلے آنا ۔
اچھا سنو ! پہلے اپنے بارے میں صاف صاف بتاؤ ۔
یہی تو کر رہا ہوں ـــ ۔ اس وقت سے میں اور کیا کر رہا ہوں ـــ ؟
میں نے تمہیں قدم قدم پر یہی بتانے کی کوشش کی ہے ۔
تم جھوٹے ہو اس سے پہلے تم نے کبھی مجھے مخاطب نہیں کیا
یاد کرو ! اچھی طرح یاد کرو ـــ ابھی سے نہیں ـــ آج نہیں
زمانے سے، صدیوں سے تمہیں یہی تو بتاتا چلا آ رہا ہوں ـــ ۔ اس
وقت سے جب تم سیپ کی کوکھ میں اس بوند کی طرح قید ہو گئے تھے
جسے موتی بننے کی تمنا تھی ـــ ۔ اس وقت بھی جب تمہاری آنکھیں
اور مٹھیاں بند تھیں، اور تم اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا کے خلاف احتجاج
کرتے ہوئے گلا پھاڑ رہے تھے ـــ اس وقت بھی جب تم نے
ماں کی چھاتیوں کو چھوڑ کر زمانے کے سرد و گرم سے کھیلنا شروع کیا
تھا ۔ اس وقت سے آج تک تمہیں قدم بہ قدم زینہ بہ زینہ یہی تو بتاتا

چلا آرہا ہوں ـــــ مگر تم ہو کہ سمجھتے ہی نہیں ؟ میں وہی ہوں،
جس کے لئے تم یہاں سے وہاں بھاگے بھاگے پھرتے ہو ـــ یہاں
تک کہ اپنی ذات، اپنے وجود، اپنے آپ سے ـــ
میں کسی کے لئے نہیں بھاگتا کسی کے پیچھے نہیں بھاگتا
دنیا اور دنیا کی ہر ایک شے میرے پیچھے بھاگتی ہے۔
نہیں! وہ تمہارے پیچھے نہیں بھاگتی ـــ بلکہ تم اس کے
پیچھے بھاگتے ہو۔
نہیں! میں نہیں۔ !! وہ خود ـــ۔
تم غلط سوچ رہے ہو ـــ بات صرف سوچنے اور سمجھنے کی ہے
میری نظر سے دیکھو تو ـــ
تمہاری نظر سے کیسے دیکھوں جب تم خود ہی ....؟
نظر نہیں آرہا ہوں ـ ! کیوں ؟
ہاں تم مجھے کہیں نظر بھی آؤ تو کچھ ....!
میں نے کہا تھا نا ـ ! میں ایسے نظر نہیں آؤں گا !
پھر کیسے ..؟
اپنی آنکھیں بند کر لو، سب کچھ دیکھنے کے قابل ہو جاؤ گے
بات تم نے لمحوں سے شروع کی تھی ـــ پھر آنکھوں
پر آکر رک گئے ـــ نہیں ـــ!
مجھے اندھے پن کا کوئی شوق نہیں ـ
تم اندھے ہی تو ہو ـــ تمہاری آنکھوں کی بصارت تو
کب کی ختم ہو چکی ہے ـ
نہیں میں اندھا نہیں ـ ! میں دیکھ سکتا ہوں ـــ اس دنیا
کو، اس کی رنگینیوں کو ـــ!
تم کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے ـ ـــ اگر دیکھ سکتے ہو تو مجھے ......!
ہاں ـــ میں تمہیں نہیں دیکھ سکتا ـــ !! لیکن کیوں ؟
میں سب کچھ تو دیکھ سکتا ہوں سوائے .....!
میرے ـــ ! کیوں ـــ ؟ میں نے کہا تھا نا کہ تمہاری آنکھوں
کی پتلیوں میں اتنی روشنی نہیں ــ
تو ـــ؟

تو میری بات مان لو ـــ سب کچھ دیکھنے لگو گے
یعنی اندھا بن جاؤں ـــ؟
ہاں ـ ـ ! یہی اندھا پن تمہارے لئے نجات کا راستہ ہے۔
ـ ـ ورنہ یوں ہی بھٹکتے رہو گے کیوں کہ تم جسے روشنی کا شہر سمجھ رہے ہو
وہ اندھا کنواں ہے ـــ
اندھا کنواں ـ ـــ؟
ہاں ـ ـ ! اندھا کنواں ـ ـ !! جہاں صرف تاریکیاں بستی ہیں
لیکن ـ ؟
نہیں ! خوف و ہراس کو دل و دماغ سے نکال کر میری
بات سمجھنے کی کوشش کرو

حلیم صبا نویدی (مدراس)

# سوراخ سے دہلیز تک

آج سے دس سال پہلے میرے گھر کی شکستہ چھت میں بے شمار سوراخوں کی فوج تھی'
اس میں کتنی سچائی تھی کہ ان بے شمار سوراخوں کا عکس مجھ پر اور میرے ساتھ زندگی کرنے
والوں پر بھی نمایاں تھا ـــــ میرے گھر کا کوئی بھی فرد یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ گھر کی مجروح چھت پر نئے
ارمانوں کا پھایا رکھے۔ کیوں کہ اس کی چھت کے سوراخوں سے جھانکنے والی روشنی نے بجلی کی ضرورت
کو بے سود ثابت کر دیا تھا۔

کیا پتہ تھا کہ ان سوراخوں کی بھیڑ سے ایک دن نئی زندگی بھی میرے کمرے میں ٹپک پڑے گی۔
اس نئی زندگی کی آمد سے میری خستہ اور ـــــ دریدہ زندگی میں نئی تابانی اور نئی توانائی تو ضرور آئی تھی ـــــ لیکن
مجروح چھت کے زخموں کے اندمال سے پہلے نئی زندگی نے میری خستگی اور دریوزہ گری کی تاب نہ لاتے ہوئے
اپنے احساسی موڑ کے ساتھ ساتھ نصب العین بھی بدل لئے تھے۔ ـــــ میں نے اس تغیر کے تیور اور پیشِ
نیمہ نتائج کے آگے ہتھیار ڈال دینے کو اپنی خاندانی شرافت سمجھا تو اسے میری رذالت کی حدوں میں رکھ کر
نئی ـــــ زندگی اچانک اس مقام کیطرف مراجعت کر گئی جہاں فطری روشنی سے زیادہ مصنوعی اجالوں کی
چمک دمک تھی ـــــ اور اس چمک دمک میں بھی کئی ایک سوراخ تھے لیکن واضح نہیں

آج میرے گھر کی چھت کے تمام تر زخم بھر چکے ہیں ـــــ دس سال پہلے جس نئی زندگی نے
چھت کے سوراخوں کے ذریعے میرے کمرے میں داخلہ حاصل کیا تھا۔ آج وہ پھر سے میرے نام کی دہلیز پر سجدہ
ریزی کے لئے آمادہ ہے۔ لیکن وقت مجھے اپنے آپ سے ملنے کی بھی مہلت نہیں دے رہا ہے ..

• وقار واثقی (احمد آباد)

# غزل

دھوپ میں شدت تھی، اور سورج نظر آتا نہیں تھا
خوبصورت سائباں بھی تھا مگر سایا نہیں تھا

اپنے آپے میں نہیں تھا، گم تھا وہ، ذہنی سفر میں
چھوڑنا اس حال میں، اس شخص کو اچھا نہیں تھا

اپنا سر ٹکرا کے میں ناکام واپس آگیا ہوں،
نقش بر دیوار تھا وہ، گھر کا دروازہ نہیں تھا

بچہ بچہ رو رہا تھا جب چڑھا ہے دار پر وہ
گو کہ سارے شہر میں اس کا کوئی اپنا نہیں تھا

جھکائے جا رہی تھی اُس کے ہمرہ آدمیت
موت سے آغوش میں وہ آدمی تنہا نہیں تھا

یار تیری بزم میں تھک رہا ہوں اجنبی میں
سیکڑوں ہم شکل تھے لیکن کوئی مجھ سا نہیں تھا

اتفاقاً آج دیکھا آئینہ تو ڈر گیا میں
آج سے پہلے خود اپنے آپ کو دیکھا نہیں تھا

اسد رضوی (مظفر پور)

# غزل

قتیل شفائی کی نذر

شبنمی دھوپ کے قطراتِ رسیلے کب تھے
تیری قسموں ترے وعدوں کے وسیلے کب تھے

تیرے ہونٹوں پہ مرے نام کی سرخی کب تھی
میری آنکھوں میں ترے خواب نشیلے کب تھے

کوئی آہٹ کوئی دستک، کوئی آواز نہیں
یہ بہانے یہ ملاقات کے حیلے کب تھے

یہ مرے حسنِ خود آرائی کا فن ہے ورنہ
اس طرح شہر کے یہ لوگ سجیلے کب تھے

اس کے چہرے سے ہویدا تھی انتظار کی دھوپ
اس قدر چاندنی کے عکس کٹیلے کب تھے

بے سبب ترکِ تعلق کا خیال آجائے
خار کی طرح اسد پھول نکیلے کب تھے

# غزل

خلش بڑودوی

انسان کا کردار بدلنے کے لئے دے تو
پیغام کوئی روح میں ڈھلنے کے لئے دے

جذبات کے دریا میں ہو پیدا کوئی ہلچل
اس دل میں کوئی موج اچھلنے کے لئے دے

پُرپیچ بنائی ہیں اگر زیست کی راہیں
قوت بھی مرے پاؤں میں چلنے کے لئے دے

دے چاندنی کرنوں سے مرے جسم کو ٹھنڈک
سورج کی شعائیں مجھے جلنے کے لئے دے

ہر گام پہ ٹھوکر کا کوئی غم نہیں لیکن
موقع بھی ذرا مجھ کو سنبھلنے کے لئے دے

دل ایسا مچلتا ہے سنبھالا نہیں جاتا
اب کوئی کھلونا ہی بہلنے کے لئے دے

کرنا ہے تو اس شان سے کر مجھ کو سرفراز
دینا ہے تو پھر ہاتھ نہ ملنے کے لئے دے

ہو درد کسی کا بھی عطا کر مرے دل کو
موتی کوئی اس سیپ میں پلنے کے لئے دے

ہے قید خلش بے در و دیوار کے گھر میں
رستہ اسے باہر بھی نکلنے کے لئے دے

بدیع الزماں خاور (دہلی)

# آزاد غزل

ہے کہاں فرصت کہ سوچیں صبح کیا ہے شام کیا
کیا بتائیں ہم کہ ہے یہ گردشِ ایام کیا؟
جب عدالت کی نظر میں بھی کوئی مجرم نہیں
ہم بھی دیں تو دیں کسی کو قتل کا الزام کیا؟
میکدے میں آخر اتنی بے دلی سے دوستو
لے کے بیٹھے ہو یہ خالی جام کیا؟
ان مسیحاؤں سے ہوگا کب محبت کا علاج
ان دواؤں سے ملے گا اب بھلا آرام کیا؟
چاہے بولے وہ کسی لہجے میں، بولے تو سہی
اسی کی جانب سے ملے تو، پھول کیا؟ دشنام کیا؟
آدمی اچھا سہی خاور مگر جاؤ گے اس کے پاس تو کیا پاؤ گے
شعر گوئی کے سوا آتا ہے اس کو کام کیا؟

شمیم قاسمی (پٹنہ)

# غزل

پھر ذہن پہ چھایا ہے خوشبو میں بسا موسم
ہر شاخِ برہنہ پہ پھولوں کی ردا موسم
سینے میں چھپا لوں یا بھر لوں اسے آنکھوں میں
ہے میری غزل موسم ہے میرا خدا موسم
جس دل میں رفاقت کی قندیل نہ روشن ہو
ممکن نہیں اس دل کا ہو جائے ہرا موسم
آنکھوں میں اندھیرے کا جنگل تھا گھنا لیکن
جگنو تیری یادوں کا بن بن کے اڑا موسم
پھر توڑ کے رکھ دے گا ہر رسم زمانے کی
معصوم سی لڑکی کا ہے دستِ دعا موسم

# غزل

فرحت قادری (گیا)

باتیں کرتا ہے جب کتاب زدہ
سب سمجھتے ہیں اس کو خواب زدہ
چاند کو ہم نے جاکے دیکھ لیا
وہ بھی کم بخت ہے شباب زدہ
زندگی کی سزا بھی جھیل چکے
اور کب تک رہیں عتاب زدہ
ساری قدریں بکھر گئیں، لیکن
رہ گئے ہم یونہی کتاب زدہ
چلتے چلتے بھی چونک جاتا ہے
غالباً آدمی ہے خواب زدہ
جب سمندر ملے تو ٹھکرا دے
کوئی اتنا نہ ہو سراب زدہ
ساری فصلوں کو پی گیا سورج
رہ گئیں کھیتیاں سحاب زدہ
صاف کھلتا نہیں کوئی فرحتؔ
سب کے سب، آج ہیں نقاب زدہ

نظام ہاتف (مرادآباد)

# آزاد غزل

میں اک وجودِ بے خبر ہوں جسم و جاں کے ذیل میں
ہے کشتی، ہوا سپرد، بادباں کے ذیل میں
مجھے تو بارشوں کے بعد ڈھونڈنا ہواؤں میں خلاؤں میں
میں اک پیام شوخ و شنگ نیز ہفت ہفت رنگ کہکشاں کے ذیل میں
اسے جو سازگاریاں ملیں وہ شہرتوں کے عرش پر پہونچ گیا
مگر وہ بٹ گیا ہے لخت لخت اس داں کے ذیل میں
میں دردِ آب اور موج گرد اور نہ جانے کیا
زمیں کا ذکر چھوڑیئے کہ آسماں ہی آج تک کبھی بیاں نہیں ہوا ہے آسماں کے ذیل میں
کبھی تو اتنا تخلیہ کہ گھور یاسیت کی دھند
کبھی تمہاری یاد شمٹاتے بلب کیطرح نواحِ جاں کے ذیل میں

صالح ندیم (الٰہ آباد)

# غزل

عالمِ فکر میں لفظوں کی جوانی مانگوں
ہوش میں آؤں تو اندازِ بیانی مانگوں

کاٹ لی میں نے زباں رنج و الم کی یارو
پھر بھی رودادِ الم اس کی زبانی مانگوں

مل گئے خاک میں آنکھوں سے ٹپک کر سپنے
کس طرح ٹوٹے ستاروں سے نشانی مانگوں

عالمِ پیاس ہے دریا پہ کھڑا ہوں لیکن
زندگی تیرے لئے کیسے میں پانی مانگوں

جھوٹ کی گرد ہے الفاظ و معانی پہ ندیم
کن کتابوں سے حقیقت کی کہانی مانگوں

# غزل

نذیر فتح پوری (پونہ)

مجھ سے خود کو بچ بچا کر وہ کہاں لے جائے گا
جس جگہ جائے گا یادوں کے نشاں لے جائے گا

اس لئے آمد پہ اس کی دل لرزتا ہے میرا
چھین کر وہ میرے خوابوں کا جہاں لے جائے گا

آکے وہ دے جائے گا لذت وصالِ عشق کی
جائے گا تو ہجر کی سب تلخیاں لے جائے گا

آنے والا دور دیکھے گا نگاہِ قدر سے
جانے والا وقت میری داستاں لے جائے گا

پیار سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیگا پھر نذیر
لوٹ کر وہ میرے دل کی بستیاں لے جائے گا

امتیاز شاہین (بہ پوسہ)

## غزل

پنی صورت دکھا سبھی بابا اور کب تک یہ دل لگی بابا
ل کے سائے کا انتظام کرو + دھوپ ہوگی وہاں کڑی بابا
ج سب کا ضمیر جھوٹا ہے + ہے حقیقت سے روکشی بابا
لے آنکھوں کی روشنی میری + ننگا ننگا ہے آدمی بابا
وگ کیوں دوسروں پہ ہنستے ہیں + خود پہ آتی نہیں ہنسی بابا
اپنے چہرے کو آئینہ دے کر + پڑھ لو اچھی بُری لکھی بابا

اب ازل سے سفر میں ہے شاہین
کوئی منزل نہ روشنی بابا

شاہد ساگری (بھوپال)

## غزل

بن گئی ہے کس کے حال زار پر + خون کی سرخی ہے کیوں تلوار پر
صبح نو کی دیکھ کر پہلی کرن + ظلمتیں شیدا ہوئیں انوار پر
ہے نظر تیری نگاہوں پہ نثار + دل فدا ہے ابروئے خمدار پر
خیر ہو یارب نشیمن کی مرے + کوندتی ہیں بجلیاں گلزار پر
رہ نوردِ شوق راہ شوق میں + گامزن ہو منزل دشوار پر
میرا سر مت دیکھ تو دیوار دیکھ + ہے نشانِ سر زدن دیوار پر
ہے یہی راز بقائے زندگی + پھول کو کر دے نچھاور خار پر

آج شاہد سن کے وہ تیری غزل
داد دیتے رہیں تیرے اشعار پر

شمس تبریزی (نئی دہلی)

## غزل

مرے خوابوں کو ذرا اور جواں رہنے دے — اور کچھ دیر جوانی کا دھواں رہنے دے
یہ بھی ممکن ہے کہ پھر لوٹ کے آئیں ہم لوگ — رہگزاروں میں کہیں کوئی نشاں رہنے دے
شام ہوتے ہی چلا جاؤں گا سورج کی طرح — اور اک آدھ پہر مجھ کو یہاں رہنے دے
دیکھیں طوفان اسے لے کے کہاں جائے گا — اپنی کشتی کو سمندر میں رواں رہنے دے
تو تو اچھا ہے ترے پاس ہے گفتار نئی — میں بُرا ہوں تو مجھے شعلہ بیاں رہنے دے

تو کہ محلوں میں رہے خوش رہے آباد رہے
مجھ کو بے یار و مددگار و مکاں رہنے دے

اظہر نیر ودیگوی (پھلائی گھر)

## غزل

ہر کوئی میرا اپنا تھا
یا میں نے سپنا دیکھا تھا
میرے مقابل جو بیٹھا تھا
تم سے بہت ملتا جلتا تھا
میں جس سے رویا گایا تھا
کیا سچ مچ اندھا بہرا تھا
روح سے مل کر ایک پرندہ
جسم کے جنگل میں اترا تھا
اس کے ساتھ ایک بھیڑ تھی لیکن
میری طرح وہ بھی تنہا تھا
اس نے وحشت مجھ سے مانگی تھی
میں جس چیز سے بے بہرہ تھا
سچ پوچھو تو میں ہی نیر
سب سے زیادہ بے پروا تھا

طالب ہاشمی (احمد آباد)

## غزل

ہر ایک دل میں تھی تیرے وقار کی خوشبو
کہاں ہے اب وہ تیرے اعتبار کی خوشبو

تمام اہل گلستاں کو یہ شکایت ہے
بہار آئی نہ آئی بہار کی خوشبو

وہ وعدہ کرکے نہ آئے کرم کیا مجھ پر
مجھے عزیز تھی خود ان کے انتظار کی خوشبو

فضائیں جھوم رہی تھیں عجیب مستی میں
شباب پر تھی گل نو بہار کی خوشبو

تمہارے کوچے کی باتیں ہیں اور طالب ہے
دماغ میں ہے اسی رہگذار کی خوشبو

ساجد شمیم (گیا)

## غزل

مری ہتھیلی میں حادثوں کا عجیب قصہ لکھا ہوا ہے
میں اپنے اندر کے آدمی سے کروں گا شکوہ انانیت کا
پرندہ زخمی جو اڑ رہا ہے نہ جانے کیسی جگہ گرے گا
انھیں سے کہتا ہوں بڑھ کے اک روز تھام لے روشنی کا سورج
اُگا رہا ہوں شجر انا کا کہ ایک دن سایہ دار ہو گا
عجیب موسم ہے اب کے یارو ہوائیں بے سمت بہہ رہی ہیں

تیرے فلک سے سیاہ بادل کا ایک تانتا لگا ہوا۔
تمام شعلوں کی دھوپ ہے اور دریچۂ دل کھلا ہوا۔
کہیں چٹانیں کھڑی ہوئی ہیں کہیں سمندر بچھا ہوا۔
دلوں پہ جن کے عجیب سائے کا سلسلہ سا بنا ہوا۔
انا ہی انساں کی آبرو ہے، کتاب دل میں لکھا ہوا۔
نہ ریت پانی میں گم ہوئی ہے نہ پیڑ کوئی اُگا ہوا۔

جہاں کوئی راستہ نہیں ہے جہاں کوئی قافلہ نہیں ہے
شمیم کی زندگی کا سورج اسی زمیں پہ اُگا ہوا ہے

جوہر ایاغ (بھاگلپور)

# غزل

زمیں پر فلک پر جہاں ڈھونڈتے ہیں
تمہا جلوہ ہم مہرباں ڈھونڈتے ہیں
سمندر کی عظمت کو سمجھے نہیں ہیں
جزیروں پہ رازِ نہاں ڈھونڈتے ہیں
الجھتا ہو پیہم زمانے سے تنہا
خدا سے جدا پاسباں ڈھونڈتے ہیں
ہر اک شہر صحرا جہنم ہے گویا
کہاں اہلِ عالم اماں ڈھونڈتے ہیں
ایاغ آزماتے ہیں جو عشق میرا
وہی لوگ میرا نشاں ڈھونڈتے ہیں

محمد رضوان قریشی (ہرلاپور)

# غزل

یہ کیسا پیار کہ پہلے تو وہ ستاتا ہے
میں روٹھ جاؤں تو پھر خود مجھے مناتا ہے
چھپا ہوا ہے تری یاد میں کہیں نشتر
جو زخم دل پہ مرے روز و شب لگاتا ہے
وہ اک خیال کہ راتوں کو جو رُلاتا ہے
عجیب بات، وہی اب ہنسائے جاتا ہے
جو نرم چاندنی راتوں کے خواب دیتا ہے
غموں کی دھوپ میں اب وہ مجھے جلاتا ہے
میں قتل ہو چکا جس راستہ پہ اے رضواںؔ
وہ بار بار اسی پر مجھے بلاتا ہے

# غزل

محمد نور الحسن میکشؔ (بھاگلپور)

درد کے مضراب سے زندہ رباب زندگی
گامزن ہے کس طرف دیکھیں شباب زندگی

گر ملے خونِ جگر سے ہے نمودِ نورِ صبح
ضوفشاں ہوگا طلوعِ آفتاب زندگی

دینی ہے ترتیب ان بکھرے ہوئے اوراق کو
کرنی ہے مجھ کو مرتب اک کتاب زندگی

صورتِ شمشیر پھر تدبیر ہوگی کارگر
مل رہا ہوگا مقدر کو جواب زندگی

دھوپ پھیکی پڑ گئی سائے نظر آنے لگے
شام کے صحرا میں دیکھا ہے سراب زندگی

کس مقامِ خاص کا ہے منتظر دنیا کا رنگ
رفتہ رفتہ ہو رہا ہے انقلاب زندگی

میں نشے کا دہر میں قائل نہیں میکشؔ مگر
جھومتا ہے ہر بشر پی کر شراب زندگی

ڈ. بنوبجے رام جوھر

# غبارِ خاطر کے آخری مکتوب پر ایک نظر

"غبارِ خاطر" آزاد کی ان مکاتیب کا مجموعہ ہے، جو مکتوب علیہ تک رسائی نہ پا سکے اور قلعہ احمد نگر کی نظر بندی کے دوران میں آزاد نے اپنے رفیقِ خاص نواب صدر یار جنگ، (حبیب الرحمن خاں شیروانی) کے نام منسوب کرتے ہوئے سپردِ قلم کیے۔ غبارِ خاطر کے البم میں ہر تصویر جاذبِ نظر ہے۔ ان تصاویر میں سے چند دھندلی سہی تاہم پرکشش ضرور ہیں مثلاً فلسفہ، مذہب، زندگی اور انانیت کی تصاویر، اسی مجموعے میں ان کی نسیمِ قلم نے پھولوں سے بھی اٹکھیلیاں کی ہیں نیز آزاد نے اپنے ذاتی حالات، عادات اور مشاغل کو بھی بے نقاب کیا ہے۔

آزاد نے باتوں ہی باتوں میں اپنے بچپن اور تعلیم کا بھی ذکر کیا ہے۔ گویا اپنے قلم سے اپنے بچپن کو جوان کیا ہے۔ اور جوانی کو مرکزِ مشاغل بنایا ہے۔ اِن مشاغل میں آزاد نے چینی چائے سے رغبت، پھولوں سے محبت، جاڑے سے فرحت اور سحر خیزی کی عادت کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں ان کے آخری مکتوب میں موسیقی سے انسیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے آخری مکتوب کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

یہ خط سرتاپا موسیقی ہے اور ساز و آواز کے ذکر سے مملو ہے۔ آزاد کے رگ و پے میں موسیقی اس حد تک سرایت کر چکی تھی کہ وہ اُسے ایک احتیاجِ زندگی تک کہہ جاتے ہیں۔
میں زندگی کے احتیاجوں میں سے ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں۔
لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا،

آزاد نے تاریخ کے اوراق پلٹ کر جس انہماک سے راگ راگنیوں کے سربستہ [راز] کو فرداً فرداً بے نقاب کیا ہے اس سے یہ امر بھی منکشف ہوتا ہے کہ آزا[د] نے میدانِ موسیقی میں صرف عملی کردار ہی ادا نہیں کیا بلکہ نظریاتی طور [پر] بھی وہ موسیقی کے زیر و بم اور نشیب و فراز سے آشنا تھے۔

ہندوستان کی موسیقی کا تجزیہ وہ امیر خسرو کی موسیقی شناس ذ[ہن] سے کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں" سازگری کا یمن اور خیال تو امیر خسرو کی ایسی مجتہدانہ اختراعات ہیں کہ جب تک ہندوستانیوں کی آواز میں رس اور ستار کے زخموں میں نغمہ ہے۔ دنیا ان کا نام نہیں بھول سکت[ی]

آزاد کے متفکرانہ ذہن اور طائرِ قلم نے بیک وقت موسیقی اور شاعر[ی] دونوں کی عظیم رفعتوں میں پرواز کی ہے اور اپنے مشاہدات کا اظہار ان [الفاظ] میں کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موسیقی اور شاعری ایک ہی حقیقت کے دو جلوے ہ[یں] اور ٹھیک ایک طریق پر ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ ........

موسیقی کے محاسن پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے اس کے موجبِ عیب بن جانے کا ذکر کیا ہے۔ اور اپنے دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ موسیقی بذات[ِ خود] بری نہیں ہوتی بلکہ اس کا طریقہ استعمال اسے بُری بناتا ہے آخری سط[ور] میں موسیقیت اور شریعت پر نہایت ہی مختصر بحث کرتے ہوئے کسی [قدر] مبہم انداز میں اس امر کی وضاحت کی ہے۔ کہ موسیقی کو دینی اعتبار[ سے] حسبِ تقاضہ وقتی طور پر محرمات شرعیہ میں داخل کیا جا سکتا ہے لیکن مستقلاً نہ[یں۔]

اس مکتوب کی روشنی میں آزاد کے اسلوب کیلئے صفحات۔ صفحات بھی سیاہ کر دینے سے داد و تحسین کا حق ادا نہ ہوگا۔

پروفیسر اظہر قادری (پاکستان)

# سورج کی صلیب ایک جائزہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ فن کی تخلیق میں ذہن اصل کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم کسی فنی تخلیق کو محض ذہن کا کارنامہ نہیں سمجھتے بلکہ ان خارجی عوامل کو بھی نظر میں رکھتے ہیں جو کسی فنی تخلیق کے لئے اصل محرک ہوتے ہیں ذہنی اور خارجی عناصر کے بامقصد اشتراک ہی سے کوئی فن پارہ وجود میں آتا ہے اور ان کی مکمل ہم آہنگی ہی سے فنی تخلیق کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

تمام فنون میں شاعری سب سے زیادہ مؤثر، مفید اور معتبر فن سمجھی جاتی ہے اس کی افادیت کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ ماحول اور سماج حالات کو بدلنے میں جو کردار وہ ادا کرتی ہے اس کی مثال دوسرے فنون میں نہیں ملتی گویا حالات سے برسرپیکار رہنا اور خوب سے خوب تر کی تلاش کرنا اچھی شاعری کا مقصد و منصب ہے ممکن ہے بعض لوگوں کے نزدیک شاعری فکر اور الفاظ کا ایک سادہ سا کھیل ہو لیکن درحقیقت بات ایسی نہیں ہے اگر ہم شاعری کو محض واردات قلبی کا ایک ایسا اظہار مان لیں جس کو خارج سے کوئی تعلق نہیں تو پھر یقیناً یہ فکر و الفاظ کے ایک سادہ کھیل سے آگے کچھ نہیں لیکن بات اگر اس کے برعکس ہے تو پھر شاعری ایک بڑا پیچیدہ عمل ہے ایسی حالت میں اس کو صرف دلی کیفیات کے پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا۔ اچھی شاعری دو طرفہ سفر ہے اس سفر کا ایک راستہ باہر سے شاعر کے دل کی طرف جاتا ہے۔ اور دوسرا راستہ اس کے دل سے نکل کر باہر کی طرف آتا ہے، خارجیت اور داخلیت کا یہی وہ باہمی عمل ہے جو شعر و ادب کو بامعنی اور قابلِ قبول بناتا ہے۔ البتہ یہ عمل ہر شاعر و ادیب کے یہاں یکساں نہیں ہوتا۔ اور اس کو ہونا بھی نہیں چاہیئے ورنہ انفرادی لہجہ کی کوئی گفتگو ادب میں نہیں ہو سکتی۔ چونکہ خارجیت کے بغیر اچھا ادب وجود میں نہیں آ سکتا اس لئے ہر اچھے شاعر اور ادیب کے یہاں خارجی عناصر کا اظہار کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملتا ہے اب یہ الگ ایک بات ہے کہ کچھ ادیب و شاعر کے یہاں خارجی پہلو زیادہ نمایاں ہوتے ہیں اور کچھ کے یہاں داخلی پہلو کا رنگ زیادہ شوخ اور گہرا ہوتا ہے۔

صبا اکرام کے مجموعۂ کلام "سورج کی صلیب" کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ خارجی حالات سے انھوں نے بھی خاطر خواہ اثر قبول کیا ہے۔ ان کو ایسے حالات سے گزرنا پڑا ہے اور ایسے واقعات کو سہارنا پڑا ہے جو غلط یا صحیح تاریخ کے ایک خاص عمل کے نتیجے میں رونما ہوئے ہیں بے زمینی کا ایک احساس تو میر کے عہد میں پیدا ہوا تھا دوسرا ۱۸۵۷ء کے بعد اور تیسرا احساس بے زمینی ہمارے موجودہ عہد کا نہایت کربناک واقعہ ہے۔

بے زمینی کے احساس نے ہمارے شاعروں اور ادیبوں کے ایک طبقے کو فطری طور پر ایسے حالات سے دوچار کر دیا ہے جس کے نتیجے میں بے یقینی اور ناامیدی کا پیدا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

اس احساس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا ہے کہ ہمارے کچھ ادیب و شاعر نے خارجی دنیا میں اپنے لئے جگہ پیدا کرنے کی بجائے اپنے اندر کی دنیا میں پناہ ڈھونڈ لی ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ خارجی دنیا کے طوفانوں سے بھاگ کر دل کی پناہ گاہ میں چھپ کر ہیئت ریت میں منھ چھپانے کے برابر ہے۔

صبا اکرام دو ہجرتوں کا المیہ سہار کر جس مقام پر پہونچے ہیں۔ وہاں بے گھری اور بے یقینی کا دل میں گھر کرنا کوئی غیر فطری بات نہیں اور شاعروں کی طرح بے گھری کا شکوہ صبا اکرام کے یہاں بھی ہے لیکن ان کی آواز میں شکست اور پچھتاوے کا کوئی لہجہ نہیں بلکہ ایک خاص تاثر کے تحت حالات کا ایسا دو ٹوک بیان ہے جس کا مقصد نمائش ہوئی حرفِ حال تو ہرگز نہیں البتہ اپنے گھروں میں اطمینان سے بیٹھنے والوں کو چونکا دینے کا عنصر ضرور ہے۔ حالات جب قسمت ہی دربدر پھرانے لگیں تو اس پر گریہ وزاری یقیناً کم ہمتی کی دلیل ہے لیکن اس کا ایسا بے نیازانہ اظہار جس کا تعلق صرف اپنی ذات سے ہو، ایک انفرادی لہجہ ہے جو کسی محفلِ ناز میں اختیار تو کیا خود محبوب کی دسترس سے بھی باہر ہے۔

ہوا نصیب بنایا، سفر لکھا اس نے
تمام عمر پھروں دربدر لکھا اس نے
اب آئے خوف سا گھر کے خیال سے مجھ کو
یہ کیسا دل میں سرِ شام ڈر لکھا اس نے

ہجر کا درد کئی صدیوں سے بیٹھا ہے صبا
دل کے پیپل کی گھنی چھاؤں میں سادھو کی طرح

٭٭٭

صدیوں سے سہہ رہا ہوں صبا بے گھری کا غم
نکلا تھا ایک بار میں اپنے مکان سے

---

بے گھری کا غم کسی کے آگے بیان کرنا ممکن ہے غمزدگی اور دردمندی کی طلب بلکہ حسنِ طلب ہو لیکن بے گھری کا غم سہتے اور سہتے رہنے کا اظہار ایک عالم گیر حقیقت کا بیان ہے اس کے عکس اس بے گھری کے المیے نے ایک ایسے رجحان کو جنم دیا ہے جس میں انسانی رشتوں کے حوالے سے گفتگو ہوتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں "صبا اکرام کی غزلوں اور نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے کتنی ہی بار میری چشمِ تصور کے سامنے ایک ایسی بے پتوار ناؤ کی تصویر ابھری جو جہت اور سمت سے ناآشنا بعض لہروں کے زیر و بم پر سفر کر رہی تھی۔ صبا کی زندگی میں بار بار اکھڑنے یعنی ۱۹۴۷ء ۱۹۷۱ء ہونے کا المیہ ابھرتا رہا ہے اور یہی المیہ اس کی شاعری میں جڑوں سے کٹنے کا منظر پیش کرتا ہے اس کے یہاں بے پتوار ناؤ، ناؤ نہیں ہے بلکہ بیخ و بن سے اکھڑا ایک درخت ہے جسے کسی چیختے ہوئے طوفان نے لہروں کے سپرد کر دیا ہے اور اب سمت سے ناآشنا لہریں اسے ساتھ ساتھ لئے پھرتی ہیں"

صبا اکرام کی شاعری کے تجزیے میں ڈاکٹر وزیر آغا کے اس قول سے اتفاق مشکل ہے کہ دو ہجرتوں کے بعد ان کی شاعری بے جہتی کا شکار ہو کر ایسی لہروں کے حوالے ہو گئی ہے جو سمت سے ناآشنا ہیں اس کے برعکس صبا اکرام کی شاعری ابتدا سے ایک جہت رکھتی ہے اور ان کے یہاں بار بار اکھڑنے اور ۱۹۴۷ء ۱۹۷۱ء ہونے کے باوصف زمین سے ایک رشتہ کسی نہ کسی انداز سے قائم ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ رشتوں کے حوالے سے بھی ان کے یہاں ایسے شعر ملتے ہیں جن سے ان کے اجتماعی شعور کا اظہار ہوتا ہے۔ احساس کے رشتے اگر مضبوط ہوں تو تمام فاصلے مٹ جاتے ہیں اور قرب کے احساس کے تحت ایک دل سے نکلی ہوئی صدائے درد کو دوسرے دل تک پہونچنے میں دیر نہیں لگتی۔ انسانی رشتوں کا یہی وہ احساس ہے جس سے اچھی اور سچائی شاعری عبارت ہے اس سلسلے میں ان کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے۔

سرحدوں سے کب کٹے احساس کے رشتے صبا
گھر کہیں کوئی جلا ہم لوگ بے کل ہو گئے

اس کے علاوہ ان کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو کسی نہ کسی سمت کا واضح پتہ دیتے ہیں۔ اور زندگی کے کسی نہ کسی رخ کی صریح ترجمانی کرتے ہیں اس کی تصدیق میں اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے صبا اکرام کی شاعرانہ جہت کی بہتر طور نمائندگی ہوتی ہے اور زندگی کے مختلف احساسات ابھر کر سامنے آتے ہیں

اونچی عمارتوں کے نگر میں میرے لئے
جائے پناہ سایۂ دیوار ہی تو ہے
ندی کے بہاؤ پیچھے نکلے ہوئے ہیں لوگ

یہ زندگی پڑھا ہوا اخبار ہی تو ہے

کب کیست امیدوں کے بہ آب نہ آئے
کس رُت میں ناشادوں کے سیلاب نہ آئے
اے زیست ہوئے دوست مرے برشادمن سے
مجھ کو تیری محفل کے وہ آداب نہ آئے

---

فرصت کہاں کہ لے کوئی غیروں سے انتقام
خود سے ہی دشمنی میں اب الجھے ہوئے ہیں ہم

---

میں ہوٹلوں کے نگر میں تلاش کرتا ہوں
وہ سوندھی باس جو مٹی کے برتنوں میں ہے

---

خاص کر ان کے اس شعر سے ان کے اجتماعی شعور کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ شعر

اک چیخ دب کے رہ گئی نعروں کے شور میں
آگے جلوس بڑھ گیا اک لاش روند کر

---

یہ شعر ایک رجحان کا نمائندہ ہے اور اگر ان کی شاعری کا لہجہ اسی سطح پر سفر آمادہ ہو جائے تو منزل ان کی دسترس سے دور نہیں۔

صبا اکرام کے یہاں علامتوں کا استعمال بھی گفتگو کے لیے ایک موضوع فراہم کرتا ہے محض علامت نگاری کے مقابلے میں یقیناً بے مایہ شے ہے لیکن علامت اگر اظہار کے حسن کے لیے استعمال ہو اور ابہام و تفہیم کی راہ میں سنگ گراں ثابت نہ ہو تو علامت نگاری سے کسی کو کیا شکایت ہو سکتی ہے البتہ جب علامت نگاری محض علامت نگاری کی غرض سے ہو اور مفہوم فی بطن شاعر ہو تو اس کے لیے بیشک ادب میں کوئی جگہ نہیں نکل سکتی۔ مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ آج کل کچھ لوگوں کے یہاں خیال و فکر کی جگہ علامت نگاری ادبی مقصد بن گئی ہے جس کے نتیجے میں ان کی تخلیقات مجذوب کی بڑ ہو کر رہ گئی ہے صبا اکرام کے یہاں علامت نگاری مقصد نہیں بلکہ مقصد کی وضاحت کے طور پر آئی ہے اور اس لیے ان کی شاعری میں علامتی پردے اتنے دبیز نہیں کہ اس پار کے جلوے دکھائی نہ دے سکیں۔ ذیل میں کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ شعر

خواہشوں کے گیت تھے پیاسے بھری برسات میں
اور جب سوکھے کی رُت آئی تو جل تھل ہو گئے

پیوست دل میں خامشیٔ شب کے ہو گیا
چھوٹا صدا کا تیر جو لب کی کماں سے

بیٹھی دھوپ بھاگ کے پیپل کے پیڑ پر
آنگن میں چھاؤں پہونچی ہے جب سائبان سے

کھلے دریچے کے اندر تو پھینک کر دیکھو
اکیلا گھر جو ہوا چیخ اٹھے گا پتھر بھی

احساس تو بدلے ہوئے موسم کا ہو دل کو
دروازوں کے پردے کو ہر اک صبح بدل دو

ان حقائق کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ صبا اکرام کا مجموعہ "سورج کی صلیب" آج کے شعری ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

یوسف ناظم (بمبئی)

# طربِ خود کلامی

یہ بات ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی کہ ہمارے دوست متین الدین افسانہ نگار بن جائیں گے۔ ہمارے دوستوں میں متین الدین ہی ایک پڑھے لکھے آدمی تھے اور ان سے ہمیں بالکل توقع نہ تھی کہ وہ خود اپنے اور ہمارے ساتھ ایسا ناروا سلوک کریں گے۔ پچھلے کئی سالوں سے ہم دیکھ رہے تھے کہ ان کے عادات واطوار کچھ ٹھیک نہیں ہیں اور افسانہ نگاری سے انکی دلچسپی بڑھتی جارہی ہے۔ افسانہ نگاری پر جو بھی اور جہاں بھی کوئی جلسہ یا سیمی نار ہوتا وہ وہاں ضرور پہنچ جاتے۔ رسالوں اخباروں میں پڑھنے کے لائق کئی چیزیں ہوتی ہیں، دوسری چیزوں کو چھوڑیے خود اشتہار، خوبصورت خواتین سے پر اور دلچسپ مضامین سے لبریز، تعداد میں اتنے ہوتے کہ کسی اور چیز کے پڑھنے کی نہ تو فرصت ہوتی نہ ضرورت لیکن متین الدین صرف کہانیاں پڑھتے۔ کچھ نہیں تو یہی کہانیاں ہی پڑھ رہے ہیں۔ کہانیوں کا پلاٹ ذہن نشین کرتے مان میں اگر پلاٹ نہیں ہوتا تو ان کے چند فقرے ہی یاد کر لیتے اور شعر کی طرح انہیں گنگناتے۔ اندر ہی اندر انھوں نے دور دور کے افسانہ نگاروں سے خط وکتابت اور مقامی کہانی کاروں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر دیا ــ تاہم ہم یہ نہیں سمجھے تھے کہ وہ خود بھی یہی حرکت کریں گے۔

غلطی اصل میں ہم سے ہوئی۔ جب انہوں نے ہماری نظروں کے سامنے افسانے سے متعلق لٹریچر (اسے لٹریچر ہی تو کہیں گے) پڑھنا شروع کیا اور تنقید کا مضامین پڑھنے لگے تو ان کے دوست ہونے کی حیثیت سے ہمیں چاہئے تھا کہ ہم انھیں ٹوکتے۔ انہی تنقیدی مضامین نے متین الدین کو گمراہ کیا۔ دوسری غلطی جسے غلطی نہیں کہا جا سکتا، یہ ہوئی کہ ہم کوئی سال بھر کے لئے ہندوستان سے باہر چلے گئے (اتنی دیر باہر نہیں رہنا چاہئے) لیکن اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ ہماری غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر متین الدین افسانہ نگار بن جائیں۔

قسطنطنیہ سے (قسطنطنیہ کا سفرنامہ ہم لکھ رہے ہیں) جب ہم واپس آئے تو معلوم ہوا کہ ہمارے دوست ملک کے مانے ہوئے افسانہ نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں اور اب آدمیوں میں انکی واپسی کا امکان نہیں ہے۔ ان کا قلمی نام ہمیں سنجیدہ متین بتایا گیا۔ یہ بھی کچھ کم صدمہ نہیں تھا لیکن سچ پوچھئے تو نام ہمارے جی کو لگا۔ اس کا صوتی آہنگ اور ترجمے کی خوبی کے علاوہ ان دو چھوٹے چھوٹے لفظوں میں فکر کا جو لطف ہے، مزا دے گیا۔ ان سے فوری ملاقات کا امکان تھا نہیں کیونکہ جب ہم باہر سے لوٹے تو وہ افسانہ نگاری کی کسی ورک شاپ میں حصہ لینے کیلئے شہر سے کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔

جب ان سے ملاقات ہوئی تو ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ ان میں صرف معنوی تبدیلی ہی نہیں آئی ہے بلکہ ایک صوری تبدیلی بھی آئی ہے یعنی وہ چشمہ بھی لگانے لگے ہیں۔ چشمے کی کیفیت پوچھی تو سنجیدہ متین نے بتایا کہ موجودہ زمانے میں ایک افسانہ نگار کیلئے زیرو نمبر کا چشمہ بھی ضروری ہوتا ہے (یقیناً ہوتا ہوگا۔ جلسے میں افسانہ پڑھتے وقت یہ چشمہ آنکھوں سے ہٹا کر سر پر چڑھا لیا جاتا ہے تاکہ سر چشمہ معلوم ہو) ہم نے کہا وہ تو خیر ٹھیک ہے لیکن پہلے اپنی افسانہ نگاری کی وجوہات بتاؤ۔ متین الدین ایک مشاق افسانہ نگار کی طرح پہلو بدل کر اس طرح بیٹھ گئے جیسے کسی رسالے کے رپورٹر کو انٹرویو دے رہے ہوں۔ ہم نے کہا کہ تمیز سے شریف آدمی کی طرح بیٹھو اور صاف صاف بتاؤ کہ تمہارا یہ حال ہوا کیسے؟ متین الدین نے جب دیکھا کہ ہم پر ان کے افسانہ نگار بن جانے کا کوئی رعب نہیں پڑا ہے اور نہ ہم ان کے قاری یا فین ہیں تو پیچھے بلکہ پسپا ہوئے اور کرسی پر سیدھے بیٹھتے ہوئے بولے بتاتا ہوں۔ تم سے پردہ بھی کیا ہے لیکن کہیں مجھے

---

ــہ قسطنطنیہ کا سفر ہمیں یوں کرنا پڑا کہ ہمارے ایک بہت پرانے دوست طارق بک نے ہمیں اپنے پوتے کی شادی میں بلا بھیجا۔ طارق کے نانا مصطفیٰ کمال (اتاترک) کے دوستوں میں تھے اور خود طارق بک خالدہ ادیب خانم کے حلقۂ بگوش رہ چکے ہیں۔ خالدہ ادیب خانم جب ہندوستان آئی تھیں تو یہ بھی ساتھ تھے اور اسی وقت ہماری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ملاقات کہاں اور کیسے ہوگئی تھی۔ وہ ابتک کیوں زندہ ہیں (ہمارے انکے تعلقات (یا مراسم جو بھی صحیح لفظ ہو) کیوں اور کیسے برقرار ہے۔ یہ سب باتیں ہمارے سفرنامے میں درج ہوں گی ــ سفرنامہ آفسیٹ پر چھپے گا۔

کوشش نہ کرنا۔ باہر میری بڑی شہرت ہے۔ مسکرانے کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن پرانی دوستی کے مدنظر ہم مسکرائے اور متین الدین کو ہم نے اطمینان دلایا کہ ہم تمہیں کبھیں کوٹ نہیں کریں گے۔ (ہم اتنے گر بھی نہیں سکتے) تم بے فکری سے اپنی داستان حیات (یعنی سال گذشتہ کی داستان) سناؤ۔

متین الدین نے کہا میں حسب معمول اپنا پسندیدہ لٹریچر پڑھ رہا تھا کہ ایک بڑے نقاد کا مضمون پڑھنے کو مل گیا۔ نقاد نے اپنے اس مضمون میں بتایا تھا کہ افسانہ ادب کی کوئی اعلیٰ صنف نہیں ہے بلکہ صرف ایک ادنیٰ صنف ہے بس یہی قول میری افسانہ نگاری کی بنیاد ہے میں نے سوچا جب یہ کوئی اعلیٰ صنف نہیں ہے تو اس میں اپنے جوہر آسانی سے دکھلائے جا سکتے ہیں۔ میں نے کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ کچھ دوستوں کو سنائیں تو انھوں نے منٹوں میں تعریفوں کے پل تعمیر کر دیئے۔ میں تو اس تنقید نگار کا ممنون ہوں جس کی تحریر نے مجھے اس صنف ادب کی طرف متوجہ کیا۔

ہم نے پوچھا تم اپنی کہانیوں کا پلاٹ کہاں سے چراتے ہو۔ بولے کہانیوں کا یہی تو ایک مسئلہ تھا۔ جب یہ مشہور ہو گیا کہ پلاٹ چرائے جاتے ہیں تو کہانی لکھنے والوں نے سرے سے پلاٹ کا جھگڑا ہی ختم کر دیا۔ اب کہانی میں پلاٹ ہوتا ہی نہیں تو چرانے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ ہم نے کہا چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔ یہ تو ایک لحاظ سے ترقی ہی ہوئی۔ کردار بھی بلند ہوا۔ سنجیدہ متین بولے لیکن بغیر پلاٹ کی کہانی لکھنا ہے مشکل کوشش یہ کرنی پڑتی ہے کہ اس میں کہیں پلاٹ نہ آجائے اور اسی لئے ایک تنقید نگار نے ابھی حال حال میں کہا ہے کہ کہانی ہوا میں جنم نہیں لیتی ہم نے پوچھا کیا موصوف نے یہ نہیں فرمایا کہ اگر کہانی جنم لے تو اسے ہوا اور دھوپ سے بچایا بھی جائے۔ سنجیدہ متین نے اپنا زیرو نمبر کا چشمہ پہن لیا (کسی نے ہمیں بتایا تھا کہ چشمہ بھی پہننے کی چیز ہے۔ یقیناً ہوگی کیونکہ پہننے کی جو چیزیں تھیں وہ تو اب پہنی نہیں جا رہی ہیں) اور بولے ہمارے تمہارے تعلقات پرانے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ افسانہ نگاروں کو اس نظر سے دیکھو۔ مانا کہ ایک نقاد نے افسانے کو ادب کا ادنیٰ صنف بتایا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کہانی لکھنے والے لوگ ادنیٰ ہوتے ہیں۔ ہمارے دل پر ایک گھونسہ سا لگا متین الدین

ہم سے ناراض بھی ہو سکتے ہیں اور انہیں غصہ بھی آسکتا ہے۔ اس کا ہمیں اندازہ نہ تھا۔ لیکن ہم نے سوچا اگر آج ہم ان کے غصے سے خائف ہو گئے تو عمر بھر کیلئے ہمیں ان کے مقابلے میں دوسرے درجے کے شہری کی طرح رہنا پڑے گا اور یہ ہر جگہ ہم سے ممکن نہیں ہے۔ دوستوں کا آپس میں ہمسر اور ہم چشم ہونا ضروری ہے۔ یہ بات ہم نے کسی رسالے کے 'اقوال زریں' کے کالم میں پڑھی تھی۔ ہم نے کہا متین الدین، تمہیں کس بات پر غصہ آیا پتہ نہیں لیکن چلو کچھ تو آیا تمہیں ـــ بہتوں کو تو اتنا بھی نہیں آتا۔ ابھی ہم نے تمہاری کوئی کہانی پڑھی نہیں ہے۔ اسی لیے ہم تمہاری قابلیت کے قائل ہیں ـــ متین الدین تھوڑا پچھلے اپنا چشمہ (زیرو نمبر کا) از سر نو اتارا۔ اسے احتیاط سے میز پر رکھا اتنی احتیاط تو نمبر کے چشموں) کرسی پر از سر نو ایک شریف آدمی کی طرح بیٹھے اور بولے سچ پوچھو تو ان تنقید نگار کی بات ہمارے گلے سے اتری نہیں افسانہ ادب کی معمولی صنف ہے تو پھر تنقید کو ہم کس نمبر پر رکھیں گے ـــ متین الدین اتنی سمجھداری کی بات کریں گے۔ ہمیں اس کا بھی اندازہ نہیں تھا۔ انہی متین الدین سے ایک مرتبہ کسی نے کہہ دیا تھا کہ نثری نظم صنفی تبدیلی کے ناکام آپریشن کا دوسرا نام ہے تو متین الدین اس شخص سے مار پیٹ پر آمادہ ہو گئے تھے (متین الدین اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے اس کے عادی ہیں) اور کئی تنقید نگاروں کے حوالے دیکر انھوں نے اس شخص کو زیر کیا تھا۔ زیر کیا بلکہ کہنا چاہیئے کہ زیر و زبر کیا تھا۔ آج انکی زبان سے کسی تنقید نگار کے بارے میں چھوٹی ہی سہی لیکن یہ بات سن کر ہمیں خوشی ہوئی۔ ہم تو انھیں گلے لگانے والے تھے لیکن انکا زیرو نمبر کا چشمہ درمیان میں تھا۔ پھر بھی ہم نے کہا کہ متین الدین تم اتنے پڑھے لکھے ہو تم خود کیوں تنقید نگار نہیں بن جاتے۔ تمہارا یہ قلمی نام اس میدان میں بھی قابل قبول ہوگا۔ متین الدین ہنسے، رکے پھر ہنسے اور بولے۔ ابھی نہیں۔ جتنا میں نے پڑھا ہے وہ بھول جاؤں تو تنقید پہ لکھنا شروع کر دوں گا۔

★

رحمت امروہوی (احمد آباد)

# حزیں قریشی احمد آبادی

**نام** :۔ احمد حسین
**تخلص** :۔ حزیں قریشی۔ وطن احمد آباد
**تاریخ پیدائش** :۔ ۱۹۱۰ء تاریخ پیدائش اور سنہ کا علم خود حزیں صاحب کو بھی نہیں تھا اُن ہی کے بقول ۱۹۱۱ء بھی ممکن ہے

**وفات** :۔ ۱۹۸۰ء ۱۷۔ اپریل

شعری مجموعہ بہشتِ خیال (۱۹۶۸) نعتیہ مجموعہ زیرِ ترتیب غیر مطبوعہ کلام محفوظ ہے مدفون موسا سہاگ قبرستان شاہی باغ احمد آباد

احمد آباد نے جو اُردو کے بابائے شاعر ولی گجراتی کی سرزمین کہا جاتا ایسے ایسے باکمال شعرا اُدبا اور فنکار دیئے ہیں کہ جب بھی احمد آباد کی ادبی تاریخ قلمبند کی جائیگی تو ان لوگوں کا نام اور ادبی خدمات فراموش نہیں کی جاسکیں گی ادب کے خاموش۔ خدمت گذاروں میں حزیں قریشی کا نام بھی ہے جنکی۔ ادبی خدمات پورے صوبے پر محیط ہیں زبان و ادب کی خاموش خدمات کا یہ سلسلہ بغیر کسی ستائش اور نام و نمود کے عمر کی آخری سانسوں تک جاری رہا حزیں مرحوم جتنے اچھے شاعر تھے اتنے ہی اچھے انسان بھی تھے نیک سیرت وضع دار با اخلاق اپنے ہمعصر شعرا کی قدر و منزلت اور اپنے سے کم عمر فنکاروں کی ہمت افزائی میں بے انتہا فراخ دل ثابت ہوتے تھے یہی وجہ ہے کہ عیب بینی سے نفرت کرتے تھے موصوف نے گجرات کے اُن علاقوں میں اُردو کو عام کیا جہاں لوگ اپنی زبان سے ناواقف تھے مثلاً سورت۔ بھڑوچ۔ کلول و دھدا و رکھمبات تک مرحوم نے زبان و شاعری کو عام کیا حزیں صاحب سے میرے بہت ہی قریبی تعلقات تھے اور اکثر اُن سے شعر و شاعری پر طویل گفتگو رہتی تھی حالانکہ میری شاعری کی عمر اُنکے مقابلے میں بہت مختصر ہے بلکہ ناپختہ اور ایک طالب علم کی سی ہے تاہم جب بھی کوئی نئی غزل کہتے تھے مجھے ضرور سُناتے تھے اور کبھی کبھی تو یہاں تک کہہ دیا کرتے تھے کہ رحمت صاحب ذرا دھیان سے سننے گا اگر کہیں کوئی سقم ہوگیا ہو تو مطلع کر دینا میرے منع کرنے کے باوجود بھی وہ اکثر یہ فقرہ دہرا دیا کرتے اور مجھے شرمندہ ہونا پڑتا اپنی تمام تر خداداد صلاحیتوں کے باوجود بھی شہرت کی تمنا نہیں کی بڑے مشاعروں میں شرکت نہیں کرتے تھے نشستوں میں البتہ جایا کرتے تھے کبھی کسی مشاعرے کی صدارت قبول نہیں کی اگر کبھی بہت اصرار کیا تو برہم ہو جاتے اور ہم لوگ خاموش ہو جاتے حزیں صاحب کی شاعری میں جو تازگی اور رکھ رکھاؤ تھا وہ انھیں اور نمایاں کر سکتا تھا مگر مزاج کی سادگی اور طبیعت کی بردباری نے انھیں تمام ہنگامہ آرائیوں اور اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کی تمام کوششوں سے باز رکھا کسی ادبی گروہ بندی یا سیاسی گٹھ جوڑ سے بہت دور تھے اور تعمیری کاموں پر یقین رکھتے تھے انکے بیشتر شاگرد اردو شعر و ادب کی عملی خدمات اسی طرح خامشی سے کر رہے ہیں جو مرحوم کا خاصہ تھا حزیں صاحب کی تعلیمی استعداد بہت معمولی تھی اسکے باوجود شاعری کے تمام رموز و نکات سے واقف تھے فن پر دسترس اور نظر باریک بیں تھی انھوں نے کلاسیکی شعرا اور اساتذہ کا نہایت گہرا

مطالعہ کیا تھا اور بعض اساتذہ کی صحبت سے مستفید بھی ہوئے تھے مشاہدے اور تجزیے کے عمل نے انکی شاعری میں ایک طرح کا تنوع بھی پیدا کر دیا تھا... حزیں قریشی کا تعلق داغ اسکول سے تھا داغ کے مشہور شاگرد آغا شاعر دہلوی کے شاگرد عادل دہلوی سے شرف تلمذ تھا اسکے باوجود علامہ سیماب اکبرآبادی کے پرستار اور مداح تھے اور علامہ کی بے پناہ قوتِ شعری سے متاثر اعجاز صدیقی کی ادارت میں جس وقت شاعر آگرے سے شایع ہوتا تھا اس وقت اس میں ہر ماہ طرحی مشاعرہ ہوتا تھا حزیں صاحب بھی طرح پر غزل کہتے اور شاعر کے اس ماہانہ سلسلے میں برابر شایع ہوتے رہے پھر انکی غزلیں شاعر اور دیگر ادبی جرائد میں نمایاں طور پر شایع ہونے لگیں اس طرح علمی و ادبی حلقے میں مشہور و معروف ہونے لگے اپنے ابتدائی دور میں ایک مرتبہ احمد آباد کے ایک فی البدیہہ مشاعرے میں مدعو کئے گئے مصرع طرح تقسیم ہوا اور مقررہ مدت کے اندر سب سے عمدہ شعر جس نے کہے وہ حزیں صاحب تھے نہایت ہی زود گو مشکل پسند اور اختراعی ذہن کے مالک تھے نئی نئی زمینوں کی تلاش نئے قوافی اور ردیف کی جستجو وہ بھی اچھوتے مضامین کے ساتھ انکا محبوب مشغلہ تھا عربی و فارسی کی نامانوس اور نئی نئی تراکیب کا استعمال اتنی خوبصورتی سے کرتے تھے کہ جذبہ و فکر دونوں کا امتزاج شعر کی ترسیل میں مبہم نہیں ہوتا تھا مشکل پسندی اور استادانہ رکھ رکھاؤ نے کتنے ہی بلند قامت شعرا کے یہاں ابہام کی فضا پیدا کر دی ہے مگر حزیں قریشی کی شاعری میں کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ عصری فضا اور آج کے مسائل کا اظہار بھی ملتا ہے استادانہ ڈھنگ کی شاعری سے حزیں صاحب نے خود کو ہمیشہ بچائے رکھا الفاظ اور تراکیب میں اگر کوئی جدت ہے بھی تو تقلیدی نہیں۔ تصوف کے رسیا مذہبی مزاج اور ماحول کے پروردہ دین دار شاعر کی شاعری میں جا بجا تصوف کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں عمر کے اس بہاؤ نے اس رنگ کو اس قدر نمایاں کیا کہ آخری عمر میں صرف نعتیں اور منقبتیں ہی کہنے لگے تھے اس رنگ میں بھی مزاج وہی تھا جو غزل میں برتا گیا تھا نئی نئی زمینوں کی تلاش نئے نئے ردیف اور منفرد قوافی اچھوتے خیالات الفاظ و تراکیب میں تلاش جستجو کا عمل صرف عقیدت ہی نہیں یا صرف شاعری ہی نہیں بلکہ احساسات و جذبات کی سچائی اور عقیدت میں انفرادیت کا لحاظ بھی تھا نعتوں اور منقبتوں کا انتخاب اگر شایع کیا جائے تو یقیناً دو جلدوں میں سمائے گا حزیں مرحوم کے صاحبزادے جو خود بھی شاعر ہیں انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ والد مرحوم کا نعتیہ کلام ترتیب دے رہے ہیں میرے خیال میں یہ بھی ہونا چاہیے وہ شعری سرمایا جو اب تک غیر مطبوعہ ہے مجموعہ کی شکل میں شایع ہو جائے۔ . حزیں صاحب کی علمی و شعری خدمات کے اعتراف میں احمد آباد کے علمی و ادبی حلقے نیز قریشی برادری نے ۱۱ مئی ۱۹۸۲ء کو شاندار پیمانے پر جشن کا اہتمام کیا جس میں مرحوم کے شاگرد جمال قریشی نے انتہائی محنت دوڑ دھوپ اور جانفشانی سے پروگرام کو کامیاب بنایا اور مرحوم کی خدمت میں کیسۂ زر بھی پیش کیا گیا مرحوم کے بے شمار شاگردوں میں انکے جانشین جمال قریشی ہیں جس کا اعلان مرحوم نے انتقال سے قبل گلبن کے ایڈیٹر کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا۔

گجرات کی علمی و ادبی محفلوں سے ایک باکمال شاعر ایک اچھا انسان ایک بزرگ رخصت ہو گیا جسکی کمی کا احساس مدتوں باقی رہے گا۔

کلام۔

زمانہ تنقید کیا کریگا کہ عارفِ حسنِ زندگی ہوں
عیوب پر بھی نگاہ کی ہے کمالِ ذوقِ ہنر سے پہلے

رات کی تنہائیوں میں جاگ تو میری طرح
سازِ دل پر گا کبھی نغماتِ ہو میری طرح

حزیں تلاشِ مضامیں کروں فلک سے بھی دور
ملیں جو میرے تخیل کو جبرئیل کے پر

کہیں ملی نہ بہارِ دوام کی سرخی
بیاضِ بلبل و گل کا ورق ورق دیکھا

ایسے دن رات بھی کچھ منزلِ حق پر کاٹے

مناظر عاشق ہرگانوی

# عکسِ ریختی

**انتخاب ریختی**
**مرتبہ** سید سبط محمد نقوی
**صفحات** ۱۴۴ سائز ڈیمائی
**قیمت** ۴/۵۰ روپے
**ناشر** اترپردیش اردو اکادمی، بلھو ہاؤس، قیصرباغ لکھنؤ (یو، پی)

بقول ڈاکٹر محمود الٰہی ادب جذبات و واردات کا آئینہ دار اسی وقت بنتا ہے جب الفاظ معنویت سے ہم آہنگ ہونے کا سلیقہ سیکھ لیتے ہیں اور یہ سلیقہ صرف درباروں، خانقاہوں اور کوچہ و بازار میں نہیں سکھایا جاتا بلکہ اس کی تربیت پس پردہ رہنے والی آبادی میں بھی ہوتی ہے۔

ہم جسے روز مرہ اور محاورہ یا ٹکسالی زبان کہتے آئے ہیں۔ وہ اسی پردے کے پیچھے والی آبادی میں ڈھلتی ہے۔ ریختی اسی ٹکسالی زبان کا ایک رخ ہے۔ اور چار دیواری میں محصور آبادی کے جذبات اور اس کے حرکات و سکنات کی ترجمان،

زبان و ادب کے تشکیلی دور کے مطالعہ کیلئے ریختی سے ہی ضروری ہے اس کے موجد کا سہرا سعادت یار خاں رنگین۔ ہاشمی بیجاپوری کے سر بندھتا ہے۔

" انتخاب ریختی " میں سبط محمد نقوی نے سعادت یار رنگین، انشاء اللہ خاں انشاء، میر یار علی جان صاحب، سید ن شاہ ہاشمی، اشرف، رحیم، رحمان، خاکی، لائق، قیس، نوبہار ذلیل مرزا علی بیگ نازنیں، عبداللہ خاں خانم، چھمن پری، شیخ باقر رضا اسداللہ دوگانا، قدرت علی قدرت، راحت دہلوی، سید احسان مخلوق، میر احمد علی نسبت، امجد علی خاں عصمت، میر حسین علی آفاق، نکتہ چیں، نازک، عابد مرزا بیگم، یک رنگ، سید محمد محسن رونق جمعیت علی خاں ثریا، کلن خاں بیچین، نثار حسین شیدا، رام راجہ بہادر حزیں، شبنم اور رنجور کا تعارف اور کلام پیش کیا ہے۔ ان میں سے سعادت یار خاں رنگین انشا اور جان صاحب پر تفصیل مواد ملتا ہے لیکن بقیہ ریختی گو شعراء کے سلسلے میں تحقیق سے کام نہیں لیا گیا ہے اکثر شعراء کے بارے میں اس طرح کے جملے درج ہیں۔

" ماسوائے تخلص کچھ نہیں معلوم "
" ان کی نسبت بھی کوئی علم نہیں "۔
" تحقیق کے ساتھ حال کا علم نہیں "
" نام یا حال کچھ نہیں معلوم "
" نام معلوم نہیں "۔
" کہیں باہر سے آکے لکھنؤ میں مقیم تھے "۔
" تخلص کے سوا بس اتنا ہی معلوم ہے کہ دہلی کے تھے "۔

نمونۂ کلام کے طور پر بھی کہیں دو کہیں تین اشعار درج ہیں۔

یہ کتاب دراصل " انتخاب ریختی " ڈاکٹر خلیق احمد صدیقی کی کتاب " ریختی کا تنقیدی مطالعہ " اور تمکین کاظمی کے تذکرہ " تذکرۂ ریختی " کو سامنے رکھ کر ایڈٹ کی گئی ہے۔

ریختی کے بعض اچھے نمونے سے لطف اندوز ہونے کے لئے

کم قیمت کی یہ کتاب پڑھی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے ایک صفحہ کا "پیش لفظ" اور سبط محمد نقوی نے چھ صفحہ میں معروضہ مرتب" لکھا ہے۔ ستر صفحہ میں فرہنگ بھی ہے کتاب کا غذ کتابت اور طباعت کے لحاظ سے معیاری ہے سرورق سادہ ہے۔

## ضلع جگت — کشن پرشاد شاد

صفحات ۸۳، سائز ڈیمائی، قیمت ۔/۴/۵۰ روپئے

ناشر۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی بہرہ ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ (یو پی)

ضلع اور جگت دو زبانوں کے دو الگ الگ لفظ ہیں۔

ضلع عربی میں پہلو کو کہتے ہیں اردو زبان میں تلازمہ و رعایت لفظی کے معنی میں مستعمل ہے۔

اور جگت ہندی کا لفظ ہے اصل معنی حکمت اور دانائی کے ہیں لیکن ارباب اردو ظرافت و بذلہ سنجی کی جگہ اس کا استعمال کرتے ہیں۔

دہلی اور لکھنؤ میں ابتداً جب اردو میں خوش گفتاری کی گئی تو خوش مذاق ظریفوں اور رنگین مزاج شوخ طبعوں نے اس پر ضلع جگت کی ایک خوشنما بیل چڑھائی۔

اس صنف میں تفریح اور دلچسپی کے علاوہ اعلیٰ درجے کی طبیعت داری و ذہانت اور زبان کے محاورات و کنایہ و اشارات پر عبور و مہارت پائی جاتی ہے

مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد اردو کے پہلے مصنف ہیں جنھوں نے ضلع جگت کی طرف توجہ دی اس صنف پر ۱۳۴۳ھ میں یہ کتاب لکھی۔ اس میں پورے فقرے اور سالم جملے اور امثلہ و مقولے و محاورات مناسب محل و مقامات کے ساتھ الگ الگ عنوان کے درج ہیں۔ اس کتاب میں چھیاسٹھ چیزوں کا ضلع جگت قلم بند ہے۔

برسات، دریا اور ندی، اسپ، فیل، تیر و کمان، خنجر و شمشیر، بندوق، شکار، چار پایہ، پرند، کیمیا، منطق، نجوم، طب، صرف و نحو، خوشنویسی، حروف و اعراب، عروض، شعر و شاعری، حساب، عمارت، فرش، پلنگ، نقارخانہ، باغ، رنبہ، ترکاری، شادی، بیاہ، اقسام طعام، شیرینی، پارچہ، لباس، خیاط، دستار، آئینہ، جواہر، زیور، پان، حقہ، عطر، رنگ، موسیقی، ساز، رقص، سیمانہ، آتش بازی، شطرنج، گنجفہ، چوسر، کبوتر، پتنگ، مرغ بازی، مور، کشتی، شیر و دروغ، ظروف، تنگ، ترازو، غلہ، کفنی، پھری گدا وغیرہ، جاگیر، بقیر، بلاد، شتر اور سراپا کا ضلع ہے۔

اپنی نوعیت کی اس دلچسپ اور معلوماتی کتاب کا مطالعہ ہر لحاظ سے "سود مند" ہوگا۔

اتر پردیش اکیڈمی کا یہ کارنامہ ہے کہ اچھی معیاری نادر اور نایاب کتابوں کو بہت ہی خوبصورت لکھائی چھپائی کے ساتھ انتہائی کم قیمت میں قاری تک پہونچا رہی ہے۔

کتاب "ضلع جگت" آفسیٹ پر چھپی ہے۔

# آپ کے خطوط

## رام لعل (لکھنؤ)

مشترکہ شمارہ موصول ہوا. ظفر ہاشمی صاحب کا اداریہ دعوت فکر دیتا ہے. عرصہ ہوا حیات اللہ انصاری صاحب نے ایک تجویز رکھی تھی کہ اب مشاعروں کو ایک "انڈسٹری" کے طور پر کمرشیل بنایا جا سکتا ہے. یعنی کوئی شخص ایک سرکس تیار کر کے سارے ہندوستان کا دورہ کرے تو لاکھوں روپئے کما سکتا ہے. اردو مشاعرے اب عالمی سطح پر بھی بے حد مقبول ہو رہے ہیں. زیر نظر شمارہ میں امان اللہ خاں شیروانی کی ہائیکو نظم پسند آئی. اسی طرح آزاد غزل تجربہ بھی جس میں کئی شعراء نے حصہ لیا ہے. پروفیسر مجتبیٰ حسین نے کرار نوری کے بہت اچھے شعروں کی نشاندہی کر دی ہے. منوہر لال ہادی کے مضمون "غالب اور گیان" میں بناپن ہے علیم صبا نویدی نے اکرام کاوش کے کلام سے بھی متعارف کرایا ہوتا تو اُن کے مضمون کی تشنگی دور ہو جاتی مجموعی طور پر رسالہ بہت اچھا ہے. اس کے لکھنے والوں کا حلقہ وسیع ہوتا جا رہا ہے. گجراتی ادب پر بھی اردو میں کچھ کام ہونا چاہیئے. وہاں کی تہذیبی تصویر بھی ابھی تک سامنے نہیں آئی ہے.

## رؤف خیر حیدر آباد

گلبن ملا. آپ کا "پوسٹ مارٹم" کا کالم بہت ہنگامہ خیز ہے عنایت اللہ کی خود نوشت Abrupt ختم ہوتی ہے اور تشنگی بڑھا دیتی ہے. آپ اگر برا نہ مانیں تو غنی اتلامی کے مضمون "اردو زبان کا پہلا شاعر کون تھا" کا تھوڑا سا پوسٹ مارٹم کر دوں. غنی اتلامی صاحب نے نہایت خود اعتمادی سے ایسے مواد پر اعتماد کیا جو ازکار رفتہ ہو چکا ہے حتی کہ جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو کی دو جلدیں چھپ گئیں چنانچہ ولی دکنی اب پہلا صاحب دیوان شاعر نہیں رہا محمد قلی قطب شاہ اس سے بہت پہلے اپنا دیوان چھوڑ چکا ہے. اردو کی پہلی شاعرہ کون ہو سکتی ہے؟ کہہ کر انھوں نے ملکہ نور جہاں کا جو غیر مستند شعر درج کیا ہے یعنی ؎

کل تم جو یہ کہتے تھے شمشیر ہے اور میں ہوں
یہ طشت ہے یہ سر ہے تقصیر ہے اور میں ہوں

اس پر نیاز فتح پوری والا لطیفہ یاد آیا کہ نیاز صاحب نے نور جہاں کو اردو کی شاعرہ قرار دئے جانے کی کوشش کا مذاق اڑاتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ ملکہ نور جہاں کو اردو کی شاعرہ قرار دینے والوں کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ داغ دہلوی کی شاگرد بھی تھی کیونکہ ملکہ نور جہاں سے منسوب اشعار کی زبان داغ کی زبان سے بہت قریب ہے.

## نصر قریشی الہ آباد

اپنے وسیع مطالعہ کی طرح تعلقات میں بھی وسعت رکھتے ہوئے صلہ اور ستائش کی پرواہ کئے بغیر قلمکار برادری سے قربت کی وجہ سے گلبن کو نئے لب و لہجے کا ترجمان بنانے میں آپ بہت کامیاب ہوئے ہیں پڑھنے کا مواد وافر انداز میں معیاری ہوتا ہے اور قلم کو تحریک دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ گلبن میں اچھے قلمکاروں کی تخلیقات یکجا کرنے میں آپ کامیاب ہیں آزاد غزل کے لئے بھی آپ کی کوشش بار آور ثابت ہوئی ہیں ہندوستان کے اردو ادبی پرچوں میں حمد اور نعت کی اشاعت میں بھی آپ [illegible] سے کام لیا ہے ورنہ لوگ احتراز کرنے کو فیشن سمجھتے

ہیں کہ کہیں قدامت کا لیبل چسپاں نہ کر دیا جائے حمد و نعت کے معاملے میں بھی اچھا انتخاب کلام سے پہچان کی ابتدا کر کے ذہن و دل پر خوشگوار تاثر قائم کیا جائے اور ہم جیسوں کو اس سے اچھی خاصی تحریک ملی ہے

**محشر رضوی نئی دہلی**

ماہ ستمبر اکتوبر کا گلبن نظر نواز ہوا۔ بہت پسند آیا۔ خاص طور سے ظفر ہاشمی صاحب نے جو ڈسکو مشاعرہ کے بارے میں لکھا ہے وہ بہت پسند آیا۔ نصر قریشی صاحب کی نعت بہت اچھی ہے۔ اس کے علاوہ نازش پرتاپ گڈھی اور اقبال دانش کی غزلیں اچھی ہیں۔ نواب احسن اسارودی کی غزل بہت پسند آئی اور ان کا یہ شعر

تشنگی جو زمانے کی داستانوں پہ
وہاں بھی میری کہانی کے اقتباس ملے

قابلِ تعریف ہے۔ اس شعر میں زندگی کی بہترین عکاسی کی گئی ہے

**سید محمد مرتضےٰ کریم سہروردی (پٹنہ)**

گلبن کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ اداریہ بہت خوب ہے ان دنوں منعقد ہونے والے مشاعروں کا نام تو واقعی ڈسکو ہی قسم کا ہونا چاہئے۔ آپ نے نہایت جرأتمندی کا ثبوت دیتے ہوئے مشاعرہ بازگروں کی خوب خبر لی ہے۔ آپ نے اداریہ کا حق ادا کر دیا ہے۔ انشاء اللہ اس کے اچھے اثرات مرتب ہونگے۔ کاش اردو کے کم از کم ادبی رسالے اپنے اداریوں سے حق کی صدا بلند کرنے میں مصلحت پسندی کو راستہ میں نہ آنے دیں۔

**شبیر حسین (گاندھی نگر)**

یقیناً گلبن ایک معیاری جریدہ ہے۔ حکیم شیرازی صاحب کا مضمون پڑھا اچھا ہے اور فکر انگیز ہے۔ شاعروں کے انحطاط پر ظفر ہاشمی صاحب کا اداریہ بہت اچھا اور حقیقت حال سے بہت قریب ہے۔ ہو سکتا ہے اب شعراء اپنا کلام رقص کرتے ہوئے بھی سنایا کریں۔

**غنی رتلامی (بڑودہ)**

اگست، ستمبر، اکتوبر کے شمارے موصول ہوئے۔ دونوں شمارے معیاری مضامین اور خوبصورت غزلوں سے مزین ہیں جو آپ کا اعلیٰ صحافت کے مظہر ہیں۔ جناب راحت امروہوی کا یاد رفتگاں بھی ان کے مخصوص انداز بیان میں خوب تر ہے۔ جناب خلش سہروردی کا مضمون بڑا ے شمس القادری مرحوم بھی خوب ہے۔

**جعفر لکھنوی (لکھنؤ)**

ستمبر اکتوبر کا گلبن زیر مطالعہ ہوا۔ مضامین اور غزلیں پسند آئیں۔ خاص طور سے نواب احسن اسارودی کی غزل اس دور شاعری میں قابل ستائش ہے۔

نعت میرے رسول کا انداز بھی انوکھا ہے۔ حالانکہ نصر قریشی صاحب نے سہارا متروکات بھی لیا ہے! تلک، اگر کوشش کرتے تو ترک کر سکتے تھے۔ ویسے مجموعی حیثیت سے رسالہ بہت اچھا ہے۔

Reg. No. GAMC-362
GULBUN (Monthly)
Vol. 6 No. 12
20/169, Gujarat Housing Board Colony,
Shahalam Tolnaka, AHMEDABAD-380028
(The First Social & Literary Urdu Magazine of Gjuarat)